مومن اور مطالعۂ مومن

ڈاکٹر
عبادت
بریلوی



سلسلۂ مطبوعات اُردو دنیا نمبر ۳

مومن

اور

مُطالعۂ مومن

ڈاکٹر عبادت بریلوی، ایم۔ اے۔، پی۔ ایچ۔ ڈی۔،
شعبۂ اُردو، پنجاب یونیورسٹی لاہور

اُردو دُنیا
کراچی ——— لاہور

تصنیف : مومن اور مطالعۂ مومن

مصنف : ڈاکٹر عبادت بریلوی، ام۔اے۔، پی ایچ۔ڈی۔،

ناشر : اُردو دُنیا۔ ۵۔حسن منزل، آرام باغ روڈ، کراچی۔۱

۳۶۔ڈنگا سنگھ بلڈنگ، بیڈن روڈ لاہور

کاتب : عبدالحق اکبرآبادی

طابع : اشرف پریس لاہور

تاریخ اشاعت : نومبر ۱۹۶۱ء

قیمت : پندرہ روپے

تعداد : ایک ہزار

سعادت یار خاں نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر اُردو دُنیا، آرام باغ روڈ، کراچی سے شائع کیا

دہلیٔ مرحوم

کی

یاد میں

سرزمیں دِلّی کی مسجودِ دلِ غم دیدہ ہے — ذرّے ذرّے میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

پاک اس اُجڑے گلستاں کی نہ ہو کیونکر زمیں — خانقاہِ عظمتِ اسلام ہے یہ سرزمیں

سوتے ہیں اس خاک میں خیرُالامم کے تاج دار — نظمِ عالم کا رہا جن کی حکومت پر مدار

دِل کو تڑپاتی ہے اب تک گرمیٔ محفل کی یاد
جَل چُکا حاصل مگر محفوظ ہے حاصل کی یاد

علامہ اقبالؒ



حکیم محمد مومن خان مومن دہلوی

فہرست

۵

مومن کی غزل

۶

مومن کی مثنویاں

۷

مومن کی اہمیت

پیش لفظ

اُنیسویں صدی کی دِلّی میں جن باکمال شاعروں نے آنکھ کھولی اُن میں حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی کی شخصیت ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے اُن کی انفرادیت کو یوں تو اُن کے ہم عصر شاعروں، معاصر تذکرہ نگاروں اور موجودہ دور کے لکھنے والوں سب ہی نے تسلیم کیا ہے لیکن ابھی تک اُن کے حالات کو جاننے، اُن کی شخصیت کو پہچاننے، اُن کے ماحول کو کھنگالنے اور اُن کی شاعری کے مختلف میدانوں کو چھاننے کا کام جیسا اور جس طرح ہونا چاہیئے تھا نہیں ہو سکا ہے جستہ جستہ مختلف تذکروں اور ادبی تاریخوں میں تو اُن کا ذکر ملتا ہے لیکن اُن پر ابھی تک کوئی مستقل اور مبسوط کتاب نہیں لکھی گئی ہے۔ حالانکہ اُن کی پہلو دار شخصیت اور تہہ دار شاعری اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ایک مفصل کتاب اُن پر لکھی جائے۔

یہ خیال ہی اس کتاب کی ترتیب و تالیف کا باعث بنا ہے۔ یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مومن کے حالاتِ زندگی کا بیان ہے۔ دوسرے باب میں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا تجزیہ ہے۔ تیسرے باب میں اُن کے زمانے کے تاریخی و سیاسی معاشی و معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، ذہنی و فکری، ادبی و شعری ماحول کا جائزہ ہے۔ چوتھے باب میں اُن کی تصانیف کی تفصیل ہے۔ پانچویں باب میں اُن کی غزل اور چھٹے باب میں اُن کی مثنویوں کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ ساتویں باب میں مختلف لکھنے والوں کے خیالات کو سامنے رکھ کر اُن کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔

ایک زمانے سے میری یہ خواہش تھی کہ مومن پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب لکھوں لیکن بعض دوسرے کاموں میں مصروف رہنے کے باعث یہ خواہش دِل کی دِل ہی میں رہی۔ اور میں اس کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کئی سال گزر جانے کے بعد اب خُدا خُدا کر کے اس خیال نے عمل کی شکل اختیار کی ہے اور اس کا سہرا برادرِ گرامی حکیم حبیب احمد خاں صاحب اشعر دہلوی

کے سر ہے۔ اُن کے پیہم تقاضوں نے اِس کام کو جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی اہمیت مجھ پر واضح کی اور مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس موضوع پر شوق اور انہماک کے ساتھ کام کروں۔

میں نے اس کتاب کی ترتیب میں مومن کی شخصیت اور شاعری سے متعلق تقریباً تمام مواد کو اپنے پیش نظر رکھا ہے، اور اب تک اس موضوع پر جتنی بھی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تحریریں دستیاب ہوئی ہیں، اُن سے حتی الامکان استفادہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مواد کی فراہمی میں مجھے بعض احباب سے بہت مدد ملی ہے۔ اِن میں جناب حکیم حبیب اشعر دہلوی، جناب مولٰینا سید ابوالخیر مودودی، جناب مولوی عبدالحیٔ انصاری، جناب قاضی عبدالودود، جناب سید تمکین کاظمی، جناب امتیاز علی خاں صاحب عرشی، جناب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب اور جناب پروفیسر سید وقار عظیم صاحب کے اسمائے گرامی خاص طور قابل ذکر ہیں۔ اِن بزرگوں اور دوستوں نے نہ صرف فراہمیٔ مواد میں میری مدد کی بلکہ اکثر اپنے گراں قدر مشوروں سے بھی مجھے نوازا، اور میں ان تمام حضرات کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ برادر محترم جناب ملک محمد اسلم صاحب (چیف اڈیٹر برٹش انفارمیشن سروس لاہور) نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس کتاب کے پروف پڑھے اور اشاریہ تیار کرنے کی زحمت بھی گوارا فرمائی۔ ان کا شکریہ ادا کرنا بھی میرا خوش گوار فرض ہے۔ میں اپنے عزیز شاگرد پروفیسر عثمان صدیقی صاحب کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے مومن کی فارسی تحریروں کی تصحیح کے کام میں میرا ہاتھ بٹایا۔

مومن کی شخصیت اور شاعری کا یہ مطالعہ تحقیقی اور تنقیدی زاویۂ نظر سے کیا گیا ہے لیکن یہ ایک بہت حقیر سی کوشش ہے جو صرف اس خیال سے کی گئی ہے کہ آئندہ بھی اس کا سلسلہ جاری رہے گا اور مستقبل میں واقعی اعلیٰ درجے کے کام اس موضوع پر ہو سکیں گے!

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

عبادت

۱۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء

مومن کے حالات

اُردو شعرا کے حالات کا سُراغ لگانا جوئے شیر کا لانا ہے۔ ان شعراء کے تھوڑے بہت حالات تو مل جاتے ہیں لیکن ان حالات کی تفصیل و جزئیات تک رسائی ذرا مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ اختصار کے ساتھ ان باتوں کا علم تو ہو جاتا ہے کہ شاعر کس خاندان سے تعلق رکھتا تھا؛ وہ کہاں پیدا ہوا؛ کن حالات میں اُس نے پرورش پائی؛ کون کون سی ملازمتیں کیں؛ کس طرح شاعری شروع کی؛ کس کا شاگرد ہوا؛ اور کتنا شعری سرمایہ جمع کیا؟۔ لیکن اگر ان حالات کی تفصیل و جزئیات کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے کیونکہ تمام تذکرے اس منزل پر پہنچ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ تلاش و جستجو کرنے والا اَن گنت سوالات لے کر ان تذکروں تک پہنچتا ہے لیکن اُس کو اپنے ان سوالوں کے خاطر خواہ جواب نہیں ملتے۔ اور بالآخر اُسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جن شاعروں کی نجی اور ذاتی زندگی ایک سیدھی لکیر کی طرح ہوتی ہے اُن کے حالات کی تفصیل و جزئیات کی تلاش و جستجو تو ایسی کچھ ضروری بھی نہیں ہوتی لیکن جن شاعروں کی زندگی میں نشیب و فراز ہوتے ہیں اور جن کی شخصیت پہلودار ہوتی ہے۔ اُن کی زندگی تفصیل و جزئیات کو معلوم کرنا ضروری

ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کا صحیح مطالعہ ممکن ہی نہیں۔ پہلو دار شخصیت رکھنے والے شاعروں کی زندگی میں اَن گنت واقعات ہوتے ہیں۔ ان واقعات کی وجہ سے اُس میں ایک ہیجان اور ہنگامہ سا برپا رہتا ہے اور ایک مدوجزر کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس لئے اس کی شخصیت اور فن کا تجزیہ حالات و واقعات کی اس تفصیل و جزئیات کا تقاضا کرتا ہے لیکن عام طور پر اُردو شعراء کی زندگی کے حالات و واقعات کی تفصیل و جزئیات نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت اور فن دونوں بڑی حد تک صحیح تجزیہ سے محروم رہتے ہیں۔

یہ بات بظاہر بڑی عجیب ہے کہ اُردو میں بعض بڑی ہی پہلو دار شخصیت کے شاعر پیدا ہوئے لیکن ان کے حالاتِ زندگی کا بہت کم لوگوں کو علم ہے لیکن جن مخصوص حالات میں یہ شاعر پیدا ہوئے اُن کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات ایسی کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اس کے اسباب بہت واضح ہیں۔ اردو کے شاعر اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنا نہیں چاہتے۔ اُن میں ایک عجز و انکسار رہتا ہے۔ اس لئے اُن کی باتیں دوسروں تک بہت کم پہنچتی ہیں۔ اور اُن کے صحیح حالات کا علم بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ اُن کا مخصوص معاشرتی اور تہذیبی ماحول بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی نجی زندگی کے حالات و واقعات کو عام کریں کیونکہ ایسا کرنے میں کچھ اپنے آپ کو رسوا کرنے کا خیال اُن کو زیادہ رہتا ہے۔ اور وہ اس رسوائی کو کسی قیمت پر مول لینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ یہی سبب ہے کہ اُردو کے شاعر کو کبھی اپنے نجی حالات کی تفصیل لکھنے کا خیال نہیں آیا۔ اپنے پاس اُٹھنے بیٹھنے والوں کو بھی اس نے یہ حالات نہیں بتائے۔ بلکہ ایسے لوگوں کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا جن کے بارے میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ وہ اُس کے حالات کو قلمبند کر دیں گے یا زبانی دوسروں تک پہنچا دیں گے۔

جس معاشرے میں یہ شاعر پیدا ہوئے، اُس میں بھی کچھ یہی ریت تھی کہ افراد شاعر کی شاعری سے تو دلچسپی لے لیتے تھے لیکن اُس کے ذاتی معاملات سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ اس کے نجی حالات سے انھیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے قریبی احباب تک کا کم و بیش یہی حال تھا۔ خطوط میں ان حالات کا خاصا ذخیرہ مل جاتا ہے لیکن اُردو کے شاعروں کے

خطوط نہیں ملتے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ شاعر خطوط لکھتے ہی نہیں تھے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان خطوط کو محفوظ رکھنے کی روایت اُس معاشرے میں موجود نہیں تھی۔ چنانچہ اُردو شعرار کے خطوط کا پتہ نہیں چلتا۔ جن اُردو شعرا کے تھوڑے بہت خطوط محفوظ کر لئے گئے ہیں انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ہم عصر شعرار کی سوانح عمریاں لکھنے کا رواج بھی اُردو میں عام نہیں تھا۔ چنانچہ ان شعرا کے حالات کو معلوم کرنے کا سب سے اہم وسیلہ وہ تذکرے ہیں جو اُن کے زمانے میں یا اُن کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان تذکروں کا مقصد نجی حالات کی تفصیل اور ذاتی معاملات کی جزئیات کو پیش کرنا نہ تھا۔ اس لئے حالات کی فراہمی میں ان سے بھی خاطر خواہ مدد تو نہیں ملتی لیکن "جگر لخت لخت" کو جمع کیا جائے تو ایک ہیولا سا ضرور بن جاتا ہے۔

مومن اُردو شعرا میں بڑی پہلو دار شخصیت رکھتے تھے۔ اور اُن کی یہ پہلو دار شخصیت بھی اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اُن کے حالات کی تفصیل و جزئیات کا سراغ لگایا جائے لیکن اس تفصیل و جزئیات کو حاصل کرنے میں خاصی دشواریاں ہیں۔ مومن نے اپنے بارے میں خود کچھ نہیں کہا ہے۔ اُن کی کوئی سوانح عمری بھی نہیں لکھی گئی ہے۔ انھیں کوئی حالی نہ ملا جو یادگار غالب کی طرح یادگار مومن لکھ دیتا۔ آزاد نے "آبِ حیات" تک میں اُن کے حالات نہیں لکھے۔ آب حیات کا پہلا اڈیشن اُن کے تذکرے سے خالی تھا۔ مولانا حالی کے توجہ دلانے پر دوسرے اڈیشن میں اُن کے حالات بڑھائے گئے۔ لیکن جس طرح حالی نے لکھ کر بھیجے تھے اسی طرح چھاپ دیے گئے۔ آزاد نے اس پر کوئی خاص اضافہ نہیں کیا۔ آب حیات میں لکھتے ہیں :-

"پہلی دفعہ اس نسخے میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ دورِ پنجم جس سے اُن کا تعلق ہے۔ بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع و لباس کے ساتھ ہو جو اہل محفل کے لئے حاصل ہے۔ نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ خان موصوف کے کمال سے مجھے انکار نہیں۔ اپنے وطن کے اہلِ کمال کا شمار بڑھا کر، اور ان کے کمالات دکھا کر ضرور چہرۂ فخر کا رنگ چمکاتا لیکن میں نے ترتیب کتاب کے

دنوں میں اکثر اہل وطن کو خطوط لکھے اور لکھوائے۔ وہاں سے جواب صاف آیا وہ خط بھی موجود ہیں۔ مجبوراً اُن کا حال قلم انداز کیا۔ دُنیا کے لوگوں نے اپنے اپنے حوصلے کے بموجب جو چاہا سو کہا۔ آزاد نے سب کی عنایتوں کو شکریے کا دامن پھیلا کر لے لیا۔ ذوق ؎

دو گالیاں کہ بوسہ خوشی پر ہے آپ کی　　رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں

البتہ افسوس اس بات کا ہے کہ بعض اشخاص جنھوں نے میرے حال پر عنایت کر کے حالات مذکورہ کی طلب و تلاش میں خطوط لکھے، اور سعی ان کی ناکام رہی۔ اُنھوں نے بھی کتاب مذکور پر ریویو لکھا۔ مگر اصل حال نہ لکھا، کچھ کا کچھ اور ہی لکھ دیا۔ میں نے اسی وقت دہلی اور اطرافِ دہلی میں اُن اشخاص کو خطوط لکھنے شروع کر دیئے تھے جو خان موصوف کے خیالات سے دل گلزار رکھتے ہیں۔ اب طبعِ ثانی سے چند مہینے پہلے تاکید و التجا کے نیاز ناموں کو جولانی دی انھیں میں سے ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے باتفاقِ احباب اور صلاحِ ہم دگر جزئیات احوال فراہم کر کے چند ورق مرتب کیئے اور عین حالتِ طبع میں کہ کتاب مذکور قریب الاختتام ہے مع ایک مُراسلے کے عنایت فرمائے بلکہ اُس میں کم و بیش کی بھی اجازت دی میں نے فقط بعض فقرے کم کیئے جن سے طولِ کلام کے سوا کچھ فائدہ نہ تھا۔ اور بعض عبارتیں اور بہت سی روایتیں مختصر کر دیں یا چھوڑ دیں جن سے اُن کے نفس شاعری کو تعلق نہ تھا باقی اصل حال کو بجنسہ لکھ دیا۔ آپ ہرگز دخل و تصرف نہ کیا۔ ہاں کچھ کہنا ہوا تو حاشیے پر با خطِ وحدانی میں لکھ دیا۔ جو احباب پہلے شاکی تھے امید ہے کہ اب اس فروگزاشت کو معاف فرما دیں گے۔[۱]

آزاد کے علاوہ مومن کے دوسرے ہم عصروں نے بھی اُن کے حالات تفصیل سے نہیں لکھے ہیں۔ اُن میں سے بعض کی تحریروں میں کہیں کہیں اجمال کے ساتھ اُن کا ذکر ملتا ہے۔ غالب

---

[۱] آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۰-۴۲۱

کی طرح مومن کے خطوط بھی محفوظ نہیں ہیں۔ صرف انشائے مومن چند فارسی خطوط اور تقریظوں کا مجموعہ ہے۔ جو چھپ چکا ہے۔ اُس میں بھی اُن کے حالات تفصیل سے نہیں ہیں صرف چند خطوط ایسے ہیں جن سے اُن کے کچھ معاملات و مسائل کا علم ہو جاتا ہے۔ ان کے علاوہ مومن نے اپنی زندگی میں جو خطوط لکھے ان کا پتہ نہیں چلتا۔ البتہ اُن کے زمانے میں جو تذکرے لکھے گئے ہیں، اُن میں کسی قدر اُن کے حالات مل جاتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی تفصیل نہیں ہے، صرف اشارے ہیں۔ ان اشاروں کو اگر یکجا کیا جائے تو مومن کے حالات کی ایک تصویر بن سکتی ہے لیکن ابھی تک یہ کام بھی ہو نہیں سکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ مومن کے حالاتِ زندگی کی تفصیل و جزئیات آسانی سے دستیاب نہیں ہوتی۔ حالانکہ اُن کی پہلو دار شخصیت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان حالات کو معلوم کیا جائے۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہے۔ کیونکہ یہ حالات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کو یکجا کرنے اور ایک لڑی میں پرونے ہی سے کسی حد تک تفصیل و جزئیات کا علم ہو سکتا ہے۔

مومن کے تھوڑے بہت حالات تو اُن کے زمانے کے تذکرہ نگاروں نے لکھے ہیں شیفتہ نے گلشن بے خار میں یوں اُن پر خاصی تفصیل سے لکھا ہے لیکن حالات کی طرف نسبتاً کم توجہ کی ہے۔ میرزا قادر بخش صابر نے گلستانِ سخن میں اُن پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن ذاتی حالات کی طرف بہت کم متوجہ ہوئے ہیں۔ مولوی کریم الدین جنھوں نے فیلن کے ساتھ مل کر تذکرہ طبقاتِ شعرائے ہند، اور گلدستۂ نازنیناں مرتب کیے، مومن کو بخوبی جانتے تھے، انھیں اُن سے عقیدت بھی تھی لیکن انھوں نے بھی ذاتی حالات کو تفصیل سے بیان نہیں کیا۔ نساخ کے سخن شعرا، اور نور الحسن کے طور کلیم میں بھی اُن کے حالات بہت مختصر ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ ان لوگوں کے پیش نظر شعرائے اُردو کے تذکرے مرتب کرنا تھا۔ ظاہر ہے کہ تذکروں میں سوانح کی سی تفصیل نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی یہ تذکرے بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ ان کے ذریعے سے جو معلومات حاصل ہوتی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ بات یہ ہے کہ ان میں سے بیشتر لکھنے والے نہ صرف مومن کے ہم عصر تھے بلکہ ان کے ساتھ ان لوگوں کی ذاتی نسبت بھی تھی۔ آزاد کی آبِ حیات پہلی کتاب ہے جس میں مولانا حالی نے مومن کے حالات کسی

قدر تفصیل سے لکھے ہیں۔ بشیر الدین احمدؔ نے بھی واقعات دار الحکومت دہلی میں مومنؔ کی زندگی کے بعض واقعات کو پھیلا کے بیان کیا ہے۔ عرشؔ گیاوی نے بھی حیاتِ مومن میں ان کے حالات کی تھوڑی سی تفصیل پیش کی ہے، اور مولانا ضیا احمد بدایونی نے دیوان مومنؔ کے دیباچے میں مومنؔ کے حالات کو نئی ترتیب کے ساتھ یکجا کیا ہے۔ نگار کے مومنؔ نمبر میں بھی اُن کے کچھ حالات مل جاتے ہیں۔ کلب علی خاں فائقؔ نے بھی حیات مومن کے عنوان سے ایک مفصل مضمون اورینٹل کالج میگزین میں لکھا ہے، اور اس میں نہ صرف اُن کی زندگی کے حالات بیان کیے ہیں بلکہ اُن کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں مومنؔ کے فارسی اور اُردو کلام کو خاص طور پر سامنے رکھا ہے۔ بس یہی حالاتِ مومنؔ کے اہم مآخذ ہیں۔ ان سے مومن کے حالات اور ان کی شخصیت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔

(۲)

مومنؔ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے شیفتہؔ نے اُن کے بارے میں لکھا ہے کہ "از دودمانِ گرامی و خاندان نامی است[1]"۔ لیکن انھوں نے اس دودمانِ گرامی اور خاندانِ نامی کی تفصیل نہیں لکھی مختلف لکھنے والوں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ اُن کا خاندان کشمیر سے ہندوستان میں آیا، اور شاہ عالم کے زمانے میں اُن کے آبا و اجداد دلّی میں آکر آباد ہوئے۔ دربار میں انھیں جگہ ملی اور شاہی طبیبوں کی حیثیت سے انھیں بڑا مرتبہ حاصل ہوا مومنؔ کے دادا حکیم نامدار خاں اپنے بھائی حکیم کامدار خاں کے ساتھ کشمیر سے دلّی آئے تھے۔ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "اُن کے (مومن خاں) والد غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں، اور حکیم کامدار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں آکر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے[2]"۔ اس سے زیادہ تفصیل اُن کے آبا و اجداد کے بارے میں کہیں اور نہیں ملتی۔

ان بیانات سے یہ تو یقین ہو جاتا ہے کہ مومنؔ کشمیری تھے بعض لوگوں نے انھیں نسلاً سید بتایا ہے۔ عرشؔ گیاوی نے "حیات مومن" میں مومنؔ کے جو حالات لکھے ہیں اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے: "آپ علوی سادات و نجبائے کشمیر سے ہیں، اصل وطن آپ کے بزرگوں کا

---

[1] شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۵ [2] آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۱

کشمیر ہے" اور حاشیے میں یہ عبارت لکھی ہے "تذکرۂ شعرا مؤلفہ نواب صدیق حسن خاں والی بھوپال اور بہ تصدیق اُس کے نواسۂ مومن جناب ناصر حبیب صاحب وکیل ریاست ذتیا ضلع بندیل کھنڈ کا خط دیکھو جس میں وہ اس کی تصدیق فرماتے ہیں۔ نیز ہندوستان میں آج سینکڑوں ایسے ہیں جو خاں صاحب اور خان بہادر کے خطاب کی بدولت سید سے پٹھان مشہور ہو گئے۔ مختصر یہ کہ مومن پٹھان نہ تھے۔"[۱] لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اُن کے باپ دادا کے نام پٹھانوں کے سے معلوم ہوتے ہیں۔ مومن کے نواسے عبدالحیٔ انصاری صاحب نے راقم الحروف کو ایک خط میں مومن کے کچھ حالات لکھے ہیں۔ اُس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اُن کی اصل کشمیری تھی لیکن وہ قوم کے پٹھان تھے یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

غالباً عرش گیاوی کو کسی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ بہت ممکن ہے یہ غلط فہمی مومن خاں کی شادی کی وجہ سے ہوئی ہو جو خواجہ میر دردؔ کے خاندان میں ہوئی تھی۔ عرش کو غالباً یہ خیال گزرا ہے کہ ایک پٹھان کی شادی سادات میں نہیں ہو سکتی لیکن چونکہ مومن خاں کی دوسری شادی شاہ محمد نصیر صاحب کی صاحب زادی انجمن النسا بیگم سے ہوئی اور وہ سید تھے اس لئے عرش گیاوی نے یہ خیال قائم کر لیا۔ بہر حال مومن کے نواسے عبدالحیٔ انصاری صاحب کا یہ خیال مستند اور صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مومن پٹھان تھے۔ اور اُن کا خاندان پٹھانوں کا ایک اہم خاندان تھا۔

عرش نے اس خاندان کے بارے میں بھی جو کچھ لکھا ہے اُس سے بھی بعض غلط فہمیاں پھیلتی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں "اصل وطن آپ کے بزرگوں کا کشمیر ہے۔ جس وقت کہ شاہ عالم کی سلطنت کا چراغ خاموش ہونے کو بھڑک رہا تھا آپ کے بزرگوں میں دو بھائی حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دہلی میں آئے اور شاہی اطبا میں داخل ہوئے۔ خاں صاحب کے خطاب سے ممتاز دربار ہوئے۔ یہ لوگ جب دلّی میں آئے تو کوچۂ چیلان میں، جہاں اُن دنوں اکابرِ روزگار کا مسکن تھا۔ قیام کیا، اور یہاں وہ راحت پائی کہ پھر وطن کو نہ پلٹے، صلۂ خدمت میں بادشاہ کی طرف سے پرگنہ نارنول کے چند مواضعات جس میں موضع بلاہہ بھی تھا بطور جاگیر عطا ہوئے۔ کچھ دنوں بعد ان دونوں بھائیوں کے نام پر دو خاندان ہو گئے یعنی نامدار خانی

[۱] عرش گیاوی: حیات مومن: صفحہ ۳۵

اور کامدار خانی۔ نامدار خانی میں مومن خاں ہوئے اور کامدار خانی میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں وغیرہ ہوئے[۵۱]۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مومن خاں اور حکیم اجمل خاں کا خاندان ایک تھا اجمل خاں کے خاندان کے لوگ کامدار خانی نہیں کہلاتے۔ "سیرت اجمل" میں لکھا ہے کہ "اجمل خان اعظم کے مورثِ اعلیٰ شہنشاہ بابر کے ساتھ ہرات سے ہندوستان آئے۔ علم و فضل کا یہ کارواں پہلے سندھ میں مقیم ہوا اور پھر اکبر آباد میں۔ ملا نورالدین علی بن محمد سلطان القاری الہروی الفقیہ الحسنی سے جو وقت کے امام تھے اس خاندان کے عروج و کمال کی ابتدا ہوتی ہے۔ جن کے بعد ملا علی داؤد، حکیم محمد فاضل خاں اور حکیم واصل خاں اس آسمان پر آفتاب بن کر چمکے، حکیم محمد فاضل خاں اس خاندان میں پہلے طبیب گزرے ہیں جن کے خلف الرشید حکیم محمد واصل خاں (اول) عہد شہنشاہ اورنگ زیبؒ میں اکبر آباد سے دہلی تشریف لائے اور عہدۂ طبابت پر ممتاز ہوئے۔ حکیم محمد واصل خاں محمد شاہ دہلی کے ابتدائی عہد حکومت میں راہی ملک بقا ہوئے۔ آپ نے دو صاحبزادے حکیم اکمل خاں جن کی عمر اس وقت ۱۶ سال تھی اور حکیم اجمل خاں اول جن کی عمر ۱۱ سال تھی، چھوڑے۔ بادشاہ نے بیٹوں کے باپ کا منصب مقرر کیا ــــ حکیم اکمل خاں کے دو صاحبزادے تھے حکیم محمد شریف خاں اور حکیم محمد سعید خاں[۵۲]"۔ حکیم اجمل خاں کا تعلق حکیم شریف خاں سے ہے اور اسی نسبت سے یہ خاندان شریف خانی کہلاتا ہے۔ حکیم کامدار خاں سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مومن کا تعلق یقیناً کامدار خاں اور نامدار خاں کے خاندان سے تھا۔

مومن کے آبا و اجداد طبیب تھے۔ یہ لوگ اطبا کی حیثیت سے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ کامدار خاں اور نامدار خاں جب کشمیر سے دلی آئے تو شاہی اطبا میں داخل ہوئے اور خاں صاحب کے خطاب سے ممتاز دربار ہوئے۔ یہ لوگ جب دلی میں آئے تو چیلوں کے کوچہ میں جہاں اکابرِ روزگار کا مسکن تھا قیام کیا اور یہاں وہ راحت پائی کہ پھر وطن کو نہ پلٹے۔ صلۂ خدمت میں بادشاہ کی طرف سے پرگنہ نارنول سے چند مواضعات جس میں موضع بلاہہ بھی تھا بطور جاگیر عطا ہوئے[۵۳]۔ یہ زمانہ مغلوں کا دور آخر تھا۔ بعضوں نے اس زمانے کو

---

۵۱ عرش گیاوی: حیاتِ مومن: ص ۳۵۔ ۵۲ سیرت اجمل (ہندوستانی دواخانہ دلی): ص ۴۰

۵۳ عرش گیاوی: حیاتِ مومن: ص ۳۵

شاہ عالم کا زمانہ بتایا ہے۔ انگریزوں کے زمانے تک یہ جاگیریں مومن خاں کے خاندان والوں کے قبضے میں رہیں۔ لیکن جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا۔ نواب مذکور نے اُن کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثہ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی۔ پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں نے اپنا حصہ لیا اور اس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے بھی اپنا حق پایا[۱]۔ عرش گیاوی نے لکھا ہے کہ "شاہی اثر معدوم ہو گیا تھا، نواب نے کمزور اور معذور جان کر اس خاندان کی پنشن مقرر کر دی۔ چنانچہ حکیم مومن خاں کہ حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نامدار خاں کے بیٹے تھے پانسو روپیہ ترکۂ خاندانی حاصل ہوا۔ اس کے علاوہ اس خاندان کے چار طبیبوں کو سرکار انگریزی کی طرف سے بھی سو روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر ہو گئی جس کے ایک چوتھائی کے وارث حکیم مومن خاں ہوئے۔ غرض یہ ممتاز خاندان عہد شاہی سے لے کر غدر سے پہلے تک نہایت فارغ البالی کے ساتھ امیرانہ زندگی بسر کرتا رہا اور اس خاندان کا ہر طبیب شاہی خصوصیت کے سبب رئیسانہ شان و شوکت رکھتا تھا[۲]۔ کم و بیش مومن خاں کے وقت تک اس خاندان کا یہی حال رہا۔ مومن کے زمانے میں حالات اگرچہ دگرگوں ہو گئے اور بڑی حد تک ماحول اس خاندان کے لئے سازگار نہ رہا۔ پھر بھی وہ خصوصیات باقی رہیں جن کو یہ خاندان اپنے لئے طرۂ امتیاز سمجھتا تھا۔

مومن خاں کے چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے۔ ہر شخص انھیں عزت کی نظر سے دیکھتا تھا اور اپنے زمانے میں اُن کی حیثیت بہت بلند تھی۔ سرسید حکیم غلام حیدر خاں کے بارے میں لکھتے ہیں "ارشد تلامذۂ حکیم شریف خاں سے ہیں۔ مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے جیسے اُن کی خدمت میں حل ہوتے ہیں، غالب یوں ہے کہ اس جزو زماں میں اور کہیں نہ ہوتے ہوں، خدمت اساتذۂ کرام مثل مولانا مخدومنا مولوی عبدالعزیز دہلوی اور مولوی رفیع الدین اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ درجاتہم سے سالہا سال استفادہ کیا اور انواع فیوض حاصل کئے۔ شفائے کامل اُن کے دست حق پرست

۱۔ بشیر الدین احمد: واقعات حکومت دہلی: ص ۴۲۴ ۲۔ عرش گیاوی: حیات مومن: ص ۳۶

میں ودیعت ہے۔ راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے[۱]" اور حکیم غلام حسن خاں کے بارے میں لکھتے ہیں "برادر حقیقی حکیم غلام حیدر خاں موصوف بصفات کمال۔ کتب طبیہ میں مہارت تام اور علاج معالجے میں دستگاہِ تمام رکھتے تھے تحصیل فن طب حکیم شریف خاں کی خدمت سے کی تھی۔ اب عرصہ چند سال کا ہے کہ اس جہاں سے عالم باقی کی طرف راہی ہوئے[۲]"

حکیم غلام نبی خاں مومنؔ کے والد تھے۔ اپنے زمانے کے طبیبوں میں ان کا مرتبہ بھی بلند تھا، اور وہ بھی اچھی زندگی بسر کرتے تھے۔ چیلوں کے کوچے میں ان کا مطب تھا، اور وہ باقاعدگی سے مطب کرتے تھے۔ ان پر مذہب کا گہرا اثر تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے ان کے تعلقات تھے۔ ان کے مطب کے قریب ہی شاہ صاحب کا مدرسہ تھا۔ ملاقاتیں رہتی تھیں، ان ملاقاتوں نے ان کو خاصا مذہبی بنا دیا تھا۔ وہ بڑے شفیق باپ تھے اور ان کی شخصیت کے اثرات مومنؔ پر بڑے گہرے ہیں۔ حکیم غلام نبی خاں کا انتقال ۱۲۴۱ھ میں ہوا۔ مومنؔ نے ان کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ تو فارسی میں کہا جس کے اشعار یہ ہیں ؎

پدرم شد اسیرِ دامِ اجل | روحش از بندِ تن بہ خشیجاں رست
طائرے بود آسماں پرواز | رفت بر شاخسار قرب نشست

بہ من الہام گشت سال وفات
کہ غلام نبی بہ حق پیوست[۳]

۱۲۴۱

اور اردو میں "شور انگیزی قلم سینہ چاک اشک فشاں در ماتم حکیم غلام نبی خاں" کے عنوان سے تاریخ کہی ؎

جہانِ نکوئی نکوئے جہاں | وحیدِ زماں والد مہرباں
یہاں تک انھیں شوق خلد بریں | کہ ہر دم کو گنتے دمِ واپسیں

---

[۱] سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۴۹-۵۰ [۲] سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۵۱
[۳] مومنؔ: دیوان فارسی: ص ۱۲۸

نہ دل میں نہ اُن کے زباں پر کبھو | رضائے الٰہی سوا آرزو
غرض آ گیا وقتِ موعود جب | گئی تن سے وہ جانِ عشرت طلب
تاسف نے کیا کیا ستایا مجھے | فلق نے زمیں پر لٹایا مجھے
غضب جان کو بے قراری ہوئی | بری حالت ایسی ہماری ہوئی
کہ دُکھا دل عشرت آلودمرگ | ہوئی زندگی اپنی محسودمرگ
جہاں سے جب ایسا شفیق اُٹھ گیا | تو جینے کا سچ ہے مزا کیا رہا
کہوں کیا کسی سے کہ کیا غم ہوا | سزاوار اشفاق ماتم ہوا
وے شعر کی جو ہوس ہے کمال | اسی غم میں تاریخ کا تھا خیال

جنازہ اُٹھایا فرشتوں نے آہ!
تو قد فاز فوزاً عظیماً کہا[۵]

۱۲۴۱

ان قطعات تاریخ سے مومن کے والد کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک خصال آدمی تھے۔ لوگوں کو اُن سے محبت تھی۔ زمانہ اُن کی عزت کرتا تھا۔ وہ بڑے شفیق اور مہربان باپ تھے۔ انھیں ہر لمحہ خلد بریں کا خیال رہتا تھا۔ رضائے الٰہی کے سوا ان کے دل میں کوئی آرزو نہیں تھی۔ غرض وہ بڑے نیک اور صاف باطن انسان تھے۔ انھیں صحیح معنوں میں جنتی کہنا چاہیئے۔

مومن کو اپنے والد کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ اُس وقت اُن کی عمر ۲۶ سال سے زیادہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ والد کی وفات کے بعد وہ بے یار و مددگار رہ گئے ہوں گے اور ساری ذمہ داریاں انھیں اُٹھانی پڑی ہوں گی۔ انشائے مومن میں اُنھوں نے ایک خط اپنی عمہ محترمہ یعنی حکیم احسن اللہ خاں کی والدہ کے نام لکھا ہے۔ اُس میں اپنی پریشانیوں کا ذکر کر کے اس سانحے پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

"اولیں جفائے این بے رحم بر من رفتہ آنست کہ ضمیرم بہ خاک دل سوختہ

---

[۵] کلیات مومن دیول کشور، ص ۱۸۵

دیگر برشتہ دل گرفتہ، روزے کہ رنگ کالبدم ریخت بہ شورِ محبت غمم انگیخت۔ جفائے ندیدہ۔ جفاہا دیدم وستمے ناکشیدہ ستمہا کشیدم۔ دیگر بیداد جانگزائی گہ جز نیم جانے نہ گذاشتہ سایۂ والدِ شفیق راکہ بہ آغوشِ عاطفتم پرورد از سرم بر داشتہ۔ ہنوز آں جراحت ناسور اثر رو بہ التیام نیاوردہ بود کہ مرگِ مادرِ مشفق سینہ خراشیہا نمود۔"[۵۱]

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کو اپنے والد کی وفات سے کتنا صدمہ ہوا اور یہ وفات اُن کے لئے کیسی پریشانی کا باعث بنی۔ اس خلش کو انھوں نے ساری زندگی محسوس کیا۔ اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں بڑی خوبیوں کے آدمی تھے اور مومن کی زندگی پر اُن کی ذات اور شخصیت کا گہرا اثر تھا۔ اُن کی وفات سے مومن کو یوں محسوس ہوا جیسے اُن کے خاندان کی عمارت گر پڑی۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کے انتقال کا خاندانی حالات پر گہرا اثر ہوا، اور اب اُس کی وہ بات باقی نہ رہی جس کے لئے وہ اس سے قبل مشہور تھا۔

(۳)

اس خاندان میں مومن خاں ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی ولادت چیلوں کے کوچے میں ہوئی۔ جہاں اُن کا آبائی مکان تھا۔ مومن کے والد اسی محلے میں مطب بھی کرتے تھے۔ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا مدرسہ بھی اس مطب سے قریب تھا، اور شاہ صاحبؒ کے غلام نبی خاں سے گہرے تعلقات تھے۔ ان تعلقات کی بنیاد عقیدت بھی تھی۔ چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو اُن کے والد شاہ عبدالعزیزؒ کو بلا کر لائے اور انھیں سے اُن کے کان میں اذان دینے کے لئے کہا۔ شاہ صاحبؒ نے مومن کے کان میں اذان دی اور غلام نبی خاں کی فرمائش پر اُن کا نام بھی رکھا۔ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا۔ گھر والوں نے اس نام کو نا پسند کیا، اور حبیب اللہ خاں نام رکھنا چاہا، لیکن شاہ صاحبؒ کے نام سے نام پایا۔"[۵۲]

---

[۵۱] انشائے مومن: صہ ۳ [۵۲] آزاد: آبِ حیات: صہ ۴۲۱

عرشؔ گیاوی نے لکھا ہے کہ ۱۲۱۵ھ اُن کا سنہ ولادت بتایا جاتا ہے۔ اسی محلے میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ پیدا ہوئے یہیں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کا مدرسہ بھی تھا اور اسی کے قریب غلام نبی خاں کا مطب بھی۔ اس لئے اُن حضرات میں مراسم تھے۔ چنانچہ جب مومن پیدا ہوئے تو اُن کے والد شاہ صاحبؒ کو بلا لائے اور انھیں سے کان میں اذان دلوائی نام کے لئے کہا تو شاہ صاحبؒ نے مومن علی نام رکھ دیا۔ گھر والوں کی طرف سے دوسرا نام حبیب اللہ پیش کیا گیا مگر شاہ صاحب نے فرمایا نہیں۔ اسی نام سے یہ دنیا میں نام پائے گا۔ آخر وہی ہوا۔ یہاں تک کہ جب شعر کہنے لگے تو تخلص بھی مومن ہی رکھا اور اُن کے اُستاد نیز دوستوں نے بھی اس کو پسند کیا۔ اور جب سب نے پسند کیا تو خدا کو بھی مقبول ہوا۔ یہاں تک کہ یہ اپنے اعمال صالح کے بدولت واقعی حبیب اللہ ہوئے اور بہ شانِ مومن دنیا سے اُٹھے[۵]۔

مومن کے نواسے عبدالحیؔ انصاری لکھتے ہیں "آپ کا نام حبیب اللہ کاشمیری تھا جب یہ پیدا ہوئے تو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی مرحوم نے آپ کا نام مومن خاں رکھا اور اسی نام سے آپ مشہور ہوئے[۶]۔" یہ ہو سکتا ہے کہ گھر والوں نے مومن کا نام حبیب اللہ خاں رکھا ہو لیکن شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس خیال سے مومن خاں رکھ دیا ہو کہ غلام نبی خاں کا بیٹا بڑا ہو کر اسم بامسمیٰ ثابت ہو۔ سوائے عرشؔ گیاوی کے کسی نے اُن کا نام مومن علی نہیں بتایا ہے۔ بہت ممکن ہے عرشؔ نے انھیں سید ثابت کرنے کی غرض سے مومن خاں کی جگہ مومن علی لکھ دیا ہو لیکن اس میں صحت نظر نہیں آتی۔ یہ عرشؔ کے ذہن کی اختراع معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال مومن کا نام آج حبیب اللہ خاں یا مومن علی کوئی نہیں جانتا۔ وہ مومن خاں ہی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

مومن کی تعلیم کا آغاز گھر ہی سے ہوا لیکن جب ہوش سنبھالا تو وہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے مدرسے میں داخل کئے گئے۔ اور ان کی ابتدائی تعلیم شاہ صاحب کے اسی مدرسے میں ہوئی۔ کچھ عرصہ انھوں نے شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے استفادہ کیا اور کچھ کتابیں اُن سے پڑھیں۔ اس کے بعد وہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی خدمت میں پہنچائے گئے اور انھوں نے عربی کی

۵۔ عرشؔ گیاوی: حیاتِ مومن: ص ۳۰ ۶۔ عبدالحیؔ انصاری صاحب کا خط راقم الحروف کے نام

ابتدائی کتابیں شاہ صاحب ہی سے پڑھیں۔ مومن کو بچپن میں ان بزرگوں سے بڑی دلچسپی رہی۔ چنانچہ وہ ان کے وعظ بھی سنتے تھے۔ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے اُسے فوراً یاد کر لیتے تھے۔ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہ اسی طرح ادا کر دیتے تھے"[1] اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مومن کو ان بزرگوں سے دلی لگاؤ تھا وہ اُن سے گہری دلچسپی لیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اُن کی صحبتوں سے بہت کچھ حاصل کیا۔ عرشؔ نے لکھا ہے کہ تعلیم ان کی اسی مدرسے میں ہوئی، کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور بقیہ علامہ شاہ عبدالقادرؒ سے پڑھیں۔ اور یہیں عربی، فارسی، حدیث، فقہ، منطق، معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔ ذہن خداداد کا یہ عالم تھا کہ شاہ صاحب کا وعظ جو علاوہ علوم ظاہری کے نکات باطنی سے بھی بھرا ہوا ہوتا تھا بے فرق دوسرے روز اپنے والد کے مطب میں بیٹھ کے دوہرا دیتے تھے۔ مزا تو یہ تھا کہ مومن نکاتِ باطنی اور اسرار سینہ کو بھی اُسی طرح بیان کر دیتے تھے جس کی جھلک حضرت شاہ صاحبؒ کی تفسیر ناتمام میں موجود ہے[2]۔ غرض مومن کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں ان بزرگوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُنھوں نے اُن کے سائے میں نہ صرف مختلف علوم سے واقفیت پیدا کی بلکہ روحانی فیض بھی حاصل کیا۔ اسی لئے مومن ان کے زندگی بھر احسان مند رہے۔ انھوں نے ہمیشہ ان کا نام عزت سے لیا ہے اور ان کی تعریفیں کرتے رہے ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات پر جو تاریخ انھوں نے کہی اُس کے اشعار سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے۔ اس میں انھوں نے شاہ صاحب کو "وحید زماں" اور "یکتائے دوراں" کہا ہے اور اشعار میں اُن کی بڑی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں ؎

انتخابِ نسخۂ دیں مولوی عبدالعزیزؒ	بے عدیل و بے نظیر و بے مثال و بے مثل
جانبِ ملکِ عدم تشریف فرما کیوں ہوئے	آگیا تھا کیا کہیں مردوں کے ایماں میں خلل
ہے ستم اے چرخ تو کس کو یہاں سے لے گیا	کیا کیا یہ ظلم تو نے بے کسوں پر اے اجل
جب اُٹھائی نعش اک عالم تہ و بالا ہوا	لوٹتا تھا خاک پر ہر قدسیٔ گردوں محل
کیا کس و ناکس پہ تھا صدمہ کیا جس وقت دفن	ڈالتا تھا خاک سر پر ہر عزیز و مبتذل

---

[1] آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۲   [2] عرش گیاوی: حیات مومن: ص ۳۷-۳۸

مجلسِ دردآفرین تعزیت میں میں بھی تھا — جب پڑھی تاریخ مومن نے یہ اکبر بے بدل
دستِ بیدادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقرودیں، فضل وہنر، لطف وکرم، علم وعمل[۵۱]

اس قطعے کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاہ صاحب کی شخصیت نے اُن پر گہرے اثرات چھوڑے تھے، اسی لئے انھوں نے زندگی بھر اُن کی شخصیت کو فقرودیں، فضل وہنر، لطف وکرم اور علم وعمل کا منبع سمجھا۔ انھیں کی بدولت مومن میں بھی بعض ایسی خصوصیات پیدا ہوئیں جن کو اُن کی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ سمجھنا چاہیے۔

شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے سامنے کچھ عرصے زانوئے ادب تہہ کرنے اور کسبِ فیض کرنے کے بعد وہ اپنے آبائی پیشے طبابت کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس وقت تک انھوں نے عربی اور فارسی میں خاصی دستگاہ حاصل کرلی تھی۔ اور مختلف اسلامی علوم میں بھی انھیں اچھا خاصا دخل ہوگیا تھا چنانچہ جب انھوں نے طبابت کی طرف توجہ کی تو اس میں بھی بہت جلد کمال حاصل کرلیا۔ طب کے ماہر خود اُن کے خاندان میں موجود تھے۔ اس لئے انھیں اس کی خاطر کہیں اور نہیں جانا پڑا۔ اُن کے والد غلام نبی خاں اور چچا غلام حیدر خاں اپنے زمانے کے بہت اچھے طبیب تھے۔ انھیں سے مومن نے طب کی کتابیں پڑھیں اور کچھ عرصے اُن کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے۔ طبیب بننے کے لئے اُس زمانے میں نسخہ نویسی کو ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مومن نے کچھ وقت اس طرح گزارا اور بہت تھوڑے عرصے میں خود ایک اعلیٰ درجے کے طبیب بن گئے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اس فن میں مہارت حاصل کرلی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے زمانے کے بہت اچھے طبیب تھے۔ خداداد ذہانت نے انھیں اعلیٰ درجے کا طبیب بنا دیا۔ اور ایک طبیب کی حیثیت سے وہ بہت جلد مشہور ہوگئے۔ کریم الدین نے گلدستۂ نازنیناں میں لکھا ہے "حکیم اس پائے کے کہ بوعلی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے پر اُن کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ پائے۔"[۵۲] اس میں مبالغہ ضرور ہے لیکن اس سے یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے

---

۵۱ کلیات مومن مطبوعہ نول کشور : ص۱۸۳
۵۲ کریم الدین : گلدستۂ نازنیناں : ص۱۰۲

ایک طبیب کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کرلی تھی، اور وہ اپنے زمانے کے حاذق طبیب سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اُن کی دلچسپی صرف طب ہی تک محدود نہیں تھی۔ انھیں زندگی کے دوسرے پہلوؤں سے بھی لگاؤ تھا۔ اس لئے انھوں نے طب کو اپنا پیشہ نہیں بنایا؛ اور وہ صرف اسی کے ساتھ وابستہ نہ رہے۔ دوسرے علوم و فنون سے بھی انھوں نے گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

طب کے علاوہ وہ علم نجوم کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور انھوں نے اس علم میں بھی کمال حاصل کیا۔ آبِ حیات میں لکھا ہے "طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا۔ اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر تھمنے نہ دیا۔ دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کئے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا۔ اس کو اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ اُن کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے۔ پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور اُن کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے۔ پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو۔ جو میں کہتا جاؤں اُس کا جواب دیتے جاؤ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔"[۵] اس کے بعد ایک واقعہ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ واقعی نجوم کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ "ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا۔ اُن کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اُس وقت موجود تھے۔ خاں صاحب نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تمھارا کچھ مال جاتا رہا ہے؟ اُس نے کہا صاحب میں لٹ گیا۔ کہا خاموش رہو، جو میں کہوں اُسے سنتے جاؤ۔ جو غلط بات ہو اُس کا انکار کردینا۔ پھر پوچھا زیور کی قسم سے تھا؟ صاحب ہاں وہی عمر بھر کی کمائی تھی۔ کہا تم نے لیا ہے یا تمھاری بیوی نے کوئی غیر چرانے نہیں آیا۔ اُس نے کہا میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا۔ ہم کیوں چراتے ہنس کر فرمایا کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے۔ مال کہیں باہر نہیں گیا۔ اُس نے کہا صاحب سارا

۵؎ آزاد: آبِ حیات: ص ۲۲۳

گھر ڈھونڈھ مارا کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔ فرمایا پھر دیکھو۔ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا۔ پھر آکر کہا۔ صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے، ایک ایک کونا دیکھ لیا۔ کہیں پتہ نہیں لگتا خاں صاحب نے کہا اسی گھر میں ہے۔ تم غلط کہتے ہو۔ کہا آپ چل کر تلاشی لے لیجیے۔ میں تو ڈھونڈھ چکا۔ فرمایا یہیں سے بتاتا ہوں۔ یہ کہہ کر سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا۔ پھر کہا اس گھر کے جنوب کے رُخ ایک کوٹھری ہے۔ اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے۔ اُس کے اوپر مال موجود ہے۔ جا کر لے لو۔ اُس نے کہا مچان کو تو تین دفعہ چھان مارا وہاں نہیں ملا۔ فرمایا اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے۔ غرض وہ گیا۔ جب روشنی کرکے دیکھا تو ڈبا اور اُس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا[1]۔ عرشؔ نے بھی اس واقعے کو کچھ بدل کر اپنی کتاب میں لکھا ہے اور اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ یہ واقعہ انھوں نے خود مومنؔ کی پوتی سے سنا۔ انھیں کی زبانی عرشؔ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ مومنؔ گنڈے تعویذ بھی کرتے تھے۔ اچھے عامل تھے اور سارے شہر میں اُن کی دھوم تھی[2]۔ اُن کے عامل ہونے کا کسی اور نے ذکر نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے۔ بہر حال اُن کے اچھے منجم ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

مومنؔ کو علم نجوم میں جو کمال حاصل تھا اور انھوں نے اس علم میں جو بصیرت حاصل کی تھی، اُس کی ایک جھلک اُس دیباچے میں ملتی ہے جو انھوں نے اس زمانے میں ایک تقویم پر "دیباچۂ تقویم سال ہزار و دو صد و پنجاہ و دو ہجری" کے عنوان سے لکھا تھا، اور جو انشائے مومنؔ میں شامل ہے۔ اس دیباچے میں انھوں نے علم نجوم کے مختلف پہلوؤں پر نہایت ہی سیر حاصل بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"دوازدہم ذیحجہ سال ہزار و دو صد و پنجاہ و دو و بیست از مبل نیر گیتی فروز اوج پیغمبری از داغِ رشک سینہ سوز خورشید خاوری طاقت شکن گردوں پایہ بلند و ستان برہم زن کیش افلاک و انجم پرستاں ناسخ احکامِ سعد اکبر وزیر اعظم بمدار طیبہ از مرکز عالم صلوٰۃ اللہ علیہ و السلام و علیٰ آلہ و اصحابہ الکرام و تاریخ

---

[1] آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۳ [2] عرش گیاوی: حیات مومن: ص ۴۲

بست و یک از مارچ ہزار و ہشت صد و سی و ہفتم دورہ ہمنشیں از ولادتِ عیسیٰ
گردوں سریر خاسف بدرِ منیر بجاگن شدی ترودشی ہیزدہ صد و نود و سہ سنہ
بکرماجیتی کہ مصطلح و مرسوم ہندی نژادانِ رصد بند است و رانیران از
اسفندارمذ ماہ الٰہی دو ہزار چہل و ہفت سال اسکندر دانش پسند آغاز
تخاقوی ہیل وہمیں سال از اثنا عشریہ ترکان کہ ترجمان پارسی زبان سال
مزرع تحریر کنند و مہندسانِ تازی لسان بکلمہ عام الطیر تعبیر بعد مرو شش
ساعت و نیم از شب سہ شنبہ کہ شانزدہ گھڑی و پانزدہ پل بجاورہ منجمان
ہند بود و تحویل آفتاب جہان تاب در بیت الشرف حمل است دوالی
سال بقوت عرضی اہتزاز زحل ابتدائی طلوع آفریں نیم دقیقہ ہجدہم درجہ
جدی از اجزائے سپہر است و رب اللیل زہرہ و رب الساعۃ و مستولی مثلثہ
ناری جرم مہر سہم الحوادث بہ ترازو جاگزیں و کدخدائی وسط السما یا تحت الشعاع
ریز شمس زیر زمین نیر اصغر در خوشہ بر سہم الحنطہ نور افشاں و خداوند بیت تاسع
بمقابلہ نگراں کیواں راجع سوئے مریخ و مشتری بہ تربیع السیر گرم نظارہ و
خفتان بہرام و طیلسان قاضی بہ ناخن شیر پارہ پارہ دقیقہ یابان ہندو
بابل نظر بر مناسبت صاحبِ دور سلاطین و امرا را بنارنجی لباس زرباف
مشرف و مخلع سازند و رمز شناسانِ روم اختیار رنگ آبی را بگونہ برہان
بجزوِ آسمانی برطرازند۔ مرا کہ نہ ستارہ پرستم نہ از بادہ سپاس افلاک سیہ مست
نہ فرماں روایانِ دانش منخود را فرماں برم نہ آرزومند خلعت و زر چہ افتاد
کہ یکیک از منسوبات کواکب بشمارم و رنگ و جوہر ملابس و فروش و مشابہت
صور و نقوش بنگارم گرفتم۔ پایۂ مانشاسم بے خبرم پندار دو دانا دلی را بہ تشنیع
نادانی ببازار داد۔ ادا فہمانِ طرزِ سخن و آگاہانِ این مشکل فن نیکو لشناسند
کہ شناسا تر از من بہیچ زمانہ نبودہ و ہیچ دانشورے با چنیں تمیز و فراست
و تمریخ سعد و نحس زبان نکشودہ۔ اگر بہ تتبع اسلاف درآیم بزم آبِ غیرت

تقلید چگونہ ربوزم۔ ہمہ کس می دانید کہ اوستادہر مس و من یکیست بجز خالق عقول ونفوس بہ تعلیم دیگرے نیاز مندیم منست آں کہ شمس را نور دادہ مرا شعور بخشیدہ وآں کہ کلاہ برتری بفرق اجرام اثیری نہادہ خیال مرا از چرخ اطلس بالاتر رسانیدہ۔ نظم ؎

کو مہر بتاں گوہر من — افلاک ندیدہ ہمسر من
تیرم بہ یکانگے ستاید — ناہید مدیح من سراید
برجیس وحید عصر داند — ہر لحظہ صداں یکا دخواند
بشگفتن طبع من زہیعی — نازد بمن افضل طبیعی

اس عبارت سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں اس علم سے نہ صرف گہری دلچسپی تھی بلکہ وہ اس کے ماہر تھے۔ یہاں انھوں نے علم نجوم کی جو مختلف اصطلاحیں استعمال کی ہیں اور روانی کے ساتھ جس طرح اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس علم کے مختلف پہلوؤں پر روشن تھے۔ ان کے اسرار و رموز کھولنے میں انھیں لطف آتا تھا اور وہ اس کام میں ایک لذت سی محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دقیق سے دقیق مسائل کو سلجھانے میں انھیں کسی قسم کی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ اس تقریظ کے ایک ایک فقرے میں ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے، اور اس کے اندازِ نگارش سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا علم نجوم کے ہر پہلو پر حاوی ہے۔

نجوم کے ساتھ ساتھ مومن علم رمل سے بھی پوری واقفیت رکھتے تھے۔ عرش گیاوی نے حیاتِ مومن میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انھیں اس میں بھی کمال حاصل تھا۔ لکھتے ہیں "خاں صاحب کا دربار لگا ہوا ہے۔ مختلف علوم وفنون کے شائق دامن طلب پھیلائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف حکیم سکھا نند رَاقم بھی مؤدب بیٹھے ہیں۔ یہ رمل میں خاں صاحب کے شاگرد ہیں۔ دیوار پر ایک چھپکلی نظر آتی ہے۔ خاں صاحب راقم کو فرماتے ہیں "بھئی ذرا دیکھنا، یہ چھپکلی دیوار سے کب ہٹے گی۔ وہ زور لگا کر کہتے ہیں۔ "حضور یہ ابھی جاتی ہے۔ خاں صاحب شطرنج کھیل رہے ہیں۔ مگر مسکراتے ہیں اور دیوار کی طرف

دیکھ کے حکم لگاتے ہیں۔ واہ جب تک پورب سے اس کا جوڑا نہ آجائے کیونکر جائے گی۔ دیکھو اور پھر دیکھو۔ گھنٹہ دو گھنٹے کے بعد بالاخانہ پر جہاں خاں صاحب جلسہ جمائے بیٹھے ہیں ریشمی کپڑوں کے دو گٹھے لئے ہوئے ایک سوداگر آتا ہے (خاں صاحب کو ریشمی کپڑوں سے ازلی ذوق تھا اور کم سے کم پاجامہ ریشمی ضرور پہنتے تھے) سوداگر مذکور کے سر سے جیوں ایک گٹھ کپڑے کا پورب والے دروازے سے داخل ہو کر کمرے میں اُتارتا ہے گانٹھ سے ایک چھپکلی ہٹ سے گرتی ہے اور دوڑ کر دیوار والی چھپکلی سے جا ملتی ہے۔ پھر دونوں چھپکلیاں مل ملا کر ایک طرف کا راستہ لیتی ہیں۔ راقم خاں صاحب عالم تحیّر میں منھ دیکھتے ہیں اور وہ مسکرا کے فرماتے ہیں۔ میاں ہنوز دلّی دور۔۔ تم چاہتے ہو شاعری کی طرح اس کو بھی حاصل کر لوں تو یہ مذاق نہیں۔"[۵۱] اس واقعے کی صحت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ بظاہر یہ سنی سنائی بات ہے لیکن اس سے یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ مومن کو علم رمل میں خاصا دخل تھا اور وہ اکثر اس سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرتے رہتے تھے۔

غرض مومن کو نجوم اور رمل دونوں میں کمال حاصل تھا۔ تقریباً تمام "تذکرہ نگاروں" نے ان علوم کے ساتھ اُن کی دلچسپی کا ذکر کیا ہے۔ کریم الدین نے "طبقات شعرائے ہند" میں لکھا ہے کہ "مومن مذکور کو علم نجوم اور رمل خوب آتا ہے۔"[۵۲] عبدالغفور نساخ نے لکھا ہے "علم تنجیم اور طب میں خوب دخل رکھتے تھے۔"[۵۳] نورالحسن نے "طور کلیم" میں لکھا ہے کہ "در طب یدطولیٰ داشت و در نجوم پایۂ والا۔"[۵۴] آزاد تک ایسے بہت سے واقعات پہنچے تھے جن سے مومن کی زندگی کے اس پہلو پر روشنی پڑتی تھی لیکن انھوں نے ان سب کو "آب حیات" میں شامل نہیں کیا۔ لکھتے ہیں "ایک صاحب کا مراسلہ اسی تحریر کے ساتھ مسلسل پہنچا ہے جس میں یہ اور اس قسم کے کئی اسرار نجومی ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور ان کے شاگردوں کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ آزاد اُن کے درج کرنے میں قاصر ہے۔ معاف فرمائیں۔ زمانہ ایک طرح کا نہیں ہے، لوگ کہیں گے کہ تذکرہ شعرا لکھنے بیٹھا اور نجومیوں کا تذکرہ

---

۵۱ عرش گیاوی: حیات مومن: ص۴۳

۵۲ کریم الدین: طبقات شعرائے ہند: ص۴۴۲

۵۳ عبدالغفور نساخ: سخن شعرا: ص۴۶۷

۵۴ نورالحسن: طور کلیم: ص۹۷

لکھنے لگا۔[۱] پھر جو واقعات اُن کے مشہور ہیں، اُن سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ نجوم اور رمل میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ انھوں نے نجوم اہلِ فن سے سیکھا اور اُس میں اس قدر دستگاہ بہم پہنچائی کہ اُن کے احکام سے لوگ حیران رہ جاتے تھے[۲] مومن نے خود بھی اس حقیقت کا اظہار اپنے بعض اشعار میں کیا ہے۔ ایک شعر تو ان کا بہت مشہور ہے ؎

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

ان علوم و فنون کے ساتھ ساتھ انھوں نے موسیقی کے فن کو بھی حاصل کیا تھا۔ اگرچہ ان کے معاصر تذکروں میں سے کسی نے بھی اس کی وضاحت نہیں کی لیکن ضیا احمد بدایونی نے دیوان مومن کے مقدمہ میں لکھا ہے۔ ”محترمہ کنیز فاطمہ صاحبہ، اپنے والد سید ناصر جیب صاحب ناصر دہلوی نبیرۂ مومن کے حوالے سے بیان کرتی ہیں کہ مومن مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فن لطیف کی طرف توجہ کی تو وہ نام پیدا کیا کہ لوگ اُن کے کمال کے معترف ہو گئے۔ نظیر بین باز نے جو اُس زمانے میں اُستاد تھا اُن کے انتقال پر بین اُٹھا کر رکھ دی کہ اب دلّی میں اُس کا کوئی قدر دان نہ رہا۔“[۳]

مومن کے کلام میں بھی جگہ جگہ اس کی طرف اشارے ملتے ہیں۔

شطرنج کے کھیل کو بھی انھوں نے ایک علم اور فن کی طرح سیکھا تھا اور اس میں بھی بڑی مہارت حاصل کی تھی۔ آبِ حیات میں لکھا ہے ”شطرنج سے بھی اُن کو کمال مناسبت تھی۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی۔ اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔“[۴]

غرض یہ کہ مومن نے اپنی زندگی میں بہت سے علوم و فنون سے دلچسپی لی اور بہت تھوڑے عرصے میں اُن سب کے ایسے ماہر ہو گئے کہ دور دور اُن کی شہرت پھیل گئی اور وہ اپنے زمانے میں جامع کمالات سمجھے جانے لگے۔

۱؎ آزاد: آبِ حیات: ص۴۲۳　　۲؎ ضیا احمد بدایونی: دیوان مومن: ص۲۵ (مقدمہ)

۳؎ ضیا احمد بدایونی: دیوان مومن: ص۲۵ (مقدمہ　　۴؎ آزاد: آبِ حیات: ص۴۲۳

(۴)

یوں مومن نے کئی علوم و فنون میں کمال حاصل کیا لیکن بنیادی طور پر وہ شاعر تھے۔ اس لئے اپنی زندگی میں سب سے زیادہ انھوں نے شعر و شاعری کے فن سے دلچسپی لی۔ انیسویں صدی کی دلی کے مخصوص شاعرانہ ماحول میں اُن کی شاعری کا آغاز ہوا۔ مومن کو شعر و شاعری سے طبعی مناسبت تھی اور وہ اس فن کے ساتھ فطری لگاؤ رکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدائے عمر ہی سے انھوں نے اُس کے ساتھ دل بستگی پیدا کی۔ وقت کے ساتھ اس دل بستگی نے اُن کے یہاں شعر کہنے اور شاعری کرنے کا شوق پیدا کیا۔ آس پاس اور گرد و پیش کے شاعرانہ ماحول نے اس آتشِ شوق کو بھڑکایا۔ شاہ نصیر اُس زمانے کے مشہور شاعر تھے اور اُس زمانے کی دلی میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ مومن نے جب شاعری شروع کی تو انھیں کے شاگرد ہوئے اور کچھ عرصے تک اُن کو اپنا کلام دکھایا۔ لیکن زیادہ وقت نہ گزرنے پایا کہ وہ خود اُستادی کے مرتبے پر پہنچ گئے۔ کریم الدین نے لکھا ہے "اصلاح اشعار کی شاہ نصیر سے انھوں نے لی ہے مگر در باب فنونِ نظمیہ کے خدا نے اُن کو وہ بہرہ دیا کہ اُن کے اُستاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے۔"[51] نساخ کا بیان ہے کہ "ایک یا دو غزل میں نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی اصلاح پسند نہ آئی۔"[52] آبِ حیات میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "شعر و شاعری سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا تھا۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا۔ مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی کو اُستاد نہیں بنایا۔"[53] عرش نے لکھا ہے "کہا جاتا ہے کہ ابتدائی چند غزلیں شاہ نصیر مرحوم کو بہ نظر اصلاح دکھائی تھیں۔ پھر وہ سلسلہ کچھ سمجھ کے بند کر دیا۔ قرینہ غالب ہے کہ اپنے کو شاہ نصیر کے رنگ سے بہت دور پایا اور دیکھا کہ ہونے کو تو وہ استاد کیا اُستاد گر ہیں اور سنگلاخ زمینوں کے بادشاہ ہیں مگر آہ اور واہ

---

۵۱ کریم الدین: طبقات شعرائے ہند: ص ۴۲۳ ۵۲ عبدالغفور نساخ: سخن شعراء: ص ۴۶
۵۳ آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۳

میں فرق ہے[۵۱]"۔ ان بیانات سے یہ حقیقت تو واضح ہے کہ مومن شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے اور ان سے چند غزلوں پر اصلاح بھی لی لیکن بہت جلد اس رشتے کو توڑ دیا۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ ایک سبب تو وہی ہو سکتا ہے کہ شاہ نصیر کے ساتھ انھیں کوئی طبعی مناسبت نہیں تھی۔ وہ سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے اور ان کا میلان مشکل پسندی کی طرف تھا۔ بہت ممکن ہے مومن کو یہ انداز نہ بھایا ہو ـــــ یہ بھی ممکن ہے کسی بات پر اَن بن ہو گئی ہو لیکن اس کا کسی تذکرہ نویس نے ذکر نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصلاح کی پابندیاں ان کی آزاد طبیعت نے قبول نہ کی ہوں۔ غرض وہ زیادہ عرصے استادی شاگردی کے رشتے میں منسلک نہ رہ سکے؛ اور انھوں نے اپنی دُنیا الگ بنا لی۔

اُن کی شاعری کا آغاز غزل سے ہوا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ دوسری اصناف کی طرف بھی متوجہ ہوئے چنانچہ بہت جلد تمام اصنافِ سخن پر قدرت حاصل کر لی۔ نور الحسن "طور کلیم" میں لکھتے ہیں "بو جمیع اصنافِ سخن قادر بود۔ از لطائف شعر و شاعری کما حقہ ماہر۔ بقوتِ سخن وری مومن کمتر کسے برخاستہ و ہر دو لفظ چنداں دستگاہے نصیبِ او گشتہ کہ پارسیاں ازاں خود می انگارند، و ہندیاں بشرفِ ہم زبانی نازہا دارند۔ دیوانش مملو از اصنافِ سخن است و مثنویات متعدد دارد[۵۲]"۔ نساخ نے لکھا ہے کہ "جمیع اصناف سخن پر قادر تھے، اشعار اُن کے پُر مضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں۔ راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گزرا نہیں[۵۳]"۔ کریم الدین نے "گلدستۂ نازنیناں" میں انھیں سخندانی میں گوہر یکتا، عالم جمیع اصناف سخن اور واقف اسرار فن[۵۴] کہا ہے اور "طبقات الشعرا" میں لکھا ہے کہ "ورباب فنون نظمیہ کے خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے استاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے۔ شعر ان کا بہت اچھا ہوتا ہے[۵۵]"۔ یہ بیانات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ مومن نے بہت جلد شعر و شاعری میں کمال حاصل کر لیا اور وہ تمام اصناف سخن

---

۵۱ عرش گیاوی: حیات مومن: ص۵۵

۵۲ نور الحسن: طور کلیم: ص۹۶

۵۳ عبدالغفور نساخ: سخن شعرا: ص۴۶۷

۵۴ کریم الدین گلدستۂ نازنیناں

۵۵ کریم الدین: طبقات شعرائے ہند: ص۴۴۳

پر قادر ہوگئے۔ انھوں نے غزلیں کہیں، مثنویوں کی تخلیق کی۔ قصیدے لکھے، مسدس مخمس رباعی، ترکیب بند، ترجیع بند سب کو اپنے شاعرانہ خیالات کے اظہار کے لئے استعمال کیا اردو کے ساتھ فارسی میں بھی طبع آزمائی کی اور اس زبان میں بھی مختلف اصناف سخن کو چار چاند لگا دیئے۔ غرض انھوں نے بہت تھوڑے عرصے میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا ایک قادر الکلام اور خوش فکر شاعر اپنے آپ کو تسلیم کرالیا۔ اُن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور دیکھتے دیکھتے وہ اپنے زمانے کے اُستاد سمجھے جانے لگے۔

مومن کا اُردو کلام تو اُن کی زندگی ہی میں یک جا ہو گیا اور اس نے کلیات کی صورت اختیار کر لی لیکن کلام فارسی اُن کی زندگی میں نہ چھپ سکا۔ مرنے کے بعد دیوان کی صورت میں شائع ہوا۔ اردو کلام کو نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے ترتیب دیا اور اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا۔ "گلشن بے خار" میں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ "با ایں ہمہ صفات کہ مذکور شد بے تحریک محرکے فکر سخن نمی پردازد۔ چنانچہ اکثر کلامش بخواہش داعی آثم صورت ظہور گرفتہ وہم تدوین افکارش را فقیر باعث گشتہ۔ دیباچہ آں کہ ریختۂ خامۂ من ست دراں بہ تفصیل ایں ماجرا باز کردہ ام" [1] شیفتہ کے اس مرتب کئے ہوئے کلیات کو کریم الدین نے ۱۸۴۶ء میں چھپوا دیا۔ طبقات الشعرا میں وہ لکھتے ہیں "ایک دیوان ان کا بہت بڑا ہے جس کو نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے فراہم کیا تھا۔ دیوان ۱۸۴۶ء کے وہ دیوان میں نے چھپوا دیا ہے" [2] اُن کے ہم عصروں نے اُس کلیات اُردو کی بڑی تعریفیں کی ہیں۔ ان تعریفوں سے پتہ چلتا ہے کہ مومن کو اپنے زمانے میں بہ حیثیت شاعر کے بڑی شہرت نصیب ہوئی۔ مرزا قادر بخش صابر نے تذکرہ "گلستان سخن" میں لکھا ہے "ایک دیوان ضخیم کہ اصناف سخن پر مشتمل اور اُس کے سامنے فصاحت سحبانی خجل ہے اور مثنویات متعددہ مثل قصۂ غم اور شکایت ستم، قول غمیں اور تف آتشیں اوس قادر الکلام سے صفحۂ روزگار پر یادگار رہیں" [3] اُن کے اُردو کلام کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اُس کا

---

۱ شیفتہ: گلشن بے خار ص ۱۹۶
۲ کریم الدین: طبقات شعرائے ہند: ص ۴۴۳
۳ قادر بخش صابر: گلستان سخن: ص ۴۴۳

اندازہ صرف اس ایک بیان سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ فارسی کا کلام ان کے مرنے کے بعد شائع ہوا۔ اس کو چھپوانے کا سہرا حکیم احسن اللہ خاں کے سر ہے۔ یہ دیوان انھوں نے ۱۲۷۱ھ میں یعنی مومن کی وفات کے تین سال بعد مطبع سلطانی میں چھپوا کر شائع کر دیا۔ مرزا قادر بخش صابر اس کے بارے میں لکھتے ہیں "ہر چند زبان اُردو میں تو علم یکتائی بلند ہی تھا لیکن کمال مہارت فارسی سے کوس لمن الملک کی صدا نے ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطی ہند و بلبل شیراز کو دم بخود کر دیا تھا۔ غزلہائے فارسی کا غذ پارہ ہائے پراگندہ پر ثبت اور بالفعل محبت طبعی اور قرابت قریبہ کے تقاضے سے اس کی تبیض میر عبدالرحمٰن آہی تخلص خلف میر حسین تسکین کے عہدۂ اہتمام میں ہے، اور جو کہ وحید عصر مسیح وحد جالینوس زماں، بقراط اواں حکیم احسن اللہ خاں سلمہ الرحمٰن کو شفائے مرضی کے اہتمام سے قدم بڑھا کر احیائے اموات اور معجزۂ مسیحائی کی ترویج پیش نہاد ہے۔ قریب ہے کہ وہ دیوان منصۂ طبع میں جلوہ گر ہو کر شہرت تمام پیدا کرے[۱]"۔ غرض مومن کا اردو اور فارسی کلام یک جا ہو کر منظر عام پر آیا۔ اور اُس نے دلوں میں جگہ بنائی۔

ایک شاعر کی حیثیت سے مومن نے اپنے زمانے میں بڑی عزت اور شہرت حاصل کی۔ اُن کا شمار اپنے زمانے کے چوٹی کے شاعروں میں ہوتا تھا لیکن انھوں نے اس شاعری کو کبھی پیشہ نہیں بنایا۔ نہ انھوں نے ایسی باتیں کیں جو عام طور پر شاعر کرتے ہیں۔ مثلاً ان کے زمانے میں دلی کی سرزمین پر بڑے بڑے شاعر موجود تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو کسی سے بڑا نہ سمجھا۔ اُن کی چشمک کسی سے نہیں تھی۔ سب ان کی عزت کرتے اور انھیں عزیز رکھتے تھے۔ غالب کی شاعری کا اُس زمانے میں شہرہ تھا اور وہ بلاشبہ اُس زمانے کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ اُن کے سامنے شاعری کا اعلیٰ و ارفع تصور تھا۔ اس لئے وہ ذرا مشکل ہی سے کسی کی شاعرانہ عظمت کو تسلیم کرتے تھے۔ غالب نے اپنے زمانے میں صرف مومن کے جوہر قابل کو تسلیم کیا ہے اور صرف اُن کو ایک اعلیٰ درجے کا شاعر مانا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے مومن خاں کی یہ غزل

---

[۱] قادر بخش صابر: گلستان سخن: ص ۴۴۳

دیکھی جس کا مطلع ہے ؎

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا　　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا

اور جب اس غزل کا یہ شعر اُن کی نظر سے گزرا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو بے اختیار کہہ اُٹھے کہ کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور یہ شعر مجھے دے دیتا[۱] غالب کے ایسے سخن شناس کا اپنے ہم عصر مومن کے بارے میں اس خیال کا اظہار صاف ظاہر کرتا ہے کہ انھیں مومن کی شاعری سے دلچسپی تھی اور وہ انھیں ایک اعلیٰ درجے کا شاعر سمجھتے تھے۔

مومن کے ہم عصر کریم الدین تو اُن کی شاعری سے حد درجہ متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف طبقات الشعرا اور گلدستہ نازنیناں دونوں میں کیا ہے۔ یہ دونوں تذکرے مومن کی زندگی ہی میں مرتب ہوئے ہیں۔ کریم الدین نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے "اصلاح اشعار کی شاہ نصیر سے انھوں نے لی ہے مگر در باب فنون نظمیہ کے خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے اُستاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے۔ شعر ان کا بہت اچھا ہوتا ہے۔ شاگرد ان کے بہت ہیں"[۲] اور گلدستۂ نازنیناں میں تو اُن کی شاعرانہ خوبیوں کی وضاحت میں قلم توڑ دیا ہے۔ لکھتے ہیں "شاعر بے نظیر خاک پا جس کی باب شاعری میں اکسیر لعل کان سخنوری بے بہا۔ سخندانی میں گوہر یکتا، عالم جمیع اصناف سخن، واقف اسرار فن، چشمۂ فیض اُس کے سے سب دانی و قاضی کامیاب ـــــ خاقانی ہرچند کہ استاد زبان فارسی کا زمان مقدم میں گزرا لیکن اگر وہ بھی ہوتا تو جبین نیاز آستان اس شاعر پر رکھتا مر جاتا۔ وہ لطافت جو کلام فارسی اس شاعر کی میں ہے ہرگز نہ پاتا۔ اس کو اگر سحر کہیں تو بجا ہے۔ اور اگر افسوں کہیں تو سزا ہے اور اگر اعجاز کہیں تو سچ ہے۔ حقیقت میں یہ شاعر اس رتبے کا ہے۔ میر نے اگرچہ طرز نو اختیار کی پر اُس رتبے کو نہ پہنچ سکا۔ سودا کو گو دعویٰ ہمسری ہر شاعر کا سودا ہوا پر یہاں وہ بھی

---

[۱] حالی: یادگار غالب: ص۷۰　[۲] کریم الدین: طبقات الشعرا: ص۴۴۳

دیوانہ ہوگیا۔ خاقانی و فیضی و انوری گرچہ فیض فیض خاقان سے منوّر ہوئے۔ پر اُن کے سامنے ان کا بھی چراغ نہ روشن ہوا۔[1] اگرچہ کریم الدین کی ان باتوں میں مبالغہ ہے لیکن ان سے یہ حقیقت ضرور واضح ہو جاتی ہے کہ ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے زمانے میں مومن کی کتنی عزت تھی اور لوگ ان کی شاعری کے کیسے پرستار تھے۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ مومن کے شاگرد تھے لیکن ان کا شعری ذوق اعلیٰ پایے کا تھا۔ انھوں نے بھی مومن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ اپنے تذکرہ گلشنِ بے خار میں انھیں "بے بہا لعل کان سخن دانی، یک دانہ گہر دریائے معانی، فرماں فرمائے اقلیم فن، پایہ بلند ساز این فن، بدور آور ساغر بادۂ بے غش، نواگر نغمہ ہائے دل پذیر و دل کش، صاحب جایگاہ، رفیع صورت معانی بیان و بدیع مہر سپہر نکتہ دانی، واقف سپہر آسمانی، شاعر حکمت پرور، حکیم سخن گستر، فرید عصر، یکتائے دوراں"[2] کہا ہے۔ ان کے بیان سے بھی یہ بات صاف ظاہر ہے کہ وہ بھی مومن کو بہت بڑا شاعر سمجھتے تھے اور اُن کے نزدیک بھی ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

میرزا قادر بخش صابر اس زمانے کے ایک اور ہم عصر تذکرہ نویس ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے تذکرہ گلستانِ سخن میں مومن کی شاعرانہ عظمت کو واضح کیا ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں "سخن سنج بے عدیل محمد مومن خاں مرحوم غفر اللہ لہ، زمین سخن اس کی بلندی فکر سے رشک افلاک اور اوج فلک اُوس کی علوئے طبع کے مقابل پستیِ خاک۔ عروس معنی اوس کے حجلۂ طبع میں شوخ و برجستہ۔ رازِ غیب اس کے سینۂ قلم میں سربستہ۔ خامہ اوں کا سوزِ معنی نخل طور اور ورق اُس کے فروغ مضامین سے مطلع نور، مصرع آہ اُوس کی غزل عاشقانہ میں تضمین اور اسرار یقین اُوس کی ابیات عارفانہ میں گوشہ گزیں ہیں۔"[3] اس بیان میں بھی اگرچہ وہی روایتی انداز میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے لیکن اس سے بھی یہ صاف ظاہر ہے کہ مومن کی شاعرانہ عظمت اُن کے نزدیک بھی مسلّم تھی اور وہ بھی

---

[1] کریم الدین: گلدستۂ نازنیناں: ص ۱۰۲

[2] شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۵

[3] میرزا قادر بخش صابر: گلستانِ سخن: ص ۴۴۳

انھیں اپنے زمانے کا ایک بہت ہی اہم شاعر مانتے تھے

غرض مومنؔ کے تقریباً تمام ہم عصروں نے اُن کی شاعرانہ اہمیت تسلیم کی ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مومنؔ کی اپنے زمانے میں بڑی قدر و منزلت تھی اور وہ ایک شاعر کی حیثیت سے نہ صرف مشہور تھے بلکہ اُن کی عزت کی جاتی تھی۔ لوگ اُن سے محبت کرتے اور اُن میں جو جوہر قابل تھا اُس کے سب ہی معترف تھے یہی سبب ہے کہ مومنؔ پر کسی نے اعتراضات نہیں کئے۔ زندگی بھر اُن سے کوئی الجھا نہیں۔ اُن کے زمانے میں بڑے بڑے صاحب کمال موجود تھے لیکن ان میں سے کسی ایک سے بھی اُن کی چشمک نہیں تھی۔ وہ شاعری کو اظہار جذبات کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے اسی لئے اُنھوں نے اس سے کبھی کچھ حاصل کرنے کی تمنا نہیں کی، انھیں کبھی کسی دربار میں داخل ہونے کا خیال نہیں آیا۔ لال قلعہ اُس زمانے میں شاعری کا مرکز تھا لیکن شاعری کے سہارے انھوں نے قلعے تک میں جانے کی کبھی آرزو نہیں کی۔ بات یہ ہے کہ وہ صرف شاعر تھے۔ اور شاعری کو کسی مقصد برآری کے لئے ذریعہ بنانا ان کے نزدیک مناسب نہیں تھا۔ آزادؔ کے بقول "شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی"[۱] اور وہ ایک فطری شاعر تھے۔ اسی لئے ساری زندگی انھوں نے ایک اچھے شاعر کی طرح شعری تخلیق میں اپنا وقت صرف کیا اور ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔

مومنؔ کے نزدیک شعر و شاعری محض تفریح طبع کی چیز نہیں تھی۔ وہ اس کو ایک فن سمجھتے تھے۔ اس فن کے تمام پہلوؤں سے انھیں لگاؤ تھا۔ وہ اس کے تمام اسرار و رموز کو جانتے تھے۔ انشائے مومنؔ کا ایک اقتباس اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے شعر و شاعری کے بارے میں حکیم احسن اللہ خاں کو لکھتے ہیں:-

"نکتہ شناساں می دانند کہ نکتۂ دل نشیں بے فراغ خاطر بہ جانہ نشیند و عالی نگاہاں فہمند کہ بے امعان نظر روے شاہد معنی اگر دیدہ آفتاب است نہ بیند مکلف شاعرانہ بے تکلفی صورت نہ بندد و معانی بیگانہ ہا بیگانگی خیال

---

[۱] آزاد: آب حیات: ص ۴۲۳

نہ پیوندد تا محو حیرت نہ شوند۔ صفائیِ الفاظ آئینہ جوہر بے حجاب کدورتے رُخ نماید و تا از خود نروند زبان در سخن و سخن بر زبان نیاید۔ اگر رجوع بہ تجاہلِ عارفانہ نہ نمائید و التفات بہ تقلیب حسن التعلیل نہ فرمائید مید انید کہ ترصیع جواہر معانی چہ قدر دشوار است۔ و طباق سپیدی و سیاہی چہ مشکل کار مضمرات ہذیان سرایاں نیست کہ اگر لف و نشر غیر مترتب بر گوش خورد جمعے از ابلہاں منقسم سازند و تخیل ہرزہ دریاں نے کہ اگر تجنیس ناقص بر زبان بگذرد بہ توشیح انصاف کس و ناکس پردازند۔ مراعات النظیر آنست کہ بہ عایتِ معانی بے نظیر باشد و تنسیق الصفات آں کہ بحلیۂ الفاظ مترادف و دلپذیر آنانکہ مہمل را لزوم مالایلزم پندارند و بے معنی زاد و معانی انگارند۔ صد ورق بہ یک دست رقم توانند نمود و ہزار نغمہ بہ یک دم توانند سرود۔ و من کہ استعارۂ مضمون از دیگراں بکنایہ ہم عیب دانم و تشبیہ لب تہ از پستہ دہانِ شکر لباں ندانم چوں کنم و چہ سازم و تہیۂ فرمائش کہ بہ و ازم دل از دست دادن و دست بر دل نہادن محال است و چشمے براہ داشتن و خود را نگاہ محض خیال من و اشک مسلسل سلاستِ عبارت چیست دل و اضطراب شوخی اشارت چہ معانی بیگانہ چہ کار آید۔ بہ آشنا، بیگانہ کار افتادہ و مضمون دلکشا چہ کشاید صیاد دل بند دستِ تعدی کشادہ الف قامتے تا بِ خیال می شکند نقش ذلک الکتاب بلوح خاطر چہ نشانم و نون نگاہے ناخن بہ دل مزند و القلم و ما یسطرون چہ دانم۔ بیت

"تا عشق نگارِ نقش بستم | بر یاد قدش قلم شکستم"[1]

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ مومنؔ شعر و شاعری کو ایک عالمانہ زاویۂ نظر سے دیکھتے تھے۔ معانی کی اہمیت کا انھیں صحیح اندازہ تھا اور معانی کے ساتھ ساتھ الفاظ شاعری میں جو کام کرتے ہیں اُس کی بھی اُن کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ الفاظ کی صفائی

---

[1] مومن: انشائے مومن: ص ۲۳-۲۵

کا انھیں خیال تھا۔ صنعتوں کے استعمال سے جو صورت حال شاعری میں پیدا ہو سکتی ہے، اُس سے بھی وہ پوری طرح واقف تھے۔ استعارہ اور کنایے سے کلام میں جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی اُن پر روشن تھی۔ غرض مومنؔ شعر و شاعری کو ایک فن سمجھتے تھے اور اس کو علمی زاویہ نگاہ سے دیکھنا ان کے پیش نظر تھا۔ یہی سبب ہے کہ شعر و شاعری کے تمام فنی پہلو اُن کے سامنے روشن تھے اور ان پر غور کرنا اُن کے مزاج میں داخل تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تقریباً ساری زندگی اسی کاروبار میں گزار دی۔ بہت تھوڑے عرصے میں ایک باشعور شاعر کی حیثیت سے وہ مشہور ہو گئے اور لوگوں نے انھیں مسلم الثبوت اُستاد تسلیم کر لیا۔

شاعری کے فن میں مومنؔ نے اپنے زمانے کے بعض اہم شاعروں کی رہنمائی کی اُن کے کچھ شاگرد تو خاصے مشہور ہیں۔ ان میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کا نام سر فہرست ہے۔ شیفتہؔ کے مومنؔ سے دوستانہ تعلقات تھے لیکن انھوں نے مومنؔ سے مشورہ سخن بھی کیا ہے۔ اُن کے کلیات میں بعض قطعات شیفتہؔ اور اُن کے تذکرے گلشن بے خار کے بارے میں ملتے ہیں اور اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے سے کتنے قریب تھے۔ شیفتہؔ کے بارے میں جو قطعہ معمّے کے طور پر لکھا ہے۔ اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مومنؔ کو اُن سے کتنا تعلق خاطر تھا۔ قطعہ یہ ہے ؎

نوا بلبل کی بے بس کر رہی ہے — بہار اک جام بے جا بھر رہی ہے
صدائے درد قمری کی بلا ہے — سرِ طاقت بھی جس کا نقش پا ہے
فلک کو کچھ نہیں بے جور و بیداد — سر کٹے کیا ہو گو ہے فصل خرداد
کہ وہ سروِ خراماں یاں نہیں ہے — سر در اپنا تو یاں امکاں نہیں ہے

بہارِ سبز پا کے پاؤں ڈھیں
کہ دردِ بے حدِ حسرت سے چھوٹیں

اور گلشن بے خار کے بارے میں لکھا ہے ؎

کیا تذکرہ شیفتہؔ نے لکھا — ہے شیفتہ جس کے جان معنی

یوں نکتہ شناس ہیں پر ایسا — کوئی نہیں قدر دانِ معنی
افکار بلند سے بنایا — یہ چرخ پر آسمانِ معنی
ہر فقرۂ نثر جانِ مضموں — ہر شعر رواں روانِ معنی
کیا بات ہے منتخب کی تیری — اے منتخب جہانِ معنی
ہر نقطۂ انتخاب تیرا — خالِ رُخِ دلبرانِ معنی
تیرے جو سخن سے ہے سرافراز — الفاظ کا پایہ شانِ معنی
معنی ہیں ثنا طرازِ الفاظ — الفاظ ہیں مدح خوانِ معنی
ہے تذکرہ یا ریاضِ فردوس — فردوس ہے یا جنانِ معنی
اے تازہ بہارِ باغِ مضموں — اے گلشنِ بے خزانِ معنی
مومن نے جب اس میں دیر تک کی — سیرِ گل و ضیمرانِ معنی
آیا ہے خیالِ سالِ اتمام — تھا وہ بھی تو باغبانِ معنی
غنچہ کی طرح سے سر فرو تھا — یک چند وہ ہمزبانِ معنی
جب نغمہ سرا نہ ہو سکا وہ — دستاں زنِ داستانِ معنی

ہاتف نے کہا ہے اس کی تاریخ
گلدستۂ گلستانِ معنی[۵۱]

۱۲۵۰ھ

اس سے بھی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شیفتہ سے ان کو دلی وابستگی اور گہرا لگاؤ تھا اور وہ انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ اگرچہ وہ ان کے شاگرد تھے لیکن اُن کے ساتھ اُن کی دوستی بھی تھی۔ کریم الدین نے اُن کے شاگردوں میں سب سے ممتاز میر حسین تسکین کو قرار دیا ہے لکھتے ہیں: "شاگرد اُن کے بہت ہیں مگر سب سے ممتاز میر حسین تسکین ہیں"[۵۲] ان کے علاوہ بھی مومن کے بعض شاگرد تھے جنھوں نے اُس زمانے ہی میں خاصا نام پیدا کر لیا تھا۔ ان میں حکیم سید منور علی آشفتہ، میر عبدالرحمٰن آہی، خلفِ میر حسین تسکین

---

۵۱ کلیاتِ مومن: ص ۱۸۶ — ۵۲ کریم الدین: طبقات الشعرا، ص ۴۴۳

حکیم مولا بخش قلق میرٹھی، نواب عباس علی خاں بیتاب رام پوری، شیخ علی بخش بیمار، میرزا غلام فخر الدین تہور، قاضی نجم الدین برق، میرزا محمود بیگ راحت، سعادت علی خاں راسخ، مرزا قربان علی بیگ سالک، ظہور علی ظہور، عظمت اللہ عظمت، غلام احمد شورش، میاں جان دہلوی صفیر، مرزا خدا بخش قیصر، شیخ غلام علی کرم، اصغر علی خاں نسیم، میر غلام علی خاں وحشت، خیر الدین یاس وغیرہ کے نام لئے جاتے ہیں۔ یہ سب مومن کے شاگرد تھے۔ ان میں سے بعضوں نے تو خود استادی کا مرتبہ حاصل کر لیا۔ مومن نے اپنی پانچویں مثنوی حنین مغموم میں ان کا ذکر کیا ہے ؎

کون سے شاگرد وہ استادِ فن ۔۔۔ بے سخن ہے دل رُبا جن کا سخن
وحشت و مضطر، کرم، تسکین و یاس ۔۔۔ بے خودی میں بھی ہیں جن کے ہوش و حواس
اکبر و عظمت، سرافرازِ سخن ۔۔۔ پایہ بالاتر، برافرازِ سخن
باعثِ ناز و غرورِ روزگار ۔۔۔ میرے مشفق میرے مونس میرے یار
شیفتہ سر دفترِ اہلِ قلم ۔۔۔ نکتۂ خاطر نشاں جس کا رقم
بے عدیل و بے سہیم و بے بدل ۔۔۔ بے نظیر و بے مثال و بے مثل
رازدانِ نکتہ ہائے کس مداں ۔۔۔ معنی کرسئ نشیں خاطر نشاں
ہم نفس ہمدم رضا جو دوستدار ۔۔۔ شیفتہ دلدار والا جاں نثار[۱]

غرض مومن کو اپنے شاگردوں پر فخر تھا۔ اُن میں سے بعضوں کو وہ اپنا بہت اچھا دوست بھی سمجھتے تھے۔ اس زمانے کی زندگی میں ان کی شخصیتیں اہم حیثیت رکھتی تھیں۔ مومن سے انھوں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اسی لئے ان سب کے دلوں میں مومن کی بڑی عزت تھی اور خود مومن ان شاگردوں کی بڑی قدر کرتے تھے۔ کیونکہ اُن سب نے مل کر اُس صحیح شاعرانہ ماحول کو پیدا کیا تھا جو مومن کو بہت عزیز تھا اور جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔

اُس زمانے کے شاعرانہ ماحول میں مومن کو بڑا دخل تھا اگرچہ وہ بہت الگ تھلگ

---

[۱] کلیات مومن: صفحہ ۳۵۴

رہنے کے عادی تھے۔ انھیں اپنے آپ کو نمایاں کرنا نہیں آتا تھا لیکن اُس کے باوجود اُس زمانے کے شعری ماحول میں اُن کی حیثیت بڑی اہم تھی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے شاعری کو پیشہ نہیں بنایا۔ اس کے توسط سے درباروں میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ وہ شاعری کے فن کو ان تمام باتوں سے بلند سمجھتے تھے۔ اُس زمانے کے کئی اہم رئیسوں نے انھیں ملازم رکھنا چاہا لیکن انھوں نے ملازمت قبول نہیں کی۔ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "انھوں نے کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں لکھا۔ ہاں راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں مشہور تھیں۔ وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سرِراہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے۔ خاں صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں۔ راجہ صاحب نے آدمی بھیج کر بلوایا۔ عزت و تعظیم سے بٹھایا (کچھ نجوم کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں) اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ۔ ہتھنی حاضر ہوئی وہ خاں صاحب کو عنایت کی۔ انھوں نے کہا کہ مہاراج میں غریب آدمی ہوں۔ اسے کہاں سے کھلاؤں گا۔ اور کیونکر رکھوں گا۔ کہا کہ سو روپیہ اور دو۔ خاں صاحب اسی پہ سوار ہو کر گھر آئے۔ اور پہلے اس سے کہ ہتھنی روپیہ کھائے اُسے بیچ کر فیصلہ کیا — پھر خاں صاحب نے ایک قصیدہ مدحیہ شکریہ میں کہہ کر راجہ صاحب کو دیا جس کا مطلع ہے ؎

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری   کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

سوا اس قصیدے کے اور کوئی مدح کسی دنیا دار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں کہی"[۵۱] — اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ صحیح معنوں میں شاعر تھے اور شاعری کو دنیاوی عزت، دولت اور شہرت کے لئے وسیلہ بنانا انھیں پسند نہیں تھا۔ ویسے وہ مشاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ آبِ حیات ہی میں اُن کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ "میں نے انھیں اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سُنا تھا۔ ایسی دردناک آواز اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے۔ کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے باتیں کہانیاں ہو گئیں"[۵۲]

---

۵۱ آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۵   ۵۲ آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۴

غرض مومن اچھے شاعر تھے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔ وہ اچھا کہتے اور اچھا پڑھتے تھے۔ اُن کے پیشِ نظر شاعری کا اعلیٰ معیار اور اعلیٰ معیار کی شاعری تھی۔ انھوں نے شعر ہی نہیں کہے، شاعری ہی نہیں کی شعر و شاعری کا صحیح ماحول بھی پیدا کیا۔

اور یہی سبب ہے کہ یہ شاعری اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ثابت ہوئی اس کی حیثیت بہت بلند ہے، اور وہ اُن کی زندگی کے اُفق پر سب سے زیادہ تابندہ ستارہ نظر آتی ہے۔

(۵)

مومن بنیادی طور پر شاعر تھے۔ شعر کہنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ اُن کی ساری زندگی شعر کہتے اور شاعری کرتے ہوئے گزر گئی اور وہ زندگی بھر ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر شاعری کرتے رہے۔ اس میں اُن کی عاشق مزاجی اور رنگینیٔ طبع کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اُن کی زندگی کے بعض واقعات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ وہ رنگین طبع اور عاشق مزاج آدمی تھے، اور یہ رنگینی اور عاشق مزاجی بقول شخصے اُن کی گھٹی میں پڑی تھی۔ انھوں نے خود اپنے آپ کو صورت پرست کہا ہے اس صورت پرستی نے انھیں رنگین مزاج بنایا اور اس رنگین مزاجی نے اُن سے عشق و عاشقی کے کوچوں کی خاک چھنوائی۔ اُن کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا اور انھوں نے اپنی زندگی میں کئی عشق کیے۔ اُن کی مثنویوں سے اُن کی زندگی کے اس پہلو پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ یہ مثنویاں اُن کی آپ بیتی تو نہیں ہیں۔ زیبِ داستان کے لیے بھی انھوں نے اِن میں بہت کچھ کہا ہے لیکن اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ رنگین مزاج تھے اور عشق و عاشقی سے انھیں خاص نسبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی زندگی میں یہ رنگ اتنا گہرا نظر آتا ہے۔ اُس کی تلاش و جستجو میں سرگرداں رہنا اُن کی فطرت میں داخل تھا اُن کے نواسے عبدالحئی انصاری نے لکھا ہے کہ مومن عاشق مزاج تھے، پتنگ بازی کا شوق تھا، رقعے پرچے تعلقاتی گھروں میں عورتوں کے پاس ذریعہ پتنگ پہنچائے جاتے

تھے[1]۔ اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ملتا لیکن یہ خیال ضرور گزرتا ہے کہ مومن یہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ خاصا زمانہ اُن کی زندگی میں ایسا گزرا ہے جب اُن کی آنکھوں کے سامنے رنگین پردے پڑے رہے ہیں اور اُنھوں نے زندگی کو ایک رنگین عینک سے دیکھا ہے۔ اس لئے بعید نہیں کہ یہ تقریب اُنھوں نے بہرِ ملاقات نکالی ہو۔ یہ تو خیر معمولی سی بات ہے اس کے علاوہ بھی وہ اس سلسلے میں بہت کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے، اور اُنھوں نے یقیناً کیا بھی ہوگا۔ افسوس ہے اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی۔

اُن کی مثنویاں بظاہر اُن کی حیاتِ معاشقہ کے مختلف واقعات کو پیش کرتی ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ اُن میں زیبِ داستاں کے لئے بھی بہت کچھ کہا گیا ہے اور بہت سے واقعات اسی مقصد سے بیان کئے گئے ہیں۔ یہ واقعات تمام و کمال صحیح نہیں ہیں لیکن ان سے مومن کی عاشق مزاجی پر روشنی ضرور پڑتی ہے اور اُن کی رنگینیٔ طبع کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ انھوں نے چھ مثنویاں لکھی ہیں۔ ان سب میں اسی حدیثِ شوق کی تفصیلات ہیں۔ پہلی مثنوی "شکایتِ ستم" میں یہ لکھا ہے کہ ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے عشق و عاشقی کے اس کوچے میں قدم رکھا۔ نو سال کی عمر تھی کہ وہ ایک شوخ کے عشق میں مبتلا ہوئے۔ وہ بھی ان پر دل و جان سے فدا ہوئی۔ بچپن کا عالم تھا۔ ابھی سن شعور کو نہیں پہنچے تھے۔ اس لئے اس کی حقیقت کو پوری طرح نہیں سمجھا۔ دو سال اسی طرح گزر گئے۔ ایک دفعہ مومن کے یہاں کوئی شادی ہوئی۔ اس شادی میں وہ محبوبہ بھی مہمان کی حیثیت سے آئی۔ مومن نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ ایک خالی مکان میں خوب خوب ملاقاتیں رہیں لیکن ایک دو دن ہی میں روزِ نشور آگیا اور وہ بزم منتشر ہو گئی لیکن ہجر و فراق کا غم اُن سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ بہت تھوڑے عرصے میں جنت کو سدھاری۔ مومن کو اس کا بہت غم ہوا۔ کچھ عرصے بہت پریشان رہے لیکن محلّے کی ایک لڑکی نے اس حالت کو دیکھ کر دلجوئی کی اور یہ اُس زہرہ جبیں کی محبت میں گرفتار ہو گئے لیکن ایک عورت نے اس لڑکی کو مومن کی طرف سے بدگمان کر دیا اور اُس نے اُن سے ہمیشہ کے لئے

---

[1] مولوی عبدالحیٔ انصاری کا خط راقم کے نام

علیحدگی اختیار کر لی۔ مومن کا سن اس وقت سترہ سال تھا۔ اُن کی دوسری مثنوی "قصۂ غم" ہے۔ اس میں بھی اُنھوں نے ایک ایسے بے وفا سے دل لگانے کا ذکر کیا ہے جو آشنا سے بھی بیگانہ رہنے کا قائل تھا۔ اس محبت میں بھی وہ ناکام رہے۔ تیسری مثنوی "قول غمیں" ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے عشق کا وہ مشہور قصہ لکھا ہے جو شاید اُن کی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ علاج کے سلسلے میں اُن کی ملاقات ایک بت طناز سے ہوئی۔ یہ اُس کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ چند مہینے یہ سلسلہ رہا۔ لیکن بالآخر اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی، اور اس کا اثر ان پر زندگی بھر رہا۔ اُن کی چوتھی مثنوی "تف آتشیں" ہے۔ اس میں اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ وہ ایک شادی کے انتظام میں مصروف تھے کہ اُن کی نظر ایک بت ہزار شیوہ پر پڑی اور یہ اُس پر دل و جان سے فدا ہو گئے اس محبوبہ نے رسوائی کے خوف سے انھیں یہ تاکید کی تھی کہ اس کو کوئی پیام نہ بھیجا جائے لیکن مومن جب ہجر و فراق کی تکلیف سے تنگ آ گئے تو مجبوراً ایک دوست کے ہاتھوں اس کو پیام بھیجا، وہ اس پر ناراض ہو گئی اور یہ کہلا بھیجا کہ اگر ضبط کی طاقت نہیں تھی تو عشق ہی کیوں کیا؟ اس طرح یہ عشق بھی ناکامی پر ختم ہوا۔ اُن کی پانچویں مثنوی "حنین مغموم" ہے ــــ اس میں اُنھوں نے لکھا ہے کہ وہ بہت پریشان رہتے تھے کہ اتفاق سے انھوں نے حسینوں کے ایک جھرمٹ میں ایک رشکِ پری کو دیکھا اور اس پری رخسار کو دل دے بیٹھے، وہ بھی اُن کی محبت میں گرفتار ہو گئی لیکن اسے مومن کی بوالہوسی کا علم ہو گیا اس لئے اُس نے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور اس طرح اس عشق میں بھی انھیں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ مومن کی آخری مثنوی "آہ و زاریِ مظلوم" ہے۔ اس میں اُنھوں نے محبوب کی بے وفائی کی تفصیل بیان کی ہے اور ایک حکایت کو بیان کر کے یہ لکھا ہے کہ وہ مر کر بھی دکھا سکتے ہیں عشق میں جان دینا اُن کے نزدیک معمولی بات ہے۔

غرض اس انداز کی یہ چھ مثنویاں اُن کی عشقیہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتی ہیں۔ یہ اُن کی آپ بیتی تو نہیں ہیں لیکن ان سے مومن کی زندگی کے عشقیہ پہلو پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ ان سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ مومن کا مزاج عاشقانہ

تھا اور وہ خاصے رنگین مزاج آدمی تھے لیکن انھوں نے جتنے عشق بھی کیے اُن میں سے ایک میں بھی انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ اسی لئے عشق و عاشقی کے ساتھ ایک احساس ناکامی اُن کی زندگی میں بہت نمایاں ہے لیکن اس احساس ناکامی نے اُن کی رنگین مزاجی کو ختم نہیں کیا ہے بلکہ اس میں کچھ زیادہ ہی شدت پیدا کی ہے۔ اس کے اثرات سب سے زیادہ ان کی شاعری میں نظر آتے ہیں۔ طبیعت کی رنگینی اور عاشق مزاجی نے انھیں شاعری کی طرف راغب کیا اور اسی میں انھوں نے اپنے لئے پناہ ڈھونڈھی۔

آب حیات میں صحیح لکھا ہے کہ "شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی۔ اور عاشق مزاجی نے اُسے اور بھی چمکا دیا تھا"[۱] اُن کی اس عاشق مزاجی کے بہت سے واقعات مشہور رہیں لیکن ان میں سے ایک واقعہ خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ شیفتہ نے گلشن بے خار میں ان کے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے[۲] اور خود مومن نے بھی اپنے کلام میں اس کی طرف واضح اشارے کئے ہیں۔ البتہ آب حیات میں اس کا ذکر نہیں ملتا۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہو سکتا ہے کہ آب حیات میں جو حالات درج ہیں، وہ حالی نے لکھے تھے۔ اور حالی کے مزاج کی ثقاہت اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ مومن جیسے اہم انسان کی عشق و عاشقی کی داستان بیان کی جائے۔ ویسے یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ بہت ممکن ہے حالی نے اس کی طرف اشارے کئے ہوں لیکن چونکہ بعض اسباب کی بنا پر آزاد اس واقعے پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے حالی کے لکھے ہوئے مومن کے حالات میں سے ان اشاروں کو نکال دیا ہو۔ بہرحال آب حیات میں اس واقعے کا بیان نہ ہونا بعض شبہات کو ضرور پیدا کرتا ہے۔ حالی کی اس چشم پوشی اور آزاد کی پہلوتہی دونوں کے پردۂ زنگاری میں کوئی معشوق ضرور معلوم ہوتا ہے۔

شیفتہ نے اس واقعہ کا بیان ذرا کھل کر کیا ہے لیکن مومن کے تذکرے میں نہیں۔ اُن کے تذکرے میں تو صرف اتنا لکھا ہے کہ "بوصل یاران رنگین و بوصل شاہدان شیریں عمرے خوش می گزارد"[۲] لیکن امۃ الفاطمہ بیگم صاحب کے تذکرے میں اس راز کو

---

[۱] آزاد: آب حیات: ص ۴۲۳

[۲] شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۶-۱۹۷

فاش کر دیا ہے اور صاف صاف لکھا ہے کہ مومن کو امۃ الفاطمہ بیگم المتخلص بہ صاحب سے عشق ہوا تھا اور ان کی مثنوی قول غمیں' اُن کے اسی عشق کی روداد کو پیش کرتی ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں "صاحب تخلص نامش امۃ الفاطمہ بیگم مشہور بہ صاحب جی کہ ماہ آسمان نکوئی است آفتاب صفت از مشرق بہ جانب مغرب آمدہ بہ تقریب مداوا با مومن خاں کارش اُفتاد و ماہے چندے کار ہا درد و دوا بود. سالہا ہست کہ باز بہ لکھنؤ رفت مثنوی قول غمیں، کہ از مصنفات خاں معزے الیہ است شرح نسخہ حسن و جمال ہماں موزوں قد است۔ القصہ بہ فیض صحبت شاں دلش بہ شعر و شاعری میل کرد. از موزونی قامت بہ موزونی طبع گرائیدہ واز آرائش زلف پریشاں بہ موشگافی اشعار پیچید"[1] اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ امۃ الفاطمہ بیگم علاج کی غرض سے مومن خاں کے پاس گئی تھیں لیکن یہ علاج خود مرض عشق کا پیش خیمہ ثابت ہوا چند سال یہ سلسلہ جاری رہا لیکن اس کے بعد صاحب جی لکھنؤ کی طرف واپس چلی گئیں۔ انھوں نے مومن کے اثر سے شاعری بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن اس واقعے کی تفصیل کہیں اور نہیں ملتی حیرت ہے کہ کریم الدین نے اس کا ذکر تفصیل سے نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ کریم الدین کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اس کاروبارِ شوق کو کھلم کھلا مفصل بیان کرتے۔ مومن سے اُن کے تعلقات برابر کے نہیں تھے۔ اُن کے مقابلے میں مومن کی معاشرتی حیثیت بلند تھی۔ مومن کا تعلق ایک اونچے طبقے سے تھا۔ کریم الدین اُن کے مقابلے میں کمتر درجے کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی تو یہ جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس واقعے کو کھلم کھلا بیان کرتے۔ چنانچہ انھوں نے طبقات الشعرا، اور گلدستہ نازنیناں' دونوں میں جہاں مومن کے حالات بیان کیے ہیں وہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ تک نہیں کیا ہے۔ البتہ امۃ الفاطمہ بیگم صاحب کے تذکرے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ "صاحب تخلص ایک عورت امۃ الفاطمہ بیگم کا ہے۔ اس کو صاحب جی بھی کہتے ہیں۔ درمیان شاہجہاں آباد کے حکیم محمد مومن خاں سے ملاقات اُس کی بہ تقریب علاج کے ہوئی تھی۔

---

[1] شیفتہ: گلشن بے خار: ص۲۳۱

مدت تک آشنائی رہی کئی سال گزرے کہ اب لکھنو کو چلی گئی ہے۔ وہ ایک خانگی تھی۔
مثنوی "قول غمیں" مومن خاں کی اسی محبوبہ کے حق میں ہے۔ بہ سبب فیض صحبت مومن خاں صاحب کے وہ بھی شعر کہنے لگی تھی۔[ا] یہ کم وبیش وہی بات ہے جو شیفتہ نے کہی ہے۔ تفصیل دونوں میں نہیں ہے۔ شیفتہ کے بیان میں اجمال کے باوجود زیادہ گہرائی کا پتہ چلتا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے اور انھیں اس سے دلچسپی بھی تھی۔ بہرحال شیفتہ اور کریم الدین دونوں کے بیان سے اس واقعہ کی صداقت مسلّم ہو جاتی ہے اور اس بات کا اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ مومن کی مشہور مثنوی قول غمیں کا موضوع یہی واقعہ ہے۔

یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مومن خاں نے قول غمیں میں جو کچھ لکھا ہے اور جو واقعات بھی بیان کیے ہیں سب کے سب سچے ہیں۔ کیونکہ وہ بہرحال ایک شاعرانہ نظم ہے اور اس میں شاعرانہ رنگ داہنگ پیدا کرنے کی غرض سے انھوں نے کچھ ایسی باتیں بھی کہہ دی ہوں گی جن کا تعلق اس واقعے سے شاید نہ ہوگا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس مثنوی سے مومن کی زندگی کے اس اہم پہلو پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور اس حدیث شوق کو سن کر یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ مومن کی آپ بیتی ہے۔

اس مثنوی میں جو قصہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مومن زمانے کی ناسازگاری کے ہاتھوں تنگ ہیں۔ ان کی زندگی میں غم ہی غم ہے۔ لیکن دور تک انھیں کسی غمخوار کی صورت نظر نہیں آتی۔ وہ ہمدم ودمساز سے محروم ہیں اور اس پر کڑھتے ہیں تاکہ ان پر جو کچھ بیتی ہے اس کو سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کریں۔ لیکن جب کوئی ہمدم ودمساز نہیں ملتا تو وہ اس افسانے کو ہر دلِ پُر درد کے لئے بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ افسانہ صرف اتنا ہے کہ مومن ایک شوخ پر مرتے تھے، اُس میں اُلفت مروّت اور وفا کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ایک زمانے تک انھوں نے اس شوخ سے نباہنے کی کوشش کی لیکن بالآخر صحبت بگڑ گئی اور ان بن ہو گئی۔ منانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانا۔ چنانچہ وقت

[ا] کریم الدین: طبقات الشعراء، ص ۳۷۱

غم و غصہ کے عالم میں گزرنے لگا لیکن ہر لمحہ اس سے پھر ملنے کی خواہش بیدار رہی۔ چنانچہ ملنے کی کوشش کی، اور ملاقات کی صورت نکل بھی آئی، اور اس طرح وقت ہنسنے ہنسانے میں گزرنے لگا۔ طبیعت میں جولانی پیدا ہوئی اور احباب کے ساتھ بھی اچھی طرح ملنے جلنے لگے۔

ایک دن ایسا ہوا کہ مومنؔ کسی یار غم خوار و وفادار کے پاس ملنے کی غرض سے جا رہے تھے کہ راستے میں غرفۂ بام دل آرا پر نظر پڑی جو پسِ چلون بڑے ناز و انداز کے ساتھ کھڑی بازار کا نظارہ کر رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اشاروں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں نے آتشِ شوق کو بھڑکایا اور انھوں نے اس کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ سارا بھید معلوم کیا۔ اور سو فریبوں سے وہاں تک پہنچے۔ اس کا مکان بہت عالی شان تھا اور اس کے مزاج میں بلا کی شوخی اور ظرافت تھی۔ ان صحبتوں میں اچھا وقت گزرنے لگا طبیعت لطف اندوز ہوئی اور ہر روز آنے جانے کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ لیکن ایک روز اس کے یہاں کوئی مہمان آیا۔ پردے کے واسطے یہ باہر آئے اور انتظار کرتے رہے کہ شاید پھر اندر بلائے جائیں گے۔ کچھ دیر انتظار کیا لیکن بلاوا نہیں آیا اس لئے گھبرا کے گھر واپس آ گئے۔ چند روز بعد وہاں سے ایک پیام آیا کہ مہمان کی نبض دیکھ جایئے۔ چنانچہ یہ گئے اور اس طرح ایک الفت تازہ کے گل کھلنے کا سامان پیدا ہوا۔ صاحبِ خانہ نے مہمان کی نبض دکھائی تاکہ مرض کی تشخیص ہو۔ انھوں نے اس کی نبض پر جو ہاتھ دھرا تو ہاتھ سے دل ہی جاتا رہا۔ وہ ہاتھ صندل سے زیادہ صاف اور مخمل سے زیادہ نرم تھے۔ ہاتھ میں ہاتھ آتے ہی انھیں ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوا اور اس عالم کیف و مستی میں ایک غزل ان کی زبان پر آ گئی جس کا مطلع یہ تھا ؎

کیا لگا دستِ دل آرام سے ہاتھ دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

اس نے یہ غزل سنی تو فوراً ہاتھ کو جھٹک کر ہاتھ کھینچ لیا اور صاحب خانہ سے یہ ہنس کر کہا کہ یہ صاحب مرض کا درماں کیا کریں گے۔ یہ بیچارے تو خود ہی بیمار ہیں۔ انھیں تو طبیب

کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ تو خود بتلائے دردہیں۔ یہ خوش بیانیاں سن کر اُن کا کچھ عجیب حال ہوا۔ چپ لگ گئی۔ بات کرنا بھول گئے۔ ہرچند بولنے کی کوشش کی لیکن زبان نہ کھلی۔ اس پر تو وہاں اور بھی فقرے کسے جانے لگے۔ کسی نے کہا یہ کسی سے لڑ کر آئے ہیں۔ کوئی کہنے لگی کسی سے بگاڑ ہو گیا ہے۔ محبوب نے کہا نہیں اُنھوں نے پی رکھی ہے اور ان پر نشے کا عالم طاری ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ آخر ہوا کیا ہے۔ کہیں ہم سے بگڑ تو نہیں گئے ہیں۔ اگر آزردگی کا عالم ہے تو پھر یہاں آنے ہی کی کیا ضرورت تھی۔ اگر نہیں بولتے تو پھر یہاں بیٹھنے سے کیا فائدہ۔ کیا گھر نہیں جا سکتے۔ یہ تو زندہ دلوں کا مجمع ہے۔ اس میں ان کے ایسے افسردہ دل کا کیا کام ــــ مومن نے یہ خوش بیانیاں سنیں تو صرف اتنا کہا کہ میں تو یہاں اچھا خاصا آیا تھا۔ یہاں آکر خدا جانے مجھے کیا ہو گیا۔ منہ سے یہ بات نکلی ہی تھی کہ سب کو اصل حقیقت کا علم ہو گیا۔ اور لوگ پہچان گئے کہ انھیں عشق ہو گیا ہے۔ چنانچہ اُن پر طعنہ زنی ہونے لگی۔ سب لوگ تو وہاں ہنستے رہے لیکن یہ خود خاموش رہے۔ دن بھر یہی عالم رہا۔ شام کو ناچار اُٹھ کر گھر آئے۔ لیکن گھر میں بھلا چین کس طرح ملتا۔ وہی خیالات ذہن پر منڈلاتے رہے۔ بار بار یہ خواہش دل میں انگڑائیاں سی لیتی رہی کہ پھر وہیں چلیے ساری رات اسی عالم میں کٹ گئی۔ صبح اُٹھتے ہی پندار کے صنم کدے کو ویران کر کے پھر اسی کوئے ملامت کی طرف چلے۔ وہ شوخ اس وقت کوٹھے پر محو خرام ناز تھی۔ ان کے آنے کی خبر سنی تو بے دھڑک سامنے آگئی۔ مومن پر وجد کا سا عالم طاری ہو گیا۔ کیونکہ اس سراپا کا محبوب انھوں نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ پھر سب لوگ جمع ہو گئے اور دلچسپ باتیں ہونے لگیں۔ لوگوں نے کہا بے وقت آکر سوتوں کو کیوں جگایا۔ یہ سن کر انھوں نے بھی زبان کھولی اور کہا کہ رات کو نیند آتی تو میں ہرگز اس وقت یہاں نہ آتا۔ اس پر محبوب کو احساس ہوا، اور اس نے کہا کہ یہ تمھارا ہی گھر ہے۔ اچھا ہوا کہ بے تکلفی کے ساتھ یہاں آگئے۔ غرض یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور پھر نامہ و پیام شروع ہو گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس عشق کا اثر بڑھتا گیا اور مومن اس سے ملنے کے لئے روزانہ وہاں جانے لگے۔ لیکن عشق اپنا اثر کرتا رہا۔ پہلی سی بحالی نہ رہی۔ رنگ اُڑ گیا۔ آنکھوں میں آنسو رہنے لگے۔

اُدھر اس محبوب کا حال بھی دگرگوں ہوا، چشم پر بے خوابی کا عالم چھا گیا اور دل کو بیتابی رہنے لگی۔ آنکھوں سے نیند اُڑ گئی۔ رات رات بھر جاگنے کے سوا اُسے کوئی کام نہ رہا۔ ایک رات موقع غنیمت جان کر اُس نے مومنؔ کو بلوا بھیجا۔ یہ اُس کے یہاں پہنچے وہ بے حجابانہ اُن کے سامنے آ گئی۔ غم کی باتیں بیان ہونے لگیں۔ اور عشق کی باتیں کر کے دونوں روتے رہے۔ لیکن پھر جدائی کی گھڑی آ گئی۔ اور یہ گھر واپس گئے۔ کچھ دنوں آمد و رفت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ صبح جاتے شام کو واپس آتے۔ چندے یہی لیل و نہار رہے لیکن گردش روزگار کو یہ صحبت ایک آنکھ نہ بھائی۔ چنانچہ محبوب کی رخصت کا وقت آیا اور اُس کے کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ چنانچہ ایک روز پیامبر آیا اور اُس نے پیام دیا کہ محبوب کو سفر درپیش ہے۔ سفر سے قبل مومن نے اس سے ایک بار پھر ملنے کی کوشش کی۔ ملاقات ہوئی مجبوریوں اور معذوریوں کا ذکر ہوا۔ یہ مومنؔ کی اپنے اس محبوب سے آخری ملاقات تھی۔ صبح وہ سفر پر روانہ ہو گئی۔ انھوں نے لاکھ چاہا کہ اُس کے ساتھ یہ بھی چلے جائیں لیکن شرمِ رسوائی درمیان میں حائل رہی۔ یہ اُس کے ساتھ جانے کی ہمت نہ کر سکے لیکن اُس کے جانے کے بعد جنگل جنگل پھرتے رہے۔ اور اس طرح صحراؤں کی خاک چھاننا اُن کا مقدر ہو گیا۔ ہر وقت وحشت سی رہنے لگی اور وہ جیتے جی مر گئے۔ احباب نے ہمدردی کی اور اُن کو اس محبوب کے گھر کی طرف لے چلے۔ وہ اس عالم کو دیکھ کر کوٹھے سے گر پڑی اور گرتے ہی مر گئی۔ اُس کی قسمت میں یہی لکھا تھا۔ عشق یہی چاہتا ہے۔ اُس کے سامنے بھلا کس کی پیش جا سکتی ہے۔

قولِ غمیں میں بس یہی واقعات ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ یہ سب کے سب صحیح ہیں لیکن ان سے مومنؔ کے اس معاشقے پر روشنی ضرور پڑتی ہے جو اُن کی زندگی کا شاید سب سے اہم واقعہ ہے۔ اس میں جس محبوب کا ذکر ہے یہ وہی امۃ الفاطمہ بیگم المتخلص بہ صاحبؔ ہیں جن کے بارے میں شیفتہؔ اور کریم الدینؔ دونوں نے اپنے تذکروں میں اشارے کئے ہیں کہ علاج کی غرض سے یہ مومنؔ خاں کے پاس آئی تھیں لیکن دونوں کو عشق کا روگ لگ گیا۔ اور کاروبارِ شوق کی یہ صحبت

ناکامی پر ختم ہوئی۔ دونوں جیتے جی مر گئے۔

امتہ الفاطمہ بیگم صاحب کے حالات کی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔ مومن نے خود اشاروں اور کنایوں میں اُن کا ذکر کہیں کہیں اپنے کلام میں کیا ہے۔ خود قولِ غمیں میں ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

سمجھی میں ناز کی یہ باتیں ہیں　　　اور انداز کی یہ باتیں ہیں
سُن کے وہ بولی کہ ہاں کیا صاحب　　　کیا کہا آپ نے اچھا صاحب
گھر جوان کا ہے یہ تو یہ ہی رہیں　　　ہم چلے جاتے ہیں لو یہ ہی رہیں

یہاں صاحب اگرچہ عام معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن اس معنویت کے پردے میں مومن کے محبوب صاحب کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ قطعہ جو انھوں نے اپنے سہسوان جانے کے بارے میں لکھا ہے اُس میں تو صاحب کا ذکرِ کھلم کھلا کیا ہے لکھتے ہیں ؎

صاحبو! میرا حال مت پوچھو　　　بندۂ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلّی کو سہسواں آیا　　　ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذر بے جا ہے سرکشی کے لئے　　　شاکیٔ بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوند شوخ کے غم میں　　　قابلِ رحم ہو گیا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک
کہ غلامِ گریز پا ہوں میں

درحقیقت ان کے سہسوان جانے کا مقصد ہی اُس غم کو غلط کرنا تھا جس کا کاری زخم صاحب کے عشق نے اُن کے دل پر لگایا تھا۔ اسی لئے انھوں نے وہاں جا کر صاحب تک پہنچنے کی آرزو اس قطعے میں کی ہے۔ مومن کے دیوان میں ایک غزل ایسی ہے جس کی ردیف صاحب ہے۔ اس ردیف کے پردے میں بھی دراصل انھوں نے اپنے محبوب ہی کے نام کو ظاہر کیا ہے ؎

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب　　　کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب ۔۔۔ غیر اور تم بھلے بھلا صاحب
کیوں اُلجھتے ہو جنبش لب سے ۔۔۔ خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب
کیوں لگے دینے خطِ آزادی ۔۔۔ کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب
ہائے ری چھیڑ رات سن سن کے ۔۔۔ حال میرا کہا کہ کیا صاحب
دمِ آخر بھی تم نہیں آتے ۔۔۔ بندگی اب کہ میں چلا صاحب
ستم آزار ظلم و جور و جفا ۔۔۔ جو کیا سو بھلا کیا صاحب
کس پہ بگڑے تھے کس پہ غصہ تھا (ق) ۔۔۔ رات تم کس پہ تھے خفا صاحب
کس کو دیتے تھے گالیاں لاکھوں ۔۔۔ کس کا شب ذکرِ خیر تھا صاحب

نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن
کیجیئے بس خدا خدا صاحب[1]

ایک اور غزل میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ کہتے ہیں ؎

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا ۔۔۔ لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

یہاں صاحب کا مطلب تو آقا ہے لیکن آقا کے معنوں میں صاحب کے لفظ کا استعمال اس حقیقت کو واضح کر دیتا ہے کہ مومن کی اس سے مراد درحقیقت ان کا وہ محبوب ہے جس کا تخلص صاحب تھا۔ اور جو صاحب جی کے نام سے مشہور تھا۔ غرض مومن کے کلام میں اُن کے اس محبوب کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومن کی زندگی پر اس شخصیت کا گہرا اثر تھا۔

یہ صاحب جی کون تھیں؟ اور ان کا تعلق کس خاندان سے تھا؟ اس کا سُراغ نہیں ملتا۔ تذکرہ نگاروں نے اس سلسلے میں تفصیل پیش نہیں کی۔ شیفتہ نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ان کا نام امۃ الفاطمہ بیگم تھا۔ صاحب تخلص کرتی تھیں۔ صاحب جی کے نام سے مشہور تھیں۔ حسن میں چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ آفتاب کی طرح مشرق سے مغرب میں آئی تھیں۔ یعنی پورب سے آکر دلی میں آباد ہو گئی تھیں۔ مومن خاں سے

---

[1] کلیاتِ مومن: صـ ۸۲

اُن کی ملاقات علاج کے سلسلے میں ہوئی۔ وہ اُن پر عاشق ہو گئے۔ چند سال یہ سلسلہ چلا۔ خاصا عرصہ ہوا کہ وہ لکھنؤ واپس چلی گئیں۔ مومن خاں نے "قولِ غمیں" کے نام سے جو مثنوی لکھی ہے وہ انھیں کے متعلق ہے۔ مومن کے فیض صحبت نے انھیں شاعر بنا دیا تھا۔ اور وہ اچھے خاصے شعر کہتی تھیں۔ کریم الدین نے بھی اُن کے بارے میں کم و بیش یہی معلومات بہم پہنچائی ہے لیکن یہ لکھ دیا ہے کہ "وہ ایک خانگی تھی"[۵۱] اس کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے کہ ان کا تعلق اچھے خاندان سے نہیں تھا۔ اس لئے صاحب جی کے حسب نسب کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے۔ لیکن انھوں نے اس کو لکھا نہیں ہے۔ اور وہ اس کو لکھ بھی نہیں سکتے تھے کہ امۃ الفاطمہ بیگم صاحب کا تعلق دلّی کے ایک مشہور خاندان سے تھا۔ اس خاندان میں بہت اچھے ادیب و انشا پرداز پیدا ہوئے ہیں۔ صاحب جی ان کی قریبی عزیزہ تھیں۔ مولانا ابو الخیر مودودی نے اپنے ایک خط میں مومن کے اس عشق پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلے میں امۃ الفاطمہ بیگم صاحب کے بارے میں بھی کچھ اشارے کیے ہیں۔ اُن کے خیال میں بیاض سالک اور برکت خیر آبادی کی مثنوی میں مومن کے اس عشق کی پوری تفصیل موجود ہے۔ لکھتے ہیں:-

"بیاض سالک تو نا قابل یافت ہے۔ برکت خیر آبادی کی مثنوی ممکن ہو دستیاب ہو سکے، قلمی تھی مگر اس کی بکثرت نقلیں ہوئی تھیں۔ برکت جنرل آکٹر لونی کے پیش کار تھے۔ مومن سے بڑا یارانہ تھا۔ عمر میں مومن سے بڑے تھے مگر مومن کی نباضی اور نباضی سے زیادہ جفر میں کمال نے برابر کا یار بنا دیا تھا، ہمراز تھے۔ مومن نوجوان تھے، یہ باراں دیدہ، انھوں نے ذرا سی بات کہی یہ تہہ تک پہنچ گئے۔ برکت کی مثنوی مومن کے عشق کی پوری روداد تھی۔ امۃ الفاطمہ ریعان شباب میں شادی کے دوسرے تیسرے سال بیوہ ہو گئیں۔ ایک ڈپٹی صاحب سے مُتعہ ہوا۔ اندرا رے کنوئیں کے عین سامنے (قاسم جان کی گلی میں) ایک بہت اونچا پھاٹک

---

۵۱ کریم الدین: طبقات الشعراء: ص ۳۷۱

آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ پھاٹک انھیں ڈپٹی صاحب کے گھرانے کی یادگار ہے۔ ڈپٹی صاحب سے بھی برکت کا یارانہ تھا۔ معالجے کے سلسلے میں وہی وجہ تقریب ہوئے۔ امۃ الفاطمہ حسن و جمال میں فرد تھیں منتے کا قیضان کچھ ایسا ہوا کہ آئین ہم آغوشی میں طاق ہوگئیں۔ وہ اولین تھیں جن پر مومن چھوٹے اور اسیر ہوگئے۔ پھر مومن کا معاملہ تو یہ ہوا کہ عشق کے عین شباب میں عالم آشوب نگاہ ہے سر راہم بگرفت، سید احمد شہیدؒ کے مرید ہوگئے اور بے چاری امۃ الفاطمہ صاحب جی خانگی بن گئی عشق مومن کی داستان قول غمیں نہیں برکت کی مثنوی ہے۔ اس سے اندازہ فرمایئے کہ پانسو بیت میں کیا کیا رقم ہوا ہوگا۔[۱]

برکت کی مثنوی باوجود تلاش کے دستیاب نہ ہوسکی۔ اگر مل جاتی تو ممکن تھا کہ مومن کے اس عشق اور امۃ الفاطمہ بیگم صاحب جی کے بارے میں کچھ مزید معلومات فراہم ہوتی — بہر حال وثوق کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ امۃ الفاطمہ بیگم صاحب کے بارے میں بھی تفصیلات کا علم نہیں ہوتا۔ مومن کے کلام سے اُن کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب شیعہ تھا اور وہ اثنا عشری عقائد رکھتی تھیں۔ غزل کے ایک شعر میں انھوں نے صاف صاف کہا ہے ؎

دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہو　　　محب حسینؑ کا اور دل رکھے شمر کا سا

ایک اور غزل میں بھی اس اس پہلو کی طرف اشارہ ہے ؎

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر　　　یوں روئے زار زار تو اہل عزا کے ساتھ

ایک اور غزل کا مطلع ہے جس میں شہدا کے علم اٹھنے اور سینہ کوبی کا ذکر ہے ؎

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے　　　کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے

اور مثنوی ُقول غمیں، میں تو ایک جگہ اس محبوب کے تقیہ کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس مثنوی میں ایک غزل ہے۔ غزل کا مقطع ہے ؎

---

[۱] مولانا سید ابو الخیر مودودی کا خط راقم کے نام

منھ کو مومن سے چھپانا کافر ... یہ تقیہ تو نہ بھایا مجھ کو

غرض مومن نے کئی جگہ اپنے محبوب امۃ الفاطمہ بیگم صاحب جی کے بارے میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اُن کا مذہب شیعہ تھا۔ اور وہ اپنے عقائد میں سخت نہیں۔ مومن کو یہ بات کھٹکتی تھی کیونکہ وہ خود شیعیت سے بہت دور تھے۔ انھیں تو اس زمانے کی وہابی تحریک سے دلچسپی تھی اسی لئے وہ غیر شعوری طور پر اپنے محبوب کے مذہب کی طرف جگہ جگہ اشارے کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔

مومن اپنے عقائد میں بہت سخت تھے لیکن دل کو کیا کرتے۔ اس کو تو ایک ایسے ہی شخص پر آنا تھا۔ جس کے مذہبی عقائد کو اُن کے عقائد کے ساتھ دور کی نسبت بھی نہیں تھی مومن بُری طرح صاحب جی کے عشق میں مبتلا ہوئے۔ اور اس عشق میں وقت کے ساتھ ساتھ اتنی شدت پیدا ہوئی کہ وہ اپنے آپ کو بھول گئے۔ اور اُن کا بُرا حال ہو گیا۔ اُن کے کلیات میں چند قطعات ہیں جن کی واقعیت اس حقیقت کو عالم آشکارا کر دیتی ہے۔
ایک قطعے میں کہتے ہیں ؎

عمِ بزرگوار کہ ہیں عیسیٰ زماں ... نسخے کا جن کے معجزے سے مشکل امتیاز
سقراطِ زہر خوردہ کا گر چارہ وہ کریں ... عمر خضر سے ہو نفسِ واپسیں دراز
وہ سب ہی جس کی فطرتِ عالی کے ہیں مقر ... وہ جس کی رائے خیلِ طبیباں میں سرفراز
ہو آب آب قولِ قدیم و جدید سے ... ترجیح قابضات کا اُن سے سنے جو راز
ہو نافِ پیچ و تاب سے بیتاب بو علی ... قولنج مادّی کے اگر ہوں وہ چارہ ساز
حضرت کے خوانِ فضل سے وہ فضلہ چیں نہیں ... قے میں نہ کیوں محققِ طوسی کے ہو براز
خاکستر اُن کے نسخۂ اکسیر اثر کی ہے ... کحل الجواہر رمدِ چشمِ حرص و آز
بالغرض گر شراب میں ترکیب اُن کی ہو ... ہرگز رہے نہ گردنِ مینا میں پھر کزاز
از بس کہ زندگی کی توقع نہیں رہی ... وہ بھی مرے علاج سے کرتے ہیں احتراز
کیا نارِ عنصری کے اُڑا دیں گے دھوئیں ... دل گرمیٔ حرارتِ عشقِ جگر گداز
سوئے دماغ ابخرۂ دل کا یوں صعود ... سجدے سے جیسے رکعتِ دل صفِ نماز

یہ حال ہے کہ ضعف سے کھلتی نہیں ہے آنکھ — ہے یاد کس کی نرگس بیمار نیم باز
میں کیا کہ دم میں چلنے کی طاقت نہیں رہی — بیٹھا ہے پاؤں توڑ کے جب اپنا ہرزہ تاز
دورانِ سر میں دیکھ کر چکر میں آگئی — وہ عقل جو کہ ہرزہ دوی سے ہے بے نیاز
گر نفس ناطقہ کو نہیں لگ گئی ہے چپ — ورد زباں ہے کیوں ہذیاں سے حدیث راز
کس کے خیال میں یہ پراگندگی ہوئی — احساس کو ذرا نہیں وسواس امتیاز
اعصاب محو زلف شکن در شکن ہوئے — گردن میں ہے تشنج اقدام سے کزاز
میں کیا کہوں حقیقتِ رنگ عذار زرد — سمجھو تو صفرت یرقان اس سے ہی مجاز
گر یہ ہے زور ضعف قوی ہی عجب نہیں — دشوار ہو وے عمر رواں کو بھی اجلواز
منھ کا مزا یہ تلخ کہ شیریں ہے اس سے تو — بے وجہ سرکہ روئیے زہا وحیلہ ساز
صندل سے دردِ سر کو ہو کیا جب تلک جبیں — میں اس کے آستاں پہ نہ رگڑوں بصد نیاز
یاں شوق سرکہ روئیے ہندی صنم ہے خاک — صفرا شکن ہو سرکۂ انگوری حجاز
یاں بوسے چاہئیں گرۂ زلفِ یار کے — ممکن نہیں کہ دانۂ آلو ہو چارہ ساز
لازم ہے میرے سینے پہ رخسار ماہ وش — کافور کی ہو قرص سے کیا چارۂ فراز
جھوٹی شرابِ یار کی درکار ہے کہاں — تسکیں پذیر ہو عرق بید سے جواز
اس جائے بوسۂ شکریں لب کا کام ہے — گل قند سے ہو کیونکہ طبیعت کو اہتزاز
باقی رہی ہے بچنے کی تدبیر کون سی — اے ناصح شفیق جگر سوز چارہ ساز
الّا یہی کہ پہنچوں وہاں جس کی خاک در — کرتی ہے آج خاک شفا پر ہزار ناز
وہ مایۂ حیات وہ سرچشمۂ بقا — جس کا کہ لعاب دہن آب جاں نواز
صد سالہ مردہ زندہ ہو گر اپنی بات پر — آجائے اس صنم کا لب معجزہ طراز
رحم آئے تو عجب نہیں آخر غلام ہوں — اور وہ غلام خاص کہ یوسف تھا یا ایاز

پہنچا دے کاش کوچے میں اس سبز رنگ کے
مرتا ہوں اپنی جان سے عمر خضر دراز

اور ایک دوسرے قطعے میں اپنا حال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

موا جاتا ہوں، اب جی میں ہے اُس بے درد کو لکھوں ۔۔۔ کہ مجھ کو تختۂ مشقِ اطبا کیوں بنایا ہے
نہ یہ سمجھیں سبب نے کچھ علامت سے مرض پایا ہیں ۔۔۔ نڑی ہیں آپ مالیخولیا مجھ کو بتایا ہے
کوئی کہتا ہے آلودہ کہ صفرائے گرانی ہے ۔۔۔ سیاہ رو نے ہرا جو رنگ کو چہرے کے پایا ہے
کوئی کہتا ہے لیکن غش ہوا جب بیخودی چھائی ۔۔۔ مجھے وسواس سبز سام درد غین بیچ ہی آیا ہے
کوئی کہتا ہے میں سمجھا یہ سر جو اُٹھ نہیں سکتا ۔۔۔ ہزال روح انسانی نے یا دوسرا اُٹھایا ہے
کوئی کہتا ہے جانتا ہے یہ گرمی غبِ خالص کی ۔۔۔ اسی جاں سوز شعلے نے دھواں دل کا اڑایا ہے
کوئی کہتا ہے ترکیب اور غالب خلط بلغم ہے ۔۔۔ رطوبت گر نہیں تو کیوں پسینے میں نہایا ہے
کسی کو قشعریرہ سے عفونت کا جو دھیان آیا ۔۔۔ تو آخر سونگھنے کو بول کا شیشہ منگایا ہے
کوئی کہتا ہے یہ سکتہ ہے نظروں میں ہماری تو ۔۔۔ کئی بار احمقوں نے لا کے آئینہ دکھایا ہے
کوئی سمجھا جو تلخی ذائقہ کی سرکہ روئی سے ۔۔۔ تو کہتا ہے کہ گا ہے شہد خالص بھی چٹایا ہے
کوئی اطراف کی سردی سے گرم شور دغو غایوں ۔۔۔ کہ سینکو چارہ بالضد مکرر آزمایا ہے
کوئی کہتا ہے دیکھو ممتلی ہے نبض مسہل دو ۔۔۔ ولیکن پیشتر سے گر کوئی منضج پلایا ہے
کسی کو کم غذائی سے گماں ہے ناتوانی کا ۔۔۔ تو کہتا ہے کہ جلدی لاؤ گر کچھ بھی پکایا ہے
کسی نے شربت وردِ مکرر کی جو ٹھہرائی ۔۔۔ تو کوئی سُن کے مثلِ غنچۂ گل مُسکرایا ہے
کوئی کہتا ہے اب تو ہو گیا گیلوس بھی ناقص ۔۔۔ کہ سالم ویسے ہی ہیں گرچہ ہونٹوں کو چبایا ہے
کوئی کہتا ہے پانوں جو تشنج سے سکڑتے ہیں ۔۔۔ کہ قطرب ہے یہی قانون میں میں نے پڑھایا ہے
کوئی کہتا ہے یہ سوزش غریزی ہے کہ نسخے میں ۔۔۔ سبھی اجزا ہیں بار دینده تحفہ ساتھ لایا ہے
کوئی کہتا ہے اس آتش کا اطفا سخت مشکل ہے ۔۔۔ مگر دے دو کوئی گر برف کا کوزہ جمایا ہے
کوئی کہتا ہے بالخاصیت ہی برف میں گرمی ۔۔۔ تمھیں ہندی مداوا کس ستمگر نے سکھایا ہے
کوئی کہتا ہے روغن دیجیے بادامِ مقشر کا ۔۔۔ یہ نکتہ مرتے دم اُستاد نے مجھ کو بتایا ہے
مگر عمِ فلاطول منزلت میرے یہ کہتے ہیں ۔۔۔ مرض وہ ہی ہے لیکن شرم کے مارے چھپایا ہے
یہ سودا عشق ہے تیرا یہ تپ سوز غریبی وہ ۔۔۔ کہ بے جا گرمی صحبت نے تیرا جی جلایا ہے
یہ تلخی ذوق کی وہ تلخ کامی ہے کہ حسرت نے ۔۔۔ لبِ شیریں کے بوسے کا مزہ مجھ کو چکھایا ہے

یہ خضرت لون کی پرتو ہے تیری سبزہ رنگی کا
عرق وہ اشک ہے جو پاس رسوائی سے رُکا تھا
صداع و صدر کا باعث بھی تیری بد دماغی ہے
سبب ظاہر ہے اضمحلال و ضعف و ناتوانی کا
یہ کیونکر کانپ کانپ اُٹھو زمانے کی ہوا بگڑی
مندی جاتی ہیں آنکھیں بس کہ شب ہائے جدائی ہیں
افاقہ عشق سے کیا آتا کہ تیری کاکل مشکیں
نہ کیونکر امتلائے معدہ ہو محسوس اک مدت

زہے نیرنگ شوقِ محبت کیا رنگ لایا ہے
اسی کے جوش نے دریا کا دریا یوں بہایا ہے
اگرچہ صحبت ناصح نے بھی سر کو پھرایا ہے
قلق نے کاوشیں کی ہیں الم نے جی کھپایا ہے
فلک نے سرد مہری سے تری کیسا ڈرایا ہے
سحر تک شام سے خوابیدہ طالع نے جگایا ہے
نہ سونگھی گر سنگھایا ہے تو عطر خس سنگھایا ہے
غم دوری تری فرقت میں کس کثرت سے کھایا ہے

غرض آ چک کہ میں بچ جاؤں اور مر جائے بن آئے
میسحا درد حسرت سے کہ کیا مُردہ جِلایا ہے

یہ طویل قطعات صرف اس مقصد سے یہاں نقل کیے گئے ہیں کہ ان سے مومن کی اُس حالت کی ہو بہو تصویر سامنے آجاتی ہے، جس سے وہ اپنے اس عشق میں دوچار ہوئے تھے۔ ان میں مبالغہ ضرور ہے لیکن اس کے باوجود وہ مومن کی اس کیفیت کو پوری طرح پیش کر دیتے ہیں جو عشق کی ناکامی نے اُن پر طاری کی تھی۔ ان میں طب کی تمام اصطلاحوں کا ذکر ہے۔ تمام امراض کا بیان ہے۔ لیکن مرضِ عشق کے سامنے ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ مومن نے اپنے عمِ بزرگوار کو ان دونوں قطعوں میں بہت بڑا طبیب بتایا ہے لیکن وہ بھی ان کے مرض کا علاج نہ کر سکے۔ کیونکہ اُن کے پاس عشق کی بیماری کا علاج نہیں تھا۔ ہاں وہ یہ جانتے ضرور تھے کہ مومن اُس بیماری میں گرفتار ہو چکے ہیں جس کو چھپانا انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ بہر حال مومن کے ان دونوں قطعات سے اُن کے اس عشق پر خاصی روشنی پڑتی ہے جس میں وقت کے ساتھ ساتھ بڑی شدت پیدا ہوتی گئی تھی، اور جس نے زندگی میں انھیں کسی کام کا نہیں رکھا تھا۔

اس عشق و عاشقی کی محرک در حقیقت مومن کے مزاج کی رنگینی اور اُن کی طبیعت کی لذت پسندی تھی لیکن حالات نے اُن کے عشق کو رنگینی اور لذت سے ہمکنار نہ ہونے دیا۔

اُن کے کلام کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ عشق میں ناکام رہے اور انھیں وہ سکون نہ میسّر آ سکا جو کامیابی اور کامرانی کے ہاتھوں نصیب ہوتا ہے۔ چنانچہ عشق کی یہ ناکامیاں اُن کے دل میں داغ بن گئی ہیں۔ اس کا سبب صرف عشق کی ناکامی ہی نہیں ہے، محبوب کی موت بھی ہے، جس کے بارے میں ایک مرثیہ بھی انھوں نے لکھا ہے۔ یہ مرثیہ اُن کے کلام میں موجود ہے۔ اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومنؔ کو اپنے محبوب کی موت کا غم بھی اٹھانا پڑا تھا۔ اگرچہ اس کا ذکر کسی تذکرے میں نہیں ہے کبھی اور ذریعے سے بھی مومنؔ کے محبوب کا مرنا ثابت نہیں ہوتا لیکن یہ مرثیہ پکار پکار کر کہتا ہے کہ یہ مومن کے دل سے نکلی ہوئی آواز ہے۔ یہ آواز زخمی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ لہو میں ڈوب کر نکلی ہے۔ یہ مرثیہ ضرور مومنؔ نے اپنی محبوبہ کی موت ہی پر لکھا ہے۔ اس کے صرف یہ دو بند اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں ؎

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج — آغوش رشک حلقہ اہل عزا ہے آج
برباد شور رعد ہوا آب اشک ابر — کیسا وفور شیون و جوش بکا ہے آج
جیتے رہے تو لال طمانچوں سے منھ کیا — تغییر رنگ شرم و خجالت فزا ہے آج
پانی کے بدلے منھ میں بھر آئے ہے لہو — لب کاٹنے میں ہائے کہاں وہ مزا ہے آج
مجھ کو نہ اپنے ساتھ عدم میں لئے گیا — ہر دم شکایت نفس نارسا ہے آج
آواز ہائے ہائے کی آتی ہے متصل — گردوں طلسم گنبد ماتم سرا ہے آج
اتنے کہاں حواس کہ تدبیر مرگ ہو — اپنی خبر نہیں مجھے کیا جانے کیا ہے آج
اے دل خبر لے نعرۂ شادی کو کیا ہوا — لب پر ہمارے نالہ واحسرتا ہے آج
بیٹے مجھے جو روئے وہ کہتے تھے بارہا — کیا روئیے اسی کا ہمیں بیٹنا ہے آج
اُترا بس گلے سے گھونٹ نہ آب حیات کے — دل آج زندگانی سے کتنا خفا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا
ماتم میں مر رہا ہوں میں یہ کون مر گیا

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جاں کو کیا ہوا — دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے — کیا جانے اُس کی زلفِ پریشاں کو کیا ہوا
پیتی ہے اپنا خونِ دلِ افسوس سے حنا — اس دستِ رشکِ پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا
شبنم کو پھر ہے جانبِ خورشید التفات — شرمندہ سازِ مہرِ درخشاں کو کیا ہوا
دل میں شکن ہے زلفِ مسلسل کدھر گئی — برہم ہے حال کاکُلِ پیچاں کو کیا ہوا
لذت فزا نہیں الم اس لب پہ کیا بنی — کچھ زخم بے مزا ہیں نمک داں کو کیا ہوا
بوئے قبائے یوسفِ گل ہے نسیم میں — اس کی شمیمِ عطرِ گریباں کو کیا ہوا
گردش پہ اپنی ناز ہے پھر روزگار کو — اس چشمِ رشکِ فتنۂ دوراں کو کیا ہوا
دعویٰ ہے شوخیوں کا غزالانِ دشت کو — اس خوش نظر کی جنبشِ مژگاں کو کیا ہوا
کتاں ہے سینہ چاک رُخِ ماہ دیکھ کر — اس روئے غیرتِ مۂ تاباں کو کیا ہوا

غیب و حجاب شمعِ رُخانِ جہاں گیا
وہ مہرِ آسمانِ نکوئی کہاں گیا

ان بندوں میں کتنی شدت ہے؟ ان کے ایک ایک لفظ سے کیسا درد ٹپکتا ہے؟۔

افسوس ہے اس کی تفصیل کہیں نہیں ملتی کہ یہ مرثیہ مومن نے کس کی موت پر لکھا ہے[1] بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ یہ کسی ایسے محبوب کا مرثیہ ہے جس کو مومن زندگی سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ امۃ الفاطمہ بیگم صاحب ہی کا مرثیہ ہو۔ مومن کی مثنوی قولِ غمیں سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ صاحب جی نے خودکشی کی۔ قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ بدنامی کے خیال اور رسوائی کے ڈر سے صاحب جی نے ضرور خودکشی کی ہوگی، اور اس سانحے نے مومن کی دُنیا کو اُجاڑ دیا ہوگا جیسا کہ اس مرثیے سے ظاہر ہے۔ اُن کے فارسی دیوان میں ایک قطعہ "تاریخِ وفات" کے عنوان سے ملتا ہے۔ اس سے اس واقعہ پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس میں محبوب کے رخصت ہونے کا ذکر ہے۔ اس کے بعد چونکہ اس کی کوئی خیر خبر نہیں ملی۔ اس لئے مومن

---

[1] مومن کے نواسے عبدالحی انصاری صاحب نے مومن کے جو حالات راقم الحروف کو لکھ کر بھیجے ہیں۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ پہلی بیوی کے مرنے پر نوحہ لکھا ہے جو کہ اُن کے دیوان میں موجود ہے اس پر جفائے چرخ کمن وا مصیبتا لیکن یہ بات کسی طرح صحیح ثابت نہیں ہوتی۔ عبادت

نے اس رخصت کو وفات ہی تصور کر لیا ہے۔ اور یہ چند شعر کہے ہیں ؎

تا رفتہ است دلبرِ من از دیارِ من | از درد و غم بہ حالتِ مُردن رسیدہ ام
آں آہوئے حرم کدۂ حسنِ یوسفی | از من رمیدہ است و من از خود رمیدہ ام
ہمراہ او نہ رفتہ ام از پاسِ عرضِ او | تا آنکہ راہِ دشت و بیاباں بریدہ ام
جلادیم کشتہ زبالینِ من گزشت | خوں باد جذبِ دل کہ بہ خوں در طپیدہ ام
اے تیرہ روسپہر رخ مہر و ماہ سیاہ | دیدی کہ روئے او دمِ رفتن نہ دیدہ ام
نے گفتہ ام بہ یار غم دل گداز خویش | نے حرف جاں فزا ز لبِ او شنیدہ ام
سوزم بہ داغِ ہجر ہمانا دلِ خودم | غلطم بہ خاک و خون مگر اشک چکیدہ ام
پژمردہ غنچہ ایست گل اخترم کہ گاہ | از باغ آرزو گل وصلے نہ چیدہ ام
نازم بہ سخت جانیٔ خود زندہ ام ہنوز | با آنکہ زہر تلخی ز ہجراں چشیدہ ام
بر پا قیامتے شد و جانم ز تن نہ رفت | صد بار صور نالہ و افغاں دمیدہ ام
واماندہ ام کجاست مقامِ نوائے اجل | صد رہ بجستجوئے تو ہر سو دویدہ ام
یارب چہ شاعری و چہ سنگیں دلی است ایں | گاہے ز ہیچ کس نہ شنیدم نہ دیدہ ام
بے درد مومن از پے تاریخ سر بہ جیب | بر داست و من ز درد گریباں دریدہ ام

تاریخ تخرجہ بہ خیالش رسید و من
در سینہ چاک از غم دوری کشیدہ ام[۱]

اس قطعے میں جس آہوئے حرم کدہ حسن یوسفی کا ذکر ہے اور جس کو مومن نے 'دلبرِ من' کہا ہے۔ وہ ضرور امۃ الفاطمہ بیگم صاحب ہے جس کو اس عشق نے دلّی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ مومن اس کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن اُس کے منع کرنے کی وجہ سے ایسا کرنے سے باز رہے۔ چلتے وقت انھیں اس کی صورت تک دیکھنی نصیب نہ ہوئی، اپنے غم دل گداز تک کو اُس کے سامنے پیش کرنے کا موقع نہ ملا۔ اُس کے لب سے ایک حرف جاں فزا بھی نہ سن سکے۔ اور ہجر میں تڑپنا، خاک و خوں میں لوٹنا اور آنسو بہانا اُن کا مقدر بن گیا۔ جب تک وہ زندہ رہے اُس کی طرف سے

[۱] مومن: دیوان فارسی: ص۱۳۰

نامہ و پیام کا آنا تو درکنار، اس کی خبر خبر تک نہیں ملی اور مومن نے یہ سمجھ لیا کہ یا تو وہ مرگئی یا اس نے خود جان دے دی۔ اور اگر بالفرض وہ زندہ بھی رہی تو کم از کم مومن کے لئے زندہ نہ رہی یہی واقعہ اس مرثیے کا محرک معلوم ہوتا ہے۔ جو ان کے اردو دیوان میں موجود ہے اور فارسی کا یہ قطعہ اس خیال کو تقویت پہنچاتا ہے۔

غرض عشق و عاشقی کے یہ معاملات مومن کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ تمام زندگی وہ ان کے اثرات سے دامن نہ چھڑا سکے۔ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں کو ان حالات نے متاثر کیا ہے۔

(۶)

مومن کی زندگی میں عشق و عاشقی کا یہ رنگ ہمیشہ نمایاں رہا لیکن اس کے باوجود انھوں نے بڑی حد تک ایک متوازن زندگی بسر کی۔ وہ عام انسانوں کی طرح جئے۔ انھوں نے شادی کی۔ گھر بسایا۔ اولاد کی پرورش اور دیکھ بھال میں پیش پیش رہے اور ان سے ہمیشہ محبت کا برتاؤ کیا - ان تمام باتوں سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی گھریلو زندگی خاصی خوشگوار تھی اور وہ اس اعتبار سے بڑی حد تک مطمئن تھے۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ مومن نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی شادی کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں ہوئی۔ ان کے نواسے عبدالحی انصاری بھی یہی لکھتے ہیں کہ "ان کی پہلی شادی معلوم نہیں کہاں ہوئی تھی"[۵] بعض لوگوں سے سنا ہے کہ یہ شادی سردھنہ کے کسی خاندان میں ہوئی تھی۔ ان سے مومن کے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ کوئی اولاد بھی پہلی بیوی سے نہیں ہوئی۔ بہت ممکن ہے تعلقات کی کشیدگی کا سبب بھی یہی ہو۔ اسی عالم میں یا تو ان کا انتقال ہوگیا یا وہ زندگی بھر مومن سے علیحدہ رہیں۔ بہر حال اس سلسلے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کہی جا سکتی کیونکہ تمام تذکرے اس موضوع پر خاموش ہیں۔ اور خود مومن نے اس کی طرف کہیں کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس لئے مومن کی پہلی شادی کے حالات ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ اور ان کے بارے میں تفصیلات کا علم کسی کو نہیں ہے۔

---

[۵] مولوی محمد عبدالحی انصاری کا خط راقم الحروف کے نام

البتہ کلب علی خاں فائق نے انشائے مومن کے حوالے سے۔ جو کچھ لکھا ہے اُس سے اُن کی اس شادی پر کچھ روشنی ضرور پڑتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

مومن کے سوانح نگار اس امر پر متفق ہیں کہ اُن کی ایک ہی شادی خواجہ محمد نصیر کی دختر سے ہوئی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مومن کی روایات کو بھی نظر انداز کر دیا۔ انشائے فارسی میں شیخ غلام علی ضامن کرم (شاگرد مومن) کے نام ایک خط موجود ہے جس میں مومن کی پہلی شادی کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کے بعد خواجہ محمد نصیر کی دختر سے شادی ہوئی ہے بیان مومن قابل غور ہے۔

"رقعہ بنام ہمیں بزرگ (کرم) در جواب انداز نامہ بہ خبر خانہ رسیدن واز شکایت زن و پدرش گردیدن اگر انصاف باشد ازیں نسبت کہ من دخترش را بعقد آوردہ ام تا روز جزا جز فخر و مباہات سخنے بر زبان نیارد۔۔۔۔۔۔
ہیہات ہیہات کہ بایں علو شان ہامشتے خاشاک مے ساختم"۔ (انشائے مومن)

وہ دو تین ماہ سسرال میں رہ چکے ہیں (خسر عظیم اللہ بیگ کمیدان ساکن سردھنہ) نے خط میں سردھنہ کی مذمت کی ہے اور قیام کا حوالہ دیا ہے عظیم اللہ بیگ نے کرم سے مومن کی والدہ کی نسبت کچھ شکایت کی ہے۔ مومن ناراض ہو کر لکھتے ہیں:۔

"طعن نسبت بہ جناب والدہ مکرمہ معظمہ نمودن، زبان بہ مذمت مریم علیہا السلام کشودن است عظیم اللہ بیگ کہ پایۂ افتخارش جز بہ منصب کمیدانی ہیچ نیست ۔۔۔۔۔ دو سہ ماہ کہ بہ نادانی و سادہ دلی مرتکب جریمہ بہ نا اہلاں ساختن گردیدم از ہیچ کس جز ملامت و نفریں نہ شنیدم۔ اکنوں کہ فارغ البال و خوش حالم۔ خدا نہ کردہ بہ مصیبت خود را گرفتار نمایم در بہ مجلس از عقل ہزار مرسخ دور افتادگان در آیم مصرع من جرب المجرب حلت بہ الندامۃ۔۔ بہ یۂ مثنے وثلث و ربع خواندہ ام و معنی آں از اساتذہ بہ تحقیق رساندہ، اگر از حرام توبہ کردہ ام حلال نہ گزاشتہ ام، واگر پائے از ہر زہ گردی برداشتہ ام و چوں از جہلائے نابکار رنجہا کشیدہ ام، و پیوستن دہاقین بداطوار مصیبت ہا دیدہ ام، سر آں

دارم کہ با ہمچو عالی خاندانے فلک شکوہے وصلت نمایم، وچشم تماشا طلب
بہ دیدار خوش نسبے زہرہ گوہرے کشایم، ورنہ از ہر دو سہ جا پیغام تناکح برزبان۔"

آگے چل کر مومن لکھتے ہیں کہ عظیم اللہ خاں (خسر مومن) سعد قلی خاں بہادر کے متوسلین سے تھا اور سعد قلی خاں ہمارے خاندان کے غلاموں میں سے ہیں ۔۔ غالباً مومن کی یہ شادی حکیم غلام نبی خاں کے انتقال (۱۲۴۱ھ) کے بعد ہوئی اور شیخ غلام علی ضامن کرم کی کوشش سے ہوئی تھی اور اسی وجہ سے انھوں نے مصالحت کی کوشش کی۔ مومن کی بیوی دیہاتی تھی۔ کہاں دہلی کی اعلیٰ مجلس اور کہاں یہ غریب دیہاتن۔ پھر ساس کی سرزنش۔ آخر دہلی کے قید خانے سے یہ بھولی بھالی بھاگ نکلی۔ ماں باپ سے جاکر شکایت کی۔ انھوں نے درمیانی شیخ غلام علی ضامن کرم کو بیچ میں ڈالا، اور مومن کو ایک ناصحانہ خط لکھوایا جس میں مومن کی والدہ کے رویّے کی شکایت تھی۔ اور مطالبہ کیا کہ مومن اپنی بیوی کو آکر لے جائے۔ اس کے جواب میں مومن نے جو اپنی متلون طبیعت سے مجبور تھے، سرھنہ جانے سے انکار کر دیا۔ اور عظیم اللہ بیگ کے سرپرست سعد قلی خاں کو اپنے خاندان کا غلام بتایا اور یہ بھی طعنہ دیا کہ میں نے حرام سے توبہ کی ہے نہ کہ حلال سے۔ اور دو تین اور چار بیویاں رکھنے کا استدلال قرآنِ عظیم سے پیش کیا۔ پھر یہ بھی ظاہر کیا کہ دو تین خاندانوں میں سے پیغام آرہے ہیں۔ اب کسی اونچے خاندان میں شادی کا ارادہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پہلی شادی ناکام رہی، کوئی اولاد اس بیوی سے ہوئی یا نہیں۔ یہ امر پایۂ تحقیق کو نہ پہنچ سکا۔[۵۱]

مومن کی دوسری شادی خواجہ میر دردؔ کے خاندان میں ہوئی۔ ان کی دوسری بیوی میر محمد نصیر محمدی خلف میر کلو نبیرہ وسجادہ نشین خواجہ میر دردؔ کی صاحبزادی تھیں نور الحسن نے طور کلیم میں میر محمد نصیر کے تذکرے میں لکھا ہے کہ "میر محمد نصیر محمدی خلف میر کلو نبیرہ وسجادہ نشین میر درد علیہ الرحمہ۔ مومن خاں با وے نسبت خویشی ودامادی داشت"[۵۲]۔ ان کا نام انجمن النساء بیگم تھا۔ سید ناصر نذیر فراق میخانہ دردؔ میں لکھتے ہیں "انجمن النساء بیگم صاحبہ

---

۵۱ کلب علی خاں فائق: حیات مومن: اورینٹل کالج میگزین: نومبر ۱۹۵۹ء ص ۷۹-۸۱
۵۲ نور الحسن: طور کلیم: ص ۱۱۱

کی شادی حکیم مومن خاں صاحب سے ہوئی جو مشہور شاعر تھے[۵۱]۔ ضیا احمد بدایونی نے لکھا ہے کہ "مومن کی شادی دہلی کے نامور خاندان ارشاد و ہدایت یعنی خواجہ میر دردؒ کے گھرانے میں ہوئی تھی۔ اُن کے خسر خواجہ محمد نصیر خواجہ میر دردؒ کے نواسے اور اُن کی خوشدامن میر درد کی پوتی تھیں[۵۲]"۔ مومن کے خسر خواجہ محمد نصیر رنج بڑی خوبیوں کے آدمی تھے۔ کریم الدین نے اُن کے متعلق اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ "رنج تخلص میر محمد نصیر جو کہ نواسے اور سجادہ نشیں خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے تھے۔ یہ صاحب بہت نیک خصلت زیبا منظر، پاکیزہ خو، خندہ رو، کشادہ پیشانی، خوش زندگانی، یار باش، توکل پر معاش فہم درست، شعر تیز، طبع رواں اُس کی سے جاری ہوتے تھے۔ اور ہر ایک شخص سے عموماً شیریں زبانی سے پیش آتے تھے، اور اس شہر میں معروف و مشہور بہت تھے۔ ہر ایک شخص ان کو جانتا ہے۔ دو تین دفعہ راقم کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ بہت شفقت اور مہربانی سے پیش آئے۔ ہر دوسری تاریخ مہینے کو مجلس راگ کی اُن کے ہاں ہوا کرتی تھی، اور علم موسیقی میں ان کو بہت کمال تھا۔ یعنی اس شہر میں ہمارے زمانے میں کوئی بجز اُن کے اس علم سے اتنا واقف نہ تھا جتنے کہ وہ تھے۔ عمر اُن کی ساٹھ سے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ ہوگی۔ دوسری شوال کے مہینے ۱۲۶۱ھ ہجری کو وفات پائی۔ اون کے سجادہ نشیں بالفعل اون کے نواسے ہوئے۔ کیونکہ اون کے خاندان میں کوئی بجز اون کی اولاد کے مسند توکل پر نہیں بیٹھ سکتا۔ الّا وہ کہ اون کی نسل سے ہو۔ اور وہ نہیں تھا مگر ایک نواسہ جو علم سے بہرہ رکھتا تھا۔ وہ مسند نشیں ہوا[۵۳]۔ بہرحال انھیں خواجہ محمد نصیر رنج کی بیٹی سے مومن کی شادی ۱۲۵۹ھ سے قبل ہوئی۔

مومن کے یہاں انجمن النساء بیگم کے بطن سے دو اولادیں ہوئیں۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکی کی تاریخ ولادت ۱۲۵۹ھ ہے۔ اس کی پیدائش کی تاریخ خود مومن نے کہی ہے جو اُن کے کلیات میں موجود ہے ؎

---

۵۱ سید ناصر نذیر فراق: میخانۂ درد: ص۲۰۳

۵۲ ضیا احمد بدایونی: مقدمہ دیوان: ص۲۷

۵۳ کریم الدین: طبقات الشعراء: ص۳۳۳

دختِ روشن رواں ہوئی پیدا — کیا ہی چمکا ہے اخترِ مومن
نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے — کہی تاریخ دخترِ مومن

۱۲۵۹ھ

اُن کی اس بیٹی نے لمبی عمر پائی۔ "نگار" کے مومن نمبر میں سیدامتیاز احمد نے غلط لکھ دیا ہے کہ اس لڑکی نے صرف چار برس کی عمر پائی۔ تاریخ وفات ملاحظہ ہو:۔

خاک بر فرقِ دولتِ دنیا — من فشاندم خزانہ بر سرِ خاک[۵۱]

یہ تاریخ مومن کے فارسی دیوان میں موجود ہے، اور یہ اُن کی لڑکی کی تاریخ وفات نہیں۔ بلکہ لڑکے کی تاریخ وفات ہے۔ اصل اشعار یہ ہیں :۔

بخت بد بیں کہ سیمتن پسرم — کرد چوں گنج جائے در بر خاک
مگر از بہر سالِ مُردنِ او — کلکِ مومن نوشت در بر خاک
خاک بر فرقِ دولتِ دُنیا — من فشاندم خزانہ بر سرِ خاک[۵۲]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ امتیاز احمد کو اس سلسلے میں کچھ غلط فہمی رہی۔ مومن کی بیٹی جن کی تاریخ ولادت انھوں نے لکھی ہے عرصے تک زندہ رہیں۔ اُن کا نام محمدی بیگم تھا۔ سیّد ناصر نذیر فراق نے میخانۂ درد میں لکھا ہے "انجمن النسا بیگم کی شادی حکیم مومن خاں صاحب سے ہوئی جو مشہور شاعر تھے اور انجمن النسا بیگم کے بطن سے خواجہ احمد نصیر خاں اور ایک دختر بی محمدی بیگم صاحبہ پیدا ہوئیں، جن کی تاریخ مومن خاں نے یہ کہی ہے[۵۳]"۔ ان کی شادی پورب میں ہوئی۔ مولانا ضیا احمد بدایونی نے لکھا ہے: "مومن مرحوم کی بیٹی کا عقد مولوی عبدالغنی وکیل سیتاپور سے ہوا۔ یہ وہی صاحبزادی ہیں جن کی تاریخ ولادت مومن نے کہی تھی[۵۴]۔" اس شادی کی تفصیل مولوی محمد عبدالحی صاحب نے راقم الحروف کو لکھ کر بھیجی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :۔

"دوسری شادی آپ کی (مومن خاں کی) حضرت خواجہ میر دردؒ کے

---

۵۱ رسالہ نگار: مومن نمبر: ص۱۸ — ۵۲ مومن: دیوان فارسی: ص۱۴۶
۵۳ ناصر نذیر فراق: میخانۂ درد: ص۲۰۳ — ۵۴ ضیا احمد بدایونی: مقدمہ دیوان مومن: ص۲۷

خاندان میں ہوئی۔ آپ کو شاہی وقت میں کچھ گاؤں ضلع غازاہیں ملے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کی بیوی احمدی بیگم تحصیل وصول کے لیے جایا کرتی تھیں ان کے بطن سے ایک صاحبزادے جن کا نام احمد نصیر تھا اور ایک دختر جن کا نام محمدی بیگم تھا، پیدا ہوئی تھیں (پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی) جس زمانے میں آپ کی بیوی غازا تحصیل وصول کے لئے جایا کرتی تھیں، اُس وقت میں آپ کے صاحبزادے اور لڑکی دونوں ہمراہ ہوتے تھے۔ اُس زمانے میں میرے دادا حضرت مولانا فصیح صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کرامتوں کا چرچا اُس اطراف میں بہت پھیلا ہوا تھا۔ اس وجہ سے محمدی بیگم صاحبہ اُن سے جا کر غازی پور میں بیعت ہوئیں اور پھر دہلی آئیں۔ شاہ محمد فصیح صاحب کے بھتیجے مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم بھی دہلی دیکھنے کے شوق میں آپ کے ساتھ ساتھ دہلی چلے گئے۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد حضرت مولانا فصیح صاحب بھی دہلی گئے، اور بیگم صاحبہ کی لڑکی محمدی بیگم سے اُن کا عقد کر دیا۔ چونکہ مولوی عبدالغنی صاحب مرحوم و مغفور ضلع سیتاپور میں وکالت کرتے تھے، اس لئے وہ اپنی بیوی اور سالے کو لے کر سیتاپور آگئے۔ باقی حال آپ کو ڈائری کے اوراق سے ملے گا۔"

اور ڈائری کے جو اوراق مجھے بھیجے ہیں اُن میں اسی واقعے کو اس طرح بیان کیا ہے:-

"اُن کے (مومن خاں کے) انتقال کے بعد بیگم صاحبہ آرا بیا جگدیش پور میں جو مواضعات اُن کے خاندان میں ملے تھے تحصیل وصول کو جاتی تھیں۔ وہاں اس وقت ہمارے دادا مولانا محمد فصیح صاحب کے فضل و کمال کا شہرہ تھا۔ اُن سے مرید ہو گئیں صاحب زادی محمدی بیگم اور صاحبزادے احمد نصیر ساتھ تھے۔ میرے والد کی پہلی شادی ہو چکی تھی اور وکالت کا امتحان بھی پاس کر چکے تھے۔ پہلی شادی اُن کی پسند کی نہ تھی یا یوں کہیے کہ اُنھوں نے دہلی کی بیگم صاحبہ کو دیکھ لیا تھا۔ اب دیہات نرکایہ

کی پلی ہوئی عورت کیسے پسند آتی۔ والد صاحب بھی دہلی کی سیر کے بہانے بیگم صاحبہ کے ساتھ دہلی آگئے اور یہیں رہنا سہنا شروع کردیا۔ دادا صاحب مرحوم کو اس کا خیال ہوا۔ صاحب کشف وکمال تھے۔ فوراً دہلی روانہ ہوئے اور فوراً بیگم صاحبہ کی بیٹی محمدی بیگم سے عقد کردیا۔ پھر والد نے اعظم گڈھ کی وکالت چھوڑ دی اور سیتاپور چلے آئے۔"

غرض ماحصل ساری تفصیل کا یہ ہے کہ مومن کی صرف ایک لڑکی تھی جس کا نام محمدی بیگم تھا۔ اس کی شادی شاہ محمد فصیح صاحب کے صاحبزادے مولوی عبدالغنی صاحب کے ساتھ ہوئی۔ اُن کی اولاد میں مولوی عبدالحئی صاحب ہیں جن کا قیام ان دنوں لالوکھیت کراچی میں ہے اور جنھوں نے مندرجۂ بالا حالات لکھ کر راقم کو بھیجے ہیں۔

اس لڑکی کے علاوہ مومن کے کئی اور لڑکے ہوئے۔ ان میں کچھ زندہ رہے کچھ مر گئے اُن کی پیدائش اور وفات کی تاریخیں مومن نے کہی ہیں جو اُن کے فارسی دیوان میں موجود ہیں۔ پیدائش کی تاریخیں یہ ہیں ؎

مادر خوبی پدر گلاب است — فرزندِ گل جنانِ خوبی
تاریخ تولدش نوشتم — نوبادۂ گلستانِ خوبی

خلفے دادہ اند مومن را — کہ سزاوارِ دولت در شدہ است
گر تو سالِ ولادتش پرسی — گل گلزار دولت در شدہ است[1]

ما گل آورد شاخ امیدم — روز نوروز آخر سال است
وے برائے من است فروردین — عہد جوشِ بہارِ آمال است
از سپہرم رسید مہمانے — کہ بہ یمنِ قدم عدو مال است
بر بہیش دولتے ہمی آید — دل گواہ نکوئی فال است

---

[1] مومن : دیوان فارسی : صـ۱۳۲

بلبلم باغبان عالم را | نغمہ سنج سپاس افضال است
بارور گشتہ نخلہائے مراد | لذت از پختگی فزوں بال است
پسرم دادہ اند سالِ وجود | نوگل باغ جاہ و اقبال است[۱]

اور وفات کی تاریخیں یہ ہیں :۔

جگر گوشۂ ما بہ کنج لحد | اماں از جہانِ پُر آفات یافت
دو سال اندر آغوش ام و پدر | ستم دید و پاس مکافات یافت[۲]

سخت بد بیں کہ سیمتن پسرم | کرد چوں گنج جائے در بر خاک
مگر از بہر سالِ مردنِ او | کلکِ مومن نوشت بر در خاک
خاک بر فرق دولتِ دنیا | من فشاندم خزانہ بر سر خاک[۳]

ان تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کے کئی اولادیں ہوئیں۔ ان میں سے زیادہ لڑکے تھے۔ ایک لڑکی کی ولادت پر بھی انھوں نے اُردو میں تاریخ کہی تھی جو پہلے درج کی جا چکی ہے۔ یہ تاریخیں اس بات کی بھی شاہد ہیں کہ مومن کو اپنی اولاد سے بڑا لگاؤ تھا اور وہ اُن سے بڑی محبت کرتے تھے یہی سبب ہے کہ اُن کی پیدائش کے مواقع پر تو وہ اس قدر خوش ہوتے ہیں، اور ان کی موت پر انھیں اتنا غم ہوتا ہے۔

مومن کے کئی بیٹے عرصے تک زندہ رہے۔ ان میں احمد نصیر خاں مشہور رہیں۔ آبِ حیات میں بھی ان کا ذکر ہے۔ عرش لکھتے ہیں کہ مومن کا جب انتقال ہوا ہے تو اُن کے صاحب زادے احمد نصیر خاں چھ سات سال کے تھے۔ بعد مومن ان کی تعلیم نانہالی رشتہ داروں کے طفیل میں ہوئی۔ آدمی بہت ذہین تھے۔ بارہ برس کی عمر میں حافظ ہوئے۔ اُس وقت کے ایک مشہور عالم مولوی عبدالرب صاحب تھے۔ جن کا وعظ سننے کے ساتھ یہ دہرا دیتے تھے۔ ہزاروں شعر عربی فارسی کے اُن کو یاد تھے۔

۱؎ مومن : دیوان فارسی : ص۱۳۵ ۲؎ مومن : دیوان فارسی : ص۱۴۶
۳؎ مومن : دیوان فارسی : ص۱۴۶

مگر طبیعت موزوں نہ تھی، اور اسی سبب سے ان کو باپ کے خوان نعمت سے جو حصل شئ تھی نہ ملی ___ گورے آدمی سر پر گھونگر والے بال۔ بدن میں ململ کا انگرکھا ہوتا تھا۔ ان کو لالٹینوں سے بڑا شوق تھا۔ اپنا دل خوش کرنے کو مختلف رنگ کے شیشوں سے انھیں سجاتے تھے اور شب کو روشن کرتے تھے۔ بیخود کے ماموں ننھے خاں صاحب کے یہاں حالی مرحوم کی اور اُن کی نشست تھی پچاس برس کی عمر میں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کے دنیا سے کوچ کیا۔[۱] عرش نے مومن کے ایک اور لڑکے عبدالوہاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو عربی فارسی کی تعلیم کے بعد فقر کی طرف رجوع ہوئے۔ ان پر عرصے تک جذب کی کیفیت طاری رہی اور اسی عالم میں انتقال کیا۔

جب تک مومن زندہ رہے اُنھوں نے اپنی اولاد کی صحیح طور پر دیکھ بھال کی اور ان کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ لیکن چونکہ وہ زیادہ عرصے تک زندہ نہ رہے اس لیے اُن کی طرف خاطر خواہ توجہ کرنے کا اُنھیں موقع نہ ملا بہر حال مومن کی خانگی زندگی خاصی خوش گوار تھی۔ اُنھوں نے اپنی اس زندگی کی ذمہ داریوں کو بھی محسوس کیا اور باوجود اپنی رندی کے حتی الامکان ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتے رہے۔ مومن کی زندگی کا یہ بھی ایک اہم پہلو تھا۔

(۷)

اس میں شبہ نہیں کہ مومن کی زندگی کا زیادہ حصہ رندی، شاہد بازی اور عشق و عاشقی کی نذر ہو گیا لیکن اس کے باوجود جس طرح انھوں نے اپنی گھریلو زندگی میں خاطر خواہ دلچسپی لی، اسی طرح زندگی کے مذہبی اور روحانی پہلوؤں سے بھی وہ بے پروا نہیں رہے۔ وہ خاصے مذہبی آدمی تھے اور انھیں مذہب سے گہری دلچسپی تھی۔ اُن پر اُس زمانے کے علماء اور مذہبی مفکرین کا گہرا اثر تھا۔ جیسا کہ اس سے قبل اُن کے بچپن کے حالات اور تعلیمی زندگی کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے لکھا جا چکا ہے وہ چھوٹی ہی عمر میں شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ کے زیر اثر آئے۔ ان کے مدرسے

---

[۱] عرش گیاوی: حیات مومن: ص ۸۷

میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ اور اُن کے وعظ بھی سُنے۔ ان دونوں بزرگوں سے اُنھیں حد درجہ عقیدت تھی، کیونکہ وہ بہرحال مومنؔ کے اُستاد تھے۔ اس کا اظہار اُن قطعات تاریخ سے ہوتا ہے جو انھوں نے اُن کی وفات پر لکھے ہیں اور جو اُن کے اُردو کلیات میں موجود ہیں۔ ان قطعات کو اس سے قبل نقل کیا جا چکا ہے۔

مومنؔ کی جوانی اگرچہ خاصی دیوانی تھی لیکن اس کے باوجود وہ دین و مذہب سے علیحدہ نہ رہ سکے۔ چنانچہ عہد شباب کی ہنگامہ آرائیوں کے باوجود انھوں نے بعض علما، اور بزرگانِ دین سے تعلقِ خاطر رکھا۔ آب حیات میں لکھا ہے کہ "نیک خیالوں سے بھی اُن کا دل خالی نہ تھا۔ نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسمٰعیل صاحبؒ کے پیر تھے۔ انھیں کے عقائد کے بھی قائل رہے"[۱]۔ عرشؔ گیاوی نے اپنی کتاب حیاتِ مومنؔ میں ان کے مذہبی عقائد پر بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مولانا سید احمدؒ بریلوی کے مرید ہونے کے باوجود وہ وہابی نہیں تھے بلکہ حنفی تھے۔ یہاں اس بحث میں پڑنا مناسب نہیں۔ یہاں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ مومنؔ کو مذہب اور مذہبی معاملات سے دلچسپی رہی کیونکہ ان کا ماحول خاصا مذہبی تھا۔ مولانا ضیا احمدؒ بدایونی نے ٹھیک لکھا ہے کہ "جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی، اس کا اقتضا یہ تھا کہ ان کو مذہب سے خاص شغف ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شاہ صاحب کے مذہبی اور علمی خاندان سے اُن کے تعلقات لمبے ہے۔ خود مولوی محمد اسمٰعیل اُن کے ہم سبق و ہم جلسہ تھے۔ اس لئے اگر مومنؔ اُن کے ہم خیال تھے تو تعجب کی بات نہیں، تاہم اُن کی طرح متشدد اور متقشف نہ تھے۔ متعدد تذکرے متفق ہیں اور خود اُن کے اشعار مؤید ہیں کہ وہ ہمیشہ عمل بالحدیث کے قائل اور کتاب و سنت پر عامل رہے"[۲]۔ بہرحال مومن ایک مذہبی آدمی تھے اور اُس زمانے کی اہم مذہبی شخصیتوں سے انھیں تعلق خاطر تھا۔ چنانچہ ان میں سے بیشتر کے ساتھ وہ کسی نہ کسی طرح متعلق رہے ہیں اور ان سے اظہار عقیدت بھی کیا ہے۔

---

[۱] آزاد: آب حیات: ص ۳۲۴ — [۲] ضیا احمد بدایونی: مقدمہ دیوان مومن: ص ۳۰

مولانا سید احمدؒ بریلوی اس وقت کے بہت بڑے عالم باعمل تھے۔ ان کی شخصیت نے مومن کو بہت متاثر کیا ـــــ اور جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے وہ نوجوانی ہی میں اُن کے مرید ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اسلام کو پھیلانے اور کافروں اور ملحدوں کی بیخ کنی کے لئے جو کام کیا ہے اُس کی وجہ سے مومن کے دل میں اُن کی بڑی عزت تھی۔ ایک قطعے میں جس کا عنوان "ایمان تازہ کردن شہور وسنین بدست امیرالمومنین ابن امیرالمومنین ہے" مومن نے مولانا سید احمدؒ سے بڑی گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں ؎

جو سید احمد امام زماں و اہل زماں	کرے ملاحدِ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سالِ وغا	خروجِ مہدیٔ کفار سوز کلک تفنگ[۱]

۱۲۴۲ھ

ایک دوسرے قطعے میں کہتے ہیں ؎

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ	کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیم کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمدؒ	کہ محض مقتدیٔ سُنّتِ پیمبرؐ ہے
زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعویٔ نور	کہ اُس کا رایتِ اقبال سایہ گستر ہے
عروجِ سنگ درِ قصر جاہ یہ کہ جسے	ہزار طعن حضیض اوجِ لامکاں پر ہے
زبس کہ کام نہیں ہے اُسے سوائے جہاد	جو کوئی اُس سے مقابل ہو سو وہ کافر ہے
شرف ہے مہر کو اُس کے زمانے سے دائم	زبس کہ روز و شب انصاف سے برابر ہے
وہ بادشاہ ملائک سپاہ کوکبِ دیں	کہ نورِ شمس و قمر جس کی گردِ لشکر ہے
وہ شعلہ خصلتِ الحاد سوز کفر گداز	کہ جس کا نقش قدم مہرِ روزِ محشر ہے
وہ برق خرمنِ اربابِ شرک اہلِ ضلال	کہ شعلہ خوشۂ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ قہرمانِ فلک توسن و نجوم حشم	کہ ترک چرخ غلام اس کا مہر چاکر ہے

وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جس کا سالِ خروج
امام برحق مہدی نشان علی فر ہے[۲]

۱۲۴۲ھ

---

[۱] کلیاتِ مومن : ص ۱۸۳
[۲] کلیاتِ مومن : ص ۱۸۴

فارسی دیوان میں بھی ایک قطعہ ہے جس میں مولانا سید احمدؒ کے معرکۂ جہاد کا ذکر کر کے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ز کہسار آمد بسلخِ رجب — زہے روزگارِ سعادت قریں
رسولے چو ابرِ کرم قطرہ زن — رسولے چو بادِ بہار آفریں
بفیضِ بشارات بلبل نوا — ز تاثیرِ شگفتگی گل چنیں
کلامش چو مرغِ چمن جاں نواز — خرامش چو کبکِ دری دلنشیں
بہ لب مژدۂ زندگی بخشِ دل — بدم چارہ فرمائے جانِ حزیں
بہ کف نامۂ جاں فزائے کزاں — حیاتِ امامِ زماں شد یقیں
کشاید جہاں چوں بہ بند دکمر — بہ بند دعدو چوں کشاید کمر
ز جولانِ اسپش بہ میدانِ جنگ — چو گردوں بہ جنبش درآید زمیں
بایں نامِ نیک و بایں دست زور — کند ہفت اقلیم زیرِ نگیں
نیازش بہ لشکر نہ حاجت بہ زر — خدا ناصر است و پیمبر معیں
چو از بہرِ تاریخ فکرِ بلند — برآمد فرازِ سپہرِ بریں
شنیدم بآخر مہ و وسطِ سال — از ایزد واں بشری المومنین
ہم از حرفِ اعداد و اعداد حرف — چو کردم شمارِ شہور و سنیں
بہ مطلب رسیدم کہ در فنِ شعر — چنانم کہ کمتر بود ایں چنیں
بریدم سرِ طاغی و حاسدش — زہ حرفِ ملفوظے این است ایں
سخن سنجم و نیز مومن یکے است — بسحرِ حلال من اعجازِ دیں
ہر آں کس کہ ایں قطعہ را خوش نہ کرد — خود از نسلِ شیطاں بود آں لعیں
کہ دستم فرستاد صدرہ درود — ملک گفت بر من ہزار آفریں[۱]

اور مثنوی بمضمونِ جہاد میں اپنے پیر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا — کہ جو پیرو اُس کا ہے سو پیشوا

---

[۱] مومن: دیوان فارسی: ص ۱۴۲-۱۴۳

وہ نورِ مجسّم وہ ظلِ الٰہ — کہ سایے سے جس کے خجل مہر و ماہ
زہے سیّد احمدؒ قبولِ خدا — سر اُمتانِ رسولِ خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف — علیؑ و حسینؑ و حسنؑ کا خلف
ہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات — ہے کفّار کی موت اُس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اُسے — سرِ قتلِ کفّار آیا اسے[۱]

ان قطعات سے صاف ظاہر ہے کہ مومنؔ نے محض رسمی طور پر مولانا سیّد احمدؒ بریلوی رح سے بیعت نہیں کی تھی۔ وہ واقعی اس مجاہدِ اعظم کی اہمیت کو محسوس کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ مومنؔ دل سے مسلمان تھے اور اُن کے دل میں پرچم اسلام کو سربلند کرنے کا خیال موجزن تھا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ خود اپنے پیر کی تحریک جہاد میں عملی طور پر حصہ نہ لے سکے لیکن اُنھوں نے ساری زندگی اس اس آرزو کی شمع اپنے دل میں فروزاں رکھی۔

آخر عمر میں مومنؔ پر مذہب کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ کریم الدین جو انھیں بہت قریب سے جانتے تھے اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں "ابتدا میں تمام اوقات شعر گوئی اور لہو و لعبِ دنیا میں صرف کر کے تمام مزے عیاشی کے اُٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر بھی کہنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر کمال عنایت فرماتے ہیں۔ اکثر شام کو شہر کی سیر کرتے ہیں۔ اب پابند نماز روزہ کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں"[۲] اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مومنؔ نے جوانی کا زمانہ اگرچہ لہو و لعب میں گزارا لیکن جلد اس سے توبہ کر لی۔ اس میں کچھ تو ان کی ناکامی عشق کو دخل ہوگا، اور کچھ اُس زمانے کے علمی، عملی اور دینی ماحول کے اثر سے بھی وہ ایسا کرنے کے لئے مجبور ہوئے ہوں گے۔ ویسے جوانی میں بھی وہ مذہب سے برگشتہ نہیں تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ مولانا سیّد احمدؒ بریلوی کے مرید نہیں ہو سکتے تھے اور ان کی تحریک جہاد سے انھیں اتنی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ کریم الدین کے بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ صوم و صلوٰۃ کے خیال کو اُنھوں نے دل سے تو کسی زمانے میں بھی نہیں نکالا۔

---

[۱] کلیاتِ مومنؔ : ص ۴۱۸
[۲] کریم الدین طبقات الشعراء : ص ۴۴۴

البتہ آخر عمر میں چونکہ اُن پر مذہب کا اثر بہت بڑھ گیا تھا، اور لہو و لعب کی زندگی سے اُنھوں نے توبہ کرلی تھی۔ اس لئے صوم وصلوٰۃ کے زیادہ پابند ہو گئے تھے۔

غرض یہ کہ مومنؔ کی زندگی میں مذہب کا خاصا اثر تھا اور وہ اپنے زمانے کے اچھے خاصے مذہبی آدمی تھے۔ مذہبی معاملات ومسائل پر غور وفکر کرنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا اکثر اس زمانے کے علماء سے ان مسائل کے مختلف پہلوؤں پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے اور نوبت مناظرے تک جا پہنچتی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہ مولانا سید احمدؒ بریلوی کے مرید تھے، اور انھیں اس زمانے کی وہابی تحریک سے دلچسپی تھی۔ اس لئے وہ بدعت کو ناپسند کرتے تھے۔ کتاب وسنت پر عمل کرنا اُن کا ایمان تھا، اور وہ عمل بالحدیث کے قائل تھے۔ اُس زمانے کے بہت بڑے عالم مولانا فضل حق خیرآبادی تھے، اسلامی علوم میں اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ مومنؔ کے ان سے مراسم تھے لیکن جہاں تک عقائد کا تعلق ہے آپس میں شدید اختلاف تھا۔ چنانچہ اکثر اُن سے بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور نوبت مناظرے تک پہنچ جاتی تھی۔ ایک بار اُن سے گرما گرم بحث ہو گئی۔ اور اس کی وجہ سے کچھ عرصے تعلقات کشیدہ رہے لیکن مولانا فضل حق نے انھیں منالیا اور بالآخر صلح ہو گئی۔[۱] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی معاملات میں وہ کس قدر دلچسپی لیتے تھے۔ دراصل بات یہ ہے کہ اُن کے آس پاس اور گرد وپیش خاصا مذہبی ماحول تھا اور اس ماحول میں نئے افکار کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور فلسفیانہ انداز میں مختلف معاملات ومسائل پر مباحث کا سلسلہ جاری تھا۔ "مومنؔ کے خصوصی احباب میں مولوی صدرالدین خاں آزردہ صدرالصدور دہلی جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد اور حنفی مسلک کے رہنما تھے۔ اُن کے دست راست مولوی رشیدالدین خاں صدر مدرس مدرسۂ دہلی تھے، جو شاہ عبدالعزیز صاحب شاہ رفیع الدین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب کے شاگرد تھے اور حنفی عقائد میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے جانشین شمار ہوتے تھے۔ دوسرے ساتھی مولوی فضل حق صاحب خیرآبادی تھے جو فلسفے میں امام مانے جاتے تھے مختلف علوم درسیہ کی تکمیل اپنے والد

---

[۱] کلب علی خاں فائق: حیاتِ مومن: اورینٹل کالج میگزین: نومبر ۱۹۵۹ء: ص ۴۷-۴۸

مولوی فضل امام صاحب سے کی تھی اور علم حدیث میں شاہ عبدالقادر صاحب سے سند رکھتے تھے اور شاہ دھومن کے مرید تھے۔ دہلی کے عوام اور خواص کی باگ ڈور ان ہی اکابرین کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کے خلاف دوسرا گروہ دہلی میں جو شرک و بدعت کے خلاف جہاد کرنے اٹھا تھا۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب شاگرد و داماد شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ صاحب برادر زادہ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب خلفائے سید احمد شہیدؒ ہیں۔ سید احمدؒ شہیدؒ شاہ عبدالعزیزؒ صاحب سے بیعت تھے اور شریعت محمدی کے احیا کے لئے علم جہاد بلند کیا تھا۔ مولانا عبدالحیٔ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے سب سے پہلے دہلی میں بدعات مٹانے کا تہیہ کیا اور کچھ مدت میں اس قدر کامیابی حاصل کرلی کہ دہلی کی جامع مسجد میں، جہاں جمعہ کے روز سامان صحن مسجد میں فروخت ہوتا تھا، وہاں نماز جمعہ عید جیسی ہونے لگی۔ ان کی مخالفت میں مولانا فضل حق صاحب اور مولانا رشید الدین خاں پیش پیش تھے، اور آزردہ درپردہ حامی تھے۔ اس سے دہلی کی مذہبی کشیدہ فضا کا اندازہ ہوتا ہے، فریقین آپس میں یگانگت اور دوستی کے باوجود دو طبقوں میں تقسیم ہوگئے تھے[۱]۔ مومن نے ان مذہبی مناقشوں میں براہ راست کوئی حصّہ نہیں لیا لیکن اصولی اور نظریاتی مباحث میں انھوں نے ضرور دلچسپی لی۔ وہ شرک اور بدعت کے خلاف تھے۔ اس لئے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا سیّد احمد بریلویؒ کے افکار و خیالات سے انھیں زیادہ دلچسپی تھی۔ چنانچہ اُن کی حمایت میں کبھی کبھی مناظرے تک کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال نے انھیں خاصا مذہبی بنا دیا تھا۔ اُن کی رندی، شاہد بازی اور عشق و عاشقی تک اُن کی اس مذہبیت کے راستے میں حائل نہ ہوسکی۔ مومن کی زندگی میں یہ پہلو بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

(۸)

مومن نے ساری زندگی کوئی ملازمت نہیں کی۔ کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا۔ کسی کے دربار میں نہیں گئے۔ کچھ حاصل کرنے کے خیال سے کسی کی مدح نہیں کی۔

۱۔ کلب علی خاں فائق: حیات مومن: اورنٹیل کالج میگزین: نومبر ۱۹۵۹ء ص ۵۲-۵۳

ان کے زمانے کے امرا، ورؤسا اس بات کے لئے کوشاں رہتے تھے کہ انھیں کسی طرح اپنے پاس ملازم رکھ لیں لیکن یہ تیار نہ ہوئے۔ ملازمت خواہ وہ کسی نوعیت کی بھی ہو انھیں پسند نہیں تھی اسی لئے جب کبھی بھی ملازمت کا کوئی سلسلہ ہوا تو انھوں نے کسی نہ کسی بہانے سے اس کو ٹھکرا دیا۔ اس کی بنیادی وجہ اُن کی غیور طبیعت تھی۔ وہ کسی کے دست نگر بن کر نہیں رہ سکتے تھے۔ مزاج میں آزادہ روی تھی، اس لئے ملازمت کی پابندیوں کو برداشت کرنا اُن کے لئے مشکل تھا۔ یہی سبب ہے کہ کئی رئیسوں نے انھیں بلایا لیکن وہ نہ گئے۔ رام پور، ٹونک، بھوپال، جہانگیر آباد، کپورتھلہ کی ریاستوں نے انھیں بلانے کی کوشش کی لیکن انھوں نے ان میں سے کسی جگہ جانے کا خیال تک نہیں کیا۔ عرش گیاوی نے لکھا ہے کہ "مومن کو والئ رام پور، والی ٹونک، والئ بھوپال، والئ جہانگیر آباد وغیرہ نے اپنے دوستانہ مراسم کے جال میں پھنسانا چاہا۔ مہاراجہ کپورتھلہ نے ساڑھے تین سو روپے ماہوار پر طلب کیا، مگر وہاں بھی نہ گئے۔ زادِ راہ تک واپس کر کے یہ صاف جواب لکھ دیا کہ جس دربار کا ایک ادنیٰ گویا ساڑھے تین سو روپے ماہوار پاتا ہو وہاں میں اسی تنخواہ میں نہیں آسکتا"[۱] یہ سب تو بہانے تھے۔ دراصل بات یہی تھی کہ ملازمت کی پابندیاں انھیں پسند نہیں تھیں۔ اور وہ ان پابندیوں میں گرفتار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔

ریاست ٹونک کے نواب وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ بہادر کو مومن سے نسبت خاص تھی۔ وہ اُن کے پیر بھائی ہوتے تھے۔ انھوں نے بلانے کی بہت کوشش کی۔ مومن نے معذرت کے طور پر ایک قصیدہ لکھ کر بھیج دیا اور اس طرح نہایت خوش اسلوبی سے انکار کر دیا۔ قصیدے کے یہ چند اشعار بڑے ہی معنی خیز ہیں۔

یاد ایامِ عشرتِ فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی

---

[۱] عرش گیاوی: حیاتِ مومن: ص ۵۳

کردیا گردشِ سپہر نے حیف　　برجِ خاکی مسیرِ کیوانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کون　　بے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں　　کہ میں شہری ہوں یا بیابانی
کیا ہوئی وہ بلندیٔ دیوار　　کیا ہوئے وہ عمادِ طولانی
جائے گل ہیں چمن میں ریزۂ سنگ　　کاہ کرتی ہے نازِ ریحانی
اَٹ گئے حوض و نہر، غیر از چشم　　ایک قطرہ کہیں نہیں پانی
نہ ملا کچھ نشانِ آبِ رواں　　خاک سارے جہان میں چھانی
سقفِ رنگین و زرنگار کہاں　　جز سپہر و نجومِ نورانی
شورِ زاغ و زغن ہے سمع خراش　　اب کہاں بلبل و غزل خوانی

ہائے وہ ساز و برگِ عیش و نشاط　　قوت افزائے روحِ انسانی
تیر بارانِ فاقہ نے مارا　　بِک چکی تھی کلاہِ نورانی
پنبۂ داغِ دل کو حیراں ہوں　　نہ رہا خرقۂ زمستانی
ایک دن یوں ہجومِ باراں تھا　　جیسے اب مجمعِ پریشانی

اے سخن سنج نکتہ داں تیری　　کس زباں سے کروں ثنا خوانی
مجھ سے ناکس کی ہم نشینی کا　　تجھ سے داور کو شوقِ پنہانی
نہ یہ سمجھا ہوں سیرِ اختر سے　　علمِ ظنی نہ ہووے ایقانی
حاملِ دفترِ مدیح سے ہوں　　مجھے پہنچا تھا علمِ اذعانی
کہ نہیں کیوں خیالِ طوفِ حرم　　مومن اور اتنی نامسلمانی

میرے گوہر تمام ناسفتہ　　میرے یاقوت سب بدخشانی
میری نیرنگیٔ تخیل سے　　سیمیا گر ہے روحِ نفسانی

میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں — جس کے در کا گدا ہے خاقانی
انوری کے بیان میں ہے کہاں — میری تقریر کی سی تابانی
ملکِ معنی کا شہریار رہے — دیکھ خسرو نہیں قلم رانی

تیرا اقبال روز افزوں ہو
جیسے مومن یہ لطفِ ربانی[1]

ان اقتباسات میں کئی باتیں ہیں۔ زمانے کا شکوہ ہے۔ اپنی زبوں حالی کا بیان ہے کچھ تعلّی ہے۔ اور پھر یہ دعا ہے کہ تیرا اقبال ہمیشہ باقی رہے لیکن ان سب کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ مجھے سب کچھ گوارا ہے لیکن ملازمت کی حلقہ بگوشی منظور نہیں۔

ویسے اس زمانے کے امراء و رؤسا سے اُن کے بہت اچھے تعلقات تھے لیکن ان تعلقات کا مقصد سوائے دوستی کے اور کچھ نہ تھا۔ انھوں نے کبھی کسی سے کچھ حاصل کرنے کے خیال سے دوستی کا ہاتھ نہیں بڑھایا بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ جن امیروں اور رئیسوں سے اُن کے تعلقات تھے وہ ایک حد تک ان کے نیاز مند تھے۔ ان میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، نواب محمد وزیر خاں، نواب اصغر علی خاں، نواب صلابت خاں نواب عبداللہ خاں سب کو اُن سے تعلق خاطر تھا۔ مومن کے زمانے میں لال قلعہ میں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ ذوق تو قلعے سے باقاعدہ منسلک تھے۔ کیونکہ بادشاہ کے استاد تھے۔ غالب تک کو قلعے سے وابستہ ہونے کی آرزو تھی اور ان کی یہ آرزو ذوق کی وفات کے بعد پوری ہوئی۔ اس زمانے میں صرف مومن ایک ایسے شاعر تھے جنھیں کبھی قلعے میں جانے کا خیال نہ آیا۔ بات یہی ہے کہ وہ اس دُنیا کے آدمی نہیں تھے۔ دربار داری کو معاش کا ذریعہ بنانا انھیں پسند نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں انھیں اپنی توہین نظر آتی تھی۔

اس زمانے میں انگریزوں نے جو مدرسۃ العلوم دہلی کالج کے نام سے قائم

---

[1] ضیاء احمد بدایونی: قصائد مومن: ص ۷۵ — ۸۸

کیا تھا۔ اُس میں مدرس فارسی کی جگہ بھی مومن خاں کو پیش کی گئی تھی لیکن اس کو بھی اُنھوں نے قبول نہیں کیا۔ مولوی کریم الدین اُس زمانے میں خود مدرسے سے منسلک تھے۔ انھوں نے اپنے تذکرے میں صہبائی کا ذکر کرتے ہوئے اس واقعے کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں "جس سال میں کہ لفٹنٹ گورنر بہادر طامسین جا جو کہ عالم کامل اور قدر شناس اہل علوم کے ہیں، شاہجہاں آباد میں واسطے بندوبست مدرسے کے تشریف لائے۔ سب مدرسوں کا معہ طالبار کے امتحان لے کر یہ تجویز کی کہ ایک مدرّس فارسی مدرسے کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاہیئے۔ شاہجہاں آباد میں سے لوگوں مستعدوں کی تلاش ہوئی۔ مفتی محمد صدرالدین خان بہادر نے جو ہمارے زمانے میں شاہجہاں آباد کے صدر الصدور ہیں جناب طامسین صاحب بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی کہ اس شہر میں اچھے فارسی داں تین شخص منتخب روزگار ہیں۔ ایک مرزا نوشہ صاحب، دوسرے مولوی امام بخش صاحب، تیسرے حکیم محمد مومن خاں لفٹنٹ گورنر نے تینوں کو بلایا۔ مرزا نوشہ صاحب نے کہ بسبب اس کے کہ اون کو نوکری کرنے سے استغنا تھی، انکار کیا۔ حکیم محمد مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماہواری تنخواہ کی کی۔ مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے وجہ معیشت نہیں رکھتے تھے حسب خواہش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کے چالیس روپے ماہوار اون کے واسطے مقرر ہوا۔ مدرّس اوّل فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے"[۵] مومن کا سو روپے تنخواہ طلب کرنا تو ایک بہانہ تھا۔ درحقیقت وہ سلیقے سے انکار کرنا چاہتے تھے، اور اُنھوں نے انکار کر دیا۔ غرض مومن کو کسی طرح کی ملازمت پسند نہیں تھی یہی سبب ہے کہ وہ زندگی بھر ملازمت کے خیال سے آزاد رہے۔

مومن نے کبھی بھی حصول معاش کی غرض سے دلّی کو نہیں چھوڑا۔ انھیں اس سرزمین سے دلی محبت تھی اس لئے کبھی باہر نہیں نکلے۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے میں ان کی زندگی کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں "از روز ولادت الی حال بسبب

---

۵ کریم الدین: طبقات الشعرا، ص ۴۱۴

موالفت جہاں آباد و اہل جہاں آباد بہ سمتے حرکت نہ کردہ۔ بہ وصال یاران رنگین بہ وصل شاہدان غبیرین عمرے خوش می گزارد ۵ اور اس میں شبہ نہیں کہ اپنی ساری زندگی اُنھوں نے دلی ہی میں گزار دی۔ بہت تھوڑے عرصے کے لئے صرف چار پانچ بار انھیں مجبوراً دلی سے نکلنا پڑا تھا جب وہ دلی کو چھوڑ کر سہسوان گئے تھے لیکن جب تک وہاں رہے یہی خیال رہا کہ ہرزہ گردی میں مبتلا ہیں۔ یا پھر اُن کا جوشِ جنوں انھیں ایک دفعہ دلی سے رام پور لے گیا لیکن وہاں بھی یہی محسوس کرتے رہے کہ ویرانے کو چھوڑ کر ویرانہ تر میں آ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ بدایوں میں بھی انھوں نے کچھ وقت گزارا تھا۔ ان کے بارے میں اشارے ان کے کلام میں موجود ہیں ؎

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا جوش ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے یہ کیوں کر چارۂ پندِ خردمندان ہوش آیا

سہسواں، بدایوں اور رام پور کے علاوہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سہارن پور بھی گئے تھے۔ بہرحال ان تمام مقامات کے سفر مومن نے ضرور کئے لیکن ان کا مقصد حصولِ معاش نہیں تھا۔ وہ تو صرف غم غلط کرنے کے لئے باہر نکلے تھے۔ انھیں اپنے عشق میں جو ناکامی ہوئی، اُس نے اُن کی زندگی میں ایک عجیب انتشار سا پیدا کر دیا۔ ایک جگہ جم کر بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ چنانچہ بیقراری کے عالم میں یہ سفر کئے۔ عرشؔ نے لکھا ہے "خاں صاحب کا کوئی سفر تحصیل زر کے لئے نہیں ہوا، بلکہ وہی جذباتِ عشق جب شدت پر تھے، اور محرومیوں سے دل گھبرا گیا تھا تو گھر چھوڑ کر چند روز کے لئے نکلے تھے یہاں تک کہ رام پور، سہسواں، بدایوں، جہانگیر آباد، ٹونک، سہارن پور تک گئے۔ کسی کسی سفر کا ذکر کلیات میں بھی کیا ہے ۵۲" اور یہ خیال زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کم از کم اس قطعے سے تو

---

۵۱ شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۶
۵۲ عرش گیاوی: حیات: ص ۵۵

یہ بات پوری طرح صحیح ثابت ہو جاتی ہے جو انھوں نے اپنے سہسوان جانے کے بارے میں لکھا ہے اور جس میں صاحب تک پہنچنے کی آرزو بڑی شدت سے ظاہر کی ہے۔ اس قطعے میں اپنے آپ کو غلام گریز پا، کہنا بھی معنویت سے بھرپور ہے ؎

صاحبو! میرا حال مت پوچھو ۔۔۔ بندۂ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلی کو سہسواں آیا ۔۔۔ ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
عذر بے جا ہے سرکشی کے لئے ۔۔۔ شاکیٔ بے سبب جفا ہوں میں
اک خداوندِ شوخ کے غم میں ۔۔۔ قابلِ رحم ہو گیا ہوں میں

مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک
کہ غلامِ گریز پا ہوں میں[1]

بہر حال مومن نے یہ سفر اسی غمِ عشق کو بھلانے اور اپنے دل کو بہلانے کی غرض سے کئے تھے۔ ان کی مثنوی "قولِ غمیں" سے بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ اس عشق کے واقعے نے ان کی زندگی میں بڑا انتشار پیدا کر دیا تھا، اور وہ کسی کام کے نہیں رہے تھے۔ یہ اُن کی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ تھا۔ اس صدمے نے جو کاری زخم لگائے تھے، اُن کو ذرا مندمل کرنے کے خیال ہی سے مومن نے یہ سفر کئے۔ اس لئے جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حصولِ معاش کی غرض سے وہ سفر پر نکلے، اصل حقیقت اُن کی نظروں سے اوجھل ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ مومن بڑے خوددار آدمی تھے۔ اس خودداری نے انھیں مادّی ضرورتوں سے خاصی حد تک بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ کئی علوم کے ماہر تھے۔ چاہتے تو ان میں سے کسی کو بھی اپنا ذریعۂ معاش بنا سکتے تھے لیکن اُنھوں نے تو طبابت تک کو اپنا پیشہ نہیں بنایا حالانکہ یہ چیز انھیں ورثے میں ملی تھی اور یہ اُن کا آبائی پیشہ تھا۔ لیکن انھوں نے اِس سے کبھی اپنی روزی کمانے کی کوشش نہیں کی۔ چونکہ آبار واجداد کا علم تھا، اس لئے اُس کو حاصل کیا اور اُس میں مہارت حاصل کر لی۔ اس کے بعد نجوم و رمل کا شوق پیدا ہوا، اُس میں بھی کمال حاصل کر لیا۔ لیکن اس کو بھی کبھی معاش کا ذریعہ نہیں بنایا۔ پھر شاعری سے دلچسپی پیدا

---

[1] کلیاتِ مومن: ص ۱۷۸-۱۷۹

ہوئی اور اس فن میں بھی وہ کامل ہو گئے لیکن اس کے ذریعے سے بھی انھوں نے کبھی کچھ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، یہ سب تو اُن کے شوق کی چیزیں تھیں اور انھوں نے ان کو شوق کے حدود سے کبھی بھی باہر نہیں نکلنے دیا۔ بقول آزاد "جس طرح شاعری کے ذریعے سے اُنھوں نے روپیہ نہیں پیدا کیا۔ اسی طرح نجوم اور طبابت کو بھی معاش کا ذریعہ نہیں کیا۔ جس طرح شطرنج اُن کی دل لگی کی چیز تھی، اسی طرح نجوم رمل اور شاعری کو بھی ایک بہلاوا دل کا سمجھتے تھے"[1]

مومن کو اپنی آبائی جائداد سے جو آمدنی تھی اسی میں گزر بسر کرتے تھے۔ اس کی تفصیل آبِ حیات میں موجود ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ "جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اُس میں شامل تھا۔ رئیس مذکور نے اُس کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثۂ حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی۔ پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصہ لیا۔ اور اُس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ وہ اُن کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی۔ اس سے ایک چوتھائی اُن کے والد کو، اور اُن کے بعد میں اُس میں سے اُن کا حصہ اُن کو ملتا رہا"[2] بس اس کے علاوہ مومن کی کوئی خاص آمدنی نہیں تھی۔ کبھی کبھی کہیں سے انعام و اکرام ضرور مل جاتا تھا۔ مومن کے نواسے عبدالحی صاحب لکھتے ہیں "بادشاہ کے یہاں شعر و سخن کا چرچا تھا۔ جاتے آتے رہتے تھے کبھی کوئی انعام بھی مل جاتا تھا"[3] یہ بات صحیح ہو سکتی ہے۔ اس زمانے میں بہادر شاہ ظفر بادشاہ تھے۔ قلعے میں اُنھوں نے شعر و سخن کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ مشاعرے ہوتے رہتے تھے شعرا کی محفلیں جمتی تھیں۔ مومن بھی اُس میں شریک ہوتے ہوں گے، اور قلعے سے انعام و اکرام کچھ نہ کچھ مل جاتا ہو گا۔ لیکن کسی اور ذریعے سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی بہرحال مومن کی معاش کے یہی ذرائع تھے۔ ظاہر ہے ان سے جو آمدنی ہوتی تھی۔ وہ

---

[1] آزاد: آب حیات: ص۴۲۵ — [2] آزاد: آب حیات: ص۴۲۱

[3] محمد عبدالحی کے لکھے ہوئے حالاتِ مومن جو انھوں نے راقم کو بھیجے۔

ان کے لئے ناکافی تھی لیکن وہ اس میں بھی امیروں کی طرح رہتے اور گزر بسر کرتے تھے مزاج میں قناعت تھی۔ ورنہ اتنی آمدنی میں زیست کرنا مشکل تھا۔ شاید یہی سبب ہے کہ وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ گردش روزگار کے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔

(۹)

اس طرح مومن نے اپنی زندگی کے تقریباً باون سال گزارے۔ ان کا انتقال ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ کوٹھے سے گر پڑے تھے۔ پاؤں پھسل گیا تھا۔ ہاتھوں اور پیروں میں شدید ضرب آئی تھی۔ چند مہینے صاحب فراش رہے، اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وفات پائی۔ عرشؔ گیاوی نے لکھا ہے کہ "بالکل بھلے چنگے تھے۔ کس بل ان کے دم خم میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ ایک بال بھی سر کا نہ پکا تھا۔ نہ وضع داری میں کوئی کمی تھی۔ عمر کے لحاظ سے بھی جب کہ قبل غدر ساٹھ برس کی عمر میں آدمی جوان ہوتا تھا۔ یہ محض ترپن برس کی عمر رکھتے تھے کہ انتقال کیا۔ دیکھنے میں چالیس بیالیس برس کے معلوم ہوتے تھے۔ صورت یہ ہوئی کہ وہ مکان جس کا نقشہ ابھی دکھلا چکا ہوں۔ اس کی چھت مرمت ہو رہی تھی اور کھولی گئی تھی۔ نیچے سے مزدور اوپر کو کڑیاں دے رہے تھے یہ اس منڈیر سے لگے ہوئے کھڑے تھے چھت کی اونچائی کم تھی۔ یکایک جھجکے اور ٹھوکر کھا کے کوٹھے سے نیچے آ پڑے۔ گرتے ہی بے ہوش ہو گئے۔ گھر میں کہرام اور محلے میں ہنگامہ ہو گیا بی بی بچوں نے سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ناصر نذیر صاحب فراق کے والد کہ مومن کے عزیز اور شاگرد تھے دوڑ پڑے اور خاں صاحب کو اٹھا کے پیچھے کے کمرے میں لٹایا، عزیزوں شاگردوں اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی۔ جن میں آہی بھی تھے۔ اُن کی طرف دیکھ کے جب ہوش میں آئے تو فرمایا، میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا، مگر میرا علم یہ کہتا ہے کہ میں صرف پانچ مہینے بچوں گا۔ لو میرے مرنے کی تاریخ لکھ رکھو۔ "دست و بازو بشکست"!

۱۲۶۸ھ

آخر وہی ہوا ـــــ جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ فرمایا، اور ہوش و حواس میں ہنستے بولتے چلے گئے۔ اعلیٰ علیین میں اُن کی روح پاک نے مقام پایا۔ حسب ہدایت اُن کا جنازہ مہندیوں میں کہ مشہور اور پرانا گورستان دہلی کا ہے لایا گیا اور وہیں دفن

ہوئے۔ نماز مسجد جامع میں ہوئی، شہر کے امیر غریب، علما، فضلا، شعرا، شہزادے سب جنازے کے ساتھ تھے۔ اور سب نے اُن کی جواں مرگی کا سوگ رکھا۔ غالب تو غالب ذوق کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اور ہر بزم میں یہی چرچا تھا کہ دہلی کا چراغ بجھ گیا مزار آپ کا زیر احاطہ دیوار مقبرہ مولانا شاہ عبدالعزیز باہر کے سمت بجانب شرق واقع ہے۔[۱] میرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے گلستانِ سخن میں اس واقعے کو تفصیل سے بیان کیا ہے لکھتے ہیں "اتفاقات قضا و قدر سے ایک روز ایک مکان کے بام بلند پر عروج معنی کے تصور میں تھا کہ ناگاہ لغزشِ پا سے اوجِ سخن سے پستی زمین کی طرف مائل اور اس مضمون پیش پا افتادہ کی جانب متوجہ کیا۔ ہر چند اوس بام کی بلندی چنداں پایہ نہ رکھتی تھی لیکن کچھ آسمان کی کج روی اور کچھ زمین کی ناہمواری سے دست و بازو میں ضرب شدید پہنچی۔ اوس شدتِ الم میں اس حادثۂ جاں کاہ کی تاریخ یہ پائی۔ اوس کوٹھے سے پاؤں کا پھسلنا بام گردوں کی نردبان تھا۔

مومن فتادہ از بام گفتم چہ رفت گفتا | خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت گفت تاریخ ایں مصیبت | گفتا خموش گفتم بشکست دست و بازو

۱۲۶۸ھ

چند ماہ انواع شدائد نے وہ رنج دیا کہ اون کا تحمل حد بشر سے خارج تھا۔ آخر الامر اوسی سال میں کہ بارہ سو اٹھسٹ ہجری تھی سفر آخرت اختیار کر کے وابستگانِ جگر فگار کے دل کو رنج اور داغ میں مبتلا اور حوران فردوس کو سعادتِ استقبال میں مستعد کیا۔ اس امر ناگزیر کے کئی مہینے کے بعد نواب مصطفے خاں بہادر شیفتہ تخلص کہ انسان صورت اور ملک سیرت ہیں، رویائے صادقہ میں دیکھتے ہیں کہ گویا مومن خاں کا خط آیا ہے اور اوس کے خاتمے پر خط سبز سے مرقوم ہے مومن اہل الجنتہ۔ وسعت رحمت سے کیا بعید ہے کہ جوش دریائے مغفرت نے اوس مستحق کرامت کے دامن کو لوثِ عصیاں سے پاک کر دیا ہو۔ صدق اللہ عزوجل قال عذابی اصیب من اشاء رحمتی وسعت کل شئی

۱۔ عرش گیاوی: حیات مومن: ص ۸۱

ابر رحمت سخت بے پرخرام است اے صدف   تا گدا مے قطرہ ایں جا باز گرداند عناں

اس سانحہ عبرت فزا کی تاریخ ہے۔ وہ مصرعہ ہے جو میر حسین تسکین کی سال وفات اوس سے معلوم اور اوسی کے ذکر میں مرقوم ہے (ارم میں مومن و تسکین و عارف ۱۲۶۸ھ) مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اس رباعی کی عبارت میں اظہار الم اور اوس نظم کے پیرائے میں افشانی غم کیا ؎

شرط است کہ بروئے دل خراشم ہمہ عمر   خوں نابہ برخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن   چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

راقم آثم بھی ازبس کہ مومن جنت نصیب سے رابطہ محبت کا مستحکم رکھتا تھا۔ فکر تاریخ میں سر بہ جیب ہوا۔ ناگاہ معدن ضمیر سے ایک لعل آب دار اور ایک گوہر شاہوار ہاتھ آیا ؎

برلب کوثر و تسنیم برفت   تشنہ جان محبت مومن
گفت تاریخ وفاتش صابر   یافت مقبولیٔ جنت مومن

اجودھیا پرشاد صبر تخلص نے ماتم مومن خاں مادہ تاریخ پایا اور خوب پایا ہے کہ اوس مادے کے پانے میں کم نہیں ہے "مومن آباد کرد خلد بریں"۔ اب چند شعر لکھ کر، ماتم مومن خاں مرحوم کو تازہ اور اوس الم کو بے اندازہ کرتا ہے اور سخن کی بے کسی پر نالہ اور معنی کی مظلومی پر نوحہ کرتا ہے[۵]"۔ ان کی وفات کے واقعے کی تفصیل کسی اور تذکرے میں نہیں ملتی میرزا قادر بخش صابر اُن کے ہم عصر تھے انھیں اُن کے مرنے کا بڑا غم تھا۔ اس لئے نہ صرف انھوں نے اس واقعے ہی کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے بلکہ مومن کی بے وقت موت سے اُن کے ہم عصر جس طرح متاثر ہوئے ہیں انھوں نے اُس کی وضاحت بھی کر دی ہے۔

یہ بھی مشہور ہے کہ مرنے سے بہت پہلے مومن کو اپنی وفات کا علم ہو گیا تھا۔ علم نجوم اور رمل کے ذریعے سے اُنھوں نے اپنے مرنے کی تاریخ تک نکال لی تھی۔ چنانچہ یہ تاریخ مومن کے فارسی دیوان میں موجود ہے۔ اسی تاریخ کو میرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے اور جو مذکورہ بالا اقتباس میں موجود ہے۔ جس وقت

۵۔ میرزا قادر بخش صابر: گلستانِ سخن: ص ۴۴۳

مومن خاں کا پاؤں پھسلا ہے اور وہ کوٹھے سے گرے ہیں، اسی وقت انھوں نے حساب لگاکر یہ بتا دیا تھا کہ وہ پانچ دن، پانچ مہینے یا پانچ برس میں مرجائیں گے۔ چنانچہ اس سانحے کے پورے پانچ مہینے بعد ان کا انتقال ہوا۔[۱] ایام مرض میں بقول عبدالرحمٰن آہی اور حکیم احسن اللہ خان مومن کی قوت برداشت قابل ستائش رہی۔ فارسی دیوان کی تکمیل کے سلسلے میں بعض غزلیں کہہ کر داخل دیوان کیں۔ دیوان مومن اُردو کی تصیح آہی کی فرمائش سے کی، اور تین روز قبل فارغ ہوئے۔ عارف کی وفات (جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) کے بعد اور تسکین کی وفات (۷ ارشوال ۱۲۶۸ھ) سے پہلے اُن کا انتقال غالباً رمضان المبارک ۱۲۶۸ھ (جون ۱۸۵۲ء) میں جمعہ کے روز ہوا۔[۲]

مومن کی موت ایک شاعر، ایک اختر شناس اور ایک رند پارسا ہی کی موت نہیں تھی، ایک آدمی، ایک انسان، ایک دوست اور ایک محب اسلام کی موت بھی تھی چنانچہ ان کی موت نے اُس زمانے کے سارے ماحول کو متاثر کیا۔ بڑے بڑے شاعروں نے تاریخیں کہیں اور اس طرح ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ بڑے بڑے عالموں اور دانش مندوں نے ان کی موت پر خون کے آنسو بہائے۔ اُس وقت کے امیروں اور رئیسوں تک کو اس کا صدمہ ہوا۔ اس کی تفصیل شعرا کے دیوانوں، علما، و مفکرین کے بیانوں اور اس وقت کے بعض اخباروں میں مل جاتی ہے۔ اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مومن اپنے وقت کے خاصے مقبول آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی دلکش شخصیت سے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی تھی۔ وہ ہر طبقے میں مقبول تھے۔ ان کی شخصیت مرنجاں مرنج تھی، وہ کسی کی اچھائی اور بُرائی میں نہیں تھے۔ انھوں نے کبھی کسی سے لڑائی مول نہیں لی کبھی کسی پر اعتراض نہیں کیا، کبھی کسی سے اُلجھے نہیں کبھی کسی کی ہجو نہیں لکھی۔ یہی سبب ہے کہ اُس زمانے کی دلی کے ہر شخص کو اُن کے مرنے کا غم ہوا۔ اور بقول غالب لوگ اُن کے غم میں کعبے کی طرح سیاہ پوش ہونے کے لئے مجبور ہوگئے۔ قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے میں مومن کی موت پر جو کچھ لکھا ہے اور جس

---

[۱] آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۸ [۲] کلب علی خاں فائق: حیاتِ مومن: اورینٹل کالج میگزین: نومبر ۱۹۵۹ء ص ۶۸

انداز میں لکھا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اُن کی موت نے ساری دلی میں کہرام مچا دیا تھا، اور ان کی یہ تحریر پوری طرح اس کی نشان دہی کرتی ہے۔

دلی دروازے کے باہر مہندیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔ یہ وہی قبرستان ہے، جہاں شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، اور اُن کے خاندان کے دوسرے لوگ دفن ہیں۔ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ "دلی دروازے کے باہر مہندیوں کے جانب غربی زیرِ دیوار احاطہ مدفون ہوئے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہے"[۵۱] ایک زمانے تک اُن کے مزار پر کوئی کتبہ نہیں لگایا گیا۔ جس کی وجہ سے اُس کا پہچاننا مشکل تھا۔ عرش گیاوی کی کتاب حیاتِ مومن کے آخر میں مومن کی پوتی عزیز بیگم صاحبہ نے جو تقریظ لکھی تھی اس میں یہ دعا کی تھی کہ "خدا کرے مومن کے موہوم مزار پر کتبہ بھی لگ جائے اور وہ زیارت گاہ عالم ہو کر رہے"[۵۲]۔ یہ کتبہ پروفیسر احمد علی صاحب نے نصب کیا۔ اب اس پر یہ عبارت درج ہے: "حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی ۱۲۱۵ – ۱۲۶۸ھ نصب کردہ پروفیسر احمد علی دہلوی (۱۳۳۳ھ) تاریخ وفات فرمودہ خود دست و بازو بشکست"۔ اور اسی کتبہ سے اب مومن کی آخری آرام گاہ پہچانی جاتی ہے۔

(۱۰)

یہ مومن کے حالات کی کُل کائنات ہے۔ اس سے زیادہ اُن کے حالات نہیں ملتے۔ ان حالات کو ہم تک پہنچانے کا سہرا حالی کے سر ہے۔ آزاد نے تو آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں انھیں سرے سے نظر انداز ہی کر دیا تھا۔ وہ تو کہیے کہ حالی نے بروقت اس کی طرف آزاد کو توجہ دلائی اور بقول آزاد اُن کے الطاف و کرم سے مومن کے حالات مرتب ہو کر آبِ حیات کے دوسرے اڈیشن میں شائع ہوئے ورنہ یہ حالات بھی حالی اور آزاد کے ساتھ ہی دفن ہو جاتے۔ یہ حالی ہی کا الطاف و کرم ہے کہ مومن کے خاندان، اُن کے آبا و اجداد، تعلیم و تربیت، معاش و مشاغل،

---

[۵۱] آزاد: آبِ حیات: ص ۴۲۸ [۵۲] عرش گیاوی: حیاتِ مومن: ص ۱۲۷

شعر و شاعری عشق و عاشقی، مذہب و عقائد وغیرہ کے بارے میں اختصار کے ساتھ ہی سہی کچھ ایسی معلومات حاصل ہو جاتی ہیں جو اُن کے حالات کی تحقیق و جستجو میں بنیادوں کا کام دیتی ہے۔ جن لوگوں نے اب تک کچھ کام کیا ہے، وہ آبِ حیات میں حالی کے لکھے ہوئے حالات کو سامنے رکھنے کے لئے مجبور ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر نے ان پر کوئی خاص اضافہ بھی نہیں کیا ہے۔ عرش گیاوی نے بے شک ایک چھوٹی سی کتاب حیاتِ مومن کے نام سے مرتّب کی ہے لیکن اس میں خیالی باتیں اور قیاس آرائیاں زیادہ ہیں بلکہ بعض جگہ تو بیکار باتیں بھی کی ہیں۔ اس لئے اس کتاب سے حالاتِ مومن کے بارے میں کوئی نئی معلومات فراہم نہیں ہوتی۔ مومن کے بارے میں اگر کوئی نئی بات کہی جا سکتی ہے تو اس کے لئے ان تذکروں کو سامنے رکھنا ضروری ہے جو اُن کے زمانے میں لکھے گئے، لیکن صرف ان سے مومن کی تصویر مکمل نہیں ہوتی اس کو مکمل کرنے کے لئے بھی آبِ حیات کو سامنے رکھنا ناگزیر ہے۔ مومنؔ کا اُردو اور فارسی کلام بے شک اُن کے حالات کو معلوم کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور اس کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے تو اُس سے بعض نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کلب علی خاں فائقؔ کا مضمون حیاتِ مومنؔ کی بنیاد یہی ہے اور اس اعتبار سے بہت کامیاب ہے۔

مومنؔ اس اعتبار سے اُردو کے خوش قسمت شاعر ہیں کہ ان کے صحیح حالات، اختصار کے ساتھ ہی سہی لیکن مل ضرور جاتے ہیں۔ اور اس طرح پیدائش سے لے کر وفات تک کا مد و جزر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ یہ حالات غلط نہیں ہیں۔ اور اُن کو بیان کرنے والوں میں اُن کی زندگی کے کسی مسئلے پر کوئی ایسا اختلاف بھی نہیں ہے جو کسی قسم کی اُلجھن اور غلط فہمی کو پیدا کرے۔ صاف اور سیدھے سادے واقعات ہیں جو انھوں نے بیان کر دیے ہیں۔ اور اس طرح جو کچھ انھوں نے آنکھوں سے دیکھا یا کانوں سے سنا ہے، وہ ہم تک پہنچ گیا ہے۔ اس لئے اس کی صداقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر اس کے علاوہ مومنؔ نے بھی اپنے بارے میں بہت کچھ کہا ہے، اُن کا کلام اس سلسلے میں پیش پیش نظر آتا ہے

ہر چند کہ اس بیان میں شاعرانہ انداز غالب ہے، اور یہ سب کچھ اشاروں اور کنایوں میں کہا گیا ہے لیکن یہ اشارے اور کنایے بڑے ہی بلیغ اور معنویت سے بھرپور ہیں، اس لئے حالات کی تلاش و جستجو میں یہ بہت بڑا سہارا بنتے ہیں اور اس طرح اس تفصیل و جزئیات کو مرتب کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے جو مومن کی پہلو دار زندگی سے شناسائی حاصل کرنے کے لئے ازبس ضروری ہے۔

ان حالات کا سراغ اسی طرح ملتا ہے ورنہ ان سے آشنا ہونا اور اس سلسلے کی ساری تفصیل و جزئیات کو مرتب کرنا واقعی جوئے شیر کو لانے سے کسی طرح کم نہ تھا۔

مومن کی شخصیت

مومن کی زندگی کے ان حالات میں اُن کی شخصیت کو سمجھنے کا بڑا سامان ہے۔ ان کو سامنے رکھا جائے تو اُن کی زندگی کے بہت سے ایسے پہلوؤں سے واقفیت ہوتی ہے جو بظاہر تو نظر نہیں آتے لیکن جو اُن کی شخصیت میں ساری زندگی اندر ہی اندر ایک ہیجان اور ہنگامہ سا برپا کرتے رہے۔ یہ حالات بتاتے ہیں کہ مومن کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے، اُن کی نسلی خصوصیات کیا تھیں اور ان نسلی خصوصیات کے اثرات اُن کی شخصیت کے کن پہلوؤں میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ ان سے اس بات کا علم بھی ہو جاتا ہے کہ اُن کے والد کا اُن پر کتنا اور کیسا اثر تھا؟۔ جب تک وہ زندہ رہے انھیں کس طرح متاثر کرتے رہے اور جب اُن کا انتقال ہو گیا تو اُن پر اس سانحے سے کیا گزری؟۔ اُن کی ذہنی کیفیت کیا ہوئی اور زندگی میں جن پریشانیوں سے انھیں دوچار ہونا پڑا، اُس کے نتیجے میں اُن کے یہاں کون سے ذہنی رجحانات پیدا ہوئے؟۔ جس مخصوص انفرادی ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی اور جس نجی فضا میں اُن کی زندگی کا ابتدائی زمانہ گزرا، اس نے اُن کے کردار میں کون سے رنگ نمایاں کیے؟

اس زمانے میں جن شخصیتوں سے انھیں واسطہ پڑا، اور جنھوں نے اُن کی ذہنی نشوونما میں حصہ لیا، اُن سے اُن کی کیا کیفیت ہوئی؟ اُن کی تعلیم کس طرح ہوئی، کن لوگوں نے انھیں تعلیم دی اور اس تعلیم نے اُن پر کیا اثر کیا؟ کون کون سے علوم انھوں نے حاصل کیے؛ ان علوم سے انھیں زندگی میں کیا کچھ ملا؟ کون سے ذہنی رجحانات اُن کے یہاں پیدا ہوئے؟ ۔ ان علوم کے ساتھ ساتھ کون سے فنون کو انھوں نے اپنا محبوب مشغلہ بنایا، اور اُن میں کس حد تک مہارت حاصل کی؟ شاعری کے فن سے انھیں کیا تعلق تھا؛ وہ شاعری کے بارے میں کیا خیالات و نظریات رکھتے تھے؟ ۔ اُس کا کیا مخصوص تصور اُن کے پیش نظر تھا؟ ۔ وہ خود اس تصور پر کس حد تک پورے اُترتے ہیں؟ ۔ اس شاعری نے اُن کی شخصیت پر کیا اثر کیا ہے؟ ۔ اُن کے عشق کے واقعات بھی اُن کی زندگی کے حالات میں بہت نمایاں ہیں۔ یہ عشق انھوں نے کیوں کیے، کیسے کیے اور اُن کے نتیجے میں اُن پر کیا کچھ بیتی؟ ۔ وہ کیوں ناکام ہوئے، اور اس ناکامی کا اُن کے ذہن پر کیا اثر ہوا؟ ۔ ان سب کا جواب اُن کی زندگی کے حالات میں موجود ہے۔ وہ معاش سے کیوں بے نیاز رہے؟ انھوں نے کوئی ملازمت کیوں نہیں کی؟ ۔ امرا و رؤسا سے تعلقات کیوں پیدا نہیں کیے؟ ۔ قصیدے کیوں نہیں لکھے اور اس صورتِ حال کا کیا اثر اُن کی شخصیت نے قبول کیا، اس پر اِن حالات سے خاصی روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی گھریلو زندگی کا کیا عالم تھا اور اس زندگی میں وہ کس حد تک متوازن تھے؛ اس کی وضاحت بھی ان حالات سے ہوتی ہے۔ اُن کے عقائد کیا تھے اور اِن عقائد نے اُن کے مزاج میں کون سی خصوصیات پیدا کیں؛ اس کا اندازہ بھی ان حالات سے ہوتا ہے۔ اور ان کو سامنے رکھا جائے تو مومنؔ کی شخصیت کی ایک تصویر اُن میں سے اُبھر کر سامنے آتی ہے ۔ یہ حالات درحقیقت اُن کی شخصیت کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ اور ان سے اُس کی پہلو دار کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان حالاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ مومنؔ کا کلام بھی اُن کی شخصیت کا آئینہ دار ہے، اور اس آئینے میں جگہ جگہ اُن کی شخصیت کے نقوش خاصے نمایاں

نظر آتے ہیں۔ غزلوں تک میں اُن کے مزاج اور اُفتادِ طبع کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں اظہار براہِ راست اور واضح طور پر نہیں ہوتا مومن کی غزلوں میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے لیکن اس کے باوجود ان میں جگہ جگہ مومن کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے اور ان کے مختلف اشعار میں اُن کی اُفتادِ طبع ذہنی رُجحانات اور عقائد و توہمات کی بجلیاں سی کوندتی ہیں خصوصیت کے ساتھ ان غزلوں کے مقطعے اُن کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو بہت اچھی طرح پیش کرتے ہیں۔ اور مثنویوں میں تو انھوں نے اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب ہی کر دیا ہے۔ اگرچہ یہ مثنویاں اُن کی زندگی کے صرف جذباتی اور رومانی پہلو کی ترجمانی کرتی ہیں لیکن ان سے اُن کے مزاج کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اُن سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کیا کرتے اور کیا کچھ کر سکتے تھے؛ اُن پر کن چیزوں کا اثر تھا، اور وہ کیسی رنگین اور پُرکار شخصیت کے مالک تھے؛۔ ان مثنویوں میں سے بعض ایسی ہیں جو اُن کے عقائد کو بھی واضح کرتی ہیں۔ اسلام سے انھیں جو لگاؤ اور دین سے انھیں جو نسبت تھی، اُس کا پتہ بھی ان سے چل جاتا ہے۔ غرض ان کی شخصیت کے خط و خال کو واضح کرنے کے لئے یہ مثنویاں بھی بہت اہم ہیں۔ مثنویوں کے علاوہ انھوں نے بعض قطعات بھی ایسے کہے ہیں جن سے ان کی شخصیت اور کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے بعض تو قطعاتِ تاریخ ہیں اور بعض طویل قطعات ہیں جن میں اپنی ذہنی کیفیت کو پیش کیا ہے لیکن اس اعتبار سے سب سے زیادہ اہمیت اُن کی بعض رباعیات کو حاصل ہے۔ کیونکہ ان رباعیات میں انھوں نے اپنے بعض خیالات و نظریات کو وثوق کے ساتھ پیش کر دیا ہے اور اس سلسلے میں شاعرانہ اشاروں اور کنایوں کا بھی بہت کم خیال رکھا ہے۔ اس لئے یہ رباعیات ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کو پوری طرح اُجاگر کر دیتی ہیں۔ منظومات میں تو صرف اُن کی شخصیت کی طرف اشارے ہی ملتے ہیں لیکن اُن کے کچھ خطوط جو انشائے مومن کے نام سے چھپے ہیں، اُن میں اُن کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی تفصیل و جزئیات مل جاتی ہے اور اس لحاظ سے مومن کی یہ تصنیف شاید سب سے زیادہ اہم ہے۔

غرض مومن نے اپنے بارے میں بہت کچھ کہا ہے اور اس سے اُن کی شخصیت کو جاننے اور اُن کے مزاج کو پہچاننے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

دوسرے لوگوں نے مومن کی شخصیت کے بارے میں بہت کم لکھا ہے۔ اُن کے ہم عصروں نے جو تذکرے لکھے ہیں، اُن میں مومن کا ذکر بھی موجود ہے اور اس ذکر میں اُن کے حالات اختصار کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں لیکن ان بیانات میں کہیں کہیں کوئی فقرہ ایسا ضرور مل جاتا ہے جس سے ان کی شخصیت کے بعض پہلوؤں کی اہمیت ذہن نشین ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں شیفتہ کے گلشن بے خار، اور کریم الدین کے تذکرہ طبقات الشعراء اور گلدستہ نازنینان کی حیثیت بہت نمایاں ہے۔ ان میں کہیں کہیں بعض ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے مومن کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ چند اور تذکروں میں بھی مومن کا ذکر ملتا ہے لیکن اُن کے بیانات میں بھی اختصار بہت ہے۔ بعد کے تذکرہ نگاروں نے تو کم و بیش انھیں خیالات کو دُہرا دیا ہے جو اس سے قبل شیفتہ اور کریم الدین نے پیش کئے تھے۔ جدید دور کے لکھنے والوں میں صرف ایک فرحت اللہ بیگ ایسے ہیں جنھوں نے مومن کی شخصیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔ اور اس میں کچھ ایسا ڈرامائی انداز پیدا کیا ہے کہ اُن کی یہ تصویر زندگی سے بھرپور معلوم ہوتی ہے اور اس اعتبار سے واقعی اُن کی تحریر بہت بلند مرتبہ ہے۔ فرحت اللہ بیگ کے بعد مومن پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اُس میں اُن کی شاعری پر تو اظہار خیال ہے لیکن اُن کی شخصیت کا تجزیاتی مطالعہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالانکہ مومن کی شخصیت اتنی پہلو دار ہے کہ وہ ایک تجزیاتی مطالعے کا تقاضا کرتی ہے۔

یہ تجزیاتی مطالعہ مومن کی زندگی کے حالات، اُن کی شعری تخلیقات، نثری نگارشات، ہم عصروں کے بیانات اور دورِ جدید کے لکھنے والوں کے پیش کئے ہوئے خیالات ہی کو سامنے رکھ کر پیش کیا جا سکتا ہے کہ اسی طرح اُن کی ایک صحیح، واضح اور مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آ سکتی ہے۔

(۲)

مومن کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جس کے اعلیٰ اور ارفع ہونے میں کسی
شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ شیفتہ نے اس کو "دودمانِ گرامی، و خاندانِ نامی"[۱] کہا ہے
اس خاندان کے لوگ خاصے فارغ البال تھے، اور ان کا شمار اپنے وقت کے امیروں
اور رئیسوں میں ہوتا تھا۔ مومن کے آبا و اجداد شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں کشمیر
سے آکر دلّی میں آباد ہوئے تھے، اور انھیں شاہی طبیبوں کی صف میں جگہ ملی تھی۔
بادشاہ نے مومن کے دادا کو جاگیریں بھی دی تھیں اور ان کو اچھی طرح نوازا تھا انگریزوں
کے زمانے تک یہ جاگیریں باقی رہیں، اور جب ان کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ تب بھی اس خاندان
کے افراد کو پنشن ملتی رہی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومن کے خاندان کے افراد اچھی
زندگی بسر کرتے تھے اور ان کو کسی طرح کی تنگی یا پریشانی نہیں تھی۔ برخلاف اس کے
رہن سہن کا انداز خاصا امیرانہ تھا۔ یہ لوگ تھے تو کشمیری لیکن نسلاً پٹھان تھے۔ چنانچہ
پٹھانوں کی نسلی خصوصیات کی جھلکیاں بھی اس خاندان کے افراد میں نظر آتی ہیں
خود مومن کی شخصیت میں یہ خصوصیات اجاگر ہیں۔ وہ بہت غیور تھے، امیروں کی طرح
رہتے سہتے تھے۔ ان کو آداب کا بڑا خیال تھا۔ وہ حفظ مراتب کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔
انھیں اپنی بڑائی کا احساس تھا اسی لئے دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو افضل و
برتر سمجھتے تھے۔ اگرچہ انھوں نے غالب کی طرح اس کا اظہار اپنے اشعار میں نہیں کیا
ہے لیکن ان کے اندازِ نظر اور طرزِ فکر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں اپنی خاندانی
عظمت اور ریاست و امارت کا احساس تھا اسی لئے وہ اپنے سامنے کسی دوسرے
کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لانا ان کے مزاج میں داخل تھا
وہ بہت لئے دیئے رہتے تھے، انھیں آدابِ محفل کا بڑا خیال رہتا تھا۔ وہ بہت کم
لوگوں سے ملتے تھے لیکن جن سے میل جول تھا ان کی عزت کرتے تھے۔ اور ان لوگوں
سے بھی ان کا یہ تقاضا ہوتا تھا کہ وہ ان کی عزت کریں۔ اٹھتے بیٹھتے اس طرح تھے
گویا ایک دربار لگا ہوا ہے۔ میرزا فرحت اللہ بیگ نے ان کی جو تصویر کھینچی ہے اس سے

اُن کی شخصیت کے ان پہلوؤں کی پوری طرح وضاحت ہوتی ہے ۔ لکھتے ہیں :۔

"چار بجے کے قریب حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچے میں ہے ۔ راستے میں امام بخش صہبائی صاحب مل گئے ۔ یہ کالج میں میرے اُستاد رہے ہیں ۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے ۔ منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں ۔ سر پر پٹھے ہیں ۔ بڑے دُبلے پتلے آدمی ہیں، کوئی چالیس سال کی عمر ہو گی ۔ ایک بر کا سفید پیجامہ، سفید انگرکھا، کشمیری کام کا جبّہ پہنتے اور سر پر چھوٹا سا صافہ باندھتے ہیں ۔ یہ بھی چیلوں کے کوچے میں رہتے ہیں ۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہاں جاتے ہو، میں نے کہا، حکیم مومن خاں کے پاس ۔ پوچھا کیا کام ہے ۔ میں نے حال بیان کیا ۔ کہنے لگے چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں ۔ حکیم آغا جان کے چھتّے کے سامنے خاں صاحب کا مکان ہے، بڑا دروازہ ہے ۔ اندر بہت وسیع صحن اور اُس کے چاروں طرف عمارت ہے ۔ دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان ۔ پچھلے دالان کے اوپر کمرہ ہے ۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے ۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے ۔ اندر کے دالان میں بیچوں بیچ قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں ۔ سامنے حکیم سکھانند متخلص بہ راقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دو زانو بیٹھے ہیں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اُٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں ۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی ۔ کشیدہ قامت تھے ۔ سُرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی ۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں لمبی لمبی پلکیں کھنچی ہوئی بھنویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، اُن پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسّی آوردہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخاشی ڈاڑھی، بھرے بھرے بازو، پتلی کمر، چوڑا سینہ، لمبی لمبی انگلیاں، سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال، لمبی لمبی زلفیں بن کر پشت اور شانوں پر بکھرے ہیں ۔ کچھ لٹیں پیشانی کے دونوں طرف کاکلوں کی شکل رکھتی ہیں ۔ کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا ۔ بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اُس کے نیچے کرتا نہ تھا ۔ اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے

میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ، کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا، اور اس کے دونوں سرے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پتلا سا خارپشت، پاؤں میں سرخ گل بدنی کا پاجامہ، مہریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ بھی پہنتے تھے۔ مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ جوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی اُلٹا کر چڑھا لیتے تھے، سر پر گلشن کی دوپلڑی ٹوپی۔ اس کے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آگئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصّہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔

جب میں اور مولوی صہبائی صاحب دونوں پہنچے تو حکیم صاحب مرزا رحیم الدین حیا سے کہہ رہے تھے۔ صاحب عالم تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ ایک ہوں دو ہوں آخر یہ روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے۔ صاحب عالم نے کہا اُستاد کیا کروں، ریذیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتے ہیں کچھ تو میں خود حل کر کے اُن کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں۔ حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا، ہمارا سلام لے کر کہا بیٹھیے بیٹھیے ہم بیٹھ گئے۔ اور پھر وہ صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے۔ میاں حیا جو نقشہ تم لائے ہو، وہ تو میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو کہ سرخ مہروں کو مات ہو گی۔ میں کہتا ہوں نہیں سبز کو ہو گی۔ تم بساط بچھاؤ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں۔ اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آ جائے، یہ سامنے کی دیوار سے نہ جائے گی۔ اس کا جوڑا آئے، بر آئے۔ سکھانند حکیم تھے، رقم تخلص کرتے تھے۔ دھرم پورہ میں رہتے تھے۔ کوئی چالیس سال کی عمر تھی۔ ریختے میں شاہ نصیر کے اور رمل میں خاں صاحب کے شاگرد تھے۔ بڑے خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے۔ اُستاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی باپ کا بیٹا کرتا ہے۔ حکیم صاحب

کی باتیں سن کر بہت خوب، بہت مناسب کہتے رہے۔ ان سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے، ارے بھئی صہبائی تم تو کئی دن سے نہیں آئے، کہو خیریت تو ہے، اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں؟ مولوی صہبائی نے کہا، یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا ہے۔ وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا، بس صاحب مجھے تو معاف ہی کیجیے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب جو اپنی امت کو لے کر چڑھ آتے ہیں۔ شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں۔ مفت میں واہ واہ سبحان اللہ سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت متعفن کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ؎

صائب دو چیز می شکند قدر شعر را تحسین ناشناس و سکوتِ سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ہُد ہُد کو ساتھ لیے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ اُستادوں پر حملہ کراتے ہیں۔ خود تو میدان میں آتے نہیں، اپنے نااہل پٹھوں کو مقابلے میں لاتے ہیں۔ اُس روز جو اُس جانور نے یہ شعر پڑھ کر کہ ؎

مرکزِ محورِ گردوں بہ لبِ آب نہیں ناخنِ قوسِ قزح شبہٴ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھ کو کس قدر ناگوار گزرا۔ غالب کے رنگ میں شعر کہنا تو کجا، وہ یا اُن کے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے میر صاحب تو اُن کی بات دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے۔ بلکہ اُن کی وجہ سے مشاعرے میں کچھ چہل پہل ہی ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے تو اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے۔ میں نے عرض کی کہ اس مشاعرے میں اُستاد ذوقؔ اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظلِ سبحانی کی غزل بھی آئے گی۔ فرمایا ہر شخص مختار ہے۔ چاہے خود آئے چاہے غزل بھیجے۔ میں تو نہ آؤں گا نہ غزل بھیجوں گا۔ یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک کپڑے کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے اُن کو عشق تھا۔ کوئی پسند آتا تو پھر قیمت کی کوئی پروا

نہیں کرتے تھے۔ جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے ایک گٹھڑی مزدور کے سر پر سے اتاری۔ اُس میں سے پٹ ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی۔ وہ لپک کر اُس سے آملی۔ اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے سکھانند صاحب سے کہا۔ کہو میاں رقم تم نے دیکھا۔ انھوں نے کہا جی ہاں ایک خانے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اُس کی معافی چاہتا ہوں۔ کہنے لگے اس کا خیال نہ کرو۔ انسان ہی سے غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو میاں صہبائی مشاعرے کے متعلق تو ہمارا صاف جواب ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین خاں کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا مجھے اس مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے۔ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں۔ اور اب اُن کو زندگی کی اُمید نہیں رہی۔ اُن کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لیں جس میں دہلی کے تمام کاملینِ فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے اُن کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ میں خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صہبائی صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے افسوس ہے کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا میری طرف سے عارف سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صہبائی صاحب، مفتی صدرالدین صاحب اور نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہو گی۔ حکیم صاحب کہنے لگے۔ میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں، اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے راستے میں اُن سے بھی کہتے جاؤ۔ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے؟ مشاعرہ کہاں ہوگا۔ اور طرح کیا ہے؟ میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتہ دیا۔ طرح کے متعلق حضرت جہاں پناہ

کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں۔ جو سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں طرح، نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا کہ جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا۔ مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ کپڑے دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔[۵]

مومن خاں کی یہ تصویر اگرچہ تمام تر خیالی ہے اور اس کو فرحت اللہ بیگ کے تخیّل کی بلند پروازی نے تخلیق کیا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں حقیقت و واقعیت کے گہرے رنگ موجود ہیں۔ یہ تصویر ہو بہو مومن کی تصویر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں نہایت خوش رو اور خوبصورت جوان تھے، اُن کے ایک ایک انداز سے وضع داری ٹپکتی تھی، اُن کے رہن سہن کا انداز امیرانہ تھا اور وہ نہایت شاندار طریقے سے رہتے تھے، اُن کی ہر بات میں سلیقہ تھا، اچھے لوگوں کی صحبت انھیں نصیب تھی، انھیں کی پر لطف اور دلچسپ صحبتوں میں اُن کا وقت گزرتا تھا۔ شطرنج کھیلنے اور نجوم اور رمل میں دلچسپی لیتے تھے۔ انھیں اپنی روایت بہت عزیز تھی۔ اپنے ہم عصروں کی وہ عزت کرتے تھے لیکن اوچھے اور چھچھورے کردار کے لوگ انھیں پسند نہیں تھے۔ دوستوں کا انھیں بڑا خیال تھا، اور اُن کی خاطر وہ بعض باتیں اپنے مزاج کے خلاف بھی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ عام مشاعروں میں جانا انھیں پسند نہیں تھا لیکن احباب کی خاطر وہ قاعدے کے مشاعروں میں شرکت کر لیتے تھے۔ غرض اُن کے مزاج میں برڈا رکھ رکھاؤ تھا۔ روایت کی پاسداری کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ لئے دئیے رہنا اُن کے مزاج میں داخل تھا۔ دوست نوازی اُن کی طبیعت کی بڑی اہم خصوصیت تھی۔ اور یہ سب باتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور لیئے دئیے انداز میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ شاندار طریقے پر زندگی بسر کرنا ان کی طبیعت کا جزو تھا۔ فارغ البالی، امارت اور ریاست کے بغیر اُن کی

---

[۵] فرحت اللہ بیگ: مضامین فرحت حصہ اول: ص ۱۵۷-۱۶۲

شخصیت ان خصوصیات سے آشنا نہیں ہو سکتی تھی۔

بعض لوگوں نے مومن کو سید بتایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ وہ نسلاً پٹھان تھے لیکن اُن کا خاندان مہذب تھا۔ کشمیر میں اُن کے خاندان کی جو حیثیت تھی اور اُن کے بزرگوں کا جو معاشرتی اور تہذیبی ماحول تھا، اُس کا تو علم نہیں لیکن جس وقت سے یہ لوگ دلی میں آکر آباد ہوئے اُس وقت سے انھیں مہذب ماحول ملا؛ اور مومن کے بزرگ خود بھی تہذیب یافتہ تھے۔ اُس زمانے کی معاشرتی زندگی میں اُن کا مرتبہ بلند تھا اور وہ تہذیبی اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اس معاشرتی اور تہذیبی زندگی نے مومن کے بزرگوں میں زندگی کی بلند اور اعلیٰ اقدار کا احساس پیدا کیا؛ اور یہ احساس مومن کو ورثے میں ملا۔ انھوں نے زندگی بھر اُس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی اقدار کو بڑی اہمیت دی۔ اُن کے مزاج میں جو نفاست پسندی تھی، لطیف چیزوں سے جو لگاؤ تھا، جمالیاتی اقدار سے جو نسبت تھی، اور جس نے اُن کی شخصیت کو اتنا رنگین اور پُرکار بنایا تھا، اُس میں اُن کی خاندانی اور نسلی خصوصیات کو بڑا دخل تھا رہن سہن، رفتار و گفتار، وضع و لباس سب کے معاملے میں وہ بڑے نفاست پسند واقع ہوئے تھے، اور ان سب نے مل کر اُن کی شخصیت میں لطافت کا رنگ بھرا تھا۔

ایک اور خصوصیت جو انھیں ورثے میں ملی وہ غیرت مندی اور خودداری ہے اُن کے بزرگ اعلیٰ عہدوں پر فائز ضرور رہے لیکن انھوں نے کبھی درباداری نہیں کی اُن کے خاندان میں اس روایت کا کہیں دور تک پتہ نہیں چلتا۔ مومن نے آنکھ کھول کر یہی ماحول دیکھا۔ مذہب سے دلچسپی بھی اُن کے خاندان میں خاصی تھی اس لئے اُن پر بھی ان حالات کا اثر ہوا، اور وہ درباری ماحول سے ہمیشہ متنفر رہے۔ انھیں اپنی عزت کا ہمیشہ خیال رہا اور انھوں نے اپنے وقار کو ہمیشہ قائم رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس معاملے میں حدود سے متجاوز نہیں ہوئے۔ یعنی اُن کے یہاں غیرت مندی اور خودداری کا احساس کسی ذہنی الجھن کی صورت اختیار نہ کر سکا۔ وہ اس سلسلے میں خاصے متوازن نظر آتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس معاملے میں اُن کے یہاں وہ صورت حال پیدا نہیں ہوئی

ہے جو انحطاط و زوال کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اور جب اپنی عظمت کا احساس افراد کے یہاں اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے اپنی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مومن کی شخصیت میں عجز و انکسار کے عناصر بھی موجود تھے۔ اپنے آپ کو نمایاں کر کے پیش کرنا اور اپنی اہمیت کو واضح کرنا انھیں پسند نہیں تھا۔ بلکہ اس معاملے میں تو وہ خاصے بے نیاز شخص تھے۔ انھوں نے نہ تو کبھی شہرت کی تمنا کی اور نہ کبھی معاشرے میں بظاہر بلند حیثیت حاصل کرنے کے آرزومند رہے۔ اُن کی شخصیت تو بہ ذاتِ خود ایک چھوٹی سی دُنیا تھی جس میں وہ خوش رہتے تھے، اور انھوں نے اپنی ذات کو ایک اچھی خاصی انجمن بنا لیا تھا۔ اسی لئے اُن کی شخصیت کی دنیا بہت محدود نظر آتی ہے لیکن محدود ہونے کے علاوہ اس میں ایک حسن کا پہلو بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ حسن خودداری اور غیرت مندی کا حسن ہے۔ مومن کی شخصیت میں یہ خودداری اور غیرت ضرور ہے لیکن ان کے حدود غرور اور تکبر سے ملے ہوئے نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے عجز و انکسار کا پہلو اس میں نمایاں نظر آتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ مومن کی شخصیت میں تعلّی کا احساس ضرور موجود ہے۔ اور وہ شاعری میں اپنے آپ کو ضرور بلند و برتر ظاہر کرتے ہیں لیکن عام طور پر یہ صورت حال ایسے ہی مواقع پر پیدا ہوتی ہے جب اُن کی خودداری کو ٹھیس لگنے کا امکان پیدا ہوتا ہے مثلاً اپنے فارسی اور اردو قصیدوں میں انھوں نے جگہ جگہ اس تعلّی سے کام لیا ہے۔ کیونکہ دوسرے کی مدح میں کچھ کہنے سے پہلے وہ اپنے بارے میں کچھ کہنا ضرور چاہتے ہیں تاکہ اُن کا احساس خودداری مجروح نہ ہو، اور اس خیال کی خلش اُن کے دل میں باقی نہ رہے کہ انھوں نے کسی کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے فارسی میں ایک قصیدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں لکھا ہے، اُس میں صاف صاف کہتے ہیں کہ مجھے چونکہ تاجداروں سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ اس لئے میں آپ کی نعت پر فخر کرتا ہوں اور یہ کہہ کر اپنی تعریف شروع کر دیتے ہیں ؎

چناں کہ دارم از او صاف تاج داراں عار　　　ز فخر نعتِ تو طرفِ کلاہ می شکنم

منم کہ نیست قرانم بہیچ قرن و زماں   منم کہ نیست نظیرم بہیچ شہر و دیار
نبود و نیست عدیلِ من امتحاں اینک   ز زندگاں لبِ خامہ ز مردگاں اشعار
چناں مقابلِ نظمم بود کلام حسود   کہ سیم قلب بہ پیشِ زرِ تمام عیار
قصایدم حسدش سبعۂ معلقہ را   بہ کعبہ کرد بہ پیشاں چو سبعۂ سیار
دریں زمانہ اش الہام و وہب بنامیم   ز وحی آمدنت گر کسے کند انکار
ہوائے نظمم پیچید در دماغ کسے   کہ صد ہزار گلستاں دمیدش از دستار
چو می رود بہ زبانہا بہ نازکی سخنم   بکام خلق شکست از چہ لذتِ اثمار
صدائے شہرتِ من تا بہ کوہ پیچیدہ   شرر ز سنگ نیامد بروں مگر گلنار
کنوں کہ تیغ زبانم گرفت عالم را   بہ نام ملک ستاناں مثل زنند ادبار
اگر شود ز شرف ہائے نسبتم آگہ   زمانہ را دگر امسال می نگردد یار
ز سوز رشک زبانم زمانہ می سوزد   ز جوش طبع من آبست جوش ہائے بار
غلام فکر لطیفم لطافتِ ارواح   اسیر طبع روانم روانی انہار[1]

اس میں اپنی تعلی کے لئے جو جواز پیدا کیا ہے، اُس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مومن کے یہاں تعلی کا مقصد صرف خود ستائی نہیں ہے بلکہ اپنی خودداری کا اظہار ہے اور ساتھ ہی اس شخصیت کی اہمیت کی وضاحت بھی ہے جس سے وہ عقیدت رکھتے ہیں، اور اس عقیدت کی وجہ سے جس کی تعریف کرنا اُن کے پیشِ نظر ہوتا ہے۔ ایک اردو قصیدے میں اُن کی شخصیت کا یہ پہلو کچھ اس طرح نمایاں ہوتا ہے ؎

مجھ تلک پہنچے ہیں اب وجد سے   در نشتاً نکتہ ہائے لقمانی
مہرِ افلاک عقل و دانش ہوں   فطرتی ہے مری درخشانی
سر طائر کو سمجھے ہے بے پر   مرغ فکرت کی بال جنبانی
وہ خردمند ہوں کہے ہے مجھے   عقل اوّل حکیم لاثانی
ہیں روش دانِ حکم بر جیسی   ہیں ادا فہم سیر کیوانی

---

[1] مومن: دیوان فارسی: ص ۱۴۰

ہوں وہ نباض جس کے ناخن ہیں — حرکاتِ عروقِ شریانی
آئینہ ہے صفا سے دل میرا — کیا ہوا گر نہیں ہے حیرانی
میرے خامے کے جوشِ گریہ سے — روئے دیتا ہے ابرِ نیسانی
سامنے میری تر زبانی کے — نطق الکن حدیثِ سحبانی
میرے ربطِ کلام کو پہنچے — نثرِ سعدی نہ نظمِ سلمانی
جانفزائی مرے سخن کی دیکھ — سَم گنے خضر آبِ حیوانی
میرے زاغِ قلم کی نیم صریر — صد صفیرِ ہزار دستانی
میرے گوہر تمام ناسُفتہ — میرے یاقوت سب بدخشانی
میری نیرنگیٔ تخیل سے — سیمیا گر ہے روحِ نفسانی
میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں — جس کے گھر کا گدا ہے خاقانی
انوری کے بیان میں ہے کہاں — میری تقریر کی سی تابانی
مُلکِ معنی کا شہریار کہے — دیکھ خُسرو مری قلم رانی
میری نسبت سے خاکِ ہند کو ہو — رونق سرمۂ صفاہانی
آج ہوتا کمال تو کہتا — اب تخلص سزا ہے نقصانی

مومنؔ اب ختم کر دعا پہ سخن
تا کجا لاف ہائے طولانی

اور اس کے بعد دعا کرتے ہیں۔ ان اشعار میں بھی مومنؔ نے اپنی تعلّی کے لئے جواز تلاش کر لیا ہے۔ اس تعلّی کا آغاز اپنے بزرگوں کے اُن نکتہ ہائے لقمانی سے ہوتا ہے جو اُن تک ورثتاً پہنچے ہیں، اور جنھوں نے ان کو ایک اعلیٰ درجے کا حکیم بنا یا ہے، پھر اپنے دل کی صفائی کا بیان ہے۔ اور یہ اسباب جن کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو ایک بڑا شاعر اور فن کار بھی ظاہر کرتے ہیں ـــ بہر حال مومنؔ کے یہاں یہ صورتِ خودداری کے احساس ہی کے ہاتھوں پیدا ہوتی ہے کہیں بزرگوں کی عظمت کا خیال اس احساس کو بیدا کرتا ہے کہیں اپنے کردار کی بعض انسانی خصوصیات اس احساس کو بیدار کرتی ہیں۔ اور ان خصوصیات کا وجود

بھی اسی لئے ہوتا ہے کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کے فرد ہیں۔

غرض مومن کی شخصیت میں مادّی زندگی سے جو بے نیازی ہے، اپنی چھوٹی سی دُنیا الگ بنانے اور اُس میں مگن رہنے کا جو خیال ہے، لفاست، لطافت اور خودداری اور غیرت مندی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا جو احساس ہے، وہ انھیں ورثے میں ملا ہے اور انھوں نے ان سب کو اپنی زندگی میں جو اتنی اہمیت دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ماحول اُن کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا اور جس میں مومن کی ذہنی نشو ونما ہوئی تھی اس کے اثرات اُن کے مزاج میں کچھ اس طرح رچ گئے تھے کہ اُن سے دامن چھڑانا ان کے لئے مشکل تھا۔ یہی سبب ہے کہ مومن کی شخصیت میں یہ خصوصیات اتنی نمایاں نظر آتی ہیں۔

(۳)

مومن کو شروع ہی سے صحیح تعلیم کا ماحول ملا۔ اُن کی تعلیم کا آغاز شاہ عبدالعزیز کے مدرسے میں ہوا۔ شاہ صاحب ہی سے اُنھوں نے تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد انھیں شاہ عبدالقادرؒ سے بھی استفادے کا موقع ملا۔ عربی کی ابتدائی کتابیں انھیں شاہ عبدالقادرؒ ہی نے پڑھائیں۔ غرض مومن کو شروع ہی سے ایسے استاد میسّر آئے جو اُس وقت کی علمی، تعلیمی، مذہبی اور روحانی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے، اور جن کی شخصیتوں کا اُس زمانے کی زندگی کے تمام شعبوں پر گہرا اثر تھا۔ ہر شخص کے دل میں اُن کی عزّت تھی۔ اور افراد اُن سے استفادہ کرنے کے خواہش مند تھے۔ مومن کی یہ خوش قسمتی تھی کہ انھیں ایسے بلند مرتبہ اُستاد میسّر آئے۔ اور ان اُستادوں نے انھیں محض رسمی طور پر ہی نہیں پڑھایا، بلکہ اُن کی تعلیم میں پوری دلچسپی لی۔ کیونکہ وہ محض اُن کے اُستاد ہی نہیں تھے، اُن کے والد کے قریبی دوست بھی تھے۔ مومن نے اپنے بچپن کا جو تھوڑا وقت ان بزرگوں کے سائے میں گزارا ہے، اُس کے اثرات اُن کی شخصیت پر بڑے گہرے ہوئے ہیں۔ یہ انھیں شخصیتوں کا اثر تھا کہ انھیں زندگی بھر مذہب اور مذہبی معاملات سے دلچسپی رہی اور وہ وقت کے ساتھ ساتھ اسلام سے زیادہ قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اُس وقت کی جو دینی تحریکیں تھیں، اُن سے بھی اُنھوں نے ذہنی طور پر قربت حاصل کر لی، اور وہ جب تک

زندہ رہے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی سے ہمکنار کرنے کا خواب دیکھتے رہے۔

یہ ابتدائی تعلیم صرف تعلیم ہی نہیں تھی، اُس نے اُن کی ذہنی تربیت کے سلسلے میں بڑا کام کیا۔ انھیں دورانِ تعلیم میں شاہ عبدالقادرؒ سے وعظ سننے کا موقع بھی ملا۔ اوران میں جو نکتے یہ بزرگ بیان کرتے تھے مومنؔ نے اُن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان نکتوں کو سمجھنا سمجھانا اُن کے مزاج میں داخل ہوگیا۔ یہ جو مشہور ہے کہ شاہ صاحب کے وعظ انھیں ازبر ہو جاتے تھے اور وہ اپنے والد غلام نبی خاں کے مطب میں بیٹھ کر ہر روز وعظ کو لفظ بہ لفظ بیان کر دیتے تھے، اِس سے صاف ظاہر ہے کہ مومنؔ کو ان باتوں میں لطف آتا تھا اور وہ اُن سے بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ان بزرگوں کے خیالات سے انھیں نظریاتی طور پر اتفاق ہی نہیں تھا، وہ اُن کو عمل کے سانچے میں ڈھالنا بھی چاہتے تھے، اور اُن کی یہ خواہش تھی کہ یہ خیالات پوری طرح عام ہوں اور تمام افراد میں ان خیالات پر عمل کرنے کا جذبہ بیدار ہو جائے۔ ان خیالات و نظریات نے آگے چل کر مومنؔ کی شخصیت کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالا اور اس میں بعض ایسے رجحانات و میلانات پیدا کیے جن سے اُن کی شخصیت پہچانی جاتی ہے۔

اُن کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں زیادہ تفصیل کا علم نہیں لیکن اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ دینی علوم میں اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ کیونکہ انھیں ایک تو دینی مدرسوں میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا تھا اور دوسرے ایسے علما کی صحبتیں میسر آئی تھیں جو ان علوم کے ماہر تھے، اس لئے انھیں حدیث، فقہ اور منطق وغیرہ سے اچھی خاصی واقفیت تھی لیکن وہ ان علوم کے ماہر نہ ہو سکے۔ کیونکہ ان کا مزاج علمی نہیں تھا۔ کریم الدینؔ نے لکھا ہے کہ "عربی اُنھوں نے شرح ملّا تک پڑھی تھی اور فارسی خوب جانتے تھے"[۱] لیکن اُن کے علاوہ کسی اور نے اُن کے عالم ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ اُنھوں نے خود بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ دینی علوم کے ماہر ہیں اور دوسرے علوم سے بھی انھیں دلچسپی ہے۔ بات یہ ہے کہ مومنؔ کا مزاج عالمانہ نہیں تھا، اُن کی طبیعت کسی ایک جگہ جمتی نہیں تھی۔ وہ محنت نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کا مزاج رومانی تھا اور طبیعت میں ہر وقت ایک بے چینی سی رہتی تھی اسی لئے وہ جم کر مختلف علوم کا مطالعہ

۱؎ کریم الدین: طبقات الشعرا: ص ۲۴۳

نہ کر سکے، اور غور و فکر سے بھی انھیں کوئی سروکار نہ رہا۔ یہی سبب ہے کہ وہ سوچتے بہت کم تھے۔ ان کا احساس تو شدید تھا اور وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کر سکتے تھے لیکن ان باتوں کی فلسفیانہ تحلیل اور ان کی تہہ تک پہنچ کر حقائق کو تلاش کرنا ان کے مزاج میں نہیں تھا۔ چنانچہ اُن کی شخصیت میں یہ عالمانہ رنگ بہت کم نظر آتا ہے۔ اُن کا مزاج مذہبی تھا۔ اس لئے مذہبی اور دینی علوم ہی میں وہ عالمانہ شان پیدا کر سکتے تھے لیکن اُن کی شخصیت میں یہ خصوصیت نہیں ملتی۔ اُنھوں نے دینی اور مذہبی معاملات سے دلچسپی کا اظہار ضرور کیا ہے لیکن اس سلسلے میں اُن کا نقطۂ نظر عالمانہ نہیں ہے بلکہ ایک جذباتی رنگ و آہنگ اس میں نمایاں نظر آتا ہے۔

تھوڑی بہت عالمانہ دلچسپی اگر انھیں کسی علم سے رہی ہے تو وہ طب ہے۔ طب کے بارے میں اُنھوں نے جہاں کہیں بھی کسی خیال کا اظہار کیا ہے اُس میں ایک عالمانہ شان ضرور پائی جاتی ہے۔ اُن کے دیوان میں بعض ایسے قطعات ہیں[۵] جن میں اُنھوں نے طب کی تمام اصطلاحوں کو داخل کیا ہے، اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے طب کے مختلف پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور "یہ نکتہ ہائے لقمانی" اُن تک اگرچہ ورثتاً پہنچے تھے لیکن انھوں نے خود بھی ان پر خاصی محنت کی تھی اور اس علم میں اچھا خاصا کمال حاصل کر لیا تھا۔ "انشائے مومن" میں حکیم احسن اللہ خاں کے نام بعض ایسے خط ہیں جن میں انھوں نے طبی معاملات و مسائل پر بہت تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ اِن میں اُن کا انداز بیان تمام تر عالمانہ ہے، اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومن کو علم طب میں مہارت حاصل تھی اور وہ اس کے ہر پہلو پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مومن چہ شدت کہ رنگ زردے داری　　　دل سوختہ کہ آہ سردے داری
ایں نالہ و دل خراش بیہودہ نیست　　　دردے داری و سخت دردے داری

مواد شوق زیارت بہ تلئین مغز فلوس مداوا خارج نمی یابد چہ چارہ و سدہ اشتیائے پیچ و تاب حسرت دیدار بہ سقمونیائے تقریر دلکشا نمی کشاید چہ تدبیر خونے بہ دل

---

۵ یہ قطعات پہلے باب میں نقل کئے جا چکے ہیں۔

جوش می زند، برص تامہ را در مانے نیست انا ملم حرکت مذبوحی دارد۔ خامہ را جنبش شربانی گو لا علاج ہذیان سرائیہا می کنم شام آدینہ روز شہریور ماہ الٰہی حرارت غریبی عشق شعلہ روئی آتش غریزی را مشتعل کرد وصعود ابخرۂ شوق وصال موے بربدن برخاستہ را منفعل حال آشفتہ بخیال زلف پریشانی درہم گشت قامت از تشنج اعصاب بباد ابروئے خط بہ محراب کعبہ کشیدہ کمان خوش خم دوران سرِ بحسرت مانوس قیامت خرامی بیداد گردش گنبد دوار بباد داد و تلخ کامی وصال شکر لبے شور لاف و گزاف ہلالی بباد و قشعریرۂ اعضار الشکلے متزلزل کرد کہ ہر قطرہ عرق آتش بکانِ سیماب ریخت و ہجوم تہوع مادہ را آں قدر بحرکت آورد کہ زہر لب معدہ برطوبت عنصری برزمین رسیدہ آمیخت۔ غثیان چنداں خلا خواست کہ نیم جانے ہم از تن بیروں رود و خفقان برنگی دل را بیتاب نمودہ کہ وہم رعشہ یقین فلاطون وجالینوس شود، دراں حال کہ از بیقراری نالہ بیمارانہ می کردم، تیمادارے کہ بہ پہلویم چوں درد دل جا داشت بگمان وصیت رقم کردستم بجان کاغذ و قلم زمانے کہ بہ بوئے صنمے عیسیٰ نفس بہ ہوش آمدم وجاں بہ لب رسیدہ باز گشت۔ القصہ نغمہ مرحبا مرحبا و زمزمہ تعال تعال برلب گزشت القصہ چارہ سازم بسر رسید و حال زارم پرسید بے اختیار برزبانم رفت۔ قطعہ ؎

حالِ بیمارِ عشق پرسیدی — زندہ کردی دم مسیحا را
حسد زندگانیٔ مومن — بیگنہ کشت خیلِ ترسا را

اس عبارت میں طب کی اصطلاحات کا استعمال واضح کرتا ہے کہ مومن کو اس علم سے گہری دلچسپی تھی، اور اُن کے سامنے اس کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کی بھی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ یہ علم اُن کی شخصیت کا جزو بن گیا تھا اور وہ زندگی کے کسی پہلو پر اظہار خیال کرتے ہوئے بھی اس کا ذکر چھیڑ دیتے تھے۔

طب کے ساتھ ساتھ جس علم سے انھوں نے عالمانہ دلچسپی کا اظہار کیا وہ نجوم اور رمل ہے۔ وہ اپنی شاعری میں جس بے باکی سے ان علوم کی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں اور جس

اعتماد کے ساتھ ان کے مختلف پہلوؤں کے نشیب و فراز کو واضح کرتے ہیں، اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مومنؔ کو ان علوم پر بھی قدرت حاصل تھی۔ اُنھوں نے محنت کر کے ان علوم کو حاصل کیا تھا اور اُن پر اِن کے تمام اسرار و رموز روشن تھے۔ ان کی زندگی میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اُس زمانے میں اُن کے علاوہ ان علوم کا اتنا بڑا ماہر کوئی اور نہیں تھا۔ اور اسی لئے وہ ان کے مختلف پہلوؤں پر اعتماد کے ساتھ گفتگو کر سکتے تھے۔ تقویم پر جو مفصل دیباچہ اُنھوں نے لکھا ہے اس سے علم نجوم میں اُن کی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ مومنؔ نے یہ تمام علوم صرف دلچسپی کی خاطر حاصل کئے تھے۔ دینی علوم سے تو اُنھوں نے اس لئے دلچسپی لی کہ وہ اپنے نجی ماحول کے ہاتھوں مجبور ہو گئے اور جن حالات میں اُنھوں نے آنکھ کھولی اور جس مخصوص فضا میں اُن کا ذہنی نشو و نما ہوا، اُس میں اِن علوم کے چرچے تھے اور انھیں ایک بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اُس وقت کی بعض اہم شخصیتیں اِن علوم کی علمبردار تھیں۔ مومنؔ نے ان کے اثر سے تھوڑا بہت ان علوم کو حاصل کیا اور ان سے کچھ دلچسپی بھی لی لیکن چونکہ ان کا مزاج خالص مذہبی نہیں تھا اس لئے وہ ان علوم میں کوئی عالمانہ شان پیدا نہ کر سکے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شخصیت میں مذہبی معاملات سے دلچسپی لینے کا میلان تو ملتا ہے لیکن ان معاملات کے مختلف پہلوؤں سے کوئی ایسا لگاؤ نظر نہیں آتا جس کی نوعیت علمی ہو —— طب سے اُنھوں نے محض اس وجہ سے دلچسپی لی کہ وہ اُن کا آبائی پیشہ تھا، اور چونکہ ان کے آباؤ اجداد بڑے طبیب تھے، اور برسوں سے اس علم کو حاصل کرنے کی روایت اُن کے خاندان میں موجود تھی اس لئے اس ماحول نے انھیں اس علم میں کمال حاصل کرنے کے لئے آمادہ کیا، اور اُنھوں نے اس میں خاصی مہارت حاصل کر لی لیکن اس کو کبھی اپنا پیشہ نہیں بنایا۔ نجوم اور رمل سے اُن کی دلچسپی یقیناً عالمانہ بنیادیں رکھتی ہے۔ اُنھوں نے اِن کو مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لئے حاصل کیا۔ اِن کے ذریعے سے وہ انسانی فطرت کو سمجھنا بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ اسی مقصد سے اُنھوں نے اِن علوم میں مہارت حاصل کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اثرات اُن کی شخصیت میں اتنے نمایاں ہیں۔

مومنؔ بعض علوم میں بصیرت ضرور رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ان میں سے بعض پر محنت بھی بہت کی تھی۔ لیکن جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے یہ حقیقت ہے کہ ان کا مزاج بنیادی طور پر علمی نہیں تھا۔ علوم سے زیادہ انھیں فنون سے دلچسپی تھی کیونکہ وہ بنیادی طور پر ایک فن کار تھے۔ شاعری کے فن پر ان کی اچھی نظر تھی۔ بعض لکھنے والوں کا خیال ہے کہ وہ فنِ موسیقی کے بھی ماہر تھے۔ اور انھیں فنون میں ان کا جی لگتا تھا۔ موسیقی کی طرف تو وہ خاطر خواہ توجہ نہ کر سکے۔ چنانچہ اُن کی شخصیت میں اس فن کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ البتہ شاعری کے فن کو حاصل کرنے اور اُس میں مہارت بہم پہنچانے کی طرف اُنھوں نے خاص طور پر توجہ کی ہے۔ اور اسی لئے اُن کی شخصیت میں شاعری کا رنگ شاید سب سے نمایاں ہے۔ اُن کی صورت بھی شاعروں کی سی ہے۔ اپنی حرکات و سکنات سے بھی وہ شاعر معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کا احساس و شعور بھی شاعروں ہی جیسا ہے۔ غرض اول اور آخر وہ ایک شاعر ہیں اور شاعری کے فن سے دلچسپی اُن کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو ہے۔

(۴)

ایک شاعر عام طور پر جذبات کی دُنیا میں رہتا ہے۔ اُس کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے اور اُس میں متاثر ہونے کی صلاحیت عام انسان کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ مومنؔ کی شخصیت میں بھی اسی صورتِ حال کا احساس ہوتا ہے۔ وہ زیادہ حساس نظر آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں انھیں متاثر کرتی ہیں، اسی لئے وہ آسودہ نظر نہیں آتے۔ ذہنی اور جذباتی دونوں اعتبار سے اُن کے یہاں ایک ناآسودگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال نے اُن کے مزاج میں ایک قسم کا تلوّن پیدا کر دیا ہے۔ اور یہ متلون مزاجی اُن کی شخصیت کا جزو بن گئی ہے۔ وہ مضطرب سے نظر آتے ہیں۔ انھیں ایک جگہ پر قرار نہیں۔ کسی جگہ جم کر بیٹھنا ان کے لئے مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت ایک دوڑ سی دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور خوب سے خوب تر کی تلاش میں اُن کی طبیعت رواں دواں معلوم ہوتی ہے کسی نئے افق کی تلاش میں وہ ذہنی طور پر ہر وقت سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی شخصیت میں مرکزیت کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے

نظر آتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہی ہے کہ حقائق کی تلاش اُن کی زندگی کا مقصد ہے ــــ یہ حقائق کی تلاش ہی انھیں کسی ایک جگہ سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ اور اُن کی شخصیت میں اُس اضطراب اور بے چینی کا احساس ہوتا ہے جو عام طور پر شاعروں میں نظر آتی ہے۔

مومن ایک سیلانی مزاج آدمی تھے لیکن مزاج کی یہ سیلانی کیفیت اُن کی طبیعت کی لاأبالی پن کی پیداوار نہیں تھی، زندگی کو دیکھنے اور انسانی فطرت کو سمجھنے کا خیال بھی اس کا محرک تھا۔ مومن سیلانی ضرور تھے لیکن اُن کی طبیعت لاأبالی نہیں تھی۔ اُن کی زندگی میں ایک نظام تھا۔ اور وہ زندگی میں بھی ایک نظام کی بےقاعدگی یا باقاعدگی کا ایک نظام دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لئے اس زندگی کو دیکھنا اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا مشاہدہ کرنا اُن کے مزاج میں داخل تھا۔ اس کام کے لئے وہ ذہنی طور پر باعمل اور فعال تھے؛ اور یہی صورت حال انھیں اِدھر اُدھر لے جاتی تھی۔ یوں اُن کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ نہیں ملتا جو اس بات کو ظاہر کرے کہ وہ ایک جگہ قیام کرنا نہیں چاہتے تھے اور ساری دنیا میں مارے مارے پھرنا ہی اُن کی خواہش تھی۔ وہ اس مزاج کے آدمی نہیں تھے۔ شیفتہ نے گلشن بے خار میں لکھا ہے کہ وہ کبھی دِلّی سے باہر نہیں نکلے۔ دِلّی اور دلّی والوں کی محبت نے انھیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔ "از روز ولادت الی حال بہ سبب مؤالفت جہاں آباد و اہل جہاں آباد بہ جہنے حرکت نہ کردہ"[لہ] اور یہ بات صحیح ہے۔ وہ کبھی دلّی کو چھوڑنے کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لائے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اپنے آپ میں گم تھے، اور انھوں نے اپنی ذات ہی کو ایک دنیا سمجھ لیا تھا، بلکہ اس لئے کہ دِلّی کو وہ اپنی دنیا سمجھتے تھے۔ اور اُس کو چھوڑنا انھیں کسی حال میں بھی گوارا نہ تھا۔ کیونکہ دلّی اُن کے نزدیک زندگی، معاشرت اور تہذیب کی ایک علامت تھی۔ چنانچہ وہ اس محدود دنیا سے باہر جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اُن کی سیلانی مزاجی بس اسی دنیا میں محدود تھی۔ کریم الدین نے اپنے تذکرے طبقات الشعراء میں ایک فقرہ اُن کے بارے میں لکھا ہے جو بظاہر بہت معمولی سا ہے لیکن اس سے اُن کی شخصیت کے اس پہلو پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ مومن کے مزاج کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اکثر شام کو شہر کی سیر کرتے ہیں"[لہ]۔ گویا اُن کی مزاج کی سیلانی کیفیت انھیں

لہ شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۶ لہ کریم الدین: طبقات الشعراء: ص ۴۴۴

شہر نوردی کے لیے مجبور کرتی تھی۔ لیکن اس کا مقصد صرف وقت گزارنا اور دل بہلانا ہی نہیں تھا۔ اس کی تہہ میں زندگی کو دیکھنے اور اُس کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کا خیال بھی کارفرما تھا۔ مومن کی سیلانی مزاجی کا یہی مقصد ہے۔

وہ ایک عالم اور مفکر سے زیادہ ایک انسان اور آدمی ہیں۔ اسی لئے اُن کی شخصیت میں غیر معمولی باتیں نسبتاً کم ہیں۔ اُن کی حرکات و سکنات عام آدمیوں کی سی ہیں۔ اُن میں کوئی چونکا دینے والی بات نہیں ہے۔ وہ عام آدمی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اُنھوں نے خود اپنے آپ کو بھی ایک آدمی کہا ہے اور اس بات پر فخر کیا ہے — ایک قطعہ تاریخ میں جو اُن کے کلیات میں موجود ہے۔ پہلے ایک وزیر بلند پایہ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

اے وزیرِ بلند پایہ تجھے — التفاتِ شہی مبارک ہو
قدرِ عالی و خصلتِ محمود — خان حامد علی مبارک ہو
رفعتِ پایہ روز افزوں ہو — آسماں پائگی مبارک ہو
اُمرائے زمانہ سے ہے تجھے — ہر طرح برتری مبارک ہو
کارگاہِ سپہر سے ہر روز — تجھ کو خلعت نئی مبارک ہو
ذات کرسی ترا مقام بلند — کیا کہوں پالکی مبارک ہو
فیل گردوں مطیع ہے تیرا — فیل تشریف بھی مبارک ہو
تیری دولت سے سب کو بے شش و پنج — ہدیۂ زادہ دہی مبارک ہو

اور آخر میں یہ کہتے ہیں ؎

مومن آیا ہے بزم میں تیری — صحبتِ آدمی مبارک ہو
تہنیت خوانِ کامیابی ہے — صلۂ دوستی مبارک ہو[۱]

یہاں "صحبتِ آدمی" اور "صلۂ دوستی" کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے، اُس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کے نزدیک آدمی ہونا بہت بڑی خوبی ہے۔ اور دوستی بہ ذاتِ خود ایک بہت بڑا انعام ہے۔ مومن اسی آدمی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ اُس کی فطرت کا مطالعہ ہمیشہ اُن کے پیشِ نظر

۱؎ مومن: کلیاتِ مومن: ص ۱۸۱

رہتا ہے، اُس کی نبّاضی اُن کے مزاج میں داخل ہے اور اس سلسلے میں وہ خاصی بصیرت رکھتے ہیں۔ اُن کے مزاج کی جو سیلانی کیفیت ہے وہ درحقیقت اس بصیرت کو حاصل کرنے کی ایک غیر شعوری کوشش ہے جو اُن کی شخصیت پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

مومنؔ انسان اور آدمی کے پرستار اور انسانی فطرت کے نبّاض اور مزاج داں ہیں اسی لئے ان کا مزاج علمی یا عالمانہ نہیں ہے۔ وہ کتابی علم سے ایسی کچھ زیادہ ذہنی مناسبت نہیں رکھتے۔ وہ تو صحیفۂ فطرت کو پڑھتے ہیں۔ اور انسانی زندگی اور انسانی فطرت کے عالم ہیں۔ اس کا اُنھوں نے تجزبی مطالعہ کیا ہے اور اسی لئے اس کے تمام اسرار و رموز اُن پر روشن ہیں۔

اس صورت حال نے مومنؔ کی شخصیت کو ایک انسانی شعور سے آشنا کیا ہے اور اسی کی بدولت وہ ایک بڑے انسان دوست آدمی بن سکے ہیں۔ ان کی شخصیت میں انسانی زندگی سے والہانہ دلچسپی ملتی ہے۔ اس کے تمام پہلوؤں سے ایک لگاؤ نظر آتا ہے۔ وہ زندگی سے بیزار نظر نہیں آتے۔ اُس کو بسر کرنے اور برتنے کا خیال اُن کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ انشائے مومن میں کئی ایسے خطوط ہیں جن میں اُس زمانے کی زندگی اور زمانے کی ناسازگار حالت اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اُس ذہنی کیفیت کا بیان ہے جس سے مومنؔ خود دوچار تھے۔ اُن کی یہ ذہنی کیفیت زندگی کو بسر کرنے اور برتنے کے خیال ہی نے پیدا کی ہے، اور اسی کی بدولت مومنؔ نے انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو سمجھا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی محرومیوں اور مجبوریوں سے واقف ہیں۔ انھیں انسان کی بے بسی کا علم ہے اسی لئے وہ کسی مزید محرومی کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کا خیال یہ ہے کہ جب انسان خود ہی محروم و معذور ہے اور وہ حالات کے مدّ و جزر پر قابو نہیں رکھتا تو اس کو زندگی میں کسی مزید محرومی کو نہیں پیدا کرنا چاہئے۔ اسی لئے وہ زندگی کی مسرّتوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں تاکہ احساسِ محرومی کی یہ خلش اتنی شدت اختیار نہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی کی مسرتوں سے چشم پوشی نہیں کرتے۔ اِن کو نظرانداز کر دینا انھیں اچھا نہیں لگتا اور وہ اس سلسلے میں رواں دواں رہتے ہیں۔ اور اس طرح اُس غم کا احساس کم ہو جاتا ہے جو ساری انسانی زندگی میں جاری

دساری ہے۔ مومن کی شخصیت میں اسی لئے دو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک تو انسانی زندگی سے مسرتوں کو حاصل کرنے کا خیال اور دوسرے اس زندگی کی محرومی اور اس محرومی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غم کا احساس —— اس صورت حال نے انھیں زندگی کا نباض اور انسانی فطرت کا مزاج داں بنا دیا ہے۔ اور وہ مختلف طریقوں سے اس کام میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

مومن کی شخصیت میں صداقت اور اخلاص مندی ہے۔ وہ انسانی زندگی کو انھیں زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ انھیں خود بھی زندگی میں انھیں چیزوں کی تلاش رہتی ہے یہی تلاش انھیں مضطرب رکھتی ہے۔ اور وہ کچھ بے چین سے نظر آتے ہیں۔ اسی اضطراب اور بے چینی نے انھیں سیلانی بنایا ہے۔ اُن کی شخصیت کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی کھوئی ہوئی چیز کی تلاش و جستجو میں مصروف ہیں اور کسی خلا کو پُر کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں۔

اور یہی بات ہے جو ایک اچھے انسان اور سچے شاعر میں ہوتی ہے۔ مومن کے مزاج میں بھی یہی خصوصیات موجود ہیں۔ وہ ایک اچھے انسان اور سچے شاعر ہیں اور ان کی شخصیت میں یہی دو رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ ان رنگوں کے نیچے اُن کی علمیت کا رنگ دب کر رہ جاتا ہے۔ ایک انسان اور شاعر کی طرح وہ زیادہ حساس اور جذباتی نظر آتے ہیں۔ اُن کے مزاج میں ایک تلون کا احساس ہوتا ہے اور ان کی شخصیت ایک سیلانی انسان کی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک سیلانی مزاج شخص عالم اور مفکر نہیں ہو سکتا۔ مومن بھی عالم اور مفکر نہیں ہیں۔ وہ تو ایک سیدھے سادے آزاد منش ہیں۔ اور اُن کی شخصیت میں رندی کا رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔

(۵)

یہ رندی، آزاد منشی اور سیلانی مزاجی مومن کی شخصیت میں ضرور موجود ہے لیکن اس کے باوجود وہ ایک بہت اچھے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں زندگی بھر اپنی ذمے داریوں کا احساس رہا ہے۔ اُن کی شخصیت میں ایک اچھے انسان، ایک اچھے دوست، ایک اچھے

شاعر، ایک اچھے مُرید اور شاگرد کی بہت سی خصوصیات نظر آتی ہیں۔

ان کا طرزِ عمل زندگی بھر متوازن انسانوں کا سا رہا ہے۔ اُنھوں نے زندگی سے محبت کی ہے۔ وہ اُس کے کسی پہلو سے بھی بیزار نہیں ہوئے ہیں۔ اُس کی مسرتوں کو اُنھوں نے حاصل کرنا چاہا ہے۔ اس کے لطیف پہلوؤں سے انھیں گہری وابستگی رہی ہے اُنھوں نے زندگی میں کچھ معیار قائم کئے ہیں اور انھیں معیاروں کو زندگی سمجھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے یہاں بڑے رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بہت لئے دیئے نظر آتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کا طرزِ عمل عام انسانوں کا سا ہے لیکن ایک عام انسان جس طرح کبھی کبھی نیچے گرتا ہے، یہ گراوٹ مومن کے یہاں نہیں ملتی۔ بات یہ ہے کہ مومن انسان اور انسانی زندگی کا ایک مثالی تصور رکھتے ہیں۔ اور حتی الامکان اُنھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ یہ مثالی تصور اُن کی شخصیت میں ایک عملی صورت اختیار کر سکے، اس کا اثر یہ ہے کہ اُن کے اقوال و افعال ڈھلے ڈھلائے معلوم ہوتے ہیں۔ اُن میں کسی قسم کے ڈھیلے ڈھالے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ اُن کی انسانیت اور انسان دوستی میں مثالیت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے کردار میں جو محبت نظر آتی ہے، وہ جس طرح خلوص کا اظہار کرتے ہیں، خودداری کو اُنھوں نے جس طرح عزیز رکھا ہے، لفاست اور لطافت کو انھوں نے جو اتنی اہمیت دی ہے، معیاروں اور قدروں کا جو انھیں اتنا خیال رہا ہے، وہ اُن کی مثالیت پسندی کا نتیجہ ہے —— اور اُس میں شبہ نہیں کہ اُن کی شخصیت میں ایک انسان کی بہت سی مثالی خوبیاں موجود ہیں۔

اُن کی زندگی کے حالات بتاتے ہیں کہ اُنھوں نے کبھی کسی انسان کو تکلیف نہیں پہنچائی۔ وہ کبھی کسی سے خواہ مخواہ نہیں اُلجھے۔ اُنھوں نے کبھی کسی کو بُرا بھلا نہیں کہا، کسی کی ہجو نہیں لکھی۔ کسی کا دل نہیں دکھایا، کسی پر اعتراضات نہیں کئے، کسی کی غلطیاں نہیں نکالیں، کسی کی بیجا خوشامد نہیں کی، کسی کو خواہ مخواہ آسمان پر نہیں چڑھایا، کسی کی بلا وجہ تعریفیں نہیں کیں —— یہ سب باتیں اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ وہ ایک اچھے انسان تھے، اور اُن کی شخصیت میں انسان دوستی کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔

سیلانی مزاجی کے باوجود مومن کو اپنے خاندان اور گھر سے بڑی دلچسپی تھی۔ اُنھیں بچپن

ہیں اپنے والدین سے بہت لگاؤ رہا۔ وہ اپنے والد سے بڑی محبّت کرتے تھے۔ اس کا اظہار اُنھوں نے اپنے ایک خط میں کیا جو "انشائے مومن" میں شامل ہے۔ یہ خط انھوں نے اپنی پھوپھی یعنی حکیم احسن اللہ خاں کی والدہ کے نام لکھا ہے۔ اس خط سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنے والد کے انتقال کا انھیں بہت صدمہ ہوا، اور اُن کے اُٹھ جانے سے انھوں نے اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا محسوس کیا۔ اُن کی وفات پر اُنھوں نے جو قطعاتِ تاریخ لکھے ہیں، اُن سے بھی اُس گہری عقیدت اور وابستگی کا اظہار ہوتا ہے جو انھیں اپنے والد کے ساتھ تھی۔ اپنی پھوپھی سے وہ تعلق خاطر رکھتے تھے۔ "انشائے مومن" میں جو خطوط اُن کے نام ہیں، اُن کے ایک ایک لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُنھیں اُن کی ذات کے ساتھ بے اندازہ عقیدت تھی۔ اور وہ اُن کی بڑی عزت کرتے تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں سے بھی وہ بڑی محبت کرتے تھے۔ "انشائے مومن" میں بیشتر خطوط انھیں کے نام ہیں، اور اُن سے یہ صاف ظاہر ہے کہ انھیں اُن کی ذات کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا ــــ وہ اُنھیں بہت چاہتے تھے۔ اور اُنھیں اپنا مونس و دمساز سمجھتے تھے۔ اسی لئے انھوں نے اُن پر اپنے دل کا حال ظاہر کر دیا ہے۔ جو کچھ اُن پر بیتی ہے۔ جو کچھ اُنھوں نے محسوس کیا ہے، اُس کی وضاحت ان خطوں میں کر دی ہے جو وقتاً فوقتاً انھیں لکھے ہیں ــــ ان خطوط کے ایک ایک لفظ سے محبت ٹپکتی ہے اور خلوص کا اظہار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ اُنھوں نے اپنے لڑکے اور لڑکی کو جو خطوط لکھے ہیں اُن سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک شفیق باپ تھے اور اپنی اولاد سے اُنھیں بڑی محبت تھی۔

حکیم احسن اللہ خاں کی والدہ کو لکھتے ہیں:۔

"قبلۂ مومن وفاپرست سلامت خرد ادب آموز دستورے نمی دہد کہ لفظ آداب تسلیمات بزنگارم و پایہ شناسی دست از درکِ فلک تازبار نمی دارد کہ حدیثِ شوق پابوس برزبان آرم ــــ"[۵]

قبلۂ مومن بے گناہ سلامت چوں چشم بینائی نیست۔ سرمہ سائی میل قلم

---

[۵] مومن: انشائے مومن: ص۲۹

جاں فرسائی ست وتا گوش شنوائی نے صریر آرائی خامہ ہمہ ہرزہ درائی ندانم چہ کنم۔ ادب از تن زدن در فریاد است وجرأت از نفس در گلو شکستن نالہ ایجاد۔ اگر ہمہ حرف گستاخانہ بر لب گزرد بمبادرت زبان بریدن برابر نباشد واگر جملہ حدیث بے باکانہ عرض رود بشوخی دم در کشیدن ہمسر نے[۵۱]

حکیم احسن اللہ خاں کو لکھتے ہیں :-

"والا نامہ گرامی برادر سخن شناس نکتہ دانم کہ بہ نام مومن ہیچ میرز رقم زدہ فرمان رسان است تا مسودہ ہائے پریشان تراز حال زارم دفتر دفتر فراہم آرم۔ در رسم ارمغان بعالی خدمت تربیت یافتگاں جناب فطانت مآبش ارسال دارم ۔۔"[۵۲]

"گرامی برادر مومن بیکس سلامت از دیر باز دل می خواست کہ نامہ رسانی و پیغام گزاری نیست، بر جان ناتوانم گزارد وہر سو بحسرت می دیدم کسے نگاہ نمی کرد وتسکین دل بآں دادہ بودم کہ خود بر آستاں والایت غم نامہ دوری می رسانم ۔۔"[۵۳]

اپنے بیٹے کو لکھتے ہیں :-

"راحتِ جانِ من ! از ریختہ خامہ ارادت نگار دریافتم کہ درد گردہ بہ آن جان نازنیں آزار ہا دادہ وبے دردی ہا بکار بردہ وہنوز صحتِ کامل حاصل نیست از درد دل خویشتن چہ شرح دہم۔ شرم جان فدانہ کردن وبانیم جانی زیستن دستور نمی دہد بہ حکیم جاں بخش سوگند کہ ازاں ہنگام کہ ایں خبر آسیب رسان سمع شدہ دوردے بگوش رساندہ دلم چناں بدرد آمدہ است کہ دوروزہ زندگانی کردن دشوار افتادہ ۔۔"[۵۴]

اور اپنی بیٹی کو لکھتے ہیں :-

"لختِ جگر سلمہا ! عریضۂ ایشاں حرزِ جاں کردم۔ ہرچہ بہ مقتضائے سعادت مندی

---

۵۱ مومن : انشائے مومن : ص ۳۵
۵۲ مومن : انشائے مومن : ص ۱۸
۵۳ مومن : انشائے مومن : ص ۱۱۹
۵۴ مومن : انشائے مومن : ص ۶۶-۶۷

از آرزوئے خویشتن حوالۂ قلم شدہ پذیرا آمد و باعث فرحت خاطر و انبساط روان گشت لحظہ نیست کہ یاد شما جاگیر دل نباشد چشم بشوق دیدار ہر سو نگراں است و دل بہ ذوق در آغوش شفقت کشیدن طپاں بدن است[1]

ان تحریروں میں کتنی محبت اور کیسا خلوص ہے! ۔ مومن کی شخصیت میں یہ محبت اور خلوص کے پہلو کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ انھیں اپنے عزیزوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ ان سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور جہاں تک ان کی زندگی کے اس پہلو کا تعلق ہے وہ بہت خوشگوار تھی۔

جہاں تک ان کی گھریلو زندگی کا تعلق ہے۔ اس میں بھی وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی ازدواجی زندگی میں کسی الجھن کا پتہ نہیں چلتا۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی پہلی شادی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ مومن کی پہلی بیوی سردھنہ کی تھیں۔ اور دلّی کے ماحول سے ان کا مطابقت پیدا کرنا مشکل تھا۔ اس لئے انھوں نے دلّی میں رہنا پسند نہ کیا، اور وہ اپنے گھر واپس چلی گئیں۔ دوسرے مومن کے خسر عظیم اللہ بیگ کسی زمانے میں سعد قلی بہادر کے متوسلین میں رہے تھے اور سعد قلی خاں مومن کے خاندان کے غلاموں میں سے تھے۔ یہ بات مومن کو ناپسند تھی۔ تیسرے ایک بات یہ بھی ہے کہ سسرال والوں سے اُن کے تعلقات خراب رہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خسر عظیم اللہ بیگ کمیدان نے مومن کی والدہ کی شان میں کچھ گستاخی کی تھی۔ مومن نے اپنے خطوط میں ان واقعات کی طرف اشارے کئے ہیں ___ بہرحال اسباب کچھ بھی ہوں واقعہ یہ ہے کہ مومن کی پہلی شادی کامیاب نہ ہو سکی۔ لیکن دوسری شادی جو خواجہ میر دردؔ کے نواسے خواجہ محمد نصیر کی بیٹی انجمن النساء بیگم سے ہوئی وہ کامیاب رہی۔ مومن نے زندگی بھر اپنی بیوی کا خیال رکھا۔ کئی اولادیں بھی ہوئیں بیوی بچوں کی دیکھ بھال میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے اور انھوں نے اس سلسلے میں خاصی مستعدی کا اظہار کیا۔ اُن کی گھریلو زندگی خوشگوار رہی اور اس سلسلے میں کبھی کوئی الجھن پیش نہیں آئی۔ اپنے فرائض کو ادا کرنے میں بھی وہ کبھی پیچھے نہیں رہے۔ اپنے بیوی بچوں سے انھیں بڑی محبت تھی۔ اور وہ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں سے اس

---

[1] مومن: انشائے مومن، صفحہ ۱۶۰-۱۶۱

حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ گھریلو زندگی انھیں بہت پسند تھی ؛ اور اس معاملے میں انھوں نے کبھی لاپروائی نہیں برتی۔ غرض مومن ایک اچھے شوہر، اور ایک شفیق باپ بھی تھے — اُن کی شخصیت کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے۔

اس کے علاوہ مومن دوستوں کے بہت اچھے دوست بھی تھے۔ اُن کا حلقۂ احباب بہت زیادہ وسیع تو نہیں تھا لیکن جو تھوڑے سے لوگ اُن کے احباب میں شامل تھے۔ اُن کے ساتھ ہمیشہ انھوں نے خلوص برتا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے۔ اُن کے ساتھ مومن کو بڑی محبت تھی۔ اُن کی زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ وہ کسی دوست سے ناراض ہوئے ہوں۔ اُن کے تعلقات تمام احباب سے ہمیشہ خوشگوار رہے اور کبھی کسی سے ناچاقی نہیں ہوئی۔ انھیں تعلقات کا بڑا خیال رہتا تھا، دوستی کو وہ بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ایک دفعہ جس سے تعلقات قائم ہو جاتے وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُن کا دوست ہو جاتا۔ لیکن یہ تعلقات قائم بڑی مشکل سے ہوتے تھے۔ اُن کے پاس دوستی کا ایک معیار تھا۔ جو لوگ اس معیار پر پورے اترتے تھے انھیں سے اُن کی دوستی ہو سکتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ مومن کے جتنے احباب بھی تھے، وہ ہر اعتبار سے بلند اور برتر شخصیتوں کے مالک تھے۔ اُن کی معاشرتی اور تہذیبی حیثیت بلند تھی۔ علم و ہنر کے میدان میں بھی وہ اہمیت رکھتے تھے فارسی خطوط میں انھوں نے اپنے بعض احباب کا ذکر کیا ہے — اس سے ان کی شخصیتوں پر خاصی روشنی پڑتی ہے — ان احباب میں تفضل حسین خاں، منشی امیر علی سندیلوی، منشی کرم احمد اور حکیم احسن اللہ خاں خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ حکیم احسن اللہ خاں اُن کے پھوپھی زاد بھائی بھی تھے لیکن اُن سے اُن کی دوستی بھی تھی۔ اسی طرح بعض شاگردوں سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ان میں حکیم سید منور علی آشفتہ، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ، میر عبدالرحمٰن آہی، نواب اصغر علی خاں نسیم، نواب محمد اکبر خاں، میر حسین تسکین اور حکیم سکھانند راقم وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ان سب نے اُن سے مشورۂ سخن کیا لیکن اُن سے تعلقات کی نوعیت دوستانہ تھی۔ مومن ان سب کی عزت کرتے تھے۔ اور ان کے دل میں بھی مومن کی بڑی عزت تھی۔ اُن کی دوستی میں بڑا خلوص تھا۔ معمولی سے تعلقات انھیں کسی شخص کا گرویدہ بنا دیتے تھے۔ مثلاً کریم الدین سے اُن کی باقاعدہ

دوستی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ مومن کی سطح کے آدمی نہیں تھے۔ پھر بھی اُن کے ساتھ تعلقِ خاطر تھا اور مومن انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ چنانچہ جب اُن کا تذکرہ گلدستہ نازنیناں شائع ہوا تو مومن نے اُس کی تاریخ کہی اور اس تاریخ میں انھیں بہت سراہا۔ یہ قطعۂ تاریخ اس تذکرے کے آخر میں درج ہے۔ اشعار یہ ہیں ؎

اُس سے کہ جس کا نام بھی اور ذات بھی کریم
تالیف ایک بیاض معانی نثار کی

دِقت پسند طبع کی یہ موشگافیاں
جالی ہے عقل شانۂ گیسوئے یار کی

دیکھے جو اس کتاب میں الفاظ گرم گرم
شمع زباں دراز نے چپ اختیار کی

اشعار عیش و صل کے آئے ہیں جب نظر
حالت بدل گئی ہے دلِ بے قرار کی

مضموں اس میں طعنۂ گردوں کے آگئے
عزت بڑھی زمانۂ بے اعتبار کی

فخر اک ردائے کوچۂ اشعار آب دار
مٹی خراب ہے گہرِ شاہوار کی

کوئی تو لے گیا تھا یہ گلدستہ باغ میں
بلبل کی وہ نوا ہے نہ رونق بہار کی

رنگینیٔ سخن ہی کا چرچا ہے ہر کہیں
یہ وجہ زردیٔ رخِ ہر گل عذار کی

از رنگِ نقش علم سُنی ہے سروش سے
تاریخ اس صحیفۂ معجز نگار کی

۱۲۶۱ھ

اور اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مومن نے یہ تعریف صرف اخلاص مندی کی وجہ سے کی ہے اور صرف محبت کی وجہ سے اس کتاب کو اتنا سراہا ہے۔ غرض مومن اپنی دوستی میں سچّے تھے اور خلوص تو گویا اُن کی گھٹی میں پڑا تھا۔ اس کے اثرات اُن کی عاشقی میں بھی نظر آتے ہیں، اُن کا عشق سچّا تھا۔ وہ اس معاملے میں بڑے پرخلوص تھے۔ ایک زمانہ اُن کی زندگی میں ایسا ضرور گزرا ہے جب عشق و ہوس میں امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے لیکن صداقت اُن کے ایک ہی عشق میں نظر آتی ہے۔ اس کی جھلک اُن کی شخصیت اور شاعری دونوں میں نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ جن شخصیّتوں سے انھیں روحانی وابستگی رہی ہے، اور جن کو انھوں نے اپنا پیر و مُرشد بنایا ہے۔ اُن کے ساتھ بھی وہ ہمیشہ خلوص سے پیش آئے۔

اور اُن کی زندگی کے یہ تمام پہلو اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اُن کی شخصیت میں

ایک اچھے انسان کی تمام خصوصیات موجود تھیں۔ وہ بظاہر تو ایک رند تھے اور ان کی طبیعت میں سیلانی پن تھا۔ لیکن اس کے باوجود انھیں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے محبت تھی۔ اپنے احباب کے ساتھ خلوص تھا۔ وہ اپنی محبت میں سچے تھے۔ اپنے بزرگوں کے ساتھ انھیں وابستگی تھی — اور یہی وہ خصوصیات ہیں جو اچھے انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ مومن کی شخصیت میں ان خصوصیات کا رنگ رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

(۶)

مومن کے مزاج میں رنگینی تھی۔ وہ طبعاً عاشق مزاج تھے۔ چنانچہ اُن کی شخصیت میں اس رنگینی اور عاشق مزاجی کا رنگ بھی بہت نمایاں نظر آتا ہے۔ اُن کی زندگی عشق و ہوس سے عبارت تھی۔ رندی اور شاہد بازی کو انھوں نے اپنا مزاج بنالیا تھا۔ اس کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتے تھے۔ اسی لئے زندگی کے خاصے بڑے حصے میں وہ رند شاہد باز اور ایک رنگین مزاج عاشق رہے ہیں۔ انھوں نے اس کو بُرا نہیں سمجھا ہے۔ اس سلسلے میں جو واقعات انھیں پیش آئے ہیں، اور جن معاملات سے سابقہ رہا ہے، اُن سب کو بیان کرنے میں انھوں نے کبھی کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کی ہے۔ انھوں نے کئی عشق کئے ہیں، اُن کی تفصیل انھوں نے اپنی مثنویوں میں پیش کردی ہے — ان میں سے ایک عشق اُن کے لئے بہت روح فرسا ثابت ہوا ہے — اور یہی عشق درحقیقت اصل عشق تھا۔ بقیہ عشق کے واقعات فروعی حیثیت رکھتے تھے — بہرحال اُن کی عشقیہ زندگی سے اس حقیقت پر روشنی ضرور پڑتی ہے کہ انھوں نے بڑی رنگین زندگی بسر کی اور اپنا خاصا وقت عشق و عاشقی میں گزارا — اُن کی مذہبیت اور دین داری بھی ان راہوں میں حائل نہ ہوسکی۔ کاروبارِ شوق کے سلسلے جاری رہے اور لذت و تعیش سے انھوں نے کبھی بھی منہ نہیں موڑا۔ اور اس سلسلے میں انھیں عجیب عجیب حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اُن کے دیوان میں بعض ایسے قطعات ہیں جن سے اُن کی شخصیت کے اس پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایک قطعے میں اپنا حال اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے — کہتے تھے مومن اور بہت دین دار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں — جو تھا سو اُس کو دیکھ کے زار و نزار تھا

عبرت کی جا ہے ان صنموں نے کیا خراب / ملنے سے جن کے معتقد ننگ و عار تھا
بیمار کر دیا شبِ ہجرِ بتاں نے آہ / کیا ہو گئے وہ روز کہ پرہیزگار تھا
یا تو ہمیں ڈراتے تھے خورشیدِ حشر سے / یا اپنے سر پہ داغِ جنوں شعلہ بار تھا
اختر شماریٔ شبِ غم نے بھلا دیا / جتنا خیال پرسشِ روزِ شمار تھا
ہر اِک طرف نگہِ بے کسانہ تھی / کس کی نگاہِ لطف کا اُمیدوار تھا
ہمت سے اور ناز اُٹھانے کی آرزو / باقی تھی گو کہ ضعف سے جینا بھی بار تھا
ہر دم ہوائے آہ سے اُڑتی تھی مُنہ پہ خاک / جتنی کہ سر میں گرد تھی دل میں غبار تھا
زخموں میں بس کہ مشک بھرا تھا میں کیا کہوں / عالم بدن کا اُس کے عجب لالہ زار تھا
آنکھوں سے چند جدولِ خونناب تھیں رواں / چہرہ جو ناخنوں سے سراپا فگار تھا
نے راحت و فراغ نہ آسائش و شکیب / نے طاقت و تواں نہ سکون و قرار تھا
بے ہوش و بے حواس و بے آرام و بے قرار / بے صبر و بے تحمل و بے اختیار تھا
کیا کشمکش نے دونوں کو بے حال کر دیا / نہ زور ہاتھ میں نہ گریباں میں تار تھا
جنبش بھی تھی محال تڑپنا تو اک طرف / کاہیدہ جسم ضعف سے کوہِ وقار تھا
ہو خود ہی بے حواس تو احوالِ دردِ دل / کس سے کہے خبر ہی نہیں کون یار تھا
گو ہاتھ سے اشارہ نہ تھا نے زباں سے بات / تو بھی تو حالِ دست و زباں آشکار تھا
اس واسطے کہ خاک پر انگشت دست سے / لکھے بحالِ بندہ خدایا نگار تھا
اور اک یہ شعر شعلہ فشان و زبانہ زن / تبخالہ ریزِ کام و وہاں بار بار تھا

آغاز کارِ عشق میں انجامِ کار تھا
میں کیوں فنائے ہستیٔ بے اعتبار تھا

ان اشعار سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے عابد و زاہد اور دین دار ہونے کے باوجود عشق و عاشقی کے کوچے میں قدم رکھا، اور وہ اس راہ میں خوب خوب خراب ہوئے۔ صنموں نے اُن کا بُرا حال کر دیا۔ ہجرِ بتاں کا روگ اُن کی جان کو لگ گیا اور اُن کے شب و روز اسی طرح گزرنے لگے۔ مزاج کی رنگینی ہی نے انھیں اس عشق و عاشقی کی طرف راغب کیا۔ طبیعت کی

لذت پسندی اس کی محرک ہوئی۔ ہر چند کہ اس عشق کے نتائج وہی ہوئے جو عام طور پر ہوتے ہیں یعنی محرومی اور ناکامی۔ اس کا شکوہ بھی مومن نے کیا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُن کی رنگین مزاجی نے انھیں اس عشق و عاشقی کی طرف متوجہ کیا۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے عشق میں اعلیٰ معیار نہیں ملتے، اُن کی حد یں ہوس سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ایک ایسا شخص کسی ایک عشق پر اکتفا نہیں کر سکتا۔ وہ کئی کئی عشق کر سکتا ہے۔ مومن نے بھی کئی عشق کئے ہیں۔ اور اس طرح خاصی رنگین زندگی گزاری ہے۔ اُن کی شخصیت کے اس پہلو کی جھلک اُن مثنویوں میں نظر آتی ہے۔ جو اُن کے کلیات میں موجود ہیں۔

"شکایت ستم" (۱۲۳۱ھ) اُن کی پہلی مثنوی ہے جس میں اُنھوں نے اپنے پہلے عشق کی تفصیل پیش کی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ بچپن ہی سے اُن کا مزاج عاشقانہ تھا۔ چنانچہ ایک لڑکی کو دیکھا، اُس سے عشق ہو گیا۔ اس وقت اُن کی عمر زیادہ نہیں تھی کچھ عرصے اس محبوبہ سے خوب خوب ملاقاتیں رہیں لیکن بالآخر وہ مر گئی۔ مومن کو اُس کے انتقال کا بہت غم ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد ایک ہمسائی نے دل لبھایا، ابھی وہ اُس سے لطف لے ہی رہے تھے کہ ایک اور محبت کا آغاز ہوا لیکن اس میں اُنھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد ایک اور سلسلہ شروع ہوا لیکن اس میں بھی وہ ناکام رہے۔ اس کا بیان اُن کی دوسری مثنوی قصۂ غم (۱۲۳۵ھ) میں موجود ہے جب یہ قصہ ختم ہوا تو اُن کا وہ عشق شروع ہوا جس کی داستان اُنھوں نے قول غمیں (۱۲۳۶ھ) میں لکھی ہے یہی صاحب جی کا عشق تھا جس نے اُن کی زندگی اُجاڑ کر رکھ دی۔ وہ صاحب جی کے علاج کے لئے بلائے گئے تھے لیکن جان کو عشق کا روگ لگا لیا۔ اور اس طرح بیمار ہوئے کہ اچھے ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ اُن کے ساتھ کچھ وقت بہت اچھا گزرا لیکن بالآخر صاحب جی کو پورب کی طرف بھیج دیا گیا، اور وہ اُن کے فراق میں زندگی کے دن گزارتے رہے لیکن آرزوئے وصلِ صنم اور حسرت ہوس رانی اب بھی باقی رہی۔ چنانچہ ایک شادی کے موقع پر اُنھوں نے کسی کو دیکھ لیا اور اُس کو دل دے بیٹھے لیکن اس میں بھی اُن کو کامیابی نہ ہوئی اور وہ اُس کے فراق میں بیمار رہنے لگے۔ اس واقعے کو اُنھوں نے اپنی مثنوی تف آتشیں (۱۲۴۱ھ) میں بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ایک محبوبہ سے اُنھوں نے اور دل لگایا لیکن وہ اُن کے جال میں نہ پھنسی اور اس طرح

یہ قصہ بھی ختم ہوگیا۔ اس کی تفصیل "حنینِ مغموم" (۱۲۴۴ھ) میں موجود ہے۔ "آہ و زاریِ مظلوم" (۱۲۴۶ھ) اُن کی آخری مثنوی ہے۔ اس میں بھی ایک محبوبہ کا ذکر ہے جس نے اُن کی طرف توجہ نہیں کی۔۔۔۔ غرض مومن نے کئی عشق کیے ہیں، اور جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا زندگی کا خاصا حصہ اس عشق و ہوس کی نذر کر دیا ہے لیکن کسی ایک عشق میں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ جہاں بھی انھوں نے دل لگایا ہے وہاں اُنھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔

مومن نے جتنے عشق بھی کیے ہیں، اُن میں عشق و عاشقی کے اعلیٰ معیاروں کا پتہ نہیں چلتا وہ تو اُن کی تعیش پسندی اور ہوس پرستی کا نتیجہ معلوم ہوتے ہیں۔ اُن کی جوانی دیوانی تھی۔ اس دیوانی جوانی نے انھیں عشق کے کوچوں میں قدم رکھنے پر مجبور کیا ہے، اور اس سے اُن کا مقصد اچھا وقت گزارنا معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُس کو عیب بھی نہیں سمجھتے تھے۔ جیسے یہ سب کچھ ایک انسان کے لئے فطری بات تھی۔ اسی لئے اُن کی عشقیہ زندگی میں کسی جھجک کا پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ بعض معاملات کو پیش کرنے میں تو وہ خاصے بے باک ہوگئے ہیں، اور انھوں نے شرم و حیا کو بالکل ہی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے کی ایسی ایسی تفصیل پیش کی ہے کہ جس کو دیکھ کر عقل حیران اور ناطقہ سر بگریبان رہ جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ مومن کے زمانے میں یہ باتیں معیوب نہیں سمجھی جاتی تھیں۔ ہر چند کہ اُس زمانے میں مذہبی نشاۃ الثانیہ کی ایک تحریک موجود تھی۔ مومن کو خود اس تحریک سے لگاؤ تھا۔ اس تحریک کے علمبرداروں کے ساتھ وہ جذباتی وابستگی بھی رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود اُس زمانے کی معاشرت میں تعیش کا دور دورہ تھا۔ امراء و رؤسا خاصے ہوس پرست تھے۔ وصالِ یارانِ رنگین اور وصلِ شاہدانِ شیریں میں لوگوں کی عمریں گزر جاتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کرتے تھے۔ شیفتہ نے مومن کی شخصیت کے اس پہلو کو بڑے فخریہ انداز میں پیش کیا ہے۔ دلّی سے انھیں جو محبت تھی اس کا ذکر کرتے ہوئے گلشنِ بے خار میں لکھتے ہیں: "از روزِ ولادت الی حال بسبب موالفت جہاں آباد و اہلِ جہاں آباد بسمتے حرکت نہ کردہ۔ بہ وصلِ یارانِ رنگین و بہ وصالِ شاہدانِ شیریں عمرے خوش می گزارد۔"[۵۱] خود شیفتہ کی زندگی میں ایسے بہت سے واقعات ہیں۔

۵۱؎ شیفتہ: گلشنِ بے خار: ص ۱۹۶

اپنی محبوبہ رجو کا ذکر انھوں نے اسی تذکرے میں مزے لے لے کر کیا ہے، اور اُسے اعلیٰ درجے کی شاعرہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مومن اسی ماحول کے فرد تھے۔ اس لئے انھوں نے جو کچھ کیا ہے وہ سب اُس ماحول کے اثر سے کیا ہے جس میں انھوں نے زندگی بسر کی ہے اُن کا تعلق اُمرا، کے طبقے سے تھا۔ وہ بڑے خوش رو اور خوش پوش نوجوان تھے۔ اُس زمانے کے عیش پرستانہ اور لذت پسندانہ ماحول نے اُن کے جذبات عشق و ہوس کو بھڑکایا اور وہ آرزوئے وصلِ صنم اور حسرتِ ہوس رانی کے زیر اثر کوچہ گردی کرنے لگے اور اُن کی زندگی کا بیشتر حصہ وصل یارانِ رنگین اور وصالِ شاہدان شیریں میں گزر گیا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے جگہ جگہ کی خاک چھانی۔ تلاش و جستجو میں گھومے کہیں انھیں کامیابی ہوئی، کہیں وہ کامیاب ہو سکے بہرحال انھوں نے اس سلسلے میں جو کچھ کیا وہ اس زمانے کے مخصوص معاشرتی اور تہذیبی ماحول کے اثر سے کیا۔ اُن کی شخصیت ایک اجتماعی پہلو بھی رکھتی تھی اور اُس میں اُس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا پرتو بھی نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مومن کے مخصوص معاشرتی ماحول نے انھیں بڑی حد تک عشق و ہوس کی دنیا کا پرستار بنایا ہے اور اس طرح اُن کی شخصیت میں رنگینیوں کا رنگ بھرا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس میں اُن کی مخصوص اُفتادِ طبع اور ذہنی رجحان کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مومن کی شخصیت میں دو باتیں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ ایک تو اُس مذہبی ماحول کا غیر شعوری ردِ عمل جس سے آنکھیں کھولتے ہی انھیں دوچار ہونا پڑا۔ دوسرے نفسیاتی طور پر وہ خلا جو بعض محرومیوں اور ناکامیوں نے اُن کی زندگی میں پیدا کیا۔ مومن کی زندگی کے واقعات یہ بتاتے ہیں کہ انھیں بچپن میں خاصا مذہبی ماحول ملا، خود اُن کے والد بڑے مذہبی آدمی تھے۔ اُن پر شاہ عبدالعزیزؒ اور شاہ عبدالقادرؒ جیسے بزرگوں کا اثر تھا۔ اس لئے انھوں نے مومن کو بھی ایک مذہبی آدمی بنانے کی کوشش کی۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے مدرسے میں داخل کیا گیا۔ وہاں کے مذہبی ماحول نے انھیں مذہب سے قریب کیا، اور اُن کی دلچسپی مذہبی معاملات سے اس حد تک بڑھی کہ وہ شاہ صاحب کے وعظ بھی سننے لگے۔ اس کا ایک غیر شعوری ردِ عمل اُن کی شخصیت میں

ملتا ہے۔ کچھ عرصے تک تو وہ اس مذہبی ماحول سے دلچسپی لیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں لیکن اُس کے بعد وہ مذہب کو خیرباد کہہ کر عشق و ہوس کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں اور مذہب کو تقریباً بھلا دیتے ہیں۔ یہ زمانہ اُن کی زندگی کا بہت ہی رنگین زمانہ ہے۔ اس کا ردِ عمل بھی آخر عمر میں ہوا جب اُنھوں نے عشق و ہوس کے ماحول سے روگردانی کی اور پوری طرح مذہبی ہو گئے۔ یہ عمل اور ردِ عمل مومنؔ کی شخصیت میں بہت نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مومنؔ کی زندگی میں کچھ محرومیاں تھیں۔ اس کا سبب وہ احتسابات تھے جن سے اُنھیں زندگی کے ہر دور میں دوچار ہونا پڑا۔ یہ احتسابات خاندان، معاشرے اور تہذیب کے احتسابات تھے۔ ان کی گرفت بہت سخت تھی، مومن کا ان سے دامن بچانا مشکل تھا۔ غرض ان حالات نے انھیں زندگی کی رنگینیوں کی طرف راغب کیا اور وہ عشق و ہوس کی دنیا میں ان رنگینیوں کو تلاش کرنے لگے۔ اسی لئے اس کا رنگ اُن کی شخصیت میں اتنا گہرا نظر آتا ہے۔

لیکن یہ رنگینیاں بھلا زندگی کا ساتھ کب دیتی ہیں۔ ان کا وجود تو برق و شرر کی طرح ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ انسانی دلوں میں داغ بن جاتی ہیں۔ مومنؔ کے دل میں بھی ان رنگینیوں کا خیال داغ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اُنھیں جذباتی زندگی میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی ہے۔ اُن کے بیشتر عشق ناکام رہے ہیں۔ اسی لئے اُن کی شخصیت میں ایک درد اور کسک کا احساس بھی ہوتا ہے اور وہ اپنی ان ناکامیوں اور محرومیوں پر آنسو بہاتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔ اسی عالم میں اُن پر یہ عقدہ کھلتا ہے کہ عشق ایک فریب ہے اور وصل میں کوئی مزا نہیں ؎

وصلت میں کبھی مزا نہ پایا ہم نے | عشق ایک فریب تھا کہ کھایا ہم نے
اے کاش کہ جان دل سے پہلے دیتے | جی کے یہ عبث عذاب اُٹھایا ہم نے

اسی لئے وہ راہِ عشق اور بتوں کی چاہ کو خوب نہیں سمجھتے۔ اس میں انھیں جی کا زیاں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ایک رباعی میں کہتے ہیں ؎

مومنؔ رہِ عشق آہ کچھ خوب نہیں | واللہ بتوں کی چاہ کچھ خوب نہیں

آمان کہا، نہ جا سوئے بت خانہ — کچھ خوب نہیں یہ راہ کچھ خوب نہیں

لیکن اُن کے دل میں آرزو کی شمع ہمیشہ جلتی رہتی ہے اور وہ بت مہر جلوہ کی تلاش و جستجو سے باز نہیں آتے ؎

پھر کوئی صنم پسند آئے مجھ کو — کوئی بُت مہر جلوہ بھائے مجھ کو
جس دن نے دکھائیں یہ اندھیری راتیں — وہ دن اللہ پھر نہ دکھائے مجھ کو

غرض اس طرح مومنؔ کی شخصیت میں آرزو اور کسک کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ غمِ عشق میں ضرور مبتلا رہے۔ انھیں رنج والم سے ضرور دوچار ہونا پڑا لیکن اُنھوں نے عشق و ہوس کو دل سے نہیں نکالا۔ چنانچہ ایک فارسی رباعی میں اپنی ذہنی کیفیت کی ترجمانی اس طرح کی ہے ؎

عشقے خواہم کہ جاودانی باشد — یاسے خواہم کہ کامرانی باشد
عمرے خواہم کہ بدتر از مرگ بود — مرگے خواہم کہ زندگانی باشد

بہرحال مومنؔ کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوئے۔ عشق کی مسلسل اور پیہم ناکامیوں نے اُن کی شخصیت میں درد کو ضرور پیدا کیا لیکن اس درد نے کبھی کرب کی صورت اختیار نہیں کی وہ زندگی سے برابر دلچسپی لیتے رہے، اور اس طرح انھوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو ایک انسان ثابت کیا۔ اُن کے اقوال وافعال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ متوازن انسان تھے۔ اور انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے منہ موڑ لینا اُن کے نزدیک ایک غیر انسانی حرکت تھی۔ اسی خیال نے انھیں عشق و ہوس کی طرف راغب کیا۔ اُنھوں نے باوجود اپنی مذہبیت اور دین داری کے ایک رنگین زندگی بسر کی اور اپنی زندگی کے اس پہلو کو کبھی بُرا نہیں سمجھا یہی وجہ ہے کہ اُن کی زندگی کا یہ پہلو اُن کی شخصیّت کا نمایاں ترین وصف نظر آتا ہے۔

(۷)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مومنؔ کی زندگی کے حالات یہ بتاتے ہیں کہ اُن کی جوانی خاصی دیوانی تھی۔ وہ عشق و ہوس کی دنیا کے آدمی تھے۔ اُنھوں نے بڑی ہی رنگین زندگی گزاری زندگی سے جتنا رس بھی حاصل کر سکتے تھے، حاصل کیا۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک مذہبی آدمی تھے۔ انھیں اپنے زمانے کی مذہبی اور دینی تحریکوں سے دلچسپی تھی انھیں اپنے مسلمان ہونے پر

فخر تھا۔ وہ اسلام کے پرستار تھے اور مسلمانوں کی عظمت کا خیال اُن کے پیش نظر تھا۔ وہ اپنے عقائد میں بھی پختہ تھے۔ اُس زمانے کی دینی شخصیتوں سے انھیں بڑی عقیدت تھی۔ غرض مذہب کا اُن پر گہرا اثر تھا۔ رندی اور شاہد بازی کے ساتھ مذہب کے ساتھ اتنا گہرا لگاؤ مومن کی شخصیت میں بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ بہرحال اس میں تضاد ہے۔ لیکن یہ تضاد تو اُس زمانے کی سماجی زندگی ہی میں موجود تھا۔ اُس وقت کے امراء کی زندگی خانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ وہ لذت اور تعیش کی زندگی گزارتے تھے لیکن اس کے اثر سے اُن کی مذہبی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آتا تھا۔ زندگی کے یہ دونوں پہلو ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ مومن کی شخصیت میں بھی یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ ان پر مذہب کا اثر بچپن ہی سے رہا۔ اُن کی ابتدائی تعلیم مذہبی ماحول میں ہوئی۔ اُن کے اُستاد شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ اُس زمانے میں دین کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ مومن پر ان شخصیتوں کا اثر ہوا۔ پھر جب وہ سن شعور کو پہنچے تو انھیں اُس زمانے کی دینی تحریکوں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ کیونکہ اسلام کا درد اُن کے دل میں موجود تھا۔ چنانچہ وہ مولانا سید احمد بریلویؒ کی تحریک سے وابستہ ہوئے۔ یہ اور بات ہے کہ اُنھوں نے اس تحریک میں عملی حصہ نہیں لیا۔ اسی زمانے میں اُن کی زندگی ان تمام طوفانوں سے دوچار ہوئی جن کو جوانی اپنے جلو میں لے کر آتی ہے۔ مومن نے اپنے آپ کو ان طوفانوں کے حوالے کر دیا۔ جوانی کی خوب خوب داد دی اور اپنے آپ کو رندی اور شاہد بازی کے دھارے پر بہا دیا۔ غرض یہ دونوں پہلو بہ یک وقت مومن کی زندگی میں نمایاں نظر آتے ہیں اور اُن کی شخصیت میں ان دونوں کا ایک متوازن امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے خود اس کا اظہار کیا ہے ؎

مومن کو ہیچ ہے دولتِ دُنیا و دیں نصیب
شب بُت کدے میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

اور اس طرح کے بہت سے اشعار اُن کے دیوان میں ملتے ہیں جن سے اُن کی زندگی کے اس تضاد کا پتہ چلتا ہے اور اس کش مکش کی وضاحت ہوتی ہے جو اس صورتِ حال نے ان کی شخصیت میں پیدا کر دی تھی۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اُن کی شخصیت کے اس پہلو پر

خاصی روشنی پڑتی ہے ؎

مومن یہ لافِ اُلفتِ تقویٰ ہے کیوں مگر
دِلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا

رات دن بادہ و صنم مومن
کچھ تو پرہیزگار ہونا تھا

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے گرائے مومن موجودِ خدا ہوتا

اب کے وفورِ عشقِ صنم میں ہے گفتگو
مومن وہ لب پہ ہائے خدایا نہیں ہنوز

مومن اس زہدِ ریائی سے بھی کیا بدتر ہے
اس بُت دشمنِ ایماں سے ہمارا اخلاص

سچ تو یہ ہے کہ اُس بُت کافر کے عہد میں
لاف و گزافِ مومنِ دیں دار ہے غلط

مر چلے اب تو اُس صنم سے ملیں
مومن اندیشۂ خدا کب تک

چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بُت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

گر ترے کوچے سے دی کعبے کو نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمنِ اسلام ہم

کیا کسی بُت کے دل میں جگہ کی، کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرتِ مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

در بُت خانۂ عشقِ بتاں اور آپ اے مومن
یہ حضرت آگئی اک بار کیا طبعِ مقدس میں

یادِ بتاں میں لاکھ بار فرطِ قلق سے ہم بھی تو
بیٹھے اُٹھے ہیں مومن آپ گر پڑے شب نماز میں

ہو گئے نامِ بتاں سنتے ہی مومن بے قرار
ہم نہ کہتے تھے کہ حضرت پارسا کہنے کو ہیں

اس نام کے صدقے جس کی دولت
مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

سُن اے مومن یہ ایمان ہے ہمارا
نہ کہنا کفر بھی عشق بتاں کو

اللہ رے گم رہی بُت و بُت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

کافر اُسے بنانا تھا یہ کیا کیا بتو!
مومن سے مِل کے تم بھی مسلمان ہو گئے

کمیں میں ہے مومن وہ کافر صنم
بس اب پاسبانیٔ دیں ہو چکی

اے حضرتِ مومن یہ مُسلّم جو ہے ارشاد
بھولے سے بھی اب ذکرِ بُتوں کا نہ کریں گے
لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

کعبے سے جانبِ بت خانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زِنہار لگا

مومن اس بُت کے نیم ناز ہی میں
تم کو دعوائے اتقا نہ رہا

عرضِ ایماں سے ضِد اُس غارتِ دیں کو بڑھی
مجھ سے اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

کہاں وہ ربطِ بُتاں اب کہ اُس کو تو مومن
ہزاروں سال ہوئے سیکڑوں برس گزُرے

غرض مومن کی شخصیت میں یہ دورنگی تھی۔ وہ بادہ و صنم سے دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن پرہیزگاری کا خیال اُن کے دل سے نہیں نکلتا تھا۔ وہ مسجد میں رہنا چاہتے تھے لیکن اُن کا دل بت خانے کی طرف بھی کھنچا جاتا تھا۔ وہ دین کی پاسبانی کا دم بھرتے تھے لیکن اصنامِ کافر سے اُن کا بچنا محال تھا اور جب یہ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ بڑی حسرت سے اس کا ذکر کرتے ہیں جیسے اُنھوں نے زندگی کی کسی بڑی اہم چیز کو کھو دیا ہو۔ اس سے یہ بات کچھ اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ زندگی کے ان دونوں پہلوؤں سے نسبت اُن کے یہاں فروعی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اُنھوں نے ان کو کچھ اس طرح اپنی زندگی میں داخل کیا تھا کہ وہ اُن کی شخصیت کے لازمی جزو بن گئے تھے۔

اُن کی شخصیت کے اس پہلو کی وضاحت اُن کے ایک قصیدے سے ہوتی ہے جو اُن کے کلیات میں شامل ہے۔ یہ قصیدہ اللہ تعالیٰ کی حمد میں ہے۔ اس کا آغاز ذات باری کی تعریف سے ہوتا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہر جائے ہے تیرا جلوہ لیکن
دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا

یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو
پایا ہر شے میں، پر نہ پایا

اللہ رے تیری بے نیازی
یعقوب کو مدتوں رُلایا

یوسف سے عزیز کو کئی سال
زندانِ عزیز میں پھنسایا

یاں شعلے کو سرکشی کی کیا تاب
ابلیس کو خاک میں ملایا

تجھ کو ہی سزا ہے کبریائی
کُرسی کا نہ عرش کا یہ پایا

مومن کو بقا ہے بعد دیدار
کیا مژدۂ جاں فزا سنایا

گو وصف ہے یومنون بالغیب
پر بندہ تو اس سے باز آیا

یاں تاب کسے کہ خاک خوں میں
بیتابیٔ شوق نے لٹایا

اللہ دکھا دے اپنا دیدار
اکشف بجمالک الغطا یا

عظمت نے سجود کی فلک کو
گردِ کرۂ زمیں پھرایا

وہ خاتمِ مرسلیں محمدؐ　　جس نے ہمیں شرک سے بچایا
جب بندہ ہے تیرا تو رہا کون　　پھر لائقِ بندگی خدایا

اسی سلسلے میں اپنا حال بھی بیان کیا ہے، اپنی گناہگاری پر ندامت ظاہر کی ہے اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان گناہوں کو معاف کرنے کی درخواست کی ہے۔ کہتے ہیں ؎

اللہ غمِ بتاں میں یک چند　　بے فائدہ جان کو کھپایا
یہ عشق وہ بد بلا ہے جس نے　　ہاروت کو چاہ میں پھنسایا
سمجھا نہ کہ ہے رہِ خطرناک　　دین و دل و عقل کو لٹایا
حاصل نہ ہوا سوا ندامت　　کس تخم کو خاک میں ملایا
کی گریہ نے کتنی آب یاری　　دریا مری چشم نے بہایا
گرداب مرے ڈبونے کو تھا　　جو قطرہ کہ خاک پر گرایا
ہر حلقۂ دامِ آرزو نے　　طوقِ لعنت مجھے پنھایا
دل گرمیٔ شوقِ شعلہ رو نے　　کیا کیا مجھے خاک پر لٹایا
گہ ساقیٔ سرخ لب کے غم نے　　خونابۂ دل جگر پلایا
ہم بزمیٔ ماہ وش نے گاہے　　جوں بدر سحر تلک جگایا
بت خانہ کو رشکِ کعبہ سمجھے　　گر شوق نے گرد کو پھرایا
تھا شور فدا اک جائے بیک　　اُس دشمنِ دیں نے گر بلایا
کرتا رہے شکر بخت بیدار　　ساتھ اپنے صنم نے گر سلایا

توڑا نہ وفا کے سلسلے کو　　تو بہ ہی پہ زور آزمایا
اللہ مرے گناہ بے حد　　وہ ہیں کہ شمار کو تھکایا

لیکن آخر میں عشق اسلام کی دعا کی ہے ؎

وہ عشق دے جس کا نام اسلام　　وہ شیوہ نبی نے جو بتایا
وہ نعرۂ علم ہے، بجائے　　جس نے کہ اُس آگ کو بجھایا

کچھ آب زنی کرے نہیں تو — سر نارِ جحیم نے اُٹھایا
مجھ کو بھی بچائے جیسے تو نے — یوسف کو گناہ سے بچایا
وہ رفعت حال دے کہ جس نے — منصور کو دار پر چڑھایا
اس کا مرے دل پہ ایک پرتو — جس شعلے نے طور کو جلایا

مومن کہے کس سے حال آخر
ہے کون ترے سوا خدایا

مومن نے ان اقتباسات میں ذات باری سے جذب و شوق کا اظہار نہایت ہی عجز و انکسار کے ساتھ کیا ہے لیکن اپنی گناہ گاری اور معصیت کی تفصیل بھی بڑی بے باکی کے ساتھ پیش کردی ہے اور آخر میں عشقِ اسلام کی دعا مانگی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کی شخصیت میں ان دونوں پہلوؤں نے اچھی خاصی کشمکش اور اُلجھن پیدا کردی تھی لیکن انھیں اس پر اختیار نہیں تھا اسی لئے وہ سب کچھ کرنے کے بعد صرف دعا کرتے ہیں۔

بہر حال اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عشق و ہوس کے تمام کاروبار میں شریک ہونے کے باوجود مومن توحید پر ایمان رکھتے تھے۔ ذات باری سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ عشقِ رسولؐ سے وہ سرشار تھے۔ اسلامی اصولوں کی اُن کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ شریعت کے وہ قائل تھے۔ طریقت کا اُن پر ایسا کوئی خاص اثر نہیں تھا۔ اسی لئے تصوّف کی انھوں نے تردید کی ہے۔ ضیا احمد بدایونی لکھتے ہیں: "جس ماحول میں پرورش پائی اُس کا اقتضا یہ تھا کہ اُن کو مذہب کے ساتھ شغف ہو، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ شاہ صاحب کے علمی اور مذہبی خاندان سے اُن کے تعلقات رہے خود مولوی محمد اسمٰعیلؒ اُن کے ہم سبق اور ہم جلسہ تھے۔ اس لئے اگر مومن اُن کے ہم خیال تھے تو تعجب کی بات نہیں۔ تاہم اُن کی طرح متشدّد اور متقشف نہ تھے۔ متعدد تذکرے متفق ہیں اور خود اُن کے مؤیّد ہیں کہ وہ ہمیشہ عمل بالحدیث کے قائل اور کتاب و سنّت پر عامل رہے۔ اب اختیار ہے اُن کو جو چاہو کہو۔ مقلّدین اور شیعہ پر اکثر اشعار میں چوٹ بھی کر گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

یہ سب کچھ رو سنّت نہ طریقِ توحید — پھر کیا ہے ضرور سب کی یکساں فہمید
ہم سمجھے ہیں معنی حقیقی یعنی — حیوان ہیں حقیقت یہ اہل تقلید

اور سنئے :-

مُنہ کو مومن سے چھپانا کافر | یہ تقیّہ تو نہ بھایا مجھ کو

صوفیوں کی تردید میں ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور | توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے | بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

سید احمد صاحب رائے بریلویؒ ایک بزرگ تھے جو اُمّیِ محض مگر پابند شریعت تھے۔ مولوی محمد اسمٰعیلؒ نے اُن کی امامت تسلیم کی، اور اُن کی سرگرمی میں کفّار سے جہاد کیا۔ مومن نے بھی سید صاحب سے بیعتِ جہاد کی تھی، اور مثنوی جہادیہ لکھی تھی۔ اگرچہ عملی شرکت کا موقع نہ ملا۔ تاہم مومن خاں آخر وقت تک اُنھیں کے معتقد رہے[۱]۔ اس بیان سے یہ بات واضح ہے کہ مومن طبعاً مذہبی آدمی تھے لیکن اس معاملے میں اُن کے یہاں شدت پسندی نہیں تھی۔ اُن کا تعلق اہلِ حدیث سے تھا، اور وہ قرآن پر عمل کرتے تھے۔ وہابی تحریک سے انھوں نے اس حد تک دلچسپی لی تھی کہ وہ مولانا سید احمد بریلویؒ کے مُرید ہوگئے تھے؛ اور اُن کے خیالات ونظریات سے اُنھیں پوری طرح اتفاق تھا ـــ اسی لئے شیعوں سے بھی وہ اختلاف رکھتے تھے۔ تصوّف سے بھی انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ جہاد کی اہمیت کے وہ قائل تھے، اور ہر مسلمان کے لئے اس کو ضروری قرار دیتے تھے۔ یہ سب کچھ وہابی تحریک کے گہرے اثرات کا نتیجہ تھا۔

عرش گیاوی نے اس کی تردید کی ہے، اور آیت اللہ بسمل کے حوالے سے لکھا ہے کہ "الزامِ وہابیت غلط ہے ..... مومن اور اُن کا سارا خاندان حنفی مسلک تھا۔ خُدائی کا دعویٰ کرنے والے وہ رباعیاں سن لیں ؎

مومن ہے اگرچہ سب اسی کا یہ ظہور | توحیدِ وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے | بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

مومن لازم ہے وضع مرغوب بنے | جو رنگ ہو آدمی خوش اسلوب بنے
کیا خرقہ وعمامہ ہے اللہ اللہ | جب شکل بگڑ گئی تو تم خوب بنے

---

[۱] ضیاء احمد بدایونی: مقدمہ دیوان مومن: ص ۳۰

وہابی نہ ہونے کے ثبوت میں ایک تخمیس بھی ہے۔ یعنی جن حضرات کو وہابیت کا غلو ہے۔ وہ نعوذ باللہ یہ بھی کہتے ہیں کہ انسان کثرت ریاضت وعبادت سے نبیؐ ہو سکتا ہے۔ نبی آخرالزماں یعنی چہ۔ قدسی کے اشعار پر مصرعے ہیں ؎

ہوں تو عاشق مگر اطلاق یہ ہے بے ادبی — میں غلام اور وہ صاحب ہے میں امت وہ نبی

یا نبی یک نگہ لطف بہ اُمّی و ابی — مرحبا سیدِ مکّی مدنی العربی

دل وجان ست فدائے چہ عجب خوش لقبی

اس کے علاوہ صحابہ کرام کی مدح میں قصائد موجود ہیں۔ اب اس پر بھی وہ وہابی سمجھے جائیں تو اور بات ہے[1] لیکن یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے۔ مومن کے زمانے میں وہابی اور حنفی علماء میں اختلافات نے شدت ضرور اختیار کر لی تھی لیکن اس کی وجہ سے مومن نے اپنے عقائد میں انتہا پسندی سے کام نہیں لیا۔ وہ ان اختلافات اور کشیدگی کے تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے تھے۔ کلب علی خاں فائق نے اُن کے عقائد کے بارے میں بعض لوگوں کے بیانات کو نقل کر کے لکھا ہے کہ "ان بیانات سے مومن کے خاندان کی عقیدت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادرؒ صاحب سے ثابت ہوتی ہے۔ نیز شاہ غلام علی کے خلیفہ آخون شیر محمدؒ اُن کے چچا کے یہاں مقیم تھے، اور اسی طرح تقلید کی زنجیریں کڑی تھیں۔ مومن نے شاہ عبدالقادر صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے۔ مومن کے خصوصی احباب میں سے مولوی صدرالدین خاں آزردہ صدر الصدور دہلی جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے شاگرد اور حنفی مسلک کے رہنما تھے۔ اُن کے دست راست مولوی رشید الدین خاں صدر مدرس مدرسۂ دہلی تھے جو شاہ عبدالعزیز صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ کے شاگرد تھے اور حنفی عقائد میں شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے جانشین شمار ہوتے تھے۔ دوسرے ساتھی مولوی فضل حق خیرآبادی تھے جو فلسفے میں امام مانے جاتے ہیں مختلف علوم درسیہ کی تکمیل مولوی فضل امام سے کی تھی، اور علم حدیث میں شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے سند رکھتے تھے، اور شاہ ڈھومن کے مرید تھے۔ دہلی کے عوام وخواص کی باگ ڈور ان ہی اکابرین کے ہاتھوں میں تھی۔ ان کے خلاف

---

[1] عرش گیاوی: حیات مومن: ص ۵۹، ۶۰

دوسرا گروہ دہلی میں جو شرک و بدعت کے خلاف جہاد کرنے اُٹھا تھا۔ مولانا عبدالحیٔ صاحب شاگرد و داماد شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت تھے اور اُنھوں نے شریعت محمدی کے احیاء کے لئے علمِ جہاد بلند کیا تھا۔ مولانا عبدالحی اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے سب سے پہلے دہلی میں بدعات مٹانے کا تہیہ کیا، اور کچھ مدت میں اس قدر کامیابی حاصل کرلی کہ دہلی کی جامع مسجد میں جہاں جمعہ کے روز سامان صحن مسجد میں فروخت ہوتا تھا، وہاں نماز جمعہ عید جیسی ہونے لگی۔ اُن کی مخالفت میں مولانا فضل حق خیرآبادی اور مولانا رشیدالدین خاں پیش پیش تھے۔ اور آزردہ دربردہ حامی تھے۔ اس سے دہلی کی مذہبی کشیدہ فضا کا اندازہ ہوتا ہے۔ فریقین آپس میں یگانگت اور دوستی کے باوجود دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے تھے[۵]۔ غرض مومن کی دِلّی میں علماء کے دو گروہ تھے۔ ان میں جہاں تک مذہبی عقائد کا تعلق تھا، اختلافات تھے۔ مومن نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ مولانا سید احمد بریلویؒ کے مرید بھی ہوئے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو ان اختلافات سے دور اور ان مناقشات سے الگ رکھا۔ اور کبھی ان میں خواہ مخواہ اُلجھے نہیں۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ مومن مذہبی ہونے کے باوجود تنگ نظر نہیں تھے۔ روشن خیالی اُن کے مزاج میں داخل تھی۔ اسی لئے فروعی باتوں سے انھیں کوئی سروکار نہیں رہتا تھا۔ وہ بنیادی معاملات و مسائل کی طرف توجہ رکھتے تھے۔ شوخی اور شرارت پسندی بھی اُن کی طبیعت میں نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذہبی اختلافات سے جو صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ اُس کا تماشا دیکھنے کا بھی انھیں شوق نہیں تھا۔ وہ ہنگامہ پسند بھی نہیں تھے۔ اسی لئے ہنگامہ آرائیوں سے انھیں کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی، اُن کا مسلک صُلح کل تھا۔ وہ بڑے آزاد خیال اور مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ ہر انسان کی عزت کرنا اُن کے پیش نظر تھا۔ مذہبی اختلافات اس راستے میں حائل نہیں ہوتے تھے۔ شیعہ، سُنّی، مقلد اور غیر مقلد سب سے اُن کی دوستی تھی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اُن کے عزیز دوست تھے لیکن ان کا مسلک مومن سے مختلف تھا۔ وہ شاہ محمد اسحاق کے مُرید تھے۔ شاہ ابوسعید اور شاہ احمد سعید سے بھی انھوں نے فیضِ روحانی حاصل کیا تھا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدرالدین خاں آزردہ سے بھی مومن کے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ لوگ بھی

---

[۵] کلب علی خاں فائق: حیاتِ مومن: اورینٹل کالج میگزین: نومبر ۱۹۵۹ء: ص۵۳

مذہبی معاملات میں شیفتہ ہی کے ہم خیال تھے۔ ان کے مقلد اور حنفی ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ مومن حنفی نہیں تھے۔ اُنھوں نے مولانا سید احمد بریلوی سے بیعت کی تھی۔ وہ اُن کے پرستار تھے لیکن اُن کے مزاج میں کٹرپن نہیں تھا۔ اور وہ مذہبی معاملات میں متعصب نہیں تھے یہی سبب ہے کہ فروعی اختلافات کی اُن کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں تھی۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے بُنیادی مذہبی عقائد میں پختہ تھے۔ توحید پر ان کا ایمان تھا۔ چنانچہ ذات باری کی حمد میں اُنھوں نے جہاں کہیں بھی اپنے کلام میں اظہار خیال کیا ہے، وہاں جذب و شوق کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایک قصیدے کے چند اشعار اس خیال کی وضاحت کے لئے کافی ہیں ؎

ہرجائے ہے تیرا جلوہ لیکن — دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا
یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو — پایا ہر شے میں پر نہ آیا
اللہ ری تیری بے نیازی — یعقوبؑ کو مدتوں رُلایا
یوسفؑ سے عزیز کو کئی سال — زندانِ عزیز میں پھنسایا
یاں شعلے کو سرکشی کی کیا تاب — ابلیس کو خاک میں ملایا
تجھ کو ہی سزا ہے کبریائی — کرسی کا نہ عرش کا یہ پایا
مومن کو بقا ہے بعد دیدار — کیا مژدۂ جاں فزا سنایا
گو وصف ہے یومنون بالغیب — پر بندہ تو اس سے باز آیا
یاں تاب کسے کہ خاک و خوں میں — بے تابیٔ شوق نے لِٹایا
اللہ دکھا دے اپنا دیدار — اکشف بجمالک الغطایا
عظمت نے سجود کی فلک کو — گرد کرۂ زمیں پھرایا
وہ خاتم مرسلیں محمدؐ — جس نے ہمیں شرک سے بچایا
جب بندہ ہے تیرا تو رہا کون — پھر لائق بندگی خدا یا
تو واحد بے نظیر و ہمتا — تو حاکم و خالقِ برایا
تجھ کو بھی نہ کہہ سکے ترا مثل — یہاں تک نقش دوئی مٹایا

یعنی وہ فنا ازل سے ہے اور | اس ذات کو کب زوال آیا
آوے تری حمد کا توہّم | یہ حوصلہ میں کہاں سے لایا

مومن عشق رسولؐ سے سرشار تھے۔ فارسی اور اردو کے بعض نعتیہ اشعار سے اس کا اندازہ ہوتا ہے ؎

زفخرِ نعتِ تو طرفِ کلاہ می شکنم | چناں کہ دارم از اوصافِ تاج داراں عار
سنم کہ نیست قرائم بہیچ قرن و زماں | منم کہ نیست نظیرم بہیچ شہر و دیار
نبود و نیست عدیلِ من امتحاں اینک | ز زندگاں لب و خامہ ز مردگاں اشعار
چناں مقابلِ نظمم بود کلامِ حسود | کہ سیم قلب بہ پیشِ زرِ تمام عیار
قصائدم حسدش سبعۂ معلقہ را | بکعبہ کرد پریشاں چو سبعۂ سیّار
دریں زمانہ اش الہام و وہب بنامیم | زوحی آمدنت گر کسے کند انکار [۱]

اگر کہے مددے یا محمدِؐ عربی | صفیرِ مرگ ہو رستم کو نعرۂ لاکوس
مخالفوں کو ترے دو جہاں جہنم ہے | کہ تابِ مہر سے جلتے رہے ہیں یاں بھی مجوس
بُراق ابر ترا ابروئے فرشتہ رکاب | کہاں ہو چشمِ بشر ایسی پاؤں سے ممسوس
نہ جس کے دھیان میں مضمونِ قاب قوسین آئے | وہ دیکھ لے ترے زین و کمان کا قربوس
ترے عدو کی خرابی کا کچھ علاج نہیں | نہ ہو قبول دعا سے بھی رفعتِ لبسبوس
ترے خیال سے اصحابِ کہف کو ہے یہ چین | وگرنہ خواب کہاں اور زمانِ دقیانوس [۲]

اس کے ساتھ ساتھ وہ صحابہ کی مدح میں بھی پیش پیش رہے ہیں ؎

ببارگاہِ تو کانجا نیافت راہِ قیاس | باوجِ جاہِ تو کانجا نہ کرد وہم گذار
بصدقِ حضرتِ صدیقؓ آسماں پایہ | مصاحبِ تو، شریکِ تو در مصائبِ غار
بہ نصفتِ عمرؓ و شرمگینیِ عثمانؓ | بقوتِ اسد اللہ حیدرؓ کرار
بپاک دامنیٔ فاطمہؓ بخلقِ حسنؑ | بخونِ ناحقِ غمگین حسینؑ بے کس و بار

۱؎ مومن: دیوان فارسی: ص ۱۳، ۱۴ | ۲؎ مومن: کلیات مومن: ص ۱۴

بہ بے کسی مُصیبت رسیدگانِ غمش | بہ سخت گیری سنگین دلانِ ظلم دثار[۵]

اُن کے اُردو کلّیات میں حضرت ابو بکر صدیق رضؓ حضرت عمر فاروق رضؓ، اور حضرت امام حسنؑ کی شان میں قصیدے موجود ہیں۔ اُن سے مومن کے عقائد پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔

مومن کو اپنے زمانے کی ان دینی تحریکوں سے دلچسپی تھی جس میں عمل کا جذبہ تھا، اور جس کے علمبردار اسلام کا بول بالا کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے انھیں مولانا سید احمدؒ بریلویؒ کی شخصیت سے تعلق خاطر پیدا ہوا، اور وہ اُن کے مرید ہوئے۔ اُن کے اثر سے مومن کے دل میں جہاد کا خیال آیا۔ چنانچہ اپنے دیوان کی پہلی غزل میں جہاں اُنھوں نے عقائد کا ذکر کیا ہے، وہاں جہاد کی اہمیت واضح کی ہے اور اس جہاد کے لئے جو لشکرِ اسلام تیار ہوا ہے، اُس میں شامل ہو کر جہاد کرنے کی دعا مانگی ہے ؎

فروغِ جلوۂ توحید کو وہ برق جولاں کر | کہ خرمن پھونک دیوے ہستیٔ اہلِ ضلالت کا
مرا جوہر ہو سرتا پا صفائے مہرِ پیغمبر | مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنّت کا
مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو | دل صد پارہ اصحابِ نفاق و اہلِ بدعت کا
خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا | لبوں پر دم بلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا
نہ رکھ بیگانہ مہرِ امامِ اقتدا سُنّت | کہ انکار آشنائی کفر ہے اس کی امامت کا
امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں یعنی | اِرادہ ہے مرا فوجِ ملائک پر حکومت کا

زمانہ مہدیٔ موعود کا پایا اگر مومن
تو سب سے پہلے کہیو تو سلام پاک حضرت کا

ان اشعار سے نہ صرف مومن کے دینی عقائد کی وضاحت ہوتی ہے، اس حقیقت کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جہاد کے معاملے میں کتنے شدت پسند تھے، اور اس وقت کی تحریک جہاد کے علمبردار امامِ زماں مولانا سید احمدؒ بریلوی سے انھیں کتنی گہری عقیدت تھی۔ جہاد پر انھوں نے جو مثنوی لکھی ہے، اس سے اس خیال کی مزید وضاحت ہوتی ہے ؎

پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور | کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور

۵؎ مومن: دیوان فارسی: ص۱۵

کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا | کہ آجائے بس نشہ اسلام کا
بہ رنگ مے ایماں کو آجائے جوش | نہ اپنا رہے اور نہ دُنیا کا ہوش
عنا دنہفتہ کو ظاہر کروں | دم تیغ سے قتل کا فر کروں
پے تشنہ کامی سبو در سبو | پیوں شوق سے ملحدوں کا لہو
یہی اب تو کچھ آگیا ہے خیال | کہ گردن کشوں کو کروں پائمال
بہت کوشش و جاں نثاری کروں | کہ شرع پیمبر کو جاری کروں
دکھا دوں بس انجام الحاد کا | نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا
نہ کیوں کر ہوں اس کام میں ناشکیب | ظہورِ امام زماں ہے قریب
وہ خضر طریق رسول خدا | کہ جو پیرو ہے اُس کا ہے پیشوا
وہ نورِ مجسّم وہ ظل الٰہ | کہ سائے سے جس کے مجلی مہر و ماہ
زہے سیّد احمدؒ قبول خدا | سر اُمتانِ رسول خدا
نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف | علیؑ و حسینؑ و حسنؑ کا خلف
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات | ہے کفّار کی موت اُس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اُسے | سرِ قتل کفّار آیا اُسے
دم اُس دست و بازو پہ دیوے اجل | لب تیغ کے بوسے لیوے اجل
جلو میں ہمیشہ رواں ہو ظفر | رکاب اُس کی پکڑے رواں ہو ظفر
کہوں کیا لوائے امامت کا اوج | کہ ہیں غوث و ابدال سب اہلِ فوج
خبردار ہو جاؤ اے اہل دل | کہ رحمت برستی ہے اب متصل
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا | اگر ہو سکے وقت ہے کام کا
ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک | کہ خوش تم سے ہو وحدہ لاشریک
جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا | فِدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیبِ حبیب خداوند ہے | خُداوند اس سے رضامند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو | خُدا کے لیے جاں نثاری کرو

سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تم کو تمیز ۔۔۔ نہ جاں آفریں سے کر جاں عزیز
کسی کو نہیں ہے اجل کی خبر ۔۔۔ کہ آجائے بیٹھے ہوئے اپنے گھر
تو مقدور کس کا کہ آنے نہ دے ۔۔۔ تنِ خستہ سے جاں کو جانے نہ دے
تو بہتر یہی ہے کہ جاں کام آئے ۔۔۔ پسِ مرگ تربت میں آرام آئے
قیامت کو اُٹھو تو تم با مراد ۔۔۔ لب الحمد گو اور دل شاد شاد
عجب وقت ہے یہ جو ہمت کرو ۔۔۔ حیاتِ ابد ہے جو اس دم مرو
جو ہے عمر باقی تو غازی ہو تم ۔۔۔ سزاوارِ گردن فرازی ہو تم
یہ ملک جہاں ہے تمھارے لئے ۔۔۔ نعیمِ جناں ہے تمھارے لئے
شراکت یہاں کی ہو طالع کا اوج ۔۔۔ کہ ایسا امام اور ایسی ہے فوج
سعادت ہے جو جاں فشانی کرے ۔۔۔ یہاں اور وہاں کامرانی کرے
الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب ۔۔۔ یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار ۔۔۔ پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے ۔۔۔ عروجِ شہید اور صدیقؓ دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے ۔۔۔ ملا دے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں ۔۔۔ مری جاں فدا ہو تری راہ میں
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں ۔۔۔ اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

ان اشعار میں کافروں کو قتل کرنے، ملحدوں کے لہو کو پینے، گردن کشوں کو پائمال کرنے، شرع پیمبرؐ کو جاری کرنے، الحاد کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کے خیالات جس انداز میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ اُن میں ایک انتہا پسندی ضرور پائی جاتی ہے لیکن ان میں خلوص ضرور ہے۔ اور تحریکِ جہاد کے علمبردار مولانا سید احمدؒ بریلویؒ کی تعریف میں جو کچھ کہا گیا ہے، اُس سے گہری عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ آخر میں شہادت کی جو تمنا کی گئی ہے، اور گنج شہیداں میں مسرور ہونے اور اسلام کی فوج کے ساتھ محشور ہونے کا جو شوق ظاہر کیا گیا ہے، اُس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومنؔ اسلام کے سچے پرستار تھے۔ اور ان کا یہ خیال تھا کہ جہاد کرنا ایک بہت بڑی عبادت

ہے۔ چنانچہ وہ جہاد کی آرزو میں مرتے تھے۔

یہ اور بات ہے کہ انھیں اس جہاد میں عملی طور پر حصّہ لینے کا موقع نہ ملا۔ یا اُن کے دوسرے مشاغل اس راہ میں حائل رہے، اور ان کی وجہ سے ان کو مہلت نہیں ملی۔ دراصل بات یہ ہے کہ مومن خیالی آدمی تھے۔ اُن کے مزاج میں رومانیت تھی جس وقت جذبات کی کوئی لہر اُٹھتی تھی تو زور و شور کے ساتھ نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے تھے لیکن اُس پر عمل کرنا اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُنھوں نے جہاد پر مثنوی لکھی۔ اس جہاد میں شریک ہونے کی تمنا کرتے رہے لیکن جس وقت مولانا سید احمدؒ بریلوی سکھوں کے مقابلے میں جہاد کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ اُس وقت مومن رنگ رلیاں منانے میں مصروف تھے۔ کلب علی خاں فائق نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ اُن کے خیال میں "مومن کا یہ جوش صرف زبانی تھا جس سال (۱۲۴۱ھ) سید احمد شہیدؒ سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے نکلے تو مومن ایک شادی کی تقریب میں آنکھ لڑا بیٹھے، اور مثنوی 'تف آتشیں' وجود میں آئی۔ ۱۲۴۴ھ میں جب کہ مجاہدین مخالفین سے جنگ آزما تھے، مومن ایک اور حسینہ کے دام میں گرفتار ہو جاتے ہیں (مثنوی حنین مغموم)۔ اور پھر ۱۲۴۶ھ جو سید احمد صاحب کا سال شہادت ہے، کسی نئی محبوبہ کا قصۂ غم سناتے ہیں (قصۂ مغموم)۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آرزوئے جہاد کی سچی خلش نہ تھی، ورنہ ملک کے ہر حصّے سے مجاہدین جوق در جوق شریک ہو رہے تھے، پھر مومن کے لئے کون سی رکاوٹ تھی۔ جوانی کی عمر تھی، رگوں میں خون دوڑ رہا تھا۔ علم دین کا پاس اس کا مقتضی تھا کہ مومن اس کارِ خیر میں نمایاں حصّہ لیتا۔ لیکن وہ صرف چند شعر کہہ کر فریضۂ جہاد سے سبک دوش ہو جاتا ہے"[۵۱] لیکن وہ یہ بھلا دیتے ہیں کہ مومن شاعر تھے۔ شاعر عام طور پر جذباتی ہوتا ہے۔ وہ کہتا تو بہت کچھ ہے لیکن عمل نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہ بات تو صحیح ہے کہ مومن جہاد کے موضوع پر جس وقت ان خیالات کا اظہار کر رہے تھے، اُس وقت اُن کا وقت لہو و لعب اور عشق و ہوس میں گزر رہا تھا لیکن یہ صحیح نہیں کہ اُن کے یہاں جہاد کی سچی خلش نہ تھی۔ اُن کے خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا اُنھوں نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ اُن کے دِل سے نکلی ہوئی آواز ہے لیکن وہ خود اس پر عمل نہیں

---

۵۱ کلب علی خاں فائق: حیاتِ مومن: اورینٹل کالج میگزین: نومبر ۱۹۵۹ء: ص ۶۸

کر سکتے تھے، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اُن کے مزاج میں رومانیت تھی۔ وہ خیالی آدمی تھے، عمل سے اُنھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔

مومن کے دین دار ہونے میں تو کسی کافر ہی کو شک ہو سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ دین داری اُن کے رومانی اور شاعرانہ مزاج پر غالب نہ آسکی۔ اُن کے یہاں بہ یک وقت ان دونوں کا سلسلہ جاری رہا۔ درحقیقت اُس زمانے کی زندگی ہی کچھ ایسی تھی کہ اُس میں یہ دونوں پہلو متوازی چل سکتے تھے۔ رنگینی اور رنگین مزاجی اُس زمانے میں عیب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ رنگین اور رنگین مزاج لوگ مذہبی اور دین دار بھی ہو سکتے تھے۔ غالب، مومن اور شیفتہ سب کا اس معاملے میں ایک ہی سا حال تھا۔ ان سب کے مزاجوں میں رندی اور شاہد بازی کے رنگ رچے ہوئے تھے لیکن مذہبی اور دین دار ہونے کا دعویٰ ان میں سے ہر ایک کو تھا، اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اُن کی شاعرانہ طبیعت اس اظہار میں بھی اپنی جھلک دکھاتی تھی۔ غالب نے رمضان کے زمانے میں اپنے روٹی کھانے اور پانی پینے کو جو روزہ بہلانے سے تعبیر کیا ہے ظاہر ہے کہ اس کا سبب اُن کا شاعرانہ مزاج ہے۔ مومن نے غالب کے انداز میں تو باتیں نہیں کی ہیں کیونکہ اُن کے مزاج میں مزاح کا عنصر نہیں تھا۔ البتہ خاص رومانی اور شاعرانہ انداز میں اپنے دینی معمولات پر روشنی ڈالی ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کو ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"فلک منزلتا۔ حالم شنیدنی است و بہ دردم رسیدنی من کہ از جور آسمان نالیدمے و بناز مہر طلعتاں بہ چین ابرو کشیدمے، بہ جفائے خاکیاں کلفت سرشت در ساختہ ام و فرق تسلیم بہ بیداد سیاہ دروناں ظلمت سرنوشت پیش انداختہ از دست، بہ روشیر پنجگاں فرصت سرخاریدن نیست. واز گلوگیری ایں گرگ منشاں جہلت نفس بر کشیدن نے، در نگارش مضمونیکہ ایامے چندمی خواہد از ضیق زمانہ مجبورم واز دولت سر بر خط فرماں نہادن محصور؛ بیت ۵

درسر ہوائے خدمت مہ طلعتے چہ سود ۔۔۔ مارا کہ فرصتے ز غم روزگار نیست

شب و روزے کہ می گزارم از عمر بحسرت گزشتگاں باور ندارم۔ ہاں تیرہ روزاں از سر جاں برخاستہ بر روز م نشستن نتوانند و سیہ بختاں نفس باختر شماری شکستہ بایں شب ہائے دراز جاں شکستن نداند سحرے نیست کہ نالہ ام خفتگاں بستر خاک را از خواب ناز بیدار نسازد و شامے نے کہ شعلۂ فغان فلک سوزم طائر

سدرہ ایال و پر سوختہ بر زمین نیندازد۔ مرا کہ از کرم خوئے ہم صحبتاں پاس ادب نیست سامعہ سوزی گرامی برادر دل سوز پسندیدن عجب نیست۔ لختے از روزگار خویشتن می نگارم و روزگارے بہ تظلم بیدار آسماں می گزارم بیت

گوشے بہ سخن تواں نہادن — ہر چند غمم شنیدنی نیست

ہر بامداد کہ خروس صبح گاہی نالہ چوں نوبتے دہل می زند و ندائے حی علی الفلاح شور در زمین می فگند باین ہمہ افتادگی ہائے ناتوانی فتنہ آسا از خاک بر می خیزم و با چندیں خشک مغزی بہا سر گرانی تلخ آب حسرت شکر خواب مانند بلا از سپہر می ریزم بجواب موذن لاحول ولا قوۃ می گویم۔ و بحیلۂ وضو دست از آسائش می شویم۔ ادائے صلوۃ امان از شر شیاطین خواستن است و شور مناجات ہنگامہ فریاد از جور ناس ابلیس فطرت آراستن ورنہ صنم خانہ در دل و رو بقبلہ کے رواست و بت در آستین سجادہ بر دوش کجا سزا است۔ فرد ؎

مومن بگرد کعبہ نگردد کسے ازاں — کیں خانہ چند روز صنم خانہ بودہ است

ہنوز دعا بر زبان است و لب تسبیح خواں کہ صدائے حلقہ در رو نشاط بر روئے دل می بندد و شور لبیک مشغول یا ایتہا النفس المطمئنۃ نمی پسندد۔ لاجرم مرحبا گویاں از خانہ بیروں می آیم و در ہائے عیش بر خود می بندم تا درے می کشایم می بینم کہ شاگردگی چین در ابرو بر در ایستادہ و زبان بے غارہ بازچہ دیر آمدہ کشادہ ہمیدوں معذرتم بر لب است کہ دیگرے چوں بلائے ناگہانی در رسیدہ و لوید رسیدن پس ماندہ ہمرہانے چند رسانیدہ بہ تحریک مروت تا نفس بجنبد احبذا تعال تعال آشنا شد، ہنگامہ آشوب یوم یکون الناس کالفراش المبثوث برپا گشت۔ رباعی ؎

از علم متبکم از دلم بیروں باد — محزوں شدم از ہنر ہنر محزوں باد
از کاوش دانشم دلم پر خوں است — یارب کہ درون دانشم پر خوں باد

نہ از گرمی ہنگامہ بحث و تکرار مدعا ادب آموختن است کہ دل و جان اوستاد

تفتہ جگر بداغِ آسماں سوز سوختن بہمہ حال باین ہمہ ستم بامی تواں ساخت ستم ترا اینست کہ ہر گرا گرہے در کار افتاد مانند عقدہ دنبالہ این تزار تراز سوزن تار بہ مضمون وزر من عمل بہامن غیراں بہ نقیض من ادزار ہم شئی روزگار فتنہ کہ بہ سینہ خراشئی کساں می انگیزد دغرض دل آزردن است وفلک زہرے کہ بکاسۂ دیگراں می کند بہ تلخئ مردن من۔ رباعی ؎

عقلم سرگشتہ ہرزمامے دارد ہر نجم بطالعم زبانے دارد
پروازِ غمم نیست کسے را بہ جہاں دیوانہ دلم غم بہانے دارد

حیف کہ مومن باعتقاد لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ ستارہ پرست است و باچندیں بے تعلقیہا علاقہ اسطرلاب از صبح تا شام در دست ارتفاع شمسی شاہد بستی طالع اختر شناس بنداری و تسوید البیوت دلیل خانہ خرابئ این ضعیف بنیان سست اساس فی الجملہ تا آفتاب می نشیند از مدرسہ رصد بنداں برمی خیزم و قطرات اشکِ ندامت بشمار ثوابت در دامن کرۂ ارض می ریزم۔ ایں زمان حسرت وصال مہ رخانِ جگر سوز است و شعلۂ آتش فراق مہر طلعتاں ہنگامہ بلا افروز۔ رباعی ؎

تا طالع دکو کبم چہ باشد روزم ہمہ شب شبم چہ باشد
سیارہ شناسم و ندانم تا طالع دکو کبم چہ باشد[۵۱]

یہاں مومن نے اپنی مصروفیتوں کا جو حال لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ مذہبی آدمی ضرور تھے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی اُن کے معمولات میں داخل تھی لیکن اس کا اظہار اُن کے یہاں شاعرانہ انداز اختیار کر لیتا تھا۔ صبح کو جب موذن کی آواز فضا میں بلند ہوتی تو وہ خواب سے بیدار ہوتے، حی علی الفلاح کی صدا پر لاحول ولا قوۃ پڑھتے، اور وضو کے بہانے آسائش سے ہاتھ دھوتے۔ شیاطین کے شر سے امان چاہنے کے لئے نماز پڑھتے اور اوراد و وظائف میں اس لئے مصروف ہو جاتے کہ شیاطین سیرت لوگوں سے محفوظ رہیں۔ ورنہ اس عالم

---

۵۱ مومن: انشائے مومن: ص ۱۰۸، ۱۱۱

ہیں جب دل میں صنم خانہ اور آستین میں بُت ہو تو قبلے کی طرف رُخ کرنا ظاہر ہے کہ مناسب نہیں۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ مومن مذہبی اور دین دار ہونے کے باوجود شاعر تھے اور شاعر ہونے کے باوجود مذہبی اور دین دار تھے ــــ یہی وجہ ہے کہ وہ مذہبی معاملات کا ذکر کرتے ہوئے زمانے کی شکوہ سنجی اور افراد کی شرپسندی کا بیان شروع کر دیتے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب تو یہ ہے کہ وہ زندگی اور زمانے کے ہاتھوں زخم خوردہ تھے اور انھیں وہ سکونِ قلب میسّر نہیں تھا جو انسان کو متوازن بناتا ہے۔ اُن کی اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے حالات سے مطمئن نہیں تھے۔ اُنھیں اپنے زمانے کی زندگی گھائل نظر آتی تھی، اور اس کو گھائل کرنے والے اُن کے خیال میں وہ افراد تھے جنھوں نے خیر کے خیال کو خیرباد کہہ کر صرف شر کو اپنے مزاجوں میں داخل کر لیا تھا۔ مومن کو اس صورتِ حال سے اُلجھن ہوتی تھی۔ وہ اُس پر کڑھتے تھے اور اسی لئے اس زندگی سے بیزاری محسوس کرتے تھے۔ دینی اور مذہبی معاملات کے ساتھ ان حالات کا بیان مومن کے یہاں جس طرح ملتا ہے وہ اُن ناسازگار حالات کے شدید احساس کا نتیجہ ہے جس کے سائے میں مومن نے زندگی بسر کی، اور جس نے اُن کے مزاج میں وہ شاعرانہ رنگ و آہنگ کو پیدا کیا جس سے اُن کی شخصیت پہچانی جاتی ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جا چکا ہے کہ مومن بنیادی طور پر ایک رومانی مزاج شخص تھے اور اور ایک رومانی کی تمام خصوصیات اُن کی شخصیت میں موجود تھیں۔ رومانی مزاج شخص کی حس بہت تیز ہوتی ہے اور اُس کا زاویۂ نظر خیالی اور تخیلی ہوتا ہے ــــ وہ اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہوتا۔ اُس کے خیال میں انتہا پسندی ہوتی ہے۔ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے، اُس کا اظہار کر دیتا ہے۔ اس اظہار میں شدت اور تیزی ہوتی ہے۔ برجستگی اور بے باکی ہوتی ہے۔ مومن کے مزاج کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ عملی آدمی نہیں تھے۔ اُن کے مزاج میں تخیلیت اور خیال پسندی تھی یہی وجہ ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو بھی اُنھیں مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کسی چیز سے بھی مطابقت پیدا نہیں کر سکتے تھے ــــ حسینوں کی ملاقات کے وقت بھی اُنھیں اُن کی جدائی کا صدمہ جاں گسل رہتا تھا۔ یہ مزاج ایک رومانی کا مزاج ہے اور مومن اسی مزاج کے انسان تھے۔ اسی لئے وہ مذہب اور مذہبی معاملات تک کو رومانی اور شاعرانہ انداز میں پیش کرنے کے لئے مجبور ہوئے۔ مذہب سے اُن کی دلچسپی بھی خیالی اور تخیلی تھی۔ اسی لئے

اُس میں شدت تو نظر آتی ہے لیکن اس باقاعدگی اور اُستواری کا پتہ نہیں چلتا جو مذہب اور دین داری کے لئے ضروری ہے۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے میں معاشرہ ایک عجیب و غریب تضاد سے دوچار تھا۔ اس میں مذہبیت اور دین داری، لذت پرستی اور تعیش پسندی ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ مذہبی ہونے کے باوجود مذہب کو شاعرانہ انداز میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ جہاد کے خیال کے ساتھ عشق و ہوس کے خیالات بھی پرورش پا سکتے تھے۔ مومنؔ کی شخصیت اسی صورت حال کی آئینہ داری کرتی ہے۔ انھوں نے خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے ؎

مومنؔ کو سچ ہے دولتِ دنیا و دیں نصیب　　　　شب بُت کدے میں گزرے ہے دن خانقاہ میں

(۸)

مومنؔ کہتے تو یہ تھے کہ انھیں دولتِ دُنیا و دیں نصیب ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اُنھیں نہ تو دنیا ہی کی دولت حاصل ہو سکی نہ دین کی۔ ان دونوں دولتوں کو وہ حاصل کرنے کے لئے ساری زندگی ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ اور اس سلسلے میں انھیں بڑی کوششیں اور کاوشیں کرنی پڑیں لیکن دین و دنیا دونوں سے جو کچھ وہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ انھیں نصیب نہ ہو سکا۔ اگر اس سلسلے میں اُنھیں کچھ حاصل بھی ہوا تو اُس کی نوعیت ذہنی اور خیالی تھی عملی طور پر انھیں کچھ بھی نہ مل سکا۔ اُن کی زندگی محرومیوں ہی سے ہمکنار رہی۔ اُس میں ناکامیوں ہی کا بسیرا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت میں حسرت اور مایوسی کا رنگ و آہنگ بہت نمایاں ہے اور وہ اپنی رنگینیوں اور رنگین خیالیوں کے باوجود ایک کرب کے عالم میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ انھیں محرومی کا احساس ہے۔ ناکامی کا خیال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زندگی کی شکایت کی ہے وہ زمانے کے شکوہ سنج رہے ہیں۔ اُنھیں بات بات پر رونا آیا ہے اور زمانے کی ناسازگاری پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے اُنھوں نے اپنی ساری زندگی گزار دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گریہ و زاری کے یہ عناصر اُن کی شخصیت میں اتنے نمایاں ہیں اور زمانے کے غم کا احساس اُس میں اس قدر شدید نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مومنؔ رئیس زادے تھے۔ اُن کا خاندان اچھے خاصے صاحبِ حیثیت لوگوں کا خاندان تھا۔ اُن کی زندگی کا خاصا حصہ آرام و اطمینان سے گزرا لیکن اس زندگی میں

اُنھیں بعض ایسے صدمے سہنے پڑے جنھوں نے انھیں ایک کرب کے عالم میں مُبتلا کر دیا۔ یہ صدمے اُن کے دل میں داغ بن گئے اور ان کے اثر سے انھیں زندگی بھر چھٹکارا نہ ملا۔ ساتھ ہی اُن کے زمانے کی خارجی اور اجتماعی زندگی میں جو انتشار تھا، اُس نے بھی انھیں چین نہ لینے دیا، اور وہ ان حالات کو دیکھ کر خاصی ذہنی پریشانیوں میں گرفتار رہے۔ ”انشائے مومن“ میں ایک خط حکیم احسن اللہ خاں کی والدہ اور اپنی عمۂ محترمہ کے نام ہے۔ اس خط سے مومن کی ان پریشانیوں کی پوری طرح وضاحت ہوتی ہے۔ اپنی عمۂ محترمہ کو لکھتے ہیں :—

”قبلۂ مومن وفاپرست، سلامت خرد ادب آموز دستورے نمی دہد کہ لفظ آداب تسلیمات بزنگارم، وپایہ شناسی دست از درک فلک تازیارنمی دارد کہ حدیث شوق پابوس برزبان آرم، حیرانم چہ سازم ونمی دانم چہ برطرازم۔ اگر گلی بباغِ فردوس در ودے فرستد برید صبا را رضوان راہ ندہد واگر قطرہ بموج خیر عماں تسلیمے عرضہ دارد، لطمۂ سیل فنا داغ ارزم بے مائگی برجگرش می نہد۔ اگر ازین گفتگو زباں بربندم طعنہ بدعت از زبان بے صرفہ سرائی زمانیاں ہم نہ پسندم باطبع دشوار پسند کارم افتادہ۔ چہ مشکل کاریست ورائے صائب ارجمند بہ یک سو کام نہ نہادہ —
چہ راہ دشوارے عنایت ازلی حضر طریقت گم کردہ راہیم باد تابہر دادی کہ روم منزل مقصود رونماید وبہ ہر میدان کہ شتابم پایم بسنگ ناہنجارے در نیاید۔ بایں ہمہ آسیمہ حیریہا جز باغوش کرم پناہم نیست وباچندیں ہرزہ دوی گریزے جز بآں درگاہم نے معنی ففِرّوا الی اللہ من غضب اللہ۔ اگر دلیلِ من نشدے از راہ دور افتادہ بودم واگر مضمون ”ہدی للمتقین“ عصائے کیاست بیمناک من نگستے قدم بسنگلاخ ضلالت نہادہ بودم، دریں صورت اگر معنیٔ اولیں ملائم طبع عالی بود وعدہ ناکردہ بخموشی وفا کردم۔ ہرچند بنالیدن بیکسانہ یگانہ ام واگر مضمون آخرین برسم لفظ آشنایاں بے معنی بپسند خاطر رعایت پسند باشد بہ کنایہ ادا کردہ تواں پذیرفت کہ بہ سخن سنجی افسانہ ام۔ بیت

خموش نیستم وجرأت سخن ہم نیست ترحمے کہ مرا کار مشکل اُفتاد است

حدیث دشوار ستمہائے فلک بیاد دم داد۔ چوں دل بہانہ شور افگندن می جست زبان بہ تظلم بر کشاد۔ اولین جفائے کہ ازیں بے رحم بہ من رفتہ آنست کہ ضمیرم بخاک دل سوختہ و جگر برشتہ در گرفتہ۔ روزے کہ رنگ کالبدم ریخت بہ شور محبت رغبتم انگیخت۔ جفائے ندیدہ۔ جفا ہا دیدم و ستمے ناکشیدہ ستمہا کشیدم۔ دیگر بیداد جاں گزائے کہ جو نیم جانی نہ گذاشتہ سایۂ والد شفیق را کہ بہ آغوش عاطفتم پروردہ از سرم برداشتہ ہنوز آں جراحت ناسور اثر رو بالتیام نیاوردہ بود کہ مرگ مادر مشفق سینہ خراشیہا نمود۔ اگرچہ ایں حادثہ تاب گسل می خواست کہ عضو عضوم از ہم گسلد و جاں برلب رسیدہ و نفس بخوں طپیدہ بخار خار شوق ہم در سینہ بخلد اما با آہن دلیم، آہن سرد کوفتن بود و نسبت جانیم سنگ بہ شیشہ شکستن می نمود۔ اکنوں بہ تعلیم کدا ایں بے مہر ستم آموز روزگار زہرے بکاسہ ام ریخت کہ بہ آب چشمہ خضر مداوا نتواں کرد و دشنہ در جگرم سپرد کہ شگاف سینہ را ہیچ مرہمے باندمال نتواند آورد۔ اکنوں جز مردن چارہ نیست کہ علاج شکستگی سنگ خارا نے۔ من و امید وصال کہ بدوری چنیں عمہ سراپا شفقت زیستن بمرگ جاں شستن و بزندگانی ملک الموت گریستن است۔ اگر ازیں اندوہ دشنہ الماس جوہر در جگرم نیست دلم صد چاک باد و اگر سودائے غبار راہ گشتن در سرم نے سرم خاک باد۔[1]

اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کو زندگی میں بڑی صعوبتیں اٹھانی پڑیں اور بے شمار پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے اثرات اُن کے ذہن پر بہت خراب ہوئے۔ انھیں ایک لمحہ بھی سکون کا نصیب نہ ہوا اور وہ اسی غم کی آگ میں پڑے سلگتے رہے۔

کون جانے کہ انھوں نے عشق و ہوس کی جو زندگی بسر کی وہ اس غم کو بھلا دینے اور غیر شعوری طور پر اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی ایک کوشش ہے۔ لیکن اُن کی زندگی کا المیہ تو یہ ہے کہ اس میں بھی انھیں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ انھوں نے جتنے عشق بھی کیے اُن میں

---

[1] مومن: انشائے مومن: ص ۲۹-۳۱

وہ ناکام رہے، اور ایک عشق تو ایسا تھا جو اُن کے دل میں ایک مستقل داغ بن گیا۔ یہ وہی عشق ہے جس کی جھلک اُن کی مثنوی "قولِ غمیں" میں نظر آتی ہے؛ اور جس کی طرف بہت واضح اشارے اُن کی غزلوں میں بھی جگہ جگہ ملتے ہیں۔ غرض یہ عشق و ہوس کی زندگی بھی اُنھیں راس نہیں آئی۔ اُنھوں نے اس کا سہارا لیا تھا لیکن خود یہ سہارا بھی اُن کے لئے ایک ناسور بن گیا۔ اُس شخص کی کس مپرسی کا کیا ٹھکانا ہے جو زندگی میں غم غلط کرنے کے لئے ایک سہارا ڈھونڈے لیکن وہ سہارا بھی جس کے لئے ایک مستقل اور مسلسل غم کا باعث بن جائے۔ مومن کو اپنی زندگی میں اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا، اور ان اثرات نے اُن کی شخصیت میں ایک مستقل کرب اور ایک مسلسل المناکی کی صورت اختیار کر لی۔

مومن بڑے خوددار آدمی تھے۔ رکھ رکھاؤ اُن کے مزاج کا جزو تھا۔ لیے دیئے رہنا اُن کی فطرت میں داخل تھا۔ اُنھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا لیکن زندگی میں بعض واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مزاج کی اس خصوصیت کے ہاتھوں خاصے پریشان رہے۔ دنیاوی معاملات میں اُنھیں دلچسپی لینی پڑی۔ جو کچھ وہ کرنا نہیں چاہتے تھے، وہ بھی اُنھیں کرنا پڑا۔ ناصر نذیر فراق نے میخانۂ درد میں ایک جگہ مومن کا ذکر کرتے ہوئے کچھ ایسے واقعات بیان کئے ہیں، جن کو پوری طرح صحیح تو نہیں کہا جا سکتا، لیکن اُن سے مومن کی شخصیت کے اس پہلو پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ وہ خواجہ ناصر امیر کی سجادہ نشینی کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "مومن خاں صاحب کو خواجہ ناصر امیر صاحب کی سجادہ نشینی بہت ناگوار ہوئی کیونکہ اُن کا جی چاہتا تھا کہ سسرے کی جگہ وہ خود سجادہ نشین ہوں۔ مگر جانتے تھے کہ اگر شاعری اور طبابت چھوڑ کر خود فقیر بنوں گا تو زمانہ چٹکیوں میں اُڑائے گا اور کہے گا ؎

اللہ رے گمرہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

اس لئے اُنھوں نے یہ ڈھونگ کھڑا کیا کہ اپنے ہم زلف مولوی سید یوسف علی مدراسی کو جمعہ کے دن دلی کی جامع مسجد میں لے گئے اور نماز کے بعد اُن کے گلے میں کفنی ڈالی اور ایک ناصری اُن کے کندھے پر رکھی، جو خواجہ میر درد صاحب کے خاندان کی خاص علامت تھی اور لوگوں سے کہا کہ خواجہ محمد نصیر مرحوم

کی جگہ آپ اُن کے سجادہ نشین ہوئے ہیں۔ مگر مولوی یوسف علی صاحب کی طرف دِلّی والے اصلاً متوجہ نہ ہوئے۔ جب مومن خاں صاحب نے دیکھا کہ یہ افسوں بھی نہ چلا تو انھوں نے بیوی اور سالی کی طرف سے دعویٰ دائر کیا کہ ساری جائداد بارہ کی اور اُس کی متعلق خواجہ محمد نصیر صاحب کی ہے، اس لئے ہمیں ملنی چاہیئے اور مقدمے کی پیروی کے لئے میر تفضل حسین کو وکیل مقرر کیا میری پرنانی اور نانی رانڈوں کا اُس وقت سوائے خُدا کے کوئی اور مددگار نہ تھا خواجہ ناصر جبیر صاحب اُس وقت ناتجربہ کار اور اپنی ضروریات میں مبتلا تھے۔ بی امانی بیگم صاحبہ اور عمدہ بیگم صاحبہ نے جواب دہی کے لئے مغل جان وکیل کو ٹھہرایا۔ پیروی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارہ دری اور حجرہ یعنی خواجہ میر دردؒ کا عبادت خانہ وقف ہو کر اُن کی اولاد سے مستثنیٰ ہوگیا۔ اور باقی جائداد کا دعویٰ اس بنا پر خارج ہوا کہ یہ تمام جائداد خواجہ محمد نصیر صاحب کی نہیں ہے بلکہ خواجہ میر درد صاحبؒ کی متروکہ ہے چونکہ خواجہ میر درد صاحبؒ کے خواجہ محمد نصیر صاحب نواسے ہیں اس لئے ان کا چوتھائی حق نانا کے ترکے میں سے ہو سکتا ہے۔ اس پہلی نالش کے مصارف میں مومن خاں صاحب کی بیوی اور سالی کے سکنی مکان فروخت ہو گئے۔ اب انھوں نے دوبارہ چوتھائی کی نالش کی، اور اس دعوے میں انھیں کامیابی ہوئی اور میری پرنانی امانی بیگم صاحبہ اور عمدہ بیگم صاحبہ میری نانی کے پاس جو ہزاروں روپے کی جائداد تھی، اُس سے چوتھائی انجمن النساء اور اشرف النساء کو مل گئی اور خرچے کی زیرباری میں یہ دونوں مکان جو میرے پاس ہیں۔ اور میں نے برخوردار ناصر خلیق کو ہبہ کر دیئے ہیں اور برخوردار ناصر خلیق اُن پر قابض ہیں اور وہ ایک مکان جو ان مکانوں سے ملحق ہے اور میرے بھتیجوں کے حِصّے میں ہے نیلام ہو گئے۔ مگر میری والدہ نے اپنا زیور فروخت کر کے ان مکانوں کو خرید لیا۔ جب مومن خاں صاحب نے دہلی میں اینٹ سے اینٹ بجا لی تو پورب کی طرف توجہ فرمائی۔ مولوی یوسف علی صاحب کو ناصری گنج بھیجا تاکہ میر عبدالناصر پر نالش کر کے اپنی چوتھائی لے لیں۔ مگر میر عبدالناصر صاحب نے بائیس کے بائیس گاؤں اپنی منکوحہ کے مہر میں لکھ دیئے تھے اس لئے مولوی یوسف علی صاحب کا پورب جانا بے سود ہوا اور وہاں اُن کی دال نہ گلی[1]۔ اس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ناصر نذیر فراق مومن کے خلاف ہیں۔ اور اس میں بہت کچھ داستان

---

[1] ناصر نذیر فراق: مے خانۂ درد: ص ۲۰۶، ۲۰۷

کے لئے بھی شامل کیا ہے لیکن اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ مومن کو دنیا کے ہنگاموں میں حصّہ لینا پڑا۔ حالانکہ وہ اُن سے ذہنی طور پر کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے لیکن حالات نے انھیں مجبور کر دیا۔۔۔ ایسے نہ جانے کتنے واقعات اُن کی زندگی میں ہوں گے۔ اس کا اثر اُن کے ذہن پر بہت خراب ہوا۔ ان واقعات نے اُن کی شخصیت میں زندگی سے بیزاری سی پیدا کر دی۔ یہی سبب ہے کہ وہ زمانے کے اتنے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔

ایک فارسی قصیدے میں کہتے ہیں ؎

ز تنگنائے جہاں من کجا روم یارب | ہجوم رنج و بلا گردِ من کشید حصار
چو یوسفم ہمگی آرزو بود غربت | بتنگ آمدہ ام از دیار و اہل دیار
ز مردمانِ جہاں بس کہ رنجہا دیدم | چہ نوع انسم از نیم ز خویشتن بیزار
چناں گریزم از ایناں کہ می روم از خود | اگر بہ صفحۂ دل صورتے کشد پندار[۱]

اور ایک اُردو قصیدے کا آغاز اس طرح کرتے ہیں ؎

کوئی اس دور میں جیئے کیوں کر | ملک الموت ہے ہر ایک بشر
داد خواہوں کے شور سے دیکھو | چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر
آئینے نے بھی اس زمانے میں | تیغ کے سے نکالے ہیں جوہر
آتشِ لعل سینۂ جاں سوز | آب نیساں ہے ایک بد گوہر
جس کو دیکھو تو مایۂ بیداد | کیا ہوا گر نہیں ہے بیمیں بر
ذکر انساں سے دیو مجنوں ہو | آدمی سے پری کو آئے حذر
ہے پئے اشتیاق ویرانی | شاہ فرہاد بے ستوں کشور
نہ امیروں کو پائے بندیٔ عدل | نہ رعایا مطیع و فرماں بر

ایک اور اُردو قصیدے میں اسی خیال کا اظہار اس طرح کرتے ہیں ؎

خاک میں رشک آسماں سے ملے | ہائے کیسے بلند ایوانی
کر دیا گردش سپہر نے حیف | بُرج خاکی سپہر کیوانی

---

[۱] مومن: دیوان فارسی: ص۹

ایسی وحشت سرا میں آئے کون — بے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں — کہ میں شہری ہوں یا بیابانی

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کی زندگی میں بڑا غم تھا۔ اور وہ آس پاس اور گردوپیش کی حالت کو دیکھ کر زندگی سے کچھ بیزار سے ہو گئے تھے۔ اسی لئے انھوں نے اس کا رونا رویا ہے۔ اُن کی شخصیت میں بیزار ہو کر گریہ وزاری کرنے والی خصوصیت خاصی نمایاں ہے لیکن ان حالات کی ناسازگار کیفیت کو دیکھ کر وہ مایوس نہیں ہو جاتے۔ زندگی کو بسر کرنے کی خواہش اُن کے یہاں موجود رہتی ہے۔ اسی لئے وہ ان ناسازگار حالات کو راہ راست پر لانے کی تمنا رکھتے ہیں —— اور شاید انقلاب کی خواہش اُن کے یہاں اسی وجہ سے بیدار ہوتی ہے ؎

اے حشر جلد کر تہہ و بالا زمین کو
گر کچھ نہیں اُمید تو ہے انقلاب میں

(۹)

زندگی میں اگر ناسازگار حالات ہوں تو خوددار انسان کو اپنی اہمیت کا احساس کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا ہے۔ مومن کے یہاں بھی یہی صورتِ حال پیدا ہوئی ہے۔ وہ ایک خوددار اور غیور شخص تھے۔ انھیں اپنی اہمیت کا احساس تھا۔ اُن کے آس پاس اور گردوپیش کی زندگی میں جو انتشار اور ماحول میں جو افراتفری تھی اُس نے اس احساس میں کچھ اور بھی شدّت پیدا کر دی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتے تھے۔ انھیں اپنے بلند مرتبہ ہونے کا خیال تھا اسی لئے وہ جگہ جگہ اپنی تحریروں میں تعلّی کر کے اپنی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ یہ تعلّی حقیقت پر مبنی ہے۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے اُس سے اُن کی شخصیت کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ اُن کے نقطۂ نظر اور نظریۂ حیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ معیار سامنے آتے ہیں جنھیں وہ زندگی میں عزیز رکھتے تھے۔ اور اُن قدروں کا پتہ چلتا ہے جن کا سہارا لینا اُن کے نزدیک زندگی میں از بس ضروری ہے۔

اُن کے فارسی دیوان میں جو پہلا قصیدہ ہے۔ اُس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے سلسلے میں انھوں نے اپنا ذکر بھی کیا ہے اور تعلّی کے انداز میں اپنی شاعری

کی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ کہتے ہیں ؎

زفخرِ نعتِ تو طرفِ کلاہ می شکنم | چناں کہ دارم از اوصافِ تاج داراں عار
منم کہ نیست قرانم بہ ہیچ قرن و زماں | منم کہ نیست نظیرم بہ ہیچ شہر و دیار
نبود و نیست عدیلِ من امتحاں اینک | ز زندگاں لب و خامہ ز مُردگاں اشعار
چناں مقابلِ نظمم بود کلامِ حسود | کہ سیمِ قلب بہ پیشِ زرِ تمام عیار
قصایدم حسدش سبعۂ معلقہ را | بہ کعبہ کرد پریشاں جو سبعۂ سیّار
دریں زمانہ اش الہام و وہب بنامیم | ز وحی آمدنت گر کسے کند انکار
ہوائے نظمم بپیچید در دماغ کسے | کہ صد ہزار گلستاں دمیدش از دستار
چو می رود بہ زبانہا ز نازکی سخنم | بہ کامِ خلق شکست از چہ لذتِ اثمار

اور راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں جو قصیدہ اُردو میں لکھا ہے، اُس کے آخر میں اپنی اہمیت اس طرح واضح کی ہے۔ ؎

شاعرِ بے نظیر ہوں، سحر بیاں دبیر ہوں | دم ہے مرا نمونۂ معجزۂ پیمبری
سحر حلال سے مرے جادوئے سامری خجل | طورِ کلیم اوجِ فکر نور خدا فسوں گری
لاف زنی پس، مدیح رسم قدیم کیا کروں | اس غم تازہ سے نہیں مجھ کو امید جاں بری
کفر حکایت غرور اُس کے بغیر یہ مجال | تا متنبی و جریر عار ہے مجھ کو ہم سری
میری زبان میں وہ بات جس سے ملک سخن پہ ہے | میرے بیان میں وہ سحر جس سے جنوں زدہ پری
حیرتی عقوبت تازہ موکلانِ قہر | بس کہ مرے حسد سے ہے تیرہ روانِ انوری
مجھ کو یہ گل زمیں پسند آگئی اتفاق سے | مزرعِ غیر میں کسے ورنہ سرِ کدیوری
نانِ گدا پہ رغبتِ شاہِ جہاں غلط غلط | با ہمہ برتری دروغ آرزوئے فروتری
اب نہیں کی ہے اختیار نظم کو میں نے یہ زباں | آپ ہیں لب پہ بوسہ زن ہندی تازی دری

حضرت علی کی شان میں ایک قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی اُن کی تیغ کے ساتھ انھیں اپنی زبان تیغ کا خیال آجاتا ہے اور اپنے بارے میں اس طرح رطب اللساں ہو جاتے ہیں ؎

ل؎ مومن: دیوان فارسی: ص۹

کٹتی ہے میری تیغ زباں سے زبانِ تیغ　　کیوں کر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ
میرے نفس کی دیکھ کے معجز نمائیاں　　کیا دور ہے کہ دم نہ رہے درمیانِ تیغ
فردوسی ایک خارِ جنانِ بیان تھا　　گل ریز میرے دم سے ہوئی داستانِ تیغ
حسّاد سر سے پاؤں تلک خوں میں ڈوب جائیں　　جوہر اگر دکھاؤں میں اپنے بسانِ تیغ
میدانِ کشت وخوں میں مرادست بے سوار　　جا دے عناں کشیدہ تو ہو ہم عنانِ تیغ
یہ دل خراشیاں مرے اشعار شوخ کی　　سینے پہ منکروں کے ہیں لاکھوں نشانِ تیغ

اور غزلوں کے مختلف اشعار میں بھی اپنی اہمیت واضح کی ہے۔ اس قسم کے اشعار کی ان کے دیوان میں خاصی تعداد موجود ہے ؎

پڑھتا ہے غزل کہیں جو مومنؔ　　لگ پڑتی ہے ایک بار آتش

اک اور پڑھ دو مومنِ شعلہ زباں غزل　　جل جائیں جس کے رشک سے حاسد بسانِ شمع

مومنؔ یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے　　جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ

مدّت سے نام سنتے تھے مومنؔ کا بارے آج　　دیکھا بھی ہم نے اُس شعراء کے امام کو

عبث ترقّیِ فن کی ہوس ہے مومنؔ کو　　زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بے مثال تو ہے

یہ تعلّی یوں تو عجیب نہیں کیونکہ اُردو شاعری میں تو اس کی اچھی خاصی مضبوط روایت ملتی ہے۔ لیکن مومنؔ کی شخصیت میں تعلّی کا یہ پہلو بہت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اول تو وہ پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔ دوسرے اُن کا یہ مزاج بھی نہیں تھا کہ وہ خود اپنی تعریف کریں یا دوسروں سے اپنی تعریف کرائیں۔ وہ اس معاملے میں خاصے گوشہ نشین قسم کے آدمی تھے۔ انھیں کسی سے اُلجھنا نہیں آتا تھا۔ شاعروں کے مقابلے میں آنے کی انھیں تمنا نہیں تھی۔ وہ تو ستائش کی تمنّا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر شعر کہتے تھے۔ اور ساری زندگی ان کا یہی انداز رہا۔ وہ کبھی

قلعے میں نہیں گئے۔ کسی رئیس کے ساتھ انھوں نے کبھی بھی وابستگی اختیار نہیں کی ـــ کبھی اپنی شاعری کو کچھ حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنایا ـــ غرض وہ خاصے بے نیاز قسم کے شاعر تھے۔

اس صورتِ حال نے اُن کے یہاں ایک برتری کا احساس پیدا کیا، اور وہ دوسرے شاعروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بلند اور برتر سمجھنے لگے۔ اسی لئے اُن کے یہاں کہیں کہیں اس کا اظہار بھی ہو گیا ہے۔ ایک بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انھیں اپنی شاعری کے ساتھ بڑا خلوص تھا۔ وہ سچے شاعر تھے۔ اور سچی اور پُر خلوص شاعری کی اُن کے نزدیک بڑی اہمیت تھی۔ اس لئے اپنی شاعری کے بارے میں انھوں نے جگہ جگہ بلند آہنگی کے ساتھ اظہار خیال کر دیا ہے ـــ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اُن کے زمانے میں جیسی اُن کی قدر دانی ہونی چاہیئے تھی، وہ نہ ہو سکی۔ اُن کا زمانہ بعض بڑے ہی اہم شاعروں کا زمانہ تھا۔ وہ خود بھی اُس زمانے کے ایک اہم شاعر تھے لیکن اُس زمانے نے ذوق کی قدر نسبتاً زیادہ کی۔ بہت ممکن ہے۔ یہ احساس بھی اس تعلّی کا باعث بنا ہو۔ وہ زمانہ جیسا کہ خود مومنؔ نے جگہ جگہ اظہار کیا ہے۔ سیاسی اور سماجی اعتبار سے ناساز گار تھا۔ ہر طرف انتشار اور افراتفری کی کیفیت تھی۔ اس انتشار اور افراتفری نے ہر شخص کی انفرادیت کو ختم کر دیا تھا۔ ہر شخص کی عزّت اور آبرو کے چراغ آندھیوں کی زد پر تھے۔ مومنؔ نے یہ سارا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ اس ماحول میں طبقاتی احساس کے پیش نظر نفسیاتی طور پر انھوں نے اپنے آپ کو بلند و برتر سمجھا ہو ـــ اور وہ اس کا اظہار بھی اس تعلّی کے پیرایے میں کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہوں۔

بہر حال اسباب جو کچھ بھی ہوں ـــ مومنؔ کی شخصیت میں یہ تعلّی کا پہلو بہت نمایاں ہے تعلّی عام طور پر ایک قسم کے سستے پن کو پیدا کرتی ہے۔ لیکن مومنؔ کے یہاں جو تعلّی ملتی ہے اُس میں یہ بات نہیں ہے۔ اُس میں تو ایک بڑائی نظر آتی ہے۔ اور مومنؔ کی شخصیت کے بعض خط و خال اس سے پوری طرح نمایاں ہو کر سامنے آجاتے ہیں۔

(۱۰)

یہ تمام تفصیلات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ مومنؔ ایک متنوع اور پہلو دار شخصیت رکھتے تھے۔ اُن کی شخصیت معمولی نہیں تھی۔ اُس میں ایک انفرادی شان نظر آتی ہے۔ وہ

وسیع اور ہمہ گیر ہے۔ اُس میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہے۔ اُس کا اثر ذہنوں پر ہوتا ہے۔ وہ دلوں میں بھی جگہ بناتی ہے۔ وہ بعض ایسی خصوصیات کی حامل ہے جو چونکاتی ہیں۔ وہ سیدھی سادہ اور سپاٹ نہیں ہے۔ اُس میں پیچ وخم ہیں۔ نشیب فراز ہیں۔ اور یہ پیچ وخم اور نشیب وفراز یکسانی اور یکرنگی کو پیدا نہیں ہونے دیتے۔ اُن کی شخصیت میں بعض عجیب وغریب باتیں بھی ہیں۔ بعض متضاد پہلو بھی اُس میں نظر آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُس میں ایک باقاعدگی اور استواری کا احساس ہوتا ہے اور وہ اپنی جگہ پر مضبوط مکمل اور بھرپور معلوم ہوتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مومنؔ اپنے زمانے کی پیداوار ہیں۔ اور اُن کی شخصیت ایک مخصوص عہد اور ایک خاص دور کی نمایندگی کرتی ہے۔ اُس زمانے کا عکس اُن کی شخصیت میں صاف نظر آتا ہے۔ اُس زمانے کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری زندگی کی جھلکیاں اُس میں نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ اور مومنؔ کی شخصیت کو دیکھ کر اُس زمانے کی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کا ایک نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ مومنؔ کی بڑائی اسی میں ہے کہ اُن کی شخصیت میں ایک دور، ایک ماحول، ایک فضا اور اُن کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے افراد کی زندگی کے جذباتی اور ذہنی پہلوؤں کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔ وہ اُس زمانے کے امیروں کی نمایندگی بھی کرتے ہیں۔ اور بدلتے ہوئے حالات نے اس طبقے کے افراد کو جن خصوصیات سے دوچار کردیا تھا، اُس کا صحیح نقشہ اُن کی شخصیت میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ اُس زمانے کی جذباتی زندگی کے مدّوجزر اور نشیب وفراز کی بھی صحیح ترجمانی کرتے ہیں اور اُس ماحول میں عام افراد جن جذباتی معاملات ومسائل سے دوچار رہتے اُس کی پرچھائیاں بھی اُن کی شخصیت پر پڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ اُس عہد کی دینی اور مذہبی تحریکات کی آئینہ داری بھی کرتے ہیں اور اُس ماحول میں ان تحریکوں نے افراد کو جس صورتِ حال سے آشنا کیا تھا اُن کی شخصیت اُس کی آئینہ داری بھی کرتی ہے۔

غرض مومنؔ کی شخصیت کے مختلف پہلو اُس عہد کے صحیح عکاس اور ترجمان ہیں۔ اور اس اعتبار سے اُن کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

وہ اپنے زمانے کی آئینہ داری ضرور کرتے ہیں۔ اُن کی شخصیت میں اُس دور کی ترجمانی ضرور نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کی شخصیت میں ایک انفرادی شان کا پتہ چلتا ہے۔ اُس زمانے کے امیر جس طرح صرف امیر ہوتے تھے۔ اور اپنی امارت کو باقی رکھنے کے لئے جس طرح زمین آسمان ایک کرتے تھے، مومنؔ کو اُس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ درباروں میں نہیں جاتے تھے۔ انھیں مال و دولت کی ہوس نہیں تھی۔ وہ خوددار اور غیور انسان تھے۔ اسی لئے سادگی سے زندگی بسر کرنا اُن کے مزاج میں داخل تھا۔ لیکن اس سادگی کا مطلب معاشرتی اور تہذیبی تقاضوں کو خیر باد کہنا نہیں تھا وہ ان روایات کے بھی صحیح علم بردار تھے۔ اسی لئے اُس رکھ رکھاؤ اور وقار کا انھوں نے خیال رکھا ہے جس کی اُمراء کے یہاں بڑی اہمیت تھی لیکن جس سے بعض لوگ ناساز گار حالات کے باعث چشم پوشی کرنے لگے تھے۔ مومنؔ نے ایسا نہیں کیا ہے۔ وہ زندگی بھر لیئے دیئے رہے ہیں۔ اُنھوں نے کبھی بھی نیچ گرنا گوارا نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس اعتبار سے اُن کی شخصیت میں ایک بلندی نظر آتی ہے۔ لیکن اس رکھ رکھاؤ اور وقار کے باوجود اُنھوں نے اُس زمانے کی امیرانہ زندگی کے معاشرتی اور مجلسی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ اُنھوں نے رنگین زندگی بھی بسر کی ہے۔ وہ عشق و ہوس کی راہوں سے بھی گزرے ہیں۔ رندی اور شاہد بازی بھی اُن کا شعار رہا ہے۔ لیکن اس معاملے میں ان کے یہاں وہ انتہا پسندی نہیں ملتی جس نے اُس زمانے کے اُمراء کی زندگی میں کسی حد تک ابتذال بھی پیدا کر دیا تھا۔ مومنؔ نے لذت اور تعیش کی زندگی بسر کی ہے اور ایسا کر کے مجلسی زندگی کے تقاضوں کو پورا کیا ہے اور زندگی کے جذباتی اور جمالیاتی پہلوؤں کی تسکین کے سامان فراہم کئے ہیں کہ یہ اُس زمانے کی معاشرت اور تہذیب کا ایک اہم جزو تھا۔ عشق وہ بیں کو لوگ عیب نہیں سمجھتے تھے۔ زندگی میں جس طرح اور بہت سی چیزوں سے دلچسپی لی جاتی تھی۔ وہاں اس کو بھی دلچسپی کی خاطر پیش نظر رکھا جاتا تھا۔ اور اس معاملے میں اُس زمانے کے لوگ خاصے بے راہرو ہو گئے تھے۔ مومنؔ اس معاملے میں بڑی حد تک متوازن رہے ہیں۔ اُنھوں نے خاصی رنگین زندگی بسر کی ہے۔ زندگی کا

بیشتر حصہ بقول شیفتہ اُنھوں نے وصالِ یاران رنگین اور وصل شاہدان شیریں میں گزارا لیکن اپنے حدود سے باہر نہیں نکلے۔ اور جو کچھ اُنھوں نے اُس زمانے میں کیا۔ وہ اِس وقت کے معیاروں کے لحاظ سے عجیب ہو سکتا ہے۔ لیکن اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو اُن کا یہ عمل عجیب وغریب نہیں تھا۔ لوگ اس کو بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ یہ سب کچھ تو اُن کے نزدیک جذباتی، ذوقی اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرنے کا ذریعہ اور وسیلہ تھا۔ مومنؔ صورت پرست کی رنگین اور پُرکار شخصیت میں کاروبارِ شوق کی یہ رنگیں کاریاں اسی صورت حال کی عکاسی کرتی ہیں۔

مومنؔ کی انفرادیت اس میں ہے کہ اُنھوں نے عشق وہوس کی زندگی میں نہ صرف توازن کو باقی رکھا، بلکہ اپنے مذہبی اور دینی عقائد میں پختہ رہے۔ اور اپنے زمانے کی ایسی شخصیتوں اور اُن کی تحریکوں سے دلچسپی لی جن کے پیش نظر دینی، مذہبی اور سیاسی اصلاح تھی۔ مومنؔ عام زندگی میں کوئی بڑے مذہبی آدمی نہیں تھے۔ رندی اور آزادہ روی کا اُن پر غلبہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ دینی تحریکوں سے متاثر ہوئے۔ اُنھوں نے نہ صرف اُس زمانے کے سب سے بڑے عالم باعمل کے ہاتھ پر بیعت کی بلکہ اُنھوں نے جہاد کا جو پیام دیا تھا اُس سے ذہنی مناسبت پیدا کی۔ زندگی بھر وہ جہاد کی آرزو کرتے رہے۔ یہ اور بات ہے کہ انھیں عملی طور پر اُس میں شریک ہونے کا موقع نہ مل سکا۔ لیکن اس معاملے میں اُنھوں نے جس اخلاص مندی اور والہانہ جذب وشوق کا اظہار کیا ہے۔ اس کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مومنؔ رند تھے۔ اُن کے مزاج میں آزادہ روی تھی لیکن اس کے باوجود اُن کی شخصیت میں مذہب کا بڑا دخل تھا؛ اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک سچے مسلمان تھے۔ مذہب اور مذہبی معاملات کے ساتھ اتنا لگاؤ اُس طبقے کے افراد میں ذرا مشکل ہی سے ملے گا، جس سے مومنؔ تعلق رکھتے تھے۔ اُن کی شخصیت کا یہ غیر معمولی پہلو ہے کہ اونچے طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اُنھوں نے مذہب کو اتنی اہمیت دی۔ اور اسلام اور مسلمانوں کا اتنا درد اپنے دل میں پیدا کیا۔ اُن کی شخصیت کا یہ بہت ہی اہم پہلو ہے اور اس سے انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سے

مومن کی شخصیت میں ایک دو رنگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے، اور ایک تضاد ضرور نظر آنے لگتا ہے۔ لیکن یہ دو رنگی اور تضاد تو خود اس زمانے کی زندگی میں موجود تھا۔ لوگ زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو خانوں میں نہیں بانٹتے تھے۔ البتہ مذہبی معاملات میں سنجیدگی اُن کے یہاں نہیں تھی۔ مومن کے یہاں اس معاملے میں سنجیدگی کا احساس ہوتا ہے، اور اسی میں اُن کی انفرادیت کا راز مضمر ہے۔

اور پھر مذہب سے اُن کی دلچسپی کی بُنیاد محض اُن کی مذہبیت ہی نہیں تھی۔ اس میں تو اُن کے سیاسی شعور کو بھی خاصا دخل تھا۔ مومن مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے خواہشمند تھے۔ اُن کے زمانے میں انگریزوں کا عمل دخل ہو چکا تھا۔ مسلمان بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔ اُن کی حیثیت شطرنج کے بادشاہ سے زیادہ نہیں تھی۔ سکّہ انگریزوں کا چلتا تھا۔ مومن اس پر کُڑھتے تھے۔ اُنھیں اس بات کا بڑا دُکھ تھا۔ اُنھوں نے انگریزوں کو اسی وجہ سے کافر کہا ہے، اور وہ اس زمانے کو دارالحرب سمجھتے رہے ہیں۔ یہی خیال ہے جو اُنھیں کبھی جہاد کے لیے آمادہ کرتا ہے اور کبھی شریفوں اور نجیبوں کی ناقدری کا احساس دلا کر لکھنؤ اور حیدرآباد جانے کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس خیال کو عملی جامہ نہیں پہنا سکے ہیں لیکن یہ خیال اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مومن اپنے زمانے کے سیاسی حالات کا کتنا گہرا شعور رکھتے تھے اور اس معاملے میں اُن کا زاویۂ نظر کیسا صحیح اور حقیقت پسندانہ تھا۔ انشائے مومنؔ میں ان کا ایک خط شامل ہے جو اُن کے چچا غلام حسین خاں کے نام ہے اور جس میں اُنھوں نے نہایت حسرت کے ساتھ لکھا ہے کہ "چوں دریں دیار خراب کہ بدست کفرہ جاہل بے قدر افتادہ قدر شریف و نجیب حکم کیمیا و دولت و اقبال تو حکم عنقا شد لاجرم سفر لکھنؤ صوابدید خاطر است۔ اگر دراں جا از رشتۂ مطلب گرہ کشود نیکوتر۔ ورنہ عزم آں دیار ہم بہ دل می خلد کہ بسیار کس قدر دانی رانچہ۔ چند و لعل بہا در نسبت باریاب کمال سیما شعرا دانمودہ و ایں ہیچ مداں رابوئے ازیں گلزار بہ دماغ اندیشہ رسیدہ"[1]۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ مومن اپنے زمانے کے ناسازگار سیاسی اور معاشی حالات کو سمجھتے تھے یہی وجہ

---

[1] مومن و انشائے مومن: ص ۱۲۵

ہے کہ وہ اس ماحول سے باہر نکلنے کی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔ لکھنؤ اور حیدر آباد میں انھیں دلّی کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ سازگار ماحول نظر آتا ہے اور وہ وہاں جانے کے منصوبے بناتے ہیں۔

مومن خاصے متوازن شخص تھے۔ اور اُن کے اس مُتوازن انداز میں بھی ان کی شخصیت کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ وہ تعلقات کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ان کی ایک گھریلو زندگی بھی تھی۔ اور اس گھریلو زندگی میں ایک خاصا خوشگوار ماحول تھا۔ اس زندگی کے جو تقاضے تھے۔ وہ انھوں نے پورے کیے۔ اُنھوں نے اپنے متعلقین سے محبت کی اور ہمیشہ ان کا خیال رکھا۔ اُن کی دلدہی اور دل آسائی کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔ اُن کے احباب کا حلقہ بہت وسیع نہیں تھا لیکن جو لوگ اُن کے حلقۂ احباب میں شامل تھے۔ اُن کے ساتھ اُنھوں نے ہمیشہ خلوص برتا اور ساری زندگی ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آتے رہے۔ اُنھوں نے کبھی کسی سے بگاڑ نہیں کیا۔ اُن کی کبھی کسی سے ناچاقی نہیں ہوئی۔ وہ کبھی کسی سے اُلجھے نہیں۔ اُنھوں کبھی کسی پر کیچڑ نہیں اُچھالی۔ وہ تو محبت کے بندے تھے۔ اُن کے پاس تو خلوص ہی خلوص تھا، ہمدردی ہی ہمدردی تھی۔ مومن کے یہاں یہ تمام رنگ رچے ہوئے نظر آتے ہیں اور اُن سب کے باہمی امتزاج اور آمیزش نے اُن کی شخصیت کو نہایت ہی متنوع اور پہلو دار، رنگا رنگ اور پُرکار بنا دیا ہے۔ یہ شخصیت اُس معاشرت کی صحیح عکاسی اور اُس تہذیب کی صحیح آئینہ داری کرتی ہے جس کو انیسویں صدی کی دلّی نے ایک ترشے ہوئے ہیرے کی شکل دے دی تھی۔

مومن کا ماحول

مومن اپنے ماحول کی پیداوار تھے اور اس ماحول کا مخصوص رنگ اُن کی شخصیت میں رچا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے زمانے کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی، تہذیبی اور مذہبی خیالات سے متاثر تھے اور اُن کی ذہنی نشو و نما انھیں حالات کے سایے میں ہوئی ہے۔ انھیں اپنے زمانے کی سیاست اور سیاسی حالات سے بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے معاشی، معاشرتی حالات سے بھی براہ راست کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، وہ مذہبی آدمی بھی نہیں تھے اور انھیں اپنے زمانے کی مذہبی زندگی سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا لیکن چونکہ اُنھوں نے ان حالات کی آغوش میں آنکھ کھولی اور انھیں کے سایے میں ان کی نشو و نما ہوئی۔ اس لئے وہ براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر ان سے ضرور متاثر ہوئے ہیں، اور اُن کی شخصیت میں ان حالات کے اثرات بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ اُن کی حرکات و سکنات، عادات و اطوار، افکار و خیالات، نظریات و تصوّرات سب میں ان حالات کے مختلف اثرات کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ان حالات نے جو مخصوص ماحول پیدا کیا ہے اور اُن کے ہاتھوں اُس زمانے کی انفرادی اور اجتماعی

زندگی میں جو مخصوص فضا قائم ہوئی ہے، اُس کا اثر مومن کی شخصیت میں نظر آتا ہے۔ اس مخصوص ماحول میں جو معیار قائم ہوئے ہیں اور اس مخصوص فضا میں جن قدروں کی ترویج ہوئی ہے، مومن کی شخصیت اُن کی صحیح آئینہ دار ہے۔ بظاہر وہ اپنے زمانے کی زندگی سے الگ، تھلگ رہے ہیں۔ اُنھوں نے اپنی ایک محدود سی دنیا علیحدہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ ان کا عام انداز ان کے بیشتر ہم عصروں سے مختلف معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود اُس زمانے کی زندگی کا عام انداز اُن کی شخصیت میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اور جس ماحول نے اس انداز کو پیدا کیا ہے، وہ اُس کے صحیح ترجمان اور عکاس نظر آتے ہیں۔

یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے ایک انتشار اور افراتفری کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں مرکزیت ختم ہوئی ہے، اقتدار کا خاتمہ ہوا ہے، طاقت نے دم توڑا ہے، حکومت وقت کی بنیادیں متزلزل ہوئی ہیں۔ نظامِ مملکت کی جان کے لالے پڑ گئے ہیں نظم و نسق پر جاں کنی کا عالم طاری ہوا ہے، زندگی کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں۔ اس کے نتیجے میں ہنگامے کھڑے ہوئے ہیں کسی چیز کا کچھ ٹھیک نہیں رہا ہے۔ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔ زندگی میں کوئی نظم و ضبط باقی نہیں رہا ہے۔ بدنظمی زندگی کا قانون بن گئی ہے۔ شورشوں نے سر اُٹھایا ہے، فتنے بیدار ہوئے ہیں، بغاوتوں نے جڑ پکڑی ہے، سازشوں کا بازار گرم ہوا ہے۔ شاہانِ وقت صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہیں۔ تخریبی طاقتوں نے انھیں شاہ شطرنج سے زیادہ حیثیت نہیں دی ہے جس کو بھی ذرا سا موقع ملا ہے اُس نے من مانی کی ہے اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے خیال پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اپنوں کے ساتھ بیگانے بھی میدان میں آگئے ہیں۔ سات سمندر پار سے آئے ہوئے لوگوں نے ملکی سیاست میں باقاعدگی سے حصہ لینا شروع کر دیا ہے، اور طاقت کی ہوس نے انھیں جو خواب دکھائے ہیں انھیں عملی شکل دینے کی کوشش بھی اُنھوں نے باقاعدگی سے شروع کر دی ہے۔ وہ صحیح معنوں میں حکمراں بن بیٹھے ہیں اور بادشاہوں کو اُٹھانے بٹھانے کا روبار اُنھوں نے شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ اُن کا اقتدار بڑھنے لگا ہے؛ اور اس بڑھتے ہوئے اقتدار کو دیکھ کر بہت سے لوگ اُن کے ساتھ ہو گئے ہیں۔ اور اُنھوں نے ان کے اقتدار کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھ لیا ہے۔ چنانچہ عجیب عجیب تماشے ہوتے رہے

ہیں۔ اس زمانے کی زندگی ان تماشوں کو نہ صرف دیکھتی رہی ہے۔ بلکہ ان تماشوں میں اُسے خود بھی شریک ہونا پڑا ہے، اور اس طرح وہ خود ایک تماشا بن گئی ہے۔

ان حالات نے اُس زمانے کی زندگی کے ہر شعبے کو بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ معاشرتی زندگی مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ جو معاشرتی روایات سینہ بہ سینہ منتقل ہو کر اس وقت کے افراد تک پہنچی ہیں۔ انھیں ان لوگوں نے عزیز تو رکھا ہے لیکن وہ انھیں پوری طرح برقرار نہیں رکھ سکے ہیں۔ معیار ڈانواڈول ہو گئے ہیں۔ قدریں متزلزل ہو گئی ہیں۔ صرف ان کا خیال باقی رہ گیا ہے۔ اسی لئے ان کی عملی شکل اس زمانے میں ذرا کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ افراد کا اخلاق بگڑا ہے۔ لذت اور تعیش کے خیالات اخلاقی معیاروں کو بہالے گئے ہیں۔ اس سیلاب بلا کے سامنے بڑے بڑوں کا قدم جمانا مشکل ہو گیا ہے اور وہ اس دھارے کے ساتھ بہہ نکلے ہیں۔ مذہبی اور دینی، ذہنی اور فکری تحریکیں بھی انھیں سہارا نہیں دے سکی ہیں۔ رندی میں لوگوں نے پناہ ڈھونڈی ہے۔ ذہنی تعیش کو افراد نے اپنا مزاج بنا لیا ہے۔ فرار پسندی ان کی طبیعتوں میں داخل ہو گئی ہے۔ غرض اس زمانے میں زندگی نے عجب عجب طوفانوں کو اُٹھایا ہے۔ معاشی اور اقتصادی نظام میں رخنے پڑ گئے ہیں اور وہ درہم برہم ہو گیا ہے۔ جب سیاسی زندگی میں سکون اور معاشرتی زندگی میں اعتدال و توازن نہ ہو تو اقتصادی اور معاشی نظام کی بنیادوں کا متزلزل ہو جانا یقینی ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں معاشی اور اقتصادی نظامِ اقدار کے فشار نے زندگی میں کچھ عجب انتشار پیدا کر دیا ہے۔ افلاس اور ناداری عام ہوئی ہے۔ بڑے بڑوں کو اس انتشار کی وجہ سے مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ زرگری کی ہوس جاری رہی ہے اور اس ہوس نے اعلیٰ معیاروں کو پس منظر میں ڈال دیا ہے۔ لوگ اپنی اپنی فکر میں پریشان اور سرگرداں رہنے لگے ہیں۔ غرض اس زمانے کی زندگی مجموعی طور پر ان حالات کی وجہ سے بڑے ہی انتشار اور افراتفری سے دوچار ہوئی ہے۔

مومن نے اس آشوبِ قیامت کی آغوش میں آنکھ کھولی، اور اسی سیاسی انتشار معاشی معاشرتی افراتفری اور ذہنی فشار کے سائے میں زندگی کے دن گزارے۔

یہ سارا تماشا اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ناسازگار حالات کے تمام مناظر اُن کی آنکھوں کے سامنے سے گزرے۔ اُنھوں نے ان کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی۔ اُن کے نشیب و فراز کا انھیں علم ہوا۔ چنانچہ اس زمانے کی زندگی کا مد و جزر اُن کی شخصیت میں بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔ وہ اس سے متاثر ہوئے ہیں یہی سبب ہے کہ وہ اپنے زمانے کی زندگی کا جزو معلوم ہوتے ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اس زندگی کی صحیح نمایندگی کرتے ہیں۔ اور اُس زمانے میں جو واقعات ظہور پذیر ہوئے ہیں، مجموعی طور پر اُن کا اثر اُن کی شخصیت میں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے۔ اس لیے ان حالات و واقعات کی تفصیل و جزئیات کی تلاش و جستجو مومنؔ کے مطالعے میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اسی آئینے میں اُن کی زندگی اور شخصیت کے خط و خال صحیح طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔

(۲)

وہ زمانہ جس میں مومنؔ نے آنکھ کھولی اور جس ماحول میں اُنھوں نے زندگی کے دن گزارے ہندوستانی مسلمانوں کے انحطاط و زوال کا زمانہ ہے۔ مغلوں کی سلطنت اس زمانے میں زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار ہوئی ہے اور اُس پر عرصے تک نزع کا عالم طاری رہا ہے۔ انحطاط و زوال کی وہ کیفیت جو اورنگ زیبؔ عالمگیر کی وفات کے بعد رونما ہوئی اُس زمانے میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ عالمگیر کا انتقال ۱۷۰۷ء میں ہوا۔ اُس کی آنکھ بند ہوتے ہی سلطنت سیاسی ہنگاموں سے دوچار ہوئی۔ مرتے وقت اُس نے اپنے بیٹوں کو میل جول کے ساتھ رہنے کی جو وصیت کی تھی اُس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اِدھر اُس کی آنکھ بند ہوئی اُدھر آپس میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ تخت و تاج کے لئے لڑائیوں کا ایک سلسلہ جاری ہوا۔ کبھی ایک بادشاہ تخت پر بیٹھا کبھی دوسرا۔ اس ماحول نے سازشوں کو ہوا دی۔ چنانچہ مغلوں کی حکومت میں دور دور تک سازشوں کے جال پھیلا دیے گئے۔ ان سازش کرنے والوں نے کٹھ پتلیوں کی طرح بادشاہوں کو اپنی گرفت میں رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی ساری ساکھ ختم ہو گئی۔ طاقت نے جواب دے دیا۔ ہر چیز منتشر ہو گئی۔ افراتفری کا دور دورہ ہوا۔ اس

صُورتِ حال سے بعض باغیانہ قوتوں نے فائدہ اُٹھایا اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ چنانچہ لڑائیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو کم و بیش انیسویں صدی عیسوی کے وسط تک جاری رہا۔ ان طاقتوں میں مرہٹے، سکھ اور انگریز خاص طور پر پیش پیش رہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں تقریباً تین چوتھائی صدی کا زمانہ انھیں ہنگاموں کی تاریخ ہے۔

یہ ہنگامے کبھی بھی نہ ہوتے یا کم از کم یہ صورت اختیار نہ کرتے، اگر مغلوں کی سلطنت میں داخلی طور پر مرکزیت اور استواری باقی رہتی لیکن مغلوں کی ہوس نے بھائی کو بھائی کے خون کا پیاسا بنا دیا - وہ بات بات پر ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔ سلطنت کو حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے ایک دوسرے کے خون کو پانی کی طرح بہایا جیسے وہ اُن کے نزدیک بہت ہی معمولی سی بات تھی۔ ان حالات نے جماعت بندیوں اور سازشوں کے لئے زمین ہموار کی۔ چنانچہ مغلوں کے دورِ آخر میں یہ سازشیں اور جماعت بندیاں زندگی جزو بن گئیں اور اُس زمانے کی سیاسی تاریخ انھیں سازشوں اور جماعت بندیوں کی ایک داستان معلوم ہوتی ہے۔ یہ سازشیں درباروں ہی تک محدود رہتیں تو صبر تھا۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ اُنھوں نے اپنے حدود سے باہر نکل کر بیرونی طاقتوں سے ساز باز بھی شروع کر دی۔ اور اس طرح ان کے علم بردار ان طاقتوں کے اشاروں پر رقص کرنے لگے۔ اس زمانے میں مغلوں کا دربار دو جماعتوں کی سازشوں کا شکار رہا۔ ان میں ایک تو ایرانی جماعت تھی اور دوسری تورانی ہندوستان کی سیاست میں اُس وقت انھیں کا عمل دخل تھا۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے رہتے تھے، اور اس کا اثر اس زمانے کے سیاسی حالات پر پڑتا تھا۔ سر جادو ناتھ سرکار نے تاریخ احمد شاہی کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس زمانے کا تمام فتنہ و فساد ایرانی اور تورانی اُمرا کے آپس کے جھگڑوں کا نتیجہ تھا[۱]۔ وہ شہزادوں کو آپس میں لڑاتے تھے تاکہ اُن کی اپنی اہمیت محسوس کی جائے اور انھیں من مانی کرنے کے مواقع ملتے رہیں۔ ان سازشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے ملک میں ابتری پھیل گئی۔ صوبے دار اپنے اپنے علاقوں میں خود مختار بن بیٹھے اور اس طرح مغلوں کی مرکزیت کا خاتمہ ہو گیا۔ بنگال میں علی وردی خاں نے اپنی

۱۔ SARKAR: FALE OF THE MOGHAL EMPIRE: VOL. I. P. 439

حکومت بنالی۔ اودھ میں سعادت علی خان نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ نظام الملک نے دکن میں ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ اس طرح ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں بعض نئی طاقتوں نے بھی سر اٹھایا۔ سکھ پنجاب میں حاکم بن بیٹھے اور مسلمانوں کے خلاف ہنگامے کرنے لگے۔ مرہٹوں نے دکن میں وہ اودھم مچایا کہ زیست مشکل ہو گئی۔ دلی اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں جاٹوں اور روہیلوں نے اپنے ہنگاموں سے قیامت برپا کر دی، اور پھر ان حالات کو دیکھ کر انگریز بھی ہندوستان کی سیاست میں پھاند پڑے۔ ساحلی علاقوں میں تو ان کا اثر بہت پہلے سے موجود تھا۔ اب جو انھوں نے یہاں کی سیاسی زندگی کے عام انتشار کو دیکھا تو ان کے دل میں طاقت حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہو گئی اور وہ بھی ان ہنگاموں میں شریک ہو گئے۔ غرض مغلوں کے انحطاط کے باعث ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے بڑی ہی غیر یقینی کیفیت پیدا ہوئی۔ اور ساری زندگی میں انتشار اور ہنگاموں کا کچھ اس طرح دور دورہ ہوا کہ ہر چیز کی بنیادیں ہل گئیں، اور زندگی کا ہر شعبہ اپنی جگہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا نظر آنے لگا۔

مومن نے جب آنکھ کھولی تو اپنے زمانے کی زندگی کو اسی صورت حال سے دوچار دیکھا۔ یہ شاہ عالم کا زمانہ تھا جس کی حکومت کچھ عرصے تک مرہٹوں کے رحم و کرم پر رہی لیکن بالآخر ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو دِلّی سے نکال باہر کیا اور اس طرح شاہ عالم بادشاہ ایک صیاد کے چنگل سے نکل کر دوسرے صیاد کے چنگل میں پھنس گیا۔ یہ وہی بدقسمت اور تیرہ روزگار شاہ عالم تھا جس نے اس سے قبل زمانے کے ہاتھوں عجب عجب ستم اٹھائے تھے۔ پورے پینتالیس برس تک اس نے حکومت کی؛ اور ان پینتالیس برسوں میں اس نے وہ کچھ دیکھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ خاصے عرصے تک انگریزوں نے اسے اپنا آلہ کار بنائے رکھا۔ دو برس تک بادشاہ کو شجاع الدولہ ساتھ ساتھ لئے پھرا، کبھی بنارس لے گیا، کبھی الہ آباد، کبھی لکھنؤ۔ ظاہر میں بادشاہ بادشاہ معلوم ہوتا تھا مگر درحقیقت وہ قیدی اعزاز کے ساتھ تھا[۵۱]۔ پھر انگریزوں نے اس کی پنشن مقرر کر دی اور وہ الہ آباد میں رہنے لگا۔ اُدھر

---

۵۱ ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان: جلد نہم: ص ۳۲

دلّی میں احمد شاہ ابدالی نے جواں بخت کو نائب بادشاہ مقرر کیا تھا اور اس طرح دلّی کی سلطنت چل رہی تھی۔ مرہٹوں اور جاٹوں کے ہنگامے جاری تھے۔ شاہ عالم کو الٰہ آباد میں رہتے ہوئے خاصا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس لئے ۱۷۷۱ء میں اُس نے دِلّی جانے کا ارادہ کیا۔ اور بغیر کچھ سوچے سمجھے چل دیا۔ میجر جنرل سر روبرٹ پارکر صاحب کچھ فوج لے کر کڑہ تک بادشاہ کے ساتھ گیا۔ یہاں ان جرنیل صاحب نے بادشاہ سے عرض کیا کہ آپ دلّی نہ جائیے۔ مگر بادشاہ نے نہ مانا۔ جن اضلاع میں بادشاہ ہو کر چلا گیا پھر اس کی حکومت کا کوئی نشان اُن میں نمودار نہ ہوا۔ اب اس بادشاہ کی سلطنت میں دو مخالف گروہ تھے۔ ایک مسلمان جو یہ چاہتے تھے کہ احمد شاہ ابدالی جس قدر ملک ہمارے لئے چھوڑ گیا ہے اُس کو اپنے قبضے میں رکھیں۔ دوسرے مرہٹے تھے جو یہ چاہتے تھے کہ پانی پت کی لڑائی میں جو نقصان ہمارا ہوا ہے اُسے پورا کریں۔ اُس کے سوا شجاع الدولہ تھا جو اس تاک میں رہتا تھا کہ جو گروہ ضعیف ہو اُسی سے کچھ لے مرے۔ انگریز بھی اپنی دانش مندی سے اعتدال کے ساتھ اس منصوبے کے درپے تھے۔ اب بادشاہ فتح گڑھ میں پہنچا۔ یہاں احمد بخش بنگش انھیں دنوں میں مرا تھا۔ اُس کے بیٹے مظفر الدولہ نے پانچ لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کیا بادشاہ نے یہاں برسات کے سبب سے قیام کیا۔ اس وقت تین ہزار مرہٹوں کی سپاہ دلّی میں موجود تھی۔ مادھوجی سیندھیا پہلے فرخ آباد میں بادشاہ کے پاس آیا، اور اپنے عہد و پیمان بادشاہ سے ٹھہرا گیا، اور ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء کو بادشاہ قلعہ میں داخل ہوا۔ عبدالاحد خاں کشمیری بادشاہ کا مقرب ہوا۔ مجدالدولہ کا اُس کو خطاب ملا۔ وہ مدارالمہام بادشاہ کے گھر کا ہوا۔ یہ ایک آدمی بڑا مکار اور فریبیا تھا۔ اُس کے کاموں کا آگے حال معلوم ہوگا۔ مرزا نجف خاں نے سپاہیوں اور بہادروں کو تلاش کر کے اپنے تئیں لائق سپہ سالار بنایا۔ اب یہاں بادشاہ کو اُس کے دوستوں یعنی مرہٹوں نے چین نہیں لینے دیا۔[1] دلّی اور اُس کے آس پاس چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ کبھی جاٹوں نے ہنگامہ کیا، کبھی مرہٹے شورش برپا کرتے رہے، کبھی سکھوں کی یورشیں جاری رہیں۔ بالآخر مادھوجی سیندھیا دلّی پر قابض ہو گیا۔ بیشتر سردار اُس کے مطیع ہو گئے۔ شاہ عالم بادشاہ اُس وقت لال قلعے میں ایک معزز قیدی تھا۔[2]

---

[1] ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان: جلد نہم: ص ۳۳۹

[2] W. FRANCKLIN: THE HSITORY OF THE REIGN OF SHAH AULUM R

اسی زمانے میں غلام قادر روہیلہ کو عروج حاصل ہوا، اور اُس نے اپنے باپ کے کھوئے ہوئے جاہ و منصب کو حاصل کرنے کے خیال سے دلّی پر حملہ کرنے کے منصوبے بنائے کچھ لڑائیوں کے بعد دلّی میں اُس کا تسلط ہو گیا۔ اسی زمانے میں وہ شاہ عالم بادشاہ سے ناراض ہو گیا کیونکہ اُس نے سیندھیا سے ساز باز کر رکھی تھی۔ بادشاہ نے ایک خط سیندھیا کو لکھا تھا۔ کہ امداد کے واسطے آؤ اور وہ غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اس نے یہ خط بادشاہ کے آگے ڈالا۔ اور اُس کو اور اُس کے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہتھیار ڈال دو۔ انھوں نے حکم کی اطاعت کی۔ اس کم بخت موذی نے بادشاہ کو قید میں ڈال دیا اور سلیم گڈھ میں سے کسی مرزتی مرزا کو بلا کر بادشاہ کے تخت پر بٹھا دیا اور بیدار بخت اُس کا لقب رکھا۔ اور سب امیروں سے اُس کو بادشاہ منوایا۔ تین روز بادشاہ پر بے آب و دانہ گزرے۔ اب غلام قادر نے انتظام کے ساتھ قلعہ کے لوٹنے کا ارادہ کیا۔ برابر کا دعوے دار اُس کا مرزا اسمٰعیل بیگ تھا۔ اوسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اپنے لشکر میں چلے جاؤ۔ وہ چلا تو گیا مگر بہت جلد اُس کو اپنی حماقت یہ معلوم ہوئی کہ بغیر لئے دیئے چلا آیا۔ ایک آدمی غلام قادر پاس بھیج کر کہلا بھیجا کہ یاروں کا حصّہ یاد رہے۔ سارے شہر کے دولت مند اور معزز اہل کاروں کو بلا کر کہہ دیا کہ ہوشیار رہو اور اپنی حفاظت کا بندوبست کرو۔ اور اپنے سپاہیوں اور نائبوں کو حکم دے دیا کہ اگر روہیلے لوٹیں تو تم بھی لوٹو۔ غلام قادر نے اوّل اپنے نئے بادشاہ سے کہا کہ تمام بیگمات سے جواہرات لے لو۔ جب اُس سے بھی پیٹ نہ بھرا تو شاہ عالم پر دولت بتانے کے لئے غضب توڑنا شروع کیا۔ اُسے یقین تھا کہ اس بڈھے کو سارے خزانے دفینے معلوم ہوں گے۔ اب کوئی ظلم و ستم باقی نہ رہا جو اس ظالم نے اس ضعیف پیرانہ سال بادشاہ اور اُس کی اولاد پر نہیں کیا۔ اس کو بیدار بخت کے ہاتھوں پٹوایا اور طرح طرح کی جسمانی تکلیفیں دیں۔ ۳۰ جولائی کو بیگموں کے بدن پر مار مار کے نیل ڈال دیے اُن کے گلابی گال مارے تھپڑوں کے لال کر دیئے۔ اُن کے دردناک آہ و نالے سے سارا محل تھرّاتا تھا مگر اس کم بخت کے دل میں ذرا رحم نہ آتا تھا۔ اسمٰعیل بیگ سے ذرا کنّی دبتی تھی۔ اوس پاس ۳۱ جولائی کو پانچ لاکھ روپیہ بھیج دیا۔ اور پھر کئی روز بعد سات لاکھ روپیہ بھیجا۔ مہاجنوں سے بھی انسانیت کے ساتھ روپیہ لیا۔ پہلی اگست کو پھر بادشاہ کو خزانہ بتانے

کے لئے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس پر بوڑھا بادشاہ چلایا کہ ارے کم بخت خزانہ کہاں دھرا ہے میرے پیٹ میں رکھا ہے اسے چیر کر نکال لے۔ اب بوڑھی بوڑھی بیگموں کی کم بختی آئی۔ اب تک اُن کی تعظیم و تکریم ہو رہی تھی کہ اُن سے ساری دولت کا پتہ لگ جائے گا۔ جب اُن سے کام نہ چلا تو اُن پر غضب ڈھایا۔ ان سب بوڑھیوں میں ممتاز محل سب سے زیادہ ممتاز تھیں۔ انھیں کی سب سے زیادہ فضیحتی کی۔ سب مال و اسباب چھین بے چاری کو قلعے سے نکال دیا۔ جس کو بادشاہ بنایا تھا اُس کی تعظیم و تکریم کو بھی اُس نے سلام کیا۔ حقّے کے دم اُس کے سامنے اُڑائے۔ دیوان خاص میں تخت پر بادشاہ کی برابر جا بیٹھا۔ ۶ر تاریخ کو تخت کو بھی آگ لگا کر سارا چاندی سونا اُس میں سے نکال لیا۔ تین روز کے اندر سارا فرش اکھاڑ ڈالا کہ کہیں اُس کے نیچے سے دفینہ ہاتھ لگے۔ اب ۱۰ر اگست ۱۷۸۸ء آئی۔ یہ وہ تاریخ ہے کہ جس کو ہمیشہ خاندان تیموریہ کی تاریخ میں یاد رکھنا چاہیئے۔ غلام قادر نے یعقوب علی اور تین چار پٹھانوں کو ساتھ لیا اور شاہ عالم کو دیوان خاص میں بُلایا اور پھر خزانہ کو پوچھا۔ اُس نے کہا اگر خزانہ مجھے معلوم ہوتا تو میں کیونکر اپنے ظروف نقرہ و طلائی کو بیچ کر اپنے نوکروں کی تنخواہ تقسیم کرتا۔ اگر کوئی دفینہ گڑا دبا ہوا ہوگا تو مجھے کیا اس کا علم ہے۔ اس پر غلام قادر نے کہا کہ اب تو کسی کام کا نہیں۔ تیرا دُنیا میں رہنا بیکار ہے۔ آنکھیں تیری نکال لینی چاہئیں۔ اس پر آہ سرد بھر کر بادشاہ نے کہا کہ یہ وہ آنکھیں ہیں جو ساٹھ برس تک کلام اللہ پڑھتی رہی ہیں۔ ان پر رحم کر۔ یہ سن کر ظالم نے بادشاہ کے بیٹے پوتوں کو جو اس عالم میں اُس کے ہمراہ تھے بے تحاشہ مارنا دھاڑنا شروع کیا۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ ان آنکھوں کے رکھنے کے لئے میں نے اس عذاب اور مصیبت کے دیکھنے کے واسطے نہیں کہا۔ تو ابھی انھیں نکال لے۔ غرض وہ سفّاک تخت پر سے کودا اور بادشاہ کو نیچے لٹا چھاتی پر چڑھ ایک آنکھ اپنے خنجر سے نکال لی۔ دوسری آنکھ نکالنے کو یعقوب علی سے کہا۔ اُس نے انکار کیا تو فوراً اُس کا تلوار سے سر اُڑا دیا۔ اس خوف سے اور پٹھانوں نے دوسری آنکھ نکال لی اور پھر بادشاہ کو سلیم گڈھ میں لے چلے۔ اُس وقت جو قلعہ کی کیفیت تھی قلم سے بیان نہیں ہو سکتی۔ کوئی شاہزادہ بے بس بے کس غم کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ کوئی شاہزادی سکتے کے عالم میں بے ہوش تھی، کوئی ہائے شاہ عالم کہہ کر سر پیٹ

رہی تھی۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو آنسوؤں سے پُر نہ تھی۔ کوئی دل نہ تھا جو اس غم سے خالی تھا ــــ جب شہر میں یہ خبریں پھیلیں تو خوف وہراس کی وجہ سے لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے ــــ لیکن اسی عالم میں مرہٹے آگئے۔ لڑائی ہوئی۔ غلام قادر زخمی ہوکر گرفتار ہوا۔ متھرا میں اُسے سیندھیا کے سامنے پیش کیا گیا۔ سیندھیا نے اُس کی بڑی فضیحتی کی۔ ایک گدھے پر اُلٹا سوار کیا۔ اور ایک پہرا ساتھ کیا، اور ہر ایک دوکان سے ایک ایک کوڑی نواب باون محال کے نام سے منگوائی۔ پھر اُس کی زبان کاٹ لی، پھر اُس کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں۔ پھر ناک کان، ہاتھ پیر کاٹ لئے۔ اس طرح لوتھڑا بنا کر بادشاہ کی خدمت میں دلی بھیجا۔ مگر راہ میں موت نے بڑی رفاقت کی۔ کہتے ہیں ۳ مارچ ۱۷۸۹ء کو ایک درخت میں اُس کو لٹکا کے پھانسی دے دی۔ یہ لاش قیمہ قیمہ اندھے بادشاہ کے روبرو دیوان خاص میں پیش کش ہوئی۔ لوگ شاہ عالم کے استقلال وصبر وتحمل کی بڑی تعریف کرتے ہیں کہ جس وقت آنکھیں اُس کی نکالی گئیں اُس نے اُف نہ کی۔ اور خدا کو یاد کرتا رہا اور اس صدمے کے بعد بھی اتنے دنوں تک زندہ رہا۔[۹]

شاہ عالم کی وفات ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ زندگی میں زمانے نے اُس پر ایسے ستم ڈھائے کہ جن کے خیال سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ انگریزوں کی چال بازیاں، مرہٹوں کی فریب کاریاں، سکھوں کی ہنگامہ آرائیاں، روہیلوں کی ستم شعاریاں، اُس نے نہ صرف اپنی آنکھوں سے دیکھیں، بلکہ اُسے براہِ راست ان سب کا شکار ہونا پڑا۔ اُس زمانے میں اس شاہ وقت سے زیادہ مظلوم اور پریشان حال کوئی اور شخص نظر نہیں آتا۔

یہ ہنگامے مومن نے اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھے لیکن کانوں سے سُنے ضرور۔ البتہ ان کی وجہ سے انتشار اور افراتفری کی جو فضا اُس زمانے میں پیدا ہوئی، وہ اُنھوں نے نہ صرف دیکھی، بلکہ اُن پر اس فضا کا اثر بھی ہوا۔ وہ ۱۸۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ یہ شاہ عالم ہی کا زمانہ تھا لیکن اُنھوں نے جب آنکھ کھول کر دیکھا تو انگریز دلی میں حکمراں ہوچکے تھے۔ لارڈ لیک کی فوجیں ۱۸۰۳ء میں دلی میں داخل ہوئیں۔ ان فوجوں نے مرہٹوں کا قلع قمع کر دیا، اور انھیں مار کر دلی سے باہر نکال دیا۔ بادشاہ اب تک مرہٹوں کے رحم وکرم پر تھا لیکن اب انگریزوں نے اسے پناہ دی۔

---

[۹] ذکاءاللہ: تاریخ ہندوستان: جلد نہم: ص ۳۴۲

اس کی بادشاہت کو برقرار رکھا۔ اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ اُس کی پنشن مقرر کی۔ ۱۸۰۶ء میں جب شاہ عالم کا انتقال ہوا تو اُس کا ولی عہد اکبر شاہ ثانی تخت پر بیٹھا اور ۱۸۳۷ء تک بادشاہ رہا۔ اس کے زمانے میں ہنگامے تو ختم ہو گئے۔ کیونکہ انگریزوں کی گرفت دلّی پر خاصی مضبوط ہو چکی تھی۔ البتہ دربار میں سازشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ انگریز ان سازشوں کو تشویش کی نظر سے دیکھتے رہے لیکن اُنھوں نے بادشاہت کو نہیں چھیڑا۔ مغلوں کی نام نہاد حکومت برقرار رہی۔ سکہ انگریزوں کا چلتا رہا۔ اکبر شاہ ثانی کے بعد محمد سراج الدین ظفر بہادر شاہ تخت پر بیٹھے اور ۱۸۵۷ء تک حکمراں رہے۔ اُن کے زمانے میں غدر پڑا اور اُنھوں نے بھی عجب عجب ستم سہے۔ جوان بیٹوں اور پوتوں کو اُن کی آنکھوں کے سامنے قتل کیا گیا۔ خود جلاوطن کئے گئے۔ اُن کے ساتھ ہی مغلوں کی حکومت ہندوستان سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔

مغلوں کے دورِ آخر کے یہ سیاسی حالات اُس ماحول کو پوری طرح پیش کر دیتے ہیں جو مومن کے زمانے میں موجود تھا اور جس کے سائے میں اُنھوں نے زندگی بسر کی تھی۔ ان حالات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؔ کی وفات کے بعد مغلوں کی سلطنت کو گھن لگ گیا تھا۔ اور انگریزوں کے باقاعدہ تسلط کے وقت تک وہ اسی عالم میں رہی۔ اس زمانے میں سازشوں کا بازار گرم رہا۔ مغل صرف نام کے بادشاہ رہ گئے۔ اس حالت کو دیکھ کر بعض طاقتوں نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں حصّہ لینا شروع کیا۔ اور وہ طاقت حاصل کرنے کے خیال سے ہنگامے برپا کرتے رہے۔ ان میں مرہٹے، سکھ، جاٹ، روہیلے اور انگریز سب ہی شامل تھے۔ اس زمانے کی سیاسی تاریخ انھیں طاقتوں کی ہنگامہ آرائیوں کی تاریخ ہے۔ ان طاقتوں کے پیشِ نظر کوئی بڑا نصب العین نہیں تھا۔ یہ سب کے سب ہندوستان میں کسی طرح اپنا اثر قائم رکھنا چاہتے تھے تاکہ انھیں دولت ملتی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغلوں کو مٹا دینا اُن کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ وہ تو اُن کو اپنے ہاتھوں میں رکھنا چاہتے تھے۔ اور اُن کی خواہش یہ تھی کہ مغل ان کے دست نگر رہیں۔ اس صورتِ حال نے اُس انتشار میں کچھ اور بھی اضافہ کیا جو مغلوں کے سیاسی انحطاط کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔

مرہٹے اس انتشار کو پیدا کرنے میں پیش پیش رہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؔ ہی کے زمانے

سے اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف ہنگامے شروع کر دیئے تھے۔ اورنگ زیبؔ نے انھیں کچلنے کی کوشش کی۔ ایک حد تک اُسے کامیابی بھی ہوئی لیکن اُس کے مرتے ہی اُنھوں نے پھر سر اُٹھایا اور مغلوں کے خلاف اچھا خاصا محاذ قائم کر لیا۔ اس زمانے میں اُن کی طاقت بڑھنے لگی۔ اس کی ایک وجہ شہزادوں اور صوبہ داروں کی آپس کی دشمنی بھی تھی۔ مرہٹوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اٹھارویں صدی میں وہ شمالی ہندوستان کی طرف بڑھنے لگے۔ اس وقت مغلوں کی حالت خراب تھی، اور روز بروز بد سے بدتر ہوتی جاتی تھی۔ اس لئے اُن کے مقابلے میں صف آرا ہونے کے بجائے مغلوں نے اُن کے ساتھ مصالحت کرنے اور انھیں مراعات دینے کی حکمت عملی کو اختیار کیا۔[۵۱] اس حکمت عملی نے اُن کی ہمت اور بھی بڑھا دی۔ بعض مغل بادشاہوں اور سید برادران کی کشمکش نے مرہٹوں کو اور بھی حاوی کر دیا۔ چنانچہ وہ دلّی پر حملہ آور ہونے کی ہمت کرنے لگے۔ سید حسینؔ علی نے جب مرہٹوں کو دکن میں چوتھ وغیرہ وصول کرنے کا حق دیا تو بادشاہ کو یہ بات بہت ناگوار ہوئی اور اُس نے مرہٹوں کے اس حق کو تسلیم نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسینؔ علی نے مرہٹوں کی مدد سے دلّی پر چڑھائی کی۔ اس کے بعد اُن کے حوصلے بہت بڑھ گئے اور انھوں نے زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کی باقاعدہ کوششیں شروع کر دیں۔ چنانچہ وہ دلّی اور دوسرے علاقوں پر حملے کرتے رہے۔ لیکن اس وقت تک اُن کا مقصد صرف لوٹ مار تھا۔ اس لوٹ مار اور غارت گری نے سارے ملک میں دہشت پھیلا دی۔ بادشاہ تک اس خوف و دہشت کا شکار ہوئے۔ مرہٹوں کے مظالم کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ لوگوں کو مار ڈالنا، اور آبادیوں کو تباہ کر دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ وہ صرف لوٹ مار اور قتل و غارت ہی میں پیش پیش نہیں تھے، لوگوں کو تکلیف دے کر خوش بھی ہوتے تھے۔ لوگوں کے ہاتھ پیر اور ناک کان کاٹ دینا، عورتوں کو اُٹھا لے جانا اور اُن کے ساتھ زنا کرنا اُن کے معمولات میں داخل تھا۔[۵۲] آنند رام مخلصؔ نے چند اشعار میں اُس آشوب قیامت کی تصویر کھینچی ہے جو مرہٹوں نے اٹھارویں صدی میں برپا کر رکھا تھا۔

---

۵۱ SARKAR: FALL OF THE MOGHAL EMPIRE: VOL.I P. 67

۵۲ SARKAR: FALL OF THE MOGHAL EMPIRE: VOL.I P. 88

بر دلِ ما تیرہ روزاں زاں صفِ مژگاں گزشت | آنچہ از فوجِ دکن بر ملکِ ہندوستان گزشت
در چمن بر برگِ گل ہا نگذرد صبح از نسیم | بر گریباں آنچہ از دستم شبِ ہجراں گزشت [۱]

مرہٹوں کے ان ہنگاموں نے خلقِ خدا کو پریشان کر دیا۔ اسی پریشانی کو دیکھ کر شاہ ولی اللہؒ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان آکر جہاد کرنے کی دعوت دی۔ اُس نے یہ دعوت قبول کی اور پانی پت کی تیسری لڑائی ہوئی جس میں مرہٹوں کی طاقت کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس کے بعد بھی وہ برابر اپنی قوتوں کو جمع کرنے کی کوشش کرتے رہے، اور اُن کی سازشیں شمالی ہندوستان میں بھی جاری رہیں۔ شاہ عالم کے زمانے میں ان کے رہنما سیندھیا نے اچھا خاصا اقتدار حاصل کر لیا لیکن انگریزوں کے سامنے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ غرض سازشوں اور جھگڑوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور مرہٹے ایک زمانے تک اُس وقت کی زندگی کے لئے مصیبت بنے رہے۔ اُن کی وجہ سے سکون ناپید ہو گیا۔ زندگی متزلزل ہو کر رہ گئی۔ نظامِ اقدار کی بنیادیں ہل گئیں۔ اور اگرچہ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے اُن کا قلع قمع کر دیا لیکن اُن کی سیاسی دھما چوکڑی نے جو اثرات چھوڑے تھے وہ عرصے تک باقی رہے۔ مومن نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے ماحول کو انھیں حالات سے دوچار پایا۔

اس سیاسی انتشار کو پیدا کرنے میں مرہٹوں کے ساتھ ساتھ سکھ بھی پیش پیش رہے۔ مغلوں سے سکھوں کی دشمنی بہت پرانی تھی۔ اس کا آغاز اُس وقت سے ہوا جب سکھوں نے اپنے آپ کو ایک مذہبی تحریک کے بجائے ایک فوجی طاقت میں تبدیل کرنا چاہا؛ اور وہ ہندوستان کی سیاست میں طاقت حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔ گرونانک نے جو روحانی تحریک شروع کی تھی اُس کو گرو گوبند سنگھ نے خالص مادی اور دنیاوی بنا دیا۔ چنانچہ مغلوں سے سکھوں کے جھگڑے شروع ہو گئے، اور وہ خوشگوار تعلقات جو بابر اور اکبر کے زمانے میں تھے، اُن کا خاتمہ ہو گیا، اس کی بنیاد تمام تر سیاسی تھی۔ سکھوں کے گرو ارجن سنگھ نے تو ایک پورا سیاسی نظام تیار کر لیا تھا، اور وہ اُس کو عملی جامہ پہنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ وقت کے ساتھ ساتھ سکھوں میں ملک گیری اور حصولِ دولت کی ہوس بڑھتی گئی۔ اور اسی صورتِ حال نے

---

[۱] تصانیف آنند رام مخلص۔ نسخہ انجمن ترقی اردو (ہند)

بقول ڈاکٹر تاراچند ایک مذہبی تحریک کو ایک ایسی جماعت میں تبدیل کر دیا جس کو حکمرانی کی ہوس نے دیوانہ بنا دیا۔[1] سکھوں کے ساتھ مسلمانوں کے جھگڑے جہانگیر ہی کے وقت سے شروع ہو گئے تھے جب باغی شہزادے خسرو کو گرو ارجن نے پناہ دی تھی۔ اس پر بادشاہ نے گرو ارجن کو دربار میں طلب کیا اور انھیں سزا دی۔ سکھوں نے اپنی تنظیم کا کام جاری رکھا۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانے میں سکھوں کے گرو تیغ بہادر نے کشمیر میں بغاوت کے شعلے بھڑکائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ نے انھیں قتل کی سزا دی۔ غرض اس طرح مغلوں اور سکھوں کے درمیان اختلافات بڑھتے گئے اور دشمنی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ جب تک زندہ رہا وہ کچھ نہ کر سکے۔ اُس کے مرتے ہی جب اُس کے جانشینوں میں جھگڑے شروع ہوئے تو سکھوں نے اس موقع کو غنیمت جانا، اور وہ مسلمانوں کے خلاف ہنگامے کرنے پر تل گئے۔ سکھوں کی نفرت صرف حکومت اور شاہانِ وقت ہی کے خلاف نہیں تھی۔ عام مسلمانوں کے بھی وہ جانی دشمن تھے۔

چنانچہ جب بھی اُنھوں نے کوئی حملہ کیا تو اُس میں عام مسلمانوں کے خون سے ہاتھ رنگے اور انھیں تباہ و برباد کیا۔ ان کے ظلم و ستم کی کوئی انتہا نہیں۔ بچوں اور عورتوں تک کو یہ لوگ مار ڈالتے تھے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر دیتے تھے۔ مسلمانوں کے دلوں میں اُن کے اس ظلم و ستم کی وجہ سے دہشت بیٹھ گئی تھی۔ مرد اُن کے ڈر کی وجہ سے ہندوؤں کے گھروں میں چھپ جاتے تھے۔ اپنے نام بدل لیتے تھے اور عورتیں اپنی عزت اور ناموس کو بچانے کی غرض سے کنوؤں میں ڈوب کر جان دے دیتی تھیں۔[2] ہندوستان میں اس وقت جو سیاسی انتشار تھا، اُس نے سکھوں کو من مانی کرنے کا موقع دیا، اور وقت کے ساتھ ساتھ اُن کی طاقت بڑھتی گئی۔ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا، اس کے بعد سکھوں کی طاقت اور ہمت میں اضافہ ہو گیا۔ ۱۷۳۹ء سے ۱۷۶۵ء تک متعدد بیرونی حملوں کی وجہ سے حالات خراب ہو گئے اور سکھوں کو ہنگامہ آرائی کا موقع ملا۔ اُنھوں نے ۱۷۶۴ء میں لاہور پر قبضہ کر لیا اور جہلم سے جمنا تک اپنا تسلط قائم کر لیا۔ ۱۷۶۵ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان اُن کا اقتدار اور بڑھا۔ اٹک سے کرنال تک اور ملتان سے

ف۱ DR. TARA CHAND: HISTORY OF THE INDIAN PEOPLE P. 269

ف۲ غلام حسین خاں: سیر المتاخرین: ص ۴۰۲

جموں تک اُن کے قبضے میں آگیا۔ اور اُنھوں نے دوآبے اور روہیل کھنڈ پر بھی حملے کرنے شروع کر دیئے۔ انیسویں صدی کے شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے پنجاب میں اپنا اقتدار قائم کیا، اور سکھوں کی طاقت اپنے پورے عروج پر پہنچ گئی۔[ل] اس زمانے میں ان ہنگامہ آرائیوں کا سلسلہ کسی حد تک ختم ہوا جو اس سے قبل سکھوں نے برپا کر رکھے تھے۔ رنجیت سنگھ نے ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے ساتھ صلح کر لی جس کی رو سے اُس کی حکومت دریائے ستلج تک محدود کر دی گئی۔[ع] انگریزوں کے ساتھ اس صلح نامے نے دلّی اور اطراف دلّی میں تو سکھوں کے ہنگاموں کو ختم کر دیا لیکن پنجاب اور سرحد کے علاقوں میں اُن کی مسلمان دشمنی جاری رہی، اُنھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا، اور اسی کے نتیجہ میں مولانا سید احمد بریلویؒ کی تحریک جہاد عمل میں آئی۔

سکھوں کے ساتھ ساتھ اس زمانے میں جاٹوں کا بھی عروج ہوا، اور مغلوں کے دور آخر میں اُنھوں نے بھی بڑے ہنگامے برپا کئے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ان لوگوں نے بھی دلّی اور اطرافِ دلّی میں لوٹ مار شروع کر دی۔ یہ لوگ بھی مسلمانوں کے جانی دشمن تھے، اور ان کے پیش نظر بھی مسلمانوں کی بنیادوں کو متزلزل کرنا تھا۔ دلّی اور آگرے کے درمیان انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے قلعے بنا لئے تھے اور موقع پا کر مسلمانوں پر حملے کرتے رہتے تھے ان کا مقصد مسلمانوں کو پریشان کرنا اور لوٹ مار کر کے اپنی ہوس کو پورا کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہؒ نے اپنے ایک مکتوب میں ان جاٹوں کے بارے میں لکھا ہے:۔

"غیر مسلموں میں ایک قوم جاٹ ہے جس کی بود و باش دہلی اور آگرہ کے درمیان ہے۔ یہ دونوں شہر بادشاہوں کے لئے دو حویلیوں کی مانند رہے ہیں مغل بادشاہ کبھی آگرہ میں رہتے تھے تاکہ اُن کا دبدبہ اور رعب راجپوتانہ تک پڑے اور کبھی دہلی میں فروکش ہوتے تھے تاکہ اُن کی شوکت اور ہیبت سہرند اور نواحی سہرند تک اثر ڈالے۔ دہلی اور آگرہ کے درمیان کے مواضعات میں قوم جاٹ کاشتکاری کرتے تھے۔ زمانۂ شاہجہاں میں اس قوم کو حکم تھا کہ گھوڑوں پر سوار نہ ہوں، بندوق اپنے پاس نہ رکھیں اور اپنے

[ل] خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: ص ۳۱۸

[ع] LYALL: RISE AND EXPANSION OF BRITISH POWER IN INDIA P.309

گڑھی نہ بنائیں۔ بعد کے بادشاہوں نے رفتہ رفتہ اُن کے حالات سے غفلت اختیار کرلی اور اس قوم نے فرصت کو غنیمت جان کر بہت سے قلعے تعمیر کرلئے، اور اپنے پاس بندوق رکھ کر بٹ ماری کا طریقہ شروع کردیا۔ اورنگ زیب اُس وقت دکھن میں قلعۂ بیجاپور و حیدرآباد کو فتح کرنے میں مشغول تھا۔ دکن ہی سے ایک فوج جاٹوں کی تادیب کے لئے اُس نے روانہ کی، اور اپنے پوتے کو فوج کا سردار مقرر کیا۔ رئیسانِ راجپوتانہ نے اس شہزادے سے مخالفت کرلی، لشکر میں اختلاف واقع ہوا۔ جاٹوں کی تھوڑی سی عاجزی پر اکتفاء کرکے فوج پادشاہی واپس ہوگئی۔ محمد فرخ سیر کے زمانے میں اس جماعت کی شورش پھر جوش میں آئی۔ قطب الملک وزیر نے زبردست فوجیں اُن کی طرف بھیجیں۔ چورامن جو اس قوم کا سردار تھا بعد جنگ صلح پر راضی ہوگیا۔ اُس کو بادشاہ کے سامنے لائے، اور تقصیرات کی معافی دلوائی۔ یہ کام بھی خلافِ مصلحت عمل میں آیا۔ پھر عہد محمد شاہ میں اس قوم کی سرکشی حد سے تجاوز کرگئی اور چورامن کا چچازاد بھائی سورج مل اس جماعت کا سردار ہوگیا، اور فساد کا راستہ اختیار کیا، چنانچہ شہر بیانہ جو اسلام کا قدیم شہر تھا اور جہاں علماء و مشائخ سات سو سال سے اقامت پذیر تھے، اُس شہر میں قہراً و جبراً قبضہ کرکے مسلمانوں کو ذلت و خواری کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اُس کے بعد سے سرکشی برابر بڑھتی گئی۔ بادشاہوں اور امیروں کے اختلافات اور غفلت کی بنا پر کوئی بھی اس جانب متوجہ نہ ہوا۔ اگر بالفرض ایک امیر اُس کی تنبیہ کا قصد کرے تو سورج مل کے کارکن دوسرے امراء کی جانب رجوع کرتے ہیں اور اس طرح بادشاہ کے مشورے کو پلٹ دیتے ہیں۔ پسر محمد شاہ کے عہد میں صفدر جنگ ایرانی نے خروج کیا اور سورج مل سے سازش کرکے پرانی دہلی پر حملہ کردیا، اور تمام باشندگان شہر کہنہ کو لوٹ لیا۔ پسر محمد شاہ نے شہر کے دروازوں کو بند کرکے جنگ توپ خانہ شروع کی محض خدا کے فضل سے صفدر جنگ اور سورج مل دو تین ماہ کے بعد ناکامیاب واپس ہوئے اور صلح و موافقت کی داغ بیل ڈالی۔ چونکہ بادشاہ کے آدمی جنگ سے تھک چکے تھے۔ اس لئے انھوں نے صلح کو غنیمت شمار کیا۔ اُس کے بعد سے سورج مل کی شوکت ترقی پاگئی دہلی سے دو کوس کے فاصلے سے لے کر آگرہ کے آخر تک طول میں اور میوات کے حدود

سے فیروزآباد و شکوہ آباد تک عرض میں سورج مل قابض ہوگیا۔ کسی کی طاقت نہیں کہ وہاں اذان و نماز جاری کر سکے[۱]۔

غرض جاٹوں نے مغلوں کے دورِ آخر میں ایسے ہنگامے برپا کئے کہ خلقِ خدا اُن کے ظلم و ستم سے تنگ آگئی۔ مسلمانوں پر تو عرصۂ حیات تنگ ہوگیا۔ دہلی اور اس کے اطراف کے باشندے اُس زمانے میں اُن کی وجہ سے خوفزدہ تھے۔ گھبراہٹ اور پریشانی اُن پر طاری تھی۔ خلیق احمد نظامی نے بہارِ گلشن شجاعی کے مصنف کا ایک بیان نقل کیا ہے جس میں اُنہوں نے جاٹوں کے ہنگاموں کی وجہ سے پیدا ہونے والی پریشانیوں کی وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ جب جاٹوں نے لوٹ مار شروع کی تو دہلی کے باشندے گھبراہٹ اور پریشانی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ وہ دربدر گلی بہ گلی مارے مارے پھرتے تھے بلکہ اسی طرح جیسے کوئی ٹوٹا ہوا جہاز ظالم موجوں کے رحم و کرم پر ہو۔ پاگلوں کی طرح ہر شخص پریشاں حال اور گھبرایا ہوا نظر آتا تھا[۲]۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی حافظ جاراللہ کے نام ایک خط میں جاٹوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "دہلی میں ایک حادثۂ عظیم واقع ہوا۔ قوم جاٹ نے دہلی کے شہرِ کہنہ کو لوٹا اور حکومت اس فساد و شرارت کو دفع کرنے سے عاجز رہی اُنھوں نے مال لوٹے، عزت و ناموس کو برباد کیا اور مکانات کو آگ لگائی۔ ——— اور یہ لوٹ مار کا حادثہ اوائل ۱۱۶۱ھ میں ہوا اور آخر شعبان تک جاری رہا[۳]۔" جاٹ ایک جاہل قوم تھی۔ وہ پڑھنا لکھنا تک نہیں جانتے تھے۔ انھیں کسی چیز کا علم نہیں تھا[۴]۔ اسی لئے وہ جنگلیوں اور وحشیوں کی طرح ہنگامے برپا کرتے تھے۔ ان جاٹوں نے مغلوں کے دورِ آخر میں زیست مشکل کر دی تھی۔ اُن کے ہنگاموں کا یہ سلسلہ انگریزوں کے تسلط کے وقت تک جاری رہا۔ جب انگریز دلّی پر حکمراں ہوگئے تو سکھوں اور مرہٹوں کی شورشوں کے ساتھ ساتھ جاٹوں کی شورش بھی ختم ہوگئی۔

۱۔ خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: ص ۱۰۱-۱۰۳

۲۔ خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: ص ۳۲۴ ۳۔ خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: ص ۳۲۴

۴۔ SARKAR: FALL OF THE MOGHAL EMPIRE VOL. III. P. 110

مومن نے اپنی آنکھوں سے جاٹوں کے یہ ہنگامے تو نہیں دیکھے کیونکہ انھوں نے جب ہوش سنبھالا تو انگریز دلّی میں داخل ہو چکے تھے لیکن جو اثرات ان جاٹوں نے دلّی کی زندگی پر اپنی شورش سے چھوڑے تھے، اُس کو اُنھوں نے ضرور دیکھا، اور وہ اُن سے متاثر بھی ہوئے۔ ان ہنگاموں نے دِلّی کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زندگی کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع کی دِلّی میں بھی اس کا اثر باقی تھا۔ اس لئے مومن ان اثرات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگریزوں نے فاتح کی حیثیت سے داخل ہو کر ان تمام ہنگاموں کو ختم کیا جو مرہٹوں، سکھوں اور جاٹوں نے اس سے قبل برپا کر رکھے تھے اور اس طرح اس سیاسی انتشار کا یقیناً خاتمہ ہوا جس کا سلسلہ تقریباً ایک صدی سے دلّی اور اطرافِ دلّی میں جاری تھا۔ اب زندگی کی غیر یقینی کیفیت بڑی حد تک ختم ہو گئی، اور لوگ وقتی طور پر کسی حد تک مطمئن بھی ہو گئے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انگریز بہ ذاتِ خود ایک ایسے سیاسی انتشار کا باعث بنے جس کا تصور بھی اس سے قبل کسی نے نہیں کیا تھا۔ جب ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دلّی میں داخل ہوئیں تو گویا صحیح معنوں میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس ملک کے باشندے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے۔ سیاسی طاقت تو اُنھوں نے اس سے قبل بھی حاصل کر لی تھی۔ وہ بادشاہوں کو لڑاتے اور اُن کے ساتھ خود بھی لڑتے تھے۔ ہندوستان کے بعض علاقوں میں تو باقاعدہ اُن کی حکومت تھی، اور اس حکومت کو اُنھوں نے اپنی حکمت عملی اور شمشیر کے زور سے حاصل کیا تھا۔ وہ اس وقت تک اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ مغل بادشاہوں کی اُن کے سامنے کوئی حیثیت نہیں تھی، وہ انھیں اپنا آلہ کار بناتے تھے۔ انھیں تخت سے اُتارنا اور تخت پر بٹھانا اُن کے لئے معمولی بات تھی، وہ بادشاہ سے دیوانی لے سکتے تھے اور اُن کی طرف سے اسے پنشن مل سکتی تھی۔ غرض اُنھوں نے ہندوستان کی سیاست میں بڑا عمل دخل پیدا کر لیا تھا، اُن کی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ وہ ہندوستان کے حکمرانوں کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور پھر اُنھوں نے اُس وقت تک جو کچھ حاصل کر لیا تھا، وہ اسی پر قانع نہیں تھے۔ اُن کی سیاسی ریشہ دوانیاں جاری تھیں، اور وہ دلّی میں بیٹھ کر سارے ہندوستان پر حکومت

کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔

۱۸۰۳ء کی لڑائی میں انھوں نے دلّی کو فتح کر لیا تھا۔ وہ چاہتے تو اس وقت مغلوں کی بادشاہت کو ختم کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ اُن کے خیال میں مغل بادشاہ کو اپنا آلۂ کار بنا کر باقی رکھنا سیاسی اعتبار سے زیادہ مناسب تھا۔ چنانچہ انھوں نے بوڑھے بادشاہ شاہ عالم کی بادشاہت کو قائم رکھا۔ شاہ عالم کے ایما ہی پر انھوں نے دلّی کی لڑائی لڑی اور وہ فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوئے۔ بادشاہ مرہٹوں جاٹوں اور روہیلوں کی شورشوں سے اتنا پریشان ہو چکا تھا کہ اس نے انگریزوں کو اپنا نجات دہندہ تصوّر کیا اور ۱۶ ستمبر ۱۸۰۳ء کو لارڈ لیک سے دربار میں ملاقات کی۔ حالانکہ اس سے قبل اس نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے کے لئے تیار رہے، کیونکہ اس کے خیال میں یہ لوگ جس ملک میں جاتے ہیں وہاں نہایت خاموشی سے طاقت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کی فتح نے اب اس کے اس خیال کو بدل دیا اور اس نے انگریزوں کی آمد کو ایک نعمت غیر مترقبہ تصور کیا۔[۵۱] لارڈ لیک کی بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ اسے بادشاہ کی طرف سے خطاب دیا گیا۔ وہی خطاب جو اس سے قبل سیندھیا کو دیا جا چکا تھا، اور جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ کی طرف سے نظم و نسق کی تمام ذمہ داری اسے سونپ دی گئی ہے۔ پہلے یہ کام سیندھیا کے سپرد ہوا تھا۔ اب یہ دستار لارڈ لیک کے سر پر باندھی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز صحیح معنوں میں حکمراں ہو گئے اور دلّی میں اُن کے نام کا سکہ چلنے لگا۔ چنانچہ ویلزلی نے بادشاہ کو یہ خط لکھا کہ انگریزوں کے زمانے میں اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اور وہ امن و اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کر سکے گا۔[۵۲] ظاہر ہے اس خط کا مطلب یہی تھا کہ انگریزوں کی سیاسی طاقت نے مختلف شورشوں کو ختم کر دیا ہے اور اب وہ بادشاہ کی حفاظت کریں گے، اور اسے زندہ رہنے کا موقع دیا جائے گا۔ انھوں نے یقیناً بوڑھے بادشاہ شاہ عالم کو زندہ رہنے کا موقع دیا، اس کی پنشن مقرر کی اور اس طرح مطمئن ہو کر اپنی سیاسی طاقت

---

۵۱ PERCIVAL SPEAR: TWILIGHT OF MUGHLS P. 35

۵۲ ایضاً: ص ۳۸

کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کام میں مصروف ہو گئے۔

اس وقت صرف لال قلعے میں بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس کی چہار دیواری کے باہر انگریزوں کا سکہ چلتا تھا۔ انگریز لال قلعے کے اندر بادشاہ کی حکومت کو تسلیم کرتے تھے جو لوگ قلعے میں آباد تھے اُن کا شمار بادشاہ کی رعایا میں ہوتا تھا۔ اور شاہی خاندان کے افراد کی شہزادوں کی طرح عزت کی جاتی تھی۔ شاہی دربار کے آداب کا خیال رکھا جاتا تھا۔ دربار باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے۔ خطابات کا سلسلہ قائم تھا۔ دربار کی مخصوص زبان بھی باقی تھی۔ انگریز دوسرے درباریوں کی طرح دربار میں حاضر ہوتے تھے۔ انگریز ریذیڈنٹ دیوان خاص میں باقاعدگی کے ساتھ حاضر ہوتا تھا۔ دوسرے درباریوں کی طرح وہ نقار خانے کے سامنے اپنی سواری سے اترتا تھا اور پیدل چل کر لال پردے کے پیچھے سے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوتا اور عام درباریوں اور امراء کی طرح سامنے کھڑا رہتا تھا اگرچہ سارے ہندوستان میں اب مغل بادشاہ کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی۔ وہ انگریزوں کا پنشن یافتہ سمجھا جاتا تھا لیکن لال قلعے کے اندر اس کی حکومت تھی اور اسے پورا اقتدار اور شان و شکوہ حاصل تھا۔[۵] لیکن ظاہر ہے کہ اس اقتدار اور شان و شکوہ کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ کیونکہ مغلوں کی حکومت کا تو خاتمہ ہو چکا تھا۔ انگریز صحیح معنوں میں حکمراں ہو چکے تھے اور بادشاہ کی حیثیت محض شاہ شطرنج کی رہ گئی تھی۔

شاہ عالم بادشاہ اسی عالم میں ۱۸۰۶ء تک زندہ رہا۔ وہ مغل بادشاہ جس نے بچپن میں نادر شاہ کا حملہ دیکھا تھا مرہٹوں اور روہیلوں، سکھوں اور جاٹوں کی شورشیں جس کی آنکھوں کے سامنے اٹھی تھیں۔ پانی پت کی تیسری لڑائی جس کے سامنے ہوئی تھی اور جو انگریزوں کے مقابلے میں بکسر کے مقام پر صف آرا ہوا تھا جس نے کلائیو کے زمانے میں انگریزوں سے الٰہ آباد کے مقام پر صلح کی تھی جو ہیسٹنگز کی پروا کئے بغیر انگریزوں کو چھوڑ کر دلّی چلا آیا تھا۔ تقریباً تین چوتھائی صدی کے ان سیاسی ہنگاموں سے دوچار رہ کر ۱۸۰۶ء میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے بعد کئی بادشاہ تخت پر بیٹھے لیکن انگریزوں کے سیاسی اقتدار پر اس کا کوئی اثر

---

۵ PERCIVAL SPEAR: TWILIGHT OF MUGHALS: P.38

نہیں ہوا۔ وہ جس طرح چاہتے تھے ان بادشاہوں کے ساتھ برتاؤ کرتے تھے۔ ان کے سیاسی اقتدار اور عسکری طاقت نے اِن بادشاہوں کو اُن کا دست نگر بنا دیا تھا۔ مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر تک یہ صورت حال باقی رہی۔ بالآخر ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی۔ یہ انگریزوں کی سیاسی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کی آخری کوشش تھی جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی سلطنت ختم ہو گئی۔ انگریز حکمراں ہو گئے اور اس سرزمین پر سیاہ و سفید کے مالک بن بیٹھے۔

یہ سیاسی ماحول تھا جس کے سائے میں مومنؔ نے آنکھ کھولی۔ ان میں سے بعض واقعات تو اُن کی آنکھوں کے سامنے ہوئے۔ بعض واقعات اُن سے قبل ہو چکے تھے لیکن ان واقعات نے اُن کے ماحول پر جو اثر کیا تھا، اُس کو اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے ضرور دیکھا۔ مرہٹوں کی یورشیں، جاٹوں اور سکھوں کے ہنگامے اور انگریزوں کی ہوسِ ملک گیری کے سارے تماشے اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور ان سب کے نتیجے میں اُن کا ماحول جس انتشار اور افراتفری سے دوچار ہوا تھا۔ اُس کو اُنھوں نے شدّت سے محسوس کیا۔ وہ جب پیدا ہوئے تو یقیناً بہت سے ہنگامے ختم ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے مرہٹوں کی طاقت کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن وہ خود صحیح معنوں میں حکمراں بن بیٹھے تھے اور مغلوں کی حکومت صرف لال قلعے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس صورت حال نے بہت سے فتنوں کو جگایا۔ ماحول میں سازشیں ہی سازشیں تھیں۔ انگریزوں نے ان سازشوں کو ہوا دی تاکہ اُن کا اقتدار باقی رہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس سرزمین پر اُن کی بنیادیں زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتی جائیں۔ غرض مومنؔ کے سیاسی ماحول میں بڑا انتشار تھا۔ زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئی تھیں اور ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھی۔

(۳)

اس سیاسی صورتِ حال نے اس زمانے کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ مسلمانوں کے درد و الم کی ایک طویل داستان ہے۔ ۱۷۳۲ء میں نادر شاہ کا حملہ ہوا اور مسلمانوں کی پریشانیوں کا ایک ایسا باب کھُل گیا جو ۱۸۵۷ء کے بعد تک جاری رہا۔ ہر صبح اُن کے لیے ایک نئے فتنے کا پیغام

لاتی تھی ـــــ مرہٹے، جاٹ، سکھ، تینوں کی ہنگامہ آرائی نے زندگی کو ایک مصیبت بنا دیا تھا۔ پھر افغانوں کے حملوں نے تو جان ہی نکال دی ـــــ سکھوں، مرہٹوں اور جاٹوں کے حملوں سے نجات ملی تو غیر ملکی حکومت کا تسلط سر پر آیا۔ مسلمان پانچ سو سال سے زیادہ تک حکمرانی کر چکے تھے، اور اُن ہی سے سیاسی اقتدار بھی چھینا گیا تھا، اس بنا پر انگریزی حکومت نے اُن پر سختی کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں مسلمانوں کے جان، مال اور آبرو سب پر مصیبت آئی اور پوری قوم پر نکبت اور افسردگی کا عالم طاری ہو گیا[۵]۔ ان حالات میں معاشی بدحالی اور معاشرتی انحطاط نے پرورش پائی۔ جینے کے لالے پڑ گئے، زندگی دوبھر ہو گئی۔ زندہ رہنے کے لئے افراد نے عیش کوشی اور تعیش پسندی کا سہارا لیا، جس نے ساری معاشرتی زندگی کی صورت مسخ کر دی۔ اخلاقی معیار بدل گئے اور زندگی کے حقائق سے فرار اور اُس کی اعلیٰ قدروں سے انحراف اُن کا مزاج بن گیا۔ انیسویں صدی کی دِلّی میں یہ معاشی بدحالی اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشرتی افراتفری زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے، اور تقریباً ہر طبقے کے افراد اُس کے شکار دکھائی دیتے ہیں جس سرزمین پر کم و بیش ایک صدی تک سیاسی اقتدار کو حاصل کرنے کے لئے یہ ہنگامے ہوتے رہیں جہاں مرکز کمزور ہو گیا ہو، جہاں بادشاہ صرف نام کے بادشاہ رہ گئے ہوں، جہاں داخلی شورشوں نے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا ہو، جہاں بیرونی طاقتوں نے داخلی سیاست میں اپنا اثر قائم کر لیا ہو، اور جہاں داخلی انتشار سے تنگ آ کر لوگ بیرونی حملہ آوروں کو ایک نعمت غیر مترقبہ سمجھنے کے لئے تیار ہو جائیں، وہاں اس صورتِ حال کا پیدا ہو جانا ایسا کچھ عجیب نہیں ہے۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد مغلوں کی حکومت روز بروز سیاسی اعتبار سے کمزور ہوتی گئی تو اس کا اثر معاشی، اقتصادی اور معاشرتی زندگی پر بھی ہوا۔ دورِ آخر کے مغل بادشاہ اس صورتِ حال سے بالکل بے خبر رہے۔ سیاسی انتشار نے انھیں اپنی دُنیا الگ بنانے کے لئے مجبور کر دیا تھا، اس محدود دُنیا میں رہ کر وہ اپنی زندگی کے دن گزارنا چاہتے تھے۔ انھیں اس کا علم نہیں تھا کہ ان کے آس پاس کی زندگی میں اندر ہی اندر

---

[۵] خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: ص ۳۳

کس طرح کے طوفان اُٹھ رہے ہیں اور اُن پر ان طوفانوں کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے۔ دولت کو بڑھانے اور اُس کے نظام کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لئے جس سکون کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اُنھیں نصیب ہی نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا خیال تک دل میں نہیں لاتے تھے۔ زندگی میں اُن کی دلچسپیاں ایسی چیزوں سے بڑھ گئی تھیں جن کے لئے دولت درکار ہوتی ہے اور جن کو حاصل کرنے کے لئے قارون کے خزانے بھی ہوں تو خالی ہو جاتے ہیں۔ سیاسی انتشار نے دولت کی پیداوار کو کم کر دیا تھا۔ مرکز کی کمزوری نے دولت کی فراہمی کے ذرائع اور وسائل محدود کر دیئے تھے لیکن دولت کو صرف کرنے کی ہوس بڑھ گئی تھی، اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا، اور اس کی وجہ ہوا و ہوس اور ذہنی تعیش اور عیش کوشی کے وہ میلانات تھے جن کو ان بادشاہوں نے اپنے مزاجوں میں داخل کر لیا تھا۔ اورنگ زیبؒ کے بعد جتنے بھی بادشاہ ہوئے کم و بیش سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ دولت کو پانی کی طرح بہانا اُن کے معمولات میں داخل تھا اورنگ زیب کے جانشین بہادر شاہ کی فیاضی مشہور ہے، اُس نے اپنی دولت کو اس طرح لٹایا کہ مالی اعتبار سے اُس کی حکومت تباہی کے قریب پہنچ گئی۔ اس کے بعد جہاندار شاہ کے زمانے میں اس کا حال کچھ اور بھی خراب ہو گیا۔ اُس کی عیاشی نے خزانے خالی کر دیئے، اُس نے بھی دولت بُری طرح لٹائی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی محبوبہ لال کنور پر دو کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا تھا[۱]۔ دربار میں عیش و عشرت کی فضا تھی۔ اس پر بُری طرح روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ فرخ سیر کو گھوڑے پالنے کا شوق تھا۔ اُس نے بے شمار گھوڑے پال رکھے تھے اور ان گھوڑوں پر ہزاروں روپیہ خرچ ہوتا تھا۔ شاہ عالم کے اخراجات زیادہ نہیں تھے آخر وقت میں تو جو رقم اُسے انگریزوں سے ملتی تھی، اُس میں وہ خاصا بچا لیتا تھا، کیونکہ بڑھاپے میں اُس کے اخراجات محدود ہو کر رہ گئے تھے[۲]۔ لیکن اُس کے جانشین اکبر شاہ ثانی نے تخت نشین ہونے کے بعد انگریزوں سے زیادہ رقم طلب کرنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اس کے اخراجات بڑھ گئے تھے، اس وقت

۱؎ IRVINE: LATERMUGHALS VOL. I, P. 194 - خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت، ص ۳۳۴

۲؎ PERCIVAL SPEAR: TWILIGHT OF THH MUGHALS P. 38

تک دلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا، اور وہ سیاہ و سفید کے مالک بن چکے تھے۔ اس لیے مغلوں کی دولت اُن کے ہاتھ میں تھی۔ ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو اُنھوں نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ غرض انگریزوں سے قبل مغل بادشاہوں کی زندگی کے عام انداز نے ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کی بنیادیں ہلا دیں۔ اُن کے بعد جو رہی سہی کسر تھی وہ انگریزوں نے پوری کر دی۔

یہ انگریز دولت کے بھوکے تھے۔ ہندوستان کی دولت نے اُن کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا تھا۔ وہ اسی دولت کو حاصل کرنے اور اس کے ذرائع اور وسائل پر قبضہ جمانے ہی کے لئے اس ملک کی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔ شروع شروع میں حکومت کرنا اُن کا مقصد نہیں تھا۔ وہ سلطنت بنانے کے خواب کم دیکھتے تھے۔ صرف دولت حاصل کرنا اُن کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے اس ملک کی دولت کو خوب خوب لُوٹا۔ اٹھارویں صدی میں دولت کو لوٹنے کا یہ سلسلہ براہ راست جاری رہا۔ بے شمار دولت وہ انگلستان لے گئے، خزانے کے خزانے اُنھوں نے خالی کر دیئے۔ یہ کمپنی کے زمانے کی بات ہے۔ کمپنی کی بنیاد تجارت ضرور تھی لیکن حالات نے تجارت سے زیادہ لوٹ مار کو اُس کا نصب العین بنا دیا تھا۔ وہ بادشاہوں سے دولت حاصل کرتے تھے، عوام کو لوٹتے تھے۔ اس ملک کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو سنوارنا اُن کے پیش نظر نہیں تھا۔ اُنھیں صرف اپنے آپ سے اور اپنی ہوس سے ہمدردی تھی، اسی لئے حکمراں ہونے کے بعد بھی وہ یہاں کی معاشی اور اقتصادی حالت کو سنوارنے کی طرف متوجہ نہیں ہوئے۔ لوٹ مار کا سلسلہ اب بھی اسی طرح جاری رہا۔ اُنھوں نے اس ملک میں اپنا زرعی نظام قائم کیا جس نے نئی جاگیرداریاں پیدا کیں۔ اس کا مقصد بھی اپنے شکم کو بھرنا تھا؎ا۔ اس زمانے میں رشوتیں لینے اور تحفے قبول کرنے میں بھی وہ پیش پیش رہے۔ یہاں کے سیاسی انتشار نے اُن کی طاقت میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس طاقت سے اُنھوں نے غلط فائدہ اُٹھایا، اور انفرادی اور اجتماعی طور پر اُنھوں نے یہاں کی دولت سے خوب خوب اپنی جھولیاں بھریں، اور ساری دولت کو سمیٹ کر سات سمندر پار لے گئے۔ اس صورت حال نے

؎ا R. PALME DUTT : INDIA TO DAY : P. 76

یہاں کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو جو نقصان پہنچایا، اُس کی مثال تاریخ میں کہیں اور نہیں مل سکتی۔ داخلی لڑائیوں، بیرونی حملوں اور سیاسی سازشوں نے بھی اُس زمانے کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ انگریزوں کی اس ہوا و ہوس نے پہنچایا۔ مختصر یہ کہ کمپنی نے اپنی تجارت اور حکومت کے مخلوط عہد میں حکومت کے پردے میں خوب زر کشی کی اور اس طرح ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کیا۔ انھیں بڑے عہدوں سے خارج کیا۔ عدالتوں کو ذریعۂ آمدنی قرار دینے کے ساتھ ہندوستانیوں سے تحقیر کا برتاؤ کیا۔ ان شکایات اور دیگر وجوہ کی بنا پر پارلیمنٹ نے ۱۸۳۲ء میں کمپنی سے تجارت کرنے کا حق چھین لیا[۵۱] ـــــ لیکن اس کے بعد تو مختلف طریقوں سے اور بھی لوٹ مار شروع ہوئی۔" پہلے دن سے ہندوستان کی تجارت، ملک گیری اور ملک داری میں جو روپیہ ہندوستان سے کما کر لگایا تھا، اُس کا منافع تو ہمیشہ کمپنی کے حصہ داروں میں تقسیم ہوتا رہتا تھا اور جو خسارہ ہوتا وہ ہندوستان پر قرضہ قرار دیا جاتا۔ اب کمپنی سے حقِ تجارت سلب کرتے وقت سلطنتِ برطانیہ نے طے کر دیا کہ اُس نام نہاد قرضے کی رقم پر جو کروڑوں کی تعداد میں تھا، ہندوستان کے خزانے سے ساڑھے دس فی صدی سالانہ سود کمپنی کو دیا جایا کرے۔ اور چالیس سال آئندہ تک قرضہ کی اصل رقم کمپنی کو ادا نہ کی جائے، بلکہ صرف اُس کا سالانہ سود ادا ہوتا رہے اور باوجود سال بہ سال ادا ہونے کے چالیس سال کی میعاد گزر جانے پر کمپنی کو سو فی صدی کی ایک مزید رقم دی جائے تب اُس کے قرضے سے سبک دوشی ہو سکے گی"[۵۲] غرض اس طرح مختلف طریقوں سے دولت کی نوچ کھسوٹ اور لوٹ مار کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جس وقت تک انگریز اس سرزمین پر حکمراں رہے۔

ہندوستان کا معاشی اور اقتصادی نظام ان حالات کی وجہ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال تک ایک کربِ مسلسل کے عالم میں رہا۔ اور انیسویں صدی میں تو اُس پر نزع کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ افلاس یہاں کے لوگوں کا مقدر بن گیا۔ نہ صرف عوام بلکہ بادشاہ اور امرا تک اس کے

---

۵۱ مولانا طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص۷۸

۵۲ مولانا طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل: ص۷۹

شکار ہوئے۔ خلیق احمد نظامی نے تاریخ مشائخ چشت میں مختلف لکھنے والوں کے حوالے سے اٹھارویں صدی کی معاشی اور اقتصادی حالت کی جو تصویر کھینچی ہے۔ تھوڑے سے فرق کے ساتھ کم و بیش یہی کیفیت انیسویں صدی کی بھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں: "احمد شاہ کے زمانے میں شاہی خزانے کی یہ حالت تھی کہ دو دو ڈھائی ڈھائی سال تک محلات کے ملازمین کو تنخواہیں نہیں ملتی تھیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض دینے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شہزادیوں کو تین تین دن کے فاقے کرنے پڑتے تھے۔" سرسید احمد خاں لکھتے ہیں: "اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا جو شاہ عالم کے وقت میں تھا۔ شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی۔ تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے۔ شاہزادوں کو جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا۔ اور جھنبوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکوں مرتے ہیں، بھوکوں مرتے ہیں۔"[۵۱]

پروفیسر اسپیر (P. SPEAR) نے اپنی عالمانہ تصنیف TWILIGHT OF THE MUGHALS میں مغل شہزادوں کے دردناک مصائب کا نقشہ کھینچا ہے اور بتایا ہے کہ ان شہزادوں کو بھوک سے مر جانے دیا جاتا تھا لیکن کوئی مزدوری یا ملازمت کرنے کی اجازت محض اس وجہ سے نہ ملتی تھی کہ یہ اُن کے دونِ مرتبت تھا۔ اُن کی حالت جانوروں سے بدتر تھی۔[۵۲] غرض اس طرح اُس زمانے کی معاشی اور اقتصادی بدحالی نے ہر طبقے کے افراد کو زبوں حال کر دیا تھا۔ اور اُن میں سے ہر ایک کی حالت ایسی تھی کہ اُس کو دیکھ کر کلیجہ مُنہ کو آتا تھا۔ لیکن حالات اس درجہ خراب ہو چکے تھے کہ اُن کو درست کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ لوگوں کو اس زبوں حالی کا احساس ضرور تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے یہاں زندگی سے ذہنی طور پر ایک بیزاری پیدا ہو گئی جس نے انھیں بے عمل بنا کر ایک فراری ذہنیت کا شکار کر دیا۔ زندگی کی حقیقتوں سے منہ موڑ لینے کے خیالات اُن کے یہاں پیدا ہونے لگے اور ایک غیر متوازن زندگی بسر کرنا اُن کا مزاج بن گیا۔ اس کی جھلک زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کو اس صورتِ حال نے بہت متاثر کیا ہے۔

---

۵۱ سرسید احمد خاں: سیرت فریدیہ: ص ۲۳، ۲۴   ۵۲ خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: ص ۳۳۵

مغل عظیم معاشرتی روایات کے علمبردار تھے، اور دورِ آخر تک آتے آتے تو اُن کی ان معاشرتی روایات نے ایک ترشے ہوئے ہیرے کی صورت اختیار کرلی تھی۔ ان کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ دولت و ثروت خاک میں مل گئی، شان و شکوہ پر ادبار کے بادل چھا گئے۔ معاشی اعتبار سے اِفلاس کی تاریکیوں نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ وہ پیسے پیسے کو محتاج ہوگئے لیکن معاشرتی آن بان کو اُنھوں نے حتی المقدور باقی رکھا۔ بلکہ اس زمانے میں تو اِن معاشرتی روایات کو برقرار رکھنے اور اُن کو فروغ دینے کا خیال تو اُن کے یہاں کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا چنانچہ اس معاشی بدحالی کے باوجود جو اُس زمانے میں سیاسی انتشار اور زوال کی وجہ سے اُن کا مقدر بن گئی تھی، اُنھوں نے اپنی زندگی کے معاشرتی تقاضوں کو پورا کیا اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے اپنی روایات کو عظیم سمجھا اور اپنی محدود دُنیا میں رہ کر ان روایات کو برتنے اور اُن کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اِن روایات کو برتنے کے خیال ہی نے اُن کے لئے اس زمانے میں زیست کا کچھ سامان پیدا کردیا۔ ورنہ تو سیاسی انتشار اور معاشی انحطاط و زوال نے اُن کے لئے زندگی دوبھر کردی تھی، اور ماحول کو جہنم بنادیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں اُنھوں نے رہن سہن میں زیادہ نفاست پیدا کی۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ عیش و عشرت کی طرف وہ زیادہ راغب ہوئے۔ لہو و لعب اور تفریح کو اُنھوں نے اپنی زندگی میں زیادہ اہمیت دی۔ اُنھوں نے لذت پسندی اور تعیش پرستی کا ماحول پیدا کیا۔ محفلیں منعقد کیں، مجلسوں کو آراستہ کیا۔ اپنے آس پاس اور گرد و پیش رقص و سرود، موسیقی و مصوری، شعر و شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ سے دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی جس کے نتیجے میں عوام اور خواص سب ہی اُن سے لُطف لینے لگے۔ غرض اس طرح لطیف چیزوں سے دلچسپی لے کر زندگی کو زیادہ سے زیادہ لطیف بنانے کی طرف خاص طور پر توجہ کی گئی۔ چنانچہ اس زمانے میں یہ رجحان عام ملتا ہے اور ہر شخص کی زندگی اسی رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کے نتیجے میں لذت پرستی کے خیالات ضرور پھیلے ہیں، تعیش پسندی کا ماحول ضرور پیدا ہوا ہے۔ لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے کی ایک فضا ضرور قائم ہوئی ہے لیکن ان سب کی تہہ میں زندگی کو ایک فن بنانے کا

احساس ضرور کارفرما ملتا ہے۔

یہ معاشرت اور معاشرتی روایات مغلوں کے دور آخر میں لال قلعے کے اندر محدود ہو کر رہ گئی ہے، اور اس کے باہر لوگوں نے قلعے کو اس معاشرت اور معاشرتی روایات کی علامت سمجھا ہے چنانچہ لال قلعے کے اندر زندگی کو بسر کرنے کے جو معیار قائم ہوئے ہیں، اور وہاں سلاطین و امراء نے اپنے آپ کو جس رنگ میں رنگا اور اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالا ہے اسی کو قلعے سے باہر لوگوں نے معیار بنایا ہے، اور وہ خود بھی اسی رنگ میں رنگ گئے ہیں چنانچہ ساری دلّی اس زمانے میں معاشرتی اعتبار سے اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے جس کی تشکیل و تعمیر لال قلعے کے اندر ہوئی تھی قلعے کے باہر بھی اس زمانے میں لوگ اپنے آپ کو امیر سمجھتے اور اس امارت و ریاست کو برقرار رکھنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ زندگی کے لطیف پہلوؤں سے لگاؤ اور نفیس چیزوں سے دلچسپی اُن کے مزاجوں میں داخل ہو گئی ہے اور اسی کو انھوں نے زندگی کا معیار سمجھا ہے۔ لہو و لعب اور عیش و عشرت کے خیالات اُن کے یہاں بھی بیدار ہوئے ہیں، اور اُنھوں نے ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی میں رنگینیوں کا دور دورہ نظر آتا ہے، اور ہر شخص اپنے اپنے فکر اور معیار کے مطابق زندگی کو ان رنگینیوں سے روشناس کرنے کی کوشش کرتا ہے، گھر گھر محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور محفلوں کو آراستہ کیا جاتا ہے۔ رقص و سرود کے بازار گرم ہوتے ہیں، اور زندگی کو ایک دلہن کی طرح سجانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور شمشیر و سنان کی بجائے طاؤس و رباب کی اولیت کے خیالات دلوں میں گھر کر لیتے ہیں۔

اس کا سلسلہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ محمد شاہ اور فرخ سیر کے زمانے سے لے کر شاہ عالم، اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر تک نہ صرف یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کچھ شدت ہی پیدا ہوتی گئی۔ محمد شاہ کے زمانے میں تو اس میں ہوس پرستی اور تعیش پسندی کو زیادہ دخل رہا تھا لیکن آخری بادشاہوں کے یہاں یہ رجحان نسبتاً کم نمایاں نظر آتا ہے، برخلاف اس کے وہ معاشرت اور معاشرتی روایات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ اور اُنھیں باقی رکھنے کا خیال انھیں زندگی کے ان پہلوؤں کی طرف

زیادہ متوجہ کرتا ہے جس میں عیش و عشرت اور تعیش پسندی کے رجحانات بھی نمایاں ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ باوجود سیاسی انحطاط و زوال کے اس زمانے کے بادشاہوں کے پاس ایک معاشرتی شعور تھا، اور وہ ہر اس چیز سے دلچسپی لینے اور اُسے برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے جس کا تعلق اُن کی معاشرت اور معاشرتی روایات سے تھا۔ وہ صرف ہوس کے بندے ہی نہیں تھے۔ اُن کی زندگی کا مقصد صرف تعیش ہی نہیں تھا۔ اُن کے پیش نظر معاشرت اور معاشرتی زندگی بھی تھی۔ اِن دونوں کو انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ ایک کو دوسرے سے الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

لال قلعہ، جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، اس زمانے میں معاشرتی زندگی کا مرکز تھا۔ اور دلی شہر کے تمام رہنے والے اُسے اپنی معاشرت کی ایک علامت سمجھتے تھے۔ بادشاہوں کو بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس لئے انھوں نے اُن تمام ہنگاموں کے باوجود جن سے وہ دوچار ہوتے رہے، لال قلعے کی مرکزیت اور اس کی معاشرتی اہمیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ حالات بھی ایسا کرنے کے لئے کچھ سازگار رہے۔ اگرچہ اس زمانے میں بہت سی جنگیں ہوتی رہیں۔ مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا لیکن لال قلعہ اس کے باوجود تباہ نہ ہوا۔ اُس پر کبھی زبردست گولہ باری نہیں ہوئی۔ کہیں کہیں سنگ سرخ اور سنگ مرمر کی دیواروں کو نقصان ضرور پہنچا لیکن یہ نقصان بہت معمولی تھا۔ البتہ محل بالکل تباہ ہو گیا۔ نادر شاہ تخت طاؤس اور جواہرات کے خزانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد ایرانیوں اور سورج مل جاٹ نے رنگ محل کی چاندی کی چھتیں اتار لیں اور قیمتی جواہرات وغیرہ لوٹ کر لے گئے۔ پھر غلام قادر روہیلے نے قلعے میں ہنگامہ برپا کیا لیکن وہ بھی اُسے تباہ نہ کر سکا، صرف جواہرات وغیرہ نکالنے کی غرض سے فرش کھود ڈالے، اور شاہی کتب خانے کو بہت سی قیمتی چیزوں سے محروم کر دیا۔ ان میں سے کچھ لکھنؤ چلے گئے جنھیں نواب وزیر اودھ نے خرید لیا۔ مرہٹوں کے زمانے میں قلعے کو اصل حالت میں برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی لیکن رقم نہ ہونے کی وجہ سے مرمت وغیرہ نہ ہو سکی۔ شاہ عالم کا نابینا ہونا اُن کے لئے

مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ ایک طرف تو اُس کا دل بجھ گیا تھا، اُس کے اخراجات محدود ہو گئے تھے، اور اُسے زیادہ روپے کی ضرورت نہیں تھی۔ دوسرے اُسے قلعے کی تباہی کا احساس ہی نہیں تھا، کیونکہ نابینا ہونے کی وجہ سے تباہی اور بربادی کے وہ مناظر اُس کے سامنے نہیں تھے، جن سے قلعۂ معلّیٰ دوچار ہو چکا تھا۔ اس لئے قلعے کی مرمت کی طرف شاہ عالم نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس کام سے کہیں زیادہ اہم اُس کے نزدیک اپنے بڑے خاندان کی پرورش اور دیکھ بھال تھی۔ اُس کے جانشین اکبر شاہ نے بے شک تخت نشین ہونے کے بعد قلعے کی مرمت کی طرف توجہ کی۔ لیڈی نوجنٹ (LADY NUGENT) نے ۱۸۱۲ء میں یہ لکھا ہے کہ قلعے کے دیوان خاص کی چھت درست ہو چکی ہے اور خاصی مرصّع ہے۔ قیمتی جواہرات کی جگہ اب نقلی جواہرات لگا دیئے ہیں اور تقریباً تمام جواہرات نقلی ہیں لیکن ان کا اثر دیکھنے والے پر اچھا ہوتا ہے لیکن یہ سلسلہ غالباً جاری نہ رہ سکا۔ کیونکہ ۱۸۲۵ء میں بشپ ہیبر (BISHOP HEBER) نے لکھا ہے کہ محل کا حال خراب ہے اور اس میں ہر طرف ویرانی برستی ہے۔ شاہ برج میں گندگی ہے اور وہ ویران ہے غسل خانے اور فوارے سوکھے پڑے ہیں، اندر کوڑے کے ڈھیر لگے رہتے ہیں اور پرندے گندگی پھیلاتے رہتے ہیں لیکن یہ صورت ہمیشہ باقی نہیں رہی بہادر شاہ ظفر کے تخت نشین ہونے کے بعد پھر قلعے کی طرف توجہ کی گئی۔ اور ۱۸۳۸ء میں رزیڈنٹ نے یہ لکھا ہے کہ قلعے کی حالت بہت بہتر ہے اور اُس کی طرف خاص توجہ کی جا رہی ہے لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم ہو گیا کیونکہ بہادر شاہ اُس وقت تک کافی ضعیف ہو گئے اور اُنھوں نے قلعے کے ظاہری پہلوؤں کی طرف توجہ نہیں دی[۱]۔ اس کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظاہری پہلوؤں سے زیادہ داخلی اور باطنی پہلوؤں کی طرف توجہ دیتے تھے، اور اُن کے نزدیک ذہنی اور روحانی معاملات کی اہمیت زیادہ تھی۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مغلوں کے دورِ آخر میں قلعے کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی کوشش کی گئی۔ بعض بادشاہ اس کام کی طرف پوری طرح متوجہ نہیں ہوئے لیکن اُنھوں نے قلعے کو مغلوں کی معاشرتی

ل PERCIVAL SPEAR: TWILIGHT OF THE MUGHALS. P. 60

زندگی کی ایک علامت ضرور سمجھا اور اُس کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سنوارنے کی کوشش کی اُنھوں نے اس شان و شکوہ کو اپنی محدود آمدنی میں بھی حتی الامکان برقرار رکھا جو انھیں اپنے آباواجداد سے ورثے میں ملی تھی۔

لیکن اپنی روایات کو برقرار رکھنے کی یہ کوشش اور کاوش کوئی مستقل صورت اختیار نہ کر سکی کیونکہ سیاسی انحطاط و زوال کے باعث پیدا ہونے والی معاشی بدحالی نے قلعہ معلّٰی میں بھی اپنے قدم جما لئے تھے۔ بادشاہ تک اس زمانے میں پہلے مرہٹوں اور پھر انگریزوں کے رحم و کرم پر رہا، یہ لوگ سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ اس لئے ان کی مقرر کی ہوئی پنشن پر بادشاہ اور اُس کے خاندان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ یہ لوگ تعداد میں بھی بہت تھے۔ شاہی خاندان کے سیکڑوں آدمی قلعے میں رہتے تھے لیکن اُن میں سے بیشتر کی معاشی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ معاشرتی زندگی کی بلند سطح کو قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس زمانے میں میجر جارج کننگھم (MAJOR GEORGE - CUNNINGHAM) نے لکھا ہے کہ جو لوگ سلاطین کہلاتے ہیں وہ اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے رہتے ہیں۔ ان دیواروں کے اندر بے شمار چٹائیوں کے بنے ہوئے جھونپڑے ہیں جن میں یہ پامال اور پریشان حال مخلوق آباد ہے۔ انھیں دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس نہ تو کھانے کے لئے کچھ ہے اور نہ پہننے کے لئے۔ ان میں سے بعض بادشاہ کے قریبی عزیز ہیں ۔ ان کی زندگی کا دار و مدار بادشاہ کی سخاوت اور ریذیڈنٹ سیٹن کی رحم دلی پر ہے ۔ ان میں سے بعض رشتے میں بادشاہ کے بھائی اور چچا ہوتے ہیں۔ ان کی کوئی معاشرتی حیثیت نہیں ہے۔ انھیں دربار تک میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں ان کی حالتِ زار پر ترس کھا کر کچھ مراعات ضرور دیں لیکن ظاہر ہے کہ اِن سے اُن کی قسمتیں نہیں بدل سکتی تھیں۔[۵] وہ جہاں تھے وہیں رہے اور اُن کی معاشرتی حیثیت بلند نہ ہو سکی۔

ان کے مقابلے میں بادشاہ کے بیٹوں کا معاشرتی مرتبہ کسی قدر بلند تھا انھیں نسبتاً زیادہ آزادی حاصل تھی۔ انھیں روپیہ بھی کچھ زیادہ ملتا تھا۔ دربار میں بھی انھیں جگہ دی جاتی تھی لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا تھا۔ اکبر شاہ کے بیٹے مرزا جہانگیر کا حال بعض لوگوں نے

---

۵ PERCIVAL SPEAR: TWILIGHT OF MUGHALS P. 62

تفصیل سے لکھا ہے۔ اِس سے اُس زمانے کے شہزادوں اور اُن کی معاشرتی زندگی پر عامی روشنی پڑتی ہے۔ کرنل سلیمن (COL. SLEEMAN) نے ۱۸۱۶ء میں اُس سے ایک ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "وہ برانڈی کی بڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انگریزوں نے اس سے بہتر شراب نہیں بنائی۔ لیکن اس میں صرف ایک ہی خرابی ہے کہ اُس سے بہت جلد نشہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس شراب سے لطف حاصل کرنے کے لیے ہر گھنٹے کے بعد ایک بڑا گلاس پیتا رہتا تھا، یہاں تک کہ اس پر مستی کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ ناچنے اور گانے والیاں مستقل اس کے سامنے ناچتی اور گاتی رہتی تھیں۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں مرگیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی زندگی بسر کرنے والا آدمی زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔"[۵۱] میرزا جہانگیر کے بھائی میرزا بابر کا بھی کم و بیش یہی حال تھا۔ اُس نے تو قلعے میں انگریزی طرز کی عمارت تعمیر کرلی تھی۔ اسی میں رہتا تھا، انگریزی لباس پہنتا تھا اور شہر میں مستقل طور سے گھومنا اُس کا محبوب مشغلہ تھا۔[۵۲] یہ لوگ ایک زوال آثار معاشرتی ماحول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ زوال و انحطاط اُس زمانے کی معاشرت میں موجود تھا اور تھوڑے سے فرق کے ساتھ تقریباً تمام لوگ اس میں پابہ زنجیر تھے۔

پھر بھی اِس زمانے میں اُن معاشرتی روایات کی جھلکیاں بعض لوگوں میں ضرور نظر آتی ہیں جو مغلوں کے ساتھ مخصوص تھیں۔ بعض لکھنے والوں نے اکبر شاہ کی بڑی تعریف کی ہے۔ بہادر شاہ بھی اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اپنے زمانے میں ان معاشرتی روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کی جو اُنھیں ورثے میں ملی تھیں، اور جنھیں وہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان دونوں بادشاہوں کے زمانے میں درباروں کی شان و شوکت قائم رہی اور انگریزوں کے حکمراں ہونے کے باوجود شاہانِ مغلیہ کے جاہ و جلال میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ روایتی شان و شکوہ کے ساتھ درباروں میں بیٹھتے تھے۔ اور سائل اُن کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ بشپ ہیبر نے اکبر شاہ کے دربار کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کھینچی ہے اُس نے لکھا ہے کہ کس طرح وہ قلعے کے مختلف حصّوں کو طے کرکے بادشاہ کے دربار میں پہنچا۔

---

۵۱ W. H. SLEEMAN: RAMBLES AND RECOLLECTIONS P. 509

۵۲ MAJOR ARCHER: TOURSIN UPPER INDIA. P. 383

کتنی بار اسے نذر پیش کرنی پڑی، کس طرح اسے خلعت پہنایا گیا، کس انداز میں اس کی آؤ بھگت ہوئی۔[۵۱] بہادر شاہ ظفر کو بھی بعض لوگوں نے بہت سراہا ہے۔ وہ فطرتاً نیک شریف اور سادہ مزاج بادشاہ تھے۔ دن بھر لکھنا پڑھنا، قرآن مجید کا مطالعہ کرنا اور فکرِ سخن میں محو رہنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ انھیں ادب اور جمالیات سے دلچسپی تھی۔ روزانہ وہ جمنا کی سیر کرتے تھے۔ برسات میں مہرولی جاکر رہنا اور برسات کی دلچسپیوں میں حصہ لینا اُن کے معمولات میں داخل تھا۔ انھیں مختلف تہواروں سے بھی دلچسپی تھی، اور وہ اُن میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ عرسوں میں شریک ہونا بھی اُن کے معمولات میں داخل تھا، اور اُن کے زمانے میں عُرس بڑے اہتمام سے منائے جاتے تھے۔ غرض ان دونوں بادشاہوں کا انداز اگرچہ ایک دوسرے سے مختلف تھا، ایک میں درباری شان وشکوہ تھا اور دوسرے میں سادگی اور درویشی تھی لیکن دونوں کا زمانہ معاشرتی اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے عہد میں مغلوں کی معاشرتی روایات کو نہ صرف برقرار رکھا گیا بلکہ معاشرتی زندگی میں بعض نئی دلچسپیاں پیدا کی گئیں جنھوں نے وقت کے ساتھ ساتھ نئی معاشرتی روایات کا روپ اختیار کر لیا۔ منشی فیاض الدین نے اپنی کتاب "بزم آخر" میں اس زمانے کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اُنھوں نے دہلی کے آخری دو بادشاہوں اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ کے طریقِ معاشرت کی تصویر پیش کی ہے۔ اس پوری تصویر میں صرف آسائش اور عیش کا رنگ بھرا ہوا ہے۔ رات اور دن جشن میں گزرتے تھے۔ کبھی تورے بندی ہے، کبھی رت جگا، کبھی نوروز، کبھی آخری چہار شنبہ، کبھی خواجہ صاحب کی چھڑیاں، کبھی سلونو، کبھی پھول والوں کی سیر —— غرض بزم ہی بزم ہے، رزم کا کہیں نام نہیں۔ قلعۂ معلّٰی کے باہر جو طوفان برپا ہے، اُس سے بے خبر فکرِ فردا سے بے نیاز —— ایسا معلوم ہوتا ہے "رقص پری پیکراں" اور غوغائے رامشگراں" میں ساری دنیا سمٹ کر آ گئی ہے۔[۵۲] اس بیان میں کسی قدر مبالغہ آرائی ضرور ہے لیکن ویسے یہ حقیقت ہے کہ اس زمانے میں معاشرتی زندگی انھیں دلچسپیوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اور چونکہ بادشاہ

---

۵۱ BISHOP HEBBERS NARRATIVE I P. 304

۵۲ خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: ص ۳۲۲

انھیں بہت اہمیت دیتے تھے اس لئے اُن کی دیکھا دیکھی عوام نے بھی انھیں اپنے معمولات میں داخل کر لیا تھا، امراء اور عوام بھی اِن میں دلچسپی لیتے تھے اور اس زمانے کے مخصوص حالات نے ان باتوں کو اُن کی زندگیوں کا جُزو بنا دیا تھا۔ وہ بھی عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ خوش وقتی اُن کے نزدیک بھی معیار بن گئی تھی۔ بقول غالب ہزاروں خواہشیں ایسی تھیں کہ ہر خواہش پر اُن کا دم نکلتا تھا۔ اُن کا دل غم کھانے میں بودا تھا اور مے گلفام کے کم ہونے کا رنج بھی اُن کے لئے بہت تھا۔

ان حالات نے ایک ایسی معاشرت کو پیدا کیا جس میں زندگی کی حقیقتوں کی طرف توجہ کم تھی۔ ان سے چشم پوشی کرنے اور انھیں بھلا دینے کا خیال زیادہ تھا۔ تعیش پسندی اور لذت پرستی اس معاشرتی زندگی کی بنیاد تھی، اور زندگی کے اس انداز کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مذہب اور دین داری کے ساتھ ساتھ بھی لذت اور تعیش کے یہ سلسلے قائم رہ سکتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں یہی ہوا ہے۔ لوگ اسی اکتسابِ لذت اور حصول تعیش کے پیچھے بھاگتے رہے ہیں۔ بعض جگہ تو اس صورتِ حال نے لطافت اور رنگینی کی صورت اختیار کی ہے لیکن بعض جگہ اس میں انتہا پسندی نے ابتذال کا رنگ بھی پیدا کر دیا ہے۔ درگاہ قلی خاں نے اپنی دلچسپ کتاب "مرقع دہلی" اگرچہ محمد شاہی عہد میں لکھی ہے لیکن اس سے شاہ عالم، اکبر شاہ اور بہادر شاہ کے عہد کی معاشرتی زندگی پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے کیونکہ اس وقت بھی تھوڑے سے فرق کے ساتھ زندگی کا عام انداز وہی تھا۔ محمد شاہ کے زمانے کی سی شدت تو اس زمانے میں باقی نہیں رہی تھی لیکن اس زندگی کے لیل و نہار کم و بیش وہی تھے۔ اس زمانے کے بازاروں، محفلوں، مجلسوں اور دوسری دلچسپیوں کا جو حال انھوں نے لکھا ہے، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قلعے کے باہر جو بازار چوک سعد اللہ خاں کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی کیفیت انھوں نے اس طرح بیان کی ہے :-

"ہنگامہ اش محاذی دروازۂ قلعہ است و مجمعش در فضائے پیش گاہ جلو خانہ سبحان اللہ کثرتے می شود کہ نظر از ملاحظہ محسوسات نگارنگ وست و پا گم می کند ونگاہ بمشاہدہ تجدد امثال در تماشا و تعداد اشکال مواد تمنا در آئینہ خانہ حیرت می نشیند، ہر طرف رقصِ امارد خوش رو قیامت آباد و ہر سو شور افسانہ سنجاں

محشر بنیاد[۵/۱]

"یہ چوک قلعۂ شاہی کے دروازے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دہلی کا بہت ہی خوبصورت بازار ہے۔ یہاں صبح و شام اس قدر مجمع رہتا ہے اور اس قدر رنگا رنگ جلوے نظر آتے ہیں کہ پہلی دفعہ دیکھنے والا دیکھ کر حیرت زدہ سا ہو جاتا ہے اور ایک اجنبی شخص کے لئے یہ بازار نگارخانۂ چین معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہاں حیرت اور دلچسپی اور تعجب کی بہت سی چیزیں ہیں۔ نیا شخص کس کس کو دیکھے۔ بازار کے ایک طرف خوبصورت اور طرحدار امردوں کا ناچ ہوتا ہے۔ یہ ناچ اس قدر دلچسپ ہوتا ہے کہ آدمی بس کھڑا دیکھا ہی کرے۔ ناچ دیکھنے والوں کی ایک بھیڑ لگی رہتی ہے، جو صدائے تحسین و مرحبا سے آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے جس کو سن کر ہر گزرنے والے کا دل زبردستی ناچ کی طرف کھنچ جاتا ہے"[۵/۲]

اور دہلی کے بعض امراء کی دلچسپیوں اور مزاج کی رنگینیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے :۔

"اعظم خاں پسر قدوی خاں برادرزادہ خان جہاں بہادر عالمگیری از امرائے عظیم الشان است بمقتضائے رنگینیٔ مزاج و مہارت راگ ممدوح مطربان ہندوستان طبیعتش امارد پسند است و مزاجش بہ محبت سادہ رویاں در بند مداخل جاگیرش صرف اخراجات ایں فرقہ است و محاصل روزگارش خرچ پا انداز مقدم ایں طبقہ ہر جا از امردے رنگیں عمری یا بد برعایت دل خواہ در کمند رفاقت خود می اندازد و از ہر طرف از سادہ روئے بپایش می رسد بہ دام احسانش می کشد جمعے ازیں گروہ بحسن سعیش بمنصب مناسب امتیاز یافتہ انیس بساط اند و برخے بمراعات خانگیش اکتفا کردہ رنگ افروز محفل نشاط در سواری بشان تمام و تجمل مالا کلام بر اسپان باد پا سوار می شوند۔ غرض ہر جا سبزہ رنگے نظر می آید منسوب بہ اعظم خاں است و ہر کجا نوخطے جلوہ کند از وابستہائے آں عظیم الشان بہ پرتو

۵/۱ درگاہ قلی خاں: مرقع دہلی: ص ۱۱

۵/۲ حسن نظامی: پرانی دہلی کے حالات (ترجمہ مرقع دہلی) ص ۲۳

خالِ ایں گل رخاں صبحِ پیری را خضاب می کند و بیا ہمہ کم فرصتی ہائے زماں فرصتِ حیات در استجلاب و حظوظ نفسانی در شتاب[۵۱]۔"

"خان جہاں بہادر عالمگیری کا بھائی اور فدوی خاں کا لڑکا ہے۔ دہلی کے بڑے امیروں میں ہے۔ رنگین مزاج اور بذلہ سنج ہے۔ فنِ موسیقی کا ماہر ہے۔ ہندوستان کے مطرب اور موسیقی داں اعظم خاں کی بہت عزت کرتے ہیں۔ حسن پرست ہے خوبصورت لڑکوں، نوخط امردوں اور ماہ رو حسینوں کی محبت میں گرفتار رہتا ہے۔ اس کی جاگیر کی آمدنی کا اکثر حصہ حسن پرستی کی نذر ہو جاتا ہے۔ جہاں کہیں کسی خوبصورت لڑکے کی خبر سنتا ہے، فوراً اس کو حاصل کرنے یا اس سے ملنے کی کوشش شروع کر دیتا ہے، یہاں تک کہ اس کو اپنا بنا لیتا ہے۔ ایسے ہی اگر کسی خوش جمال عورت کا حال سنتا ہے تو اس کو بھی قبضے میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کو حاصل کر لیتا ہے۔ عشق بازی اور حسن پرستی کے سلسلے میں نڈر اور بے خوف ہے۔ اس سلسلے میں بے شمار روپیہ خرچ کر ڈالتا ہے۔ عیاشی اس کی زندگی، امرد پرستی اس کا شعار، اور زن پرستی اس کی عادت ہے۔ اس کی محفلِ نشاط میں منتخب حسینانِ جہاں کا جمگھٹا رہتا ہے[۵۲]۔"

"میرزا منوکہ از امیر زادہائے زمانہ است و در ین فن سحر کار یہا یگانہ۔ اکثرے از امرا زادہ ہائے احکام ضروری ایں علم از و یاد می گیرند و بشاگردیش فخر می کنند شیرازہ ایں محفل است و باعث انتظام ایں بزم غلمان مشاکل۔ خانہ اش بہشتِ شداد است و کاشانہ اش آشیاں مجمع پری زاد ہر نوخط رنگیں کہ با ایں محفل ربطہ ندارد فرد باطل است و ہر صبیح کہ بایں مجمع مربوط نیست از حلیۂ اعتبار عاطل مجلسش دار العیار شاہدان است و بزمش محک امتحان گل رخاں نقد

---

۵۱ درگاہ قلی خاں: مرقع دہلی: ص ۲۷ ۵۲ حسن نظامی: پرانی دہلی کے حالات (ترجمہ مرقع دہلی): ص ۳۸، ۳۹

قرامنہ حسن تا بہ دارالضرب بزمش رجوع نہ کند کامل عیار نیست چہ شد کہ مثل طلائے دست افشار است و سیم جمال تا در کوزہ مجلسش گداز نیابد چاندی نیست چہ شد کہ اگر نقرہ خالص است۔[۱]

"یہ حضرت بھی مشہور امیر زادے ہیں، اور حسن پرستی اور امرد نوازی کے فن میں یگانۂ روزگار سمجھے جاتے ہیں بڑے بڑے نواب زادے دولت مند ہیں۔ اور میر زا منو کے اس فن خاص کو سیکھتے ہیں' اور میر زا کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں۔ میرزا منو کی محفل رندانہ تک اچھے اچھوں کی رسائی نہیں ہوتی اور وہ میرزا کی صحبت کے لئے ترستے ہیں۔ میرزا کی محفل بہشت شداد کا نمونہ ہے۔ جہاں پری زاد غلمان، جادو نگاہ لڑکے اور خوبصورت مطربوں اور معشوقوں کا مجمع رہتا ہے مشہور ہے کہ میرزا کی بزم جمال حسن و خوبصورتی کی امتحان گاہ ہے۔ کیونکہ میرزا عشق بازی اور حسن پرستی کے فن میں اتنا کامل ہے کہ کسی حسین کا اس کے چنگل سے نکل جانا یا میرزا کا کسی حسین سے محبت نہ کرنا اس حسین کے نقص کی علامت ہے۔ دہلی کی ہر حسین لڑکی اور ہر حسین لڑکے کا میرزا کے تعلق میں ہونا لازمی ہے۔ یہ مثل مشہور ہے کہ جو امرد میرزا منو کی محفل کی زینت نہیں وہ عیار کامل نہیں ہے اور اس کو معشوقیت کی تمیز نہیں ہے۔"[۲]

ان بیانات سے مغلوں کے دورِ آخر کی دلی، اس کی معاشرت اور اس معاشرت کے علمبرداروں پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ کم و بیش یہی حال امراء و رؤساء کا بہادر شاہ ظفر کے وقت تک رہا۔ ان میلانات کے اثرات اس زمانے کی معاشرتی زندگی پر اتنے گہرے ہوئے کہ عوام تک نے اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگ لیا۔ اور اس طرح ہر طرف ایک عیش و عشرت، لذت پسندی اور ہوا و ہوس کی فضا قائم ہو گئی۔ اس زمانے کا ہر فرد اسی فضا میں سانس لیتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے افکار و خیالات، عقائد و توہمات اور عادات و اطوار سب ہیں

---

[۱] درگاہ قلی خاں: مرقع دہلی: ص ۲۷-۲۸ [۲] حسن نظامی: پرانی دلی کے حالات: ص ۳۹-۴۰

اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان لوگوں نے زندگی کے اسی انداز کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے اور اس کو علمی جامہ پہنانے کے خیال میں وہ سب کے سب سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس زمانے کے مخصوص حالات نے ان میں سے ہر ایک کو انتہا پسند بنا دیا ہے اور اُن کی انتہا پسندی نے مجموعی طور پر معاشرتی زندگی میں عجب عجب گل کھلائے ہیں۔

بظاہر یہ زندگی بڑی رنگین اور پُرکار نظر آتی ہے۔ اس کے ہر شعبے پر رنگین پردے پڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس میں بڑی دلکشی ہے۔ یہ رعنائی سے بھرپور ہے۔ اس میں دلچسپی کا بڑا سامان ہے۔ یہ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس رنگینی اور پُرکاری کے بے بنیاد اور بے اساس ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہ ایک خواب و خیال کی دُنیا معلوم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو انحطاط و زوال کے غیر شعوری احساس نے پیدا کیا تھا۔ اب آگے بڑھنے کے راستے بند ہو گئے تھے۔ شمشیر و سنان کی جگہ طاؤس و رباب نے لے لی تھی۔ رزم کی جگہ بزم کا دور دورہ تھا۔ اس لئے لوگ زندگی کے حقائق کو بھلا دینا چاہتے تھے۔ اُس کے سنگین معاملات سے چشم پوشی کرنا اُن کے مزاجوں میں داخل ہو گیا تھا۔ اس لئے اُن کی زندگی متوازن نہیں رہی تھی۔ اُس زمانے کے لوگ عظیم معاشرتی روایات کے علمبردار تھے لیکن اب سیاسی انتشار اور اُس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بدحالی نے ان روایات کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ اس لئے وہ ان روایات کو سینے سے لگائے رکھنا چاہتے تھے لیکن ان روایات کو اصل صورت میں باقی رکھنے کے لئے سیاسی اقتدار اور معاشی انضباط کی ضرورت تھی اور یہ دونوں چیزیں عنقا ہو چکی تھیں۔ اس لئے ان معاشرتی روایات کو برقرار رکھنے کے خیالات افراد سے عجیب عجیب حرکتیں سرزد کراتے تھے۔ معاشرتی زندگی میں لذت پسندی کا خیال انھیں ورثے میں ملا تھا لیکن اب اس خیال نے عجیب و غریب صورتیں اختیار کر لی تھیں۔ اس میں فراری ذہنیت نمایاں تھی۔ اس لئے ابتذال کا رنگ رونما ہونے لگا تھا۔ تاج محل اور لال قلعے کی تعمیر کے لئے اس زمانے میں وسائل موجود نہیں تھے۔ اس لئے تخلیقی صلاحیتیں ان بزم آرائیوں کی نذر ہو گئی تھیں جن کا مقصد صرف ذہنی تعیش تھا۔

اس زمانے کی زندگی کے مختلف شعبوں میں افراد کی حرکات و سکنات اسی صورت حال کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

(۴)

یہ صورت اُس ذہنی پستی کا نتیجہ تھی جس کو سیاسی انتشار اور معاشی پراگندگی کے ہاتھوں وجود میں آنے والے انحطاط و زوال نے پیدا کیا تھا۔ مغلوں کے دور آخر کا تقریباً ڈیڑھ سو سال کا زمانہ اسی ذہنی پستی اور انحطاط و زوال کی نشان دہی کرتا ہے۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات سے لے کر بہادر شاہ ظفر کے معزول ہونے تک ہندوستان کی زندگی اسی صورت حال سے دوچار رہی۔ مسلمانوں پر اس کا نسبتاً زیادہ اثر ہوا۔ کیونکہ وہ براہ راست ان حالات سے دوچار ہوئے۔ اس آشوبِ قیامت نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جو اس زمانے میں سیاسی اقتدار کی کمی اور مرکز کی کمزوری کی وجہ سے سکھوں اور جاٹوں کی شورشوں نے برپا کیا تھا۔ معاشی بدحالی نے اُن کے لئے زیست دشوار کر دی۔ اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے وہ نہ کر سکے بے بسی اُن کی راہوں میں حائل رہی۔ چنانچہ انھیں میدان چھوڑنا پڑا، اور وہ عملی زندگی سے مُنہ موڑ لینے پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے خیال کی دُنیا میں محفلیں سجائیں اور اُن کا وہی حال ہوا جو عام طور پر ان حالات میں رومانی مزاج لوگوں کا ہوتا ہے۔ وہ معاشرتی روایات کو برقرار تو رکھتے ہیں۔ اُن کی زندگی میں نفاست اور لطافت بھی نظر آتی ہے، اُن کی مجلسوں میں ولقوں کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن اس ذہنی پستی اور اخلاقی انحطاط کے اثرات بھی اُن کے یہاں نمایاں ہیں جن کو عام طور پر وہ بے اعتدالی پیدا کرتی ہے جو رومانیت کی بنیاد ہے۔ یہ بے اعتدالی اس زمانے کی زندگی میں بہت عام ہے، اور اس نے معاشرتی زندگی کے شیرازے کو منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ چنانچہ ہر چیز اس زمانے میں نمود و نمائش کا ذریعہ بن گئی ہے۔ ہر شعبے میں ہوا و ہوس کے خیالات نے گھر کر لیا ہے اور اس کی تکمیل ہی کو لوگ زندگی کا مقصد سمجھنے لگے ہیں۔

ان حالات میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ذہنی اور فکری تحریک چلتی ہے جس کا مقصد زندگی کو راہ راست پر لانا ہوتا ہے۔ اس زمانے میں بھی بعض اہم ذہنی اور فکری تحریکیں ملتی ہیں جن کا

شباب مغلوں کے انحطاط و زوال کا بھی زمانہ ہے۔ اس تحریک کی ابتدا شاہ ولی اللہؒ دہلوی سے ہوتی ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کے سیاسی انحطاط، معاشی انتشار اور معاشرتی پراگندگی کو محسوس کیا، اور انھیں اس سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ یہ کام آسان نہیں تھا کیونکہ اس زمانے میں ایک عام افراتفری کا دور دورہ تھا۔ سکھوں کے ہنگاموں، جاٹوں کی یورشوں اور مرہٹوں کے حملوں نے نہ صرف سلطنت مغلیہ کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا تھا۔ بلکہ عام مسلمانوں کے لئے بھی زندگی دشوار کر دی تھی۔ بادشاہ اور امراء ان حالات کی تاب نہ لا کر عیش و عشرت میں گم ہو گئے تھے۔ انھوں نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش کو بھلا دیا تھا۔ اور زندگی کے حقائق سے اس طرح اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے انھیں ان حالات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس صورت حال نے سازشوں کا ماحول پیدا کیا۔ ہوس ملک گیری بڑھ گئی۔ لوگ دولت کے پیچھے بھاگنے لگے۔ کسی کے سامنے کوئی بڑا نصب العین نہ رہا۔ فوجی طاقت کمزور ہو گئی۔ بغاوتوں نے سر اٹھایا۔ سازشوں کے فتنے بیدار ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ معاشی اور اقتصادی حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ معاشرتی زندگی میں فراری ذہنیت کا عکس نظر آنے لگا۔ غرض ایک عام پراگندگی پھیل گئی۔

شاہ ولی اللہؒ نے ان حالات کو بغور دیکھا، ان کے نشیب و فراز پر نظر ڈالی۔ سیاسی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی معاملات کا غور سے مطالعہ کیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے انحطاط و زوال، ان کے قومی انتشار اور ملی پراگندگی کا سبب دین اور مذہب سے علیحدگی اور اسلام کے صحیح اصولوں سے بے گانگی ہے۔ اسی نے ان کے یہاں ڈھیلا ڈھالا پن پیدا کیا ہے، اور وہ صحیح زندگی کے راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ زندگی کا سارا نظام بگڑ گیا ہے۔ معاشی نظام اقدار میں ناہمواری پیدا ہو گئی ہے۔ معاشرتی مذمومات عام ہو گئے ہیں۔ لہو و لعب زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ تعیش پرستی مزاجوں میں داخل ہو گئی ہے۔ لذت پسندی کے خیالات عام ہو گئے ہیں۔ اپنی کتاب 'تفہیمات' میں انھوں نے ان تمام پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے اور مسلمانوں کے تمام طبقوں کو ان حالات سے باہر نکلنے کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اس زمانے کے مسلمان امراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

"اے امیرو! دیکھو! کیا تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ دُنیا کی فانی لذتوں میں تم ڈوبے جارہے ہو۔ اور جن لوگوں کی نگرانی تمہارے سپرد ہوئی ہے اُن کو تم نے چھوڑ دیا ہے تاکہ اُن میں بعض بعض کو کھاتے اور نگلتے رہیں، چاہیئے کہ تم اپنی شہوانی خواہشوں کو نکاح کے ذریعے پورا کرو۔ خواہ تمہیں ایک سے زیادہ ہی نکاح کیوں نہ کرنا پڑیں۔ لیکن تمہاری ساری ذہنی قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں کہ لذیذ کھانوں کی قسمیں پکواتے رہو اور نرم و گداز جسم والی عورتوں سے لطف اٹھاتے رہو۔ اچھے کپڑوں اور اونچے مکانات کے سوا تمہاری توجہ کسی طرف منعطف نہیں ہوتی ہے"

اور عوام کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :۔

"اپنے مصارف وضع قطع میں تکلف سے کام نہ لیا کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو تمہارے نفوس بالآخر فسق کے حدود تک پہنچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پسند فرماتا ہے کہ اس کے بندے اس کی آسانیوں سے فائدہ اُٹھائیں۔۔۔ اتنا کمانے کی کوشش کرو جس سے تمہاری ضرورتیں پوری ہو جائیں۔ دوسرے کے سینے کے بوجھ بننے کی کوشش نہ کرو کہ اُن سے مانگ کر کھایا کرو۔ یا تم اُن سے مانگو اور وہ نہ دیں۔ اس طرح بے چارے بادشاہ اور حکام کے لئے بوجھ نہ بن جاؤ۔ تمہارے لئے یہی پسندیدہ ہے کہ تم خود کما کر کھایا کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں معاش کی بھی رائے سمجھائے گا جو تمہارے لئے کافی ہوگی۔۔۔ اے آدم کے بچو! جسے خدا نے ایک جائے سکونت دے رکھی ہو۔ جس میں وہ آرام کرے۔ اتنا پانی جس سے سیراب ہو۔ اتنا کھانا جس سے بسر ہو جائے۔ اتنا کپڑا جس سے تن ڈھک جائے۔ ایسی بیوی جو اس کی رہن سہن کی جدوجہد میں مدد دے سکتی ہو تو یاد رکھو کہ دنیا کامل طور سے اس شخص کو مل چکی ہے۔ چاہیے کہ اس پر خدا کا شکر ادا کرے"[۱]

---

[۱] شاہ ولی اللہ: تفہیمات بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات: مرتبہ خلیق احمد نظامی: ص ۱۶۹

اسی طرح جو لوگ بری رسموں کو معاشرتی زندگی کا اہم حصہ سمجھنے لگے تھے۔ اُن کے بارے میں لکھا ہے :۔

"تم نے ایسی فاسد رسمیں اختیار کرلی ہیں جن سے دین متغیر ہوگیا ہے مثلاً یوم عاشورہ کو تم باطل حرکات کرتے ہو، ایک جماعت نے اُس دن کو ماتم کا دن بنا رکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس دن کو کھیل تماشوں کا دن بنالیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اُسے مذہبی مناسک کا دن بنا رکھا ہے۔ پھر تم شب برات میں جاہل قوموں کی طرح کھیل تماشے کرتے ہو اور تم میں سے ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ اس روز مردوں کو کثرت سے کھانا بھیجنا چاہیئے"[۵۱]

اور جو لوگ معاشرتی زندگی میں بعض رسموں کو پورا کرنے کے لئے فضول خرچی کرتے ہیں انھیں مخاطب کرکے کہا ہے :۔

"پھر تم نے ایسی رسمیں بنا رکھی ہیں جن سے تمھاری زندگی تنگ ہو رہی ہے مثلاً شادیوں میں فضول خرچی، طلاق کا ممنوع بنالینا، بیوہ عورت کو بٹھا رکھنا تم نے موت اور غمی کو عید بنا رکھا ہے"[۵۲]

غرض شاہ ولی اللہ نے اس وقت کی ساری زندگی کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ اُس کو نئی راہوں پر گامزن کرنا چاہا ہے۔ اُس کے مختلف شعبوں میں نیا خون دوڑانے کے سلسلے میں وہ پیش پیش رہے ہیں۔ اُن کی تحریک اُس وقت کی اہم تحریک تھی۔ اس تحریک کی نوعیت بہ یک وقت دینی بھی تھی سیاسی بھی۔ معاشی بھی تھی معاشرتی بھی۔ انھوں نے زندگی کے ان تمام شعبوں میں ایک نئی روح پھونکی ہے اور انھیں صحت مندی سے ہمکنار کرنے کا اہم کام انجام دیا ہے ——
بقول شیخ محمد اکرام" شاہ ولی اللہ قومی زندگی کے ایک بڑے نازک دور میں پیدا ہوئے۔ اُن کا ظہور اُس زمانے میں ہوا جب اسلامی حکومت کی بنیادیں اُکھڑ رہی تھیں۔ اور اس ملک میں صدیوں جاہ وجلال سے حکومت کرنے کے بعد اس قدر آرام طلب اور کمزور ہوگئے تھے کہ وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقابلے میں تساہل اختیار کرتے تھے۔ شاہ صاحب کو اس صورت حال

---

[۵۱] بحوالہ تاریخ مشائخ چشت : ص ۳۶۲ [۵۲] بحوالہ تاریخ مشائخ چشت : ص ۳۶۳

کا افسوس ہوتا ہوگا لیکن جو شخص علمی کام کرنا چاہے اُسے اپنا دائرۂ عمل محدود اور معین کرنا پڑتا ہے شاہ صاحب اپنے آپ کو اس کام کے لیے موزوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عملی زندگی میں دخل انداز ہو کر واقعات کی رَو کو روکیں لیکن جس کام کے لیے وہ موزوں تھے، اور جو کچھ کم ضروری تھا (یعنی رسول اکرمؐ کی خلافت باطنیہ) اس کے لیے انھوں نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ وہ ان عیوب اور کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھے جو مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں گھر کر گئی تھیں، اور جن کی وجہ سے انھیں یہ روزِ بد دیکھنا نصیب ہو رہا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے انھیں پوری طرح بے نقاب کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کا ازالہ ہو جائے[۵] یہ بہت ہی اہم کام تھا، کیونکہ اُس وقت کی زندگی حدِ نظر تک پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں بھٹک رہی تھی۔ اُسے راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ منزل کی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ شاہ ولی اللہؒ کے افکار و خیالات نے اُس کے لیے شمعِ راہ کا کام کیا جس کی روشنی میں اُس زمانے کی زندگی کے مختلف شعبوں نے اپنا ارتقائی سفر جاری رکھا۔

یہ تحریک بنیادی طور پر ذہنی اور فکری تحریک تھی۔ اس میں عمل کا پہلو نمایاں نہیں تھا۔ اُس وقت حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اسی تحریک نے آگے بڑھ کر عملی صورت بھی اختیار کی۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا سید احمد بریلویؒ اسی تحریک کے چشم و چراغ ہیں لیکن اُن کے یہاں عمل کا جذبہ تحریک جہاد کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اور یہ مردانِ حق آگاہ باطل کے مقابلے میں حق کی قوتوں کو صف آرا کرتے ہیں اور راہِ حق میں لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں۔ ان بزرگوں نے شاہ ولی اللہؒ اور اُن کے صاحبزادوں سے فیض حاصل کیا۔ شاہ ولی اللہؒ کے صاحبزادوں میں شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنیؒ تھے۔ اُنھوں نے اپنے والد کی وفات کے بعد اُن کی ذہنی اور فکری تحریک کو جاری رکھا اور مسلمانوں کی دینی زندگی کو سدھارنے، معاشرتی معاملات کو سنوارنے اور تہذیبی حالات کو نکھارنے میں پیش پیش رہے۔

شاہ عبدالعزیز ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد شاہ ولی اللہؒ سے علم

---

[۵] شیخ محمد اکرام: رودِ کوثر: ص ۳۸۷، ۳۸۸

حاصل کیا اور پندرہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے۔ جب شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا انتقال ہوا تو اُن کی عمر سترہؔ سال تھی۔ وفات کے بعد یہ شاہ صاحبؒ کے خلیفہ مقرر ہوئے اور ساٹھ سال تک اپنے والد کے کام کو جاری رکھا۔ علم حدیث کے درس کی طرف اُنھوں نے خاص طور پر توجہ کی۔ چنانچہ ہندوستان کے اکثر محدثین کا سلسلہ آپ سے ملتا ہے۔ اپنے والد کی طرح وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ نہ کر سکے کیونکہ اُن کا زیادہ وقت درس و تدریس میں صرف ہوتا تھا اور وہ ارشاد و ہدایت کے کام میں مصروف رہتے تھے۔ اُس زمانے کے تذکروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے جو اہم کام شروع کر رکھا تھا، اُس کو اُس زمانے کے لوگ کتنی اہمیت دیتے تھے، اور اُن کے دلوں میں شاہ صاحبؒ کی کتنی عزت تھی جن نامور ہستیوں نے اُن سے فیض حاصل کیا۔ اُن میں شاہ رفیع الدین، شاہ محمد اسحٰق، شاہ غلام علی، مفتی صدر الدین آزردہ، مولوی مخصوص اللہ، مولوی عبدالحئی، مولانا میر محبوب علی، مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی الٰہی بخش کاندھلوی اور مولانا سید احمد بریلویؒ وغیرہ کے نام خاص طور پر مشہور ہیں۔[1] شاہ عبدالعزیزؒ نہ صرف اسلامی علوم کے ماہر تھے بلکہ دوسرے علوم و فنون پر بھی اُن کی نظر بہت گہری تھی۔ زبان و ادب کے بھی وہ بہت بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ اس زمانے کے بعض شاعروں نے بھی اُن سے فیض حاصل کیا ہے۔ مومن بچپن ہی میں اُن کے مدرسے سے منسلک ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی وہاں حاصل کی اور اُن کے وعظ بھی سنے۔ ذوقؔ نے بھی اُن کی شاگردی اختیار کی اور اپنی غزلیں اُنھیں دکھائیں۔ ناصر نذیر فراقؔ نے لال قلعے کی ایک جھلک میں اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

"کون نہیں جانتا کہ حضرت شاہ نصیر صاحب دہلوی اکبر شاہ ثانی اور ابو ظفر بہادر شاہ اور شیخ ابراہیم ذوق کے اُستاد تھے۔ جب شاہ نصیر صاحب کا ذوق سے دل کھٹا ہو گیا، اور اصلاح موقوف ہوئی تو ذوق ہر جمعہ کو مولانا عبدالعزیزؒ صاحب کے وعظ میں جانے لگے، اور وعظ بہت غور سے سننے لگے۔ کسی دوست نے اس کا سبب پوچھا تو ذوق نے کہا، اُستاد مجھ گنہ گار سے ناخوش ہو گئے، شعر و سخن

---

[1] شیخ محمد اکرام : رودِ کوثر : ص ۳۹ [2] آزاد : آبِ حیات : ص

میں اصلاح ملتی نہیں۔ اس کا بدل میں نے یہ نکالا ہے۔ کیونکہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اُردو زبان دانی میں شاہ نصیر صاحب سے کسی طرح کم نہیں اُن کے بیان اور گفتگو کو سنتا ہوں، اور اُردو کے محاورے روزمرہ یاد کرتا ہوں۔ اس لئے کہ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ اپنے والد ماجد کے حکم کے بموجب اُردو زبان سیکھنے کے لئے خواجہ میر درد صاحبؒ کی خدمت میں چھٹپن سے حاضر ہوتے تھے اور چپ چاپ بیٹھے ہوئے آپ کی تقریر سُنا کرتے تھے، اور محاورات کو دل ہی دل میں چُنا کرتے تھے۔ مولانا ولی اللہ صاحبؒ اپنے بچوں سے کہا کرتے تھے جس طرح اصولِ حدیث اور اصول فقہ فن ہے، اسی طرح حصول زبان بھی فن ہے۔ اور اُردو زبان کے موجد و مجتہد خواجہ میر درد صاحبؒ ہیں۔ آپ کی صحبت کو اس فن کے واسطے غنیمت سمجھو کیونکہ خواجہ صاحب یکے پان ہیں چنانچہ شاہ عبدالقادر صاحبؒ خاص طور پر میر درد صاحبؒ کے شاگرد تھے۔[۱]

غرض شاہ عبدالعزیزؒ سے نہ صرف علمائے بلکہ شعراء نے بھی استفادہ کیا کیونکہ وہ جامع کمالات تھے۔ ہر علم اور فن میں انھیں ملکہ حاصل تھا۔ بقول سرسید "ذات فیض سمات ان حضرت بابرکت کی فنون کسبی و وہبی اور مجموعۂ فیض ظاہری و باطنی تھی۔ اگرچہ جمیع علوم مثل منطق و حکمت و ہندسہ و ہیئت کو خادم علوم دینی کا کر کر تمام ہمت و سراسر سعی کو تحقیق غوامض حدیث نبوی و تفسیر کلامِ الٰہی اور اعلائے اعلامِ شریعت مقدسہ حضرت رسالت پناہی میں مصروف فرماتے تھے اور سوا اس کے جو کہ جلائے آئینہ باطن صیقل عرفان والقان سے کمال کو پہنچی تھی، طالبان صافی نہاد کی ارشاد و تلقین کی طرف توجہ عام تھی، اس پر بھی علوم عقلیہ میں سے کون سا علم تھا کہ اس میں یکتائی اور یک فنی نہ تھی۔[۲]" غرض وہ بہت بڑے عالم تھے، اور علمی حیثیت سے اُن کے بلند مرتبے کو ہر ایک نے تسلیم کیا ہے۔ اس علم سے اُنھوں نے اس زمانے کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونکی۔ اُنھیں زندگی بسر کرنے کا گر بتایا اور جینے کے صحیح آداب سکھائے اور اس طرح اُن میں زندگی اور جولانی کی ایک لہر دوڑائی۔ اُنھوں نے اپنے زمانے کے حالات کا جائزہ لیا۔ اور

۱۔ ناصر نذیر فراق: لال قلعے کی ایک جھلک: ص۴۳ ۲۔ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص۵۱

اس زمانے میں مختلف قوتوں کے زیرِ اثر زندگی جن نئے رجحانات سے آشنا ہو رہی تھی اُن کا خیر مقدم کیا، اور اُن کے قبول کرنے کی طرف لوگوں کو بھی توجہ دلائی۔ شاہ عبدالعزیزؒ کا انتقال ۷ر شوال ۱۲۳۹ھ یعنی ۷ر جولائی ۱۸۲۳ء کو ہوا۔ مومن نے جو اپنے اصلی نام حبیب اللہ سے نہیں بلکہ شاہ صاحب کے دیئے ہوئے نام مومن خاں سے زیادہ مشہور ہوئے، تاریخ کہی

دستِ بیدادِ اجل سے بے سر و پا ہو گئے
فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم، علم و عمل[1]

اور اس میں شبہ نہیں کہ وہ فقر و دیں، فضل و ہنر، لطف و کرم اور علم کا مجسمہ تھے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں انھیں عام کرنے کی کوشش کی اور اس سلسلہ میں اُن کے ذوق و شوق اور انہماک نے انھیں بہ ذات خود ایک ادارہ اور ایک تحریک بنا دیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کے ساتھ ساتھ اُن کے بھائی شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ عبدالغنی بھی اس کام میں پیش پیش رہے جس کا آغاز اُن کے والد شاہ ولی اللہؒ نے کیا تھا اُنھوں نے بھی اپنے علم و فضل اور درس و تدریس سے اس وقت کے مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شاہ رفیع الدین ۱۱۶۳ھ مطابق ۱۷۴۹ء میں پیدا ہوئے اپنے والد شاہ ولی اللہؒ سے علوم حاصل کیے۔ جب شاہ عبدالعزیزؒ آخر عمر میں درس و تدریس کا کام نہ کر سکے تو یہ کام شاہ رفیع الدینؒ نے سنبھالا۔ اُن کا سب سے اہم کارنامہ قرآن مجید کا تحت اللفظ ترجمہ ہے۔ ساری زندگی اُنھوں نے دین اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۹ء میں انتقال کیا۔ شاہ عبدالقادرؒ بھی شاہ ولی اللہؒ کے نامور فرزند تھے۔ اُنھوں نے بھی ساری زندگی درس و تدریس میں گزاری۔ علم سے فارغ ہو کر اکبرآبادی مسجد میں گوشہ نشیں رہے۔ قرآن مجید کا با محاورہ ترجمہ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اس ترجمہ نے مسلمانوں میں نئی زندگی پیدا کی کیونکہ انھیں دین کو براہ راست سمجھنے کا موقع ملا۔

علم فقہ، حدیث اور تفسیر کے بھی وہ زبردست عالم تھے اور اُنھوں نے مسلمانوں میں ان علوم کے ذریعہ سے بھی دین اور دنیا دونوں کو سمجھنے کا شعور پیدا کیا۔ آپ کے علم و فضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے۔

---

[1] شیخ محمد اکرام: رود کوثر: ص۳۵

زبان کو کیا طاقت کہ ایک حرف حضرت کی صفات سے لکھ سکے۔ اور قلم کی کیا مجال کہ آپ کی مدائح سے ایک ذرہ لکھ سکے۔ کسب فیض باطن سوائے والد ماجد کے اور بزرگوں کی خدمت سے بھی اتفاق ہوا ہے۔ بارہا ثقات کی زبان سے سُنا گیا کہ جس امر میں کچھ فرمایا ویسا ہی بے کم وکاست ظہور میں آیا، باوجود اس کے کہ بسبب کثرت اخلاق کے کسی کے حق میں کچھ ارشاد نہ کرتے اور کسی کو نہ فرماتے کہ اِدھر بیٹھ یا اُدھر لیکن من جانب اللہ لوگوں کے دل میں آپ کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ روسائے شہر جب آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے، بسبب ادب کے دور دور خاموش بیٹھتے اور بدون آپ کی تحریک کے مجال سخن نہ پاتے اور ایک دو بات کے سوا یارا نہ دیکھتے کہ کچھ اور کلام کریں"[۱]۔ غرض شاہ عبدالقادرؒ بڑے پائے کے بزرگ اور بڑے ہی متبحر عالم تھے۔ اُن کا فیض اُس زمانے میں عام تھا۔ باقاعدگی سے درس دیتے تھے۔ وعظ کا سلسلہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ ان میں اچھے اچھے لوگ شرکت کرتے تھے۔

مومن نے بھی اُن سے استفادہ کیا۔ "بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادرؒ صاحب کی خدمت میں پہنچایا، اُن سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جو کچھ شاہ صاحب سے سنتے تھے فوراً یاد کر لیتے تھے"[۲]۔ غرض شاہ عبدالقادرؒ کا فیض عام تھا۔ اُنھوں نے اُس زمانے میں دین کے اُصولوں کو عام کرنے اور اُن کی روشنی میں صحیح زندگی بسر کرنے کی فضا قائم کی۔ ۱۲۴۲ھ میں اُن کا انتقال ہوا۔

شاہ عبدالقادرؒ کے چھوٹے بھائی شاہ عبدالغنیؒ تھے۔ اگرچہ وہ اپنے بڑے بھائیوں کی طرح مشہور و معروف نہیں لیکن جس دینی اور اصلاحی تحریک کی داغ بیل شاہ ولی اللہؒ نے ڈالی تھی اور جس کو اُن کے بڑے بھائیوں نے زندہ رکھا تھا۔ اُس میں اُن کا بھی خاصا حصّہ ہے۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ انھیں کے بیٹے تھے جنھوں نے اسلامی علوم کو عوام میں پھیلایا، اور پھر مولانا سید احمد بریلویؒ کے ساتھ جامِ شہادت پی کر اپنے آپ کو ایک بہت بڑا عالم باعمل ثابت کر دکھایا۔

یہ تحریک اپنے شباب پر اُس وقت پہنچی، جب اُس زمانے کے سب سے بڑے عالم باعمل

---

[۱] سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص۷۵ [۲] آزاد: آبِ حیات: ص۴۲۲

مولانا سید احمدؒ بریلوی جہاد کے خیال سے میدان میں آئے، اور جنھوں نے مسلمانوں کو منظم کرنے اور کفار کے مقابلے میں صف آرا ہونے کی تحریک شروع کی کہ اُن کے خیال میں اسی طرح اسلام کا بول بالا ہو سکتا تھا اور مسلمان اس قعرِ مذلت سے باہر نکل سکتے تھے جس میں وہ تقریباً ایک صدی سے پڑے ہوئے تھے۔ مولانا سید احمدؒ بریلوی نے شاہ عبدالعزیزؒ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا تھا اور شاہ عبدالقادرؒ سے بھی انھیں نسبتِ خاص رہی تھی۔ یہی سبب ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کا اُن پر گہرا اثر نظر آتا ہے۔ ہر چند کہ انھوں نے مصلح یا مجدد ہونے کا کوئی بلند بانگ دعویٰ نہ کیا تھا لیکن تجدید و اصلاح کا پورا سامان مہیا کر دیا تھا۔ قوم کی اخلاقی اور روحانی قباحتوں کو انھوں نے اپنی تصانیف میں بے نقاب کیا۔ ملک میں قرآن فہمی اور درس حدیث کے چشمے لگا دیئے جن کی وجہ سے غیر اسلامی عناصر آسانی سے نمایاں ہونے لگے۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ ایک ایسی جماعت کی بنیاد ڈال گئے تھے جو اُن کی اصلاحی تجاویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی تھی ـــــ حضرت امام الہندؒ کے جانشین شاہ عبدالعزیزؒ نے اس کام کو جاری رکھا لیکن اُن کی اصلاحی کوششوں میں اُن کی طبعی میانہ روی نمایاں تھی، اور مرض اس قدر عام اور پرانا ہو گیا تھا کہ اُس کے ازالے کے لئے معمولی عرق سونف اور نمک سلیمانی کافی نہ تھے بلکہ کسی بہت تیز اور کڑوی دوا کی ضرورت تھی۔ یہ معالجہ شاہ صاحب کے خلیفہ مولانا سید احمدؒ بریلوی اور اُن کے رفقائے کار نے تجویز کیا۔[۵۱] اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مولانا سید احمدؒ بریلوی نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اور مسلمانوں کی اس ذہنی اور اصلاحی تحریک کو معراجِ کمال تک پہنچانے میں اُن کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

مولانا سید احمدؒ بریلوی یکم محرم ۱۲۰۱ھ یعنی ۲۴ر اکتوبر ۱۷۸۶ء کو ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں انھیں علم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مکتب میں داخل ہوئے لیکن پڑھنے لکھنے میں جی نہ لگا جب سن شعور کو پہنچے تو لکھنؤ گئے، وہاں کسی امیر کی ملازمت کر لی۔ اس زمانے میں شاہ عبدالعزیزؒ کے درس و تدریس کا شہرہ تھا۔ مولانا سید احمدؒ بریلوی کے

---

۵۱ شیخ محمد اکرام: موجِ کوثر: ص ۹-۱۰

دل میں اُن سے ملنے اور فیض حاصل کرنے کی خواہش بیدار ہوئی۔ چنانچہ وہ اسی مقصد سے دلّی روانہ ہوئے۔ دلّی پہنچے۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے انھیں اپنے بھائی شاہ عبدالقادرؒ کے پاس بھیجا جو ان دنوں اکبرآبادی مسجد میں مقیم تھے۔ شاہ صاحب سے انھوں نے مختلف علوم پڑھے قرآن کا مطالعہ بھی کیا۔ بائیس سال کی عمر میں وہ شاہ عبدالعزیزؒ کے مرید ہوئے اور نقشبندیہ سلسلے میں اُن سے بیعت کی لیکن زیادہ عرصے دلّی میں نہ ٹھہر سکے۔ انھیں بعض مجبوریوں کی بنا پر رائے بریلی واپس جانا پڑا۔ وہاں کچھ عرصے قیام کرنے کے بعد وہ نواب امیر خاں فرمانروائے ٹونک کے پاس چلے گئے اور فوج میں ملازمت کرلی۔ چھ سات سال وہاں رہے اور انھیں سپہ گری کے فن کو سیکھنے کا موقع ملا۔ جہاد کا شوق انھیں ہمیشہ سے تھا۔ یہاں اس شوق کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع زیادہ فراہم ہوئے۔ چنانچہ سات سال تک وہ یہاں جہاد کی ترغیب دیتے رہے لیکن فوج میں ان کی حیثیت محض ایک سپاہی کی نہیں تھی۔ وہ متعدد لڑائیوں میں ایک دستے کے امیر اور نواب کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے شریک رہے۔ لیکن جب وہاں کی فضا سازگار نہ رہی تو انھوں نے دلّی کا رُخ کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ نواب کی مدد سے ہندوستان میں حقیقی جہاد کے لئے زمین ہموار ہو سکے گی لیکن جب نواب نے انگریزوں سے صلح کرلی تو یہ توقع ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ چنانچہ دلّی واپس آکر انھوں نے علیحدہ جہاد کی اس جدوجہد کو جاری رکھا۔[1] اس زمانے میں شاہ عبدالعزیزؒ کے داماد مولانا عبدالحئی اور اُن کے بھتیجے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس سے مولانا سیّد احمدؒ کو بڑا سہارا ملا۔ انھیں ساتھ لے کر وہ دورے پر نکلے اور شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے خیالات کی نشر و اشاعت کی۔ ان کے مواعظ سے بہت اصلاح و انقلاب ہوا۔ اس ایک سفر نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے مشائخ کا تزکیۂ باطن اور بڑے بڑے علماء و مصلحین کی برسوں کی تربیت ظاہر کرتی ہے۔ ہر ہر جگہ سیکڑوں آدمی متقی، متورّع عابد، متبعِ سنّت اور ربّانی بن گئے۔ ہزاروں فاسق و فاجر صالح اور اولیاء اللہ ہو گئے۔ بیسیوں آدمی قتل کے ارادے سے آئے اور جاں نثار بن گئے اور گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ

۱؎ مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک: ص ۳۳-۳۴

ہو گئے یہاں تک کہ میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ جس نے ایک دفعہ زیارت کر لی وہ آپ کے رنگ میں رنگ گیا۔[1] اسی زمانے میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا عبدالحی نے اُن کے اقوال و خیالات کو صراطِ مستقیم کے نام سے یک جا کیا ہے۔ اس میں مختلف دینی اور معاشرتی معاملات پر خیالات کا اظہار ہے اور ان سے مولانا سید احمد بریلوی کی طبیعت کے اصلاحی بلکہ انقلابی میلان پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پنجاب میں سکھوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ اس کی خبریں دلّی تک پہنچتی تھیں۔ مولانا سید احمد بریلوی کو بھی اس کا علم ہوا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ جب مولانا وعظ کے لئے رام پور گئے تو وہاں بعض افغانوں نے اپنی روداد سنائی کہ کس طرح وہ پنجاب کے ایک علاقے میں ایک کنوئیں پر پانی پینے گئے۔ وہاں سکھوں کی کچھ عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔ انھیں پنجابی زبان نہیں آتی تھی۔ اس لئے انھوں نے اشارے سے پانی پلانے کو کہا۔ تب اِن عورتوں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر پشتو زبان میں یہ کہا کہ وہ مسلمان افغانوں کی بیٹیاں ہیں۔ سکھ انھیں یہاں زبردستی پکڑ کر لائے ہیں اور سکھ بنا کر جبراً یہاں رہنے پر مجبور کیا ہے۔ یہ سن کر مولانا کو بڑا صدمہ ہوا اور انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ عنقریب سکھوں سے جہاد کریں گے۔[2] اگرچہ فوراً یہ خیال عملی جامہ نہ پہن سکا۔ کیونکہ اس واقعے کے بعد وہ مکہ معظمہ چلے گئے۔ واپسی پر انھوں نے جہاد کی تحریک باقاعدہ طور پر شروع کی۔ سارے ہندوستان میں یہ تحریک اس طرح پھیلی جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو سکھوں کے پنجوں سے نجات دلانا تھا وہ ۱۸۲۵ء میں جہاد کے لئے روانہ ہوئے۔ پہلے کابل گئے اور پھر کابل سے پشاور آئے نوشہرہ اور اکوڑہ کے مقام پر کئی لڑائیاں ہوئیں جن میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی لیکن اس کے بعد سیدو کے مقام پر جو لڑائی ہوئی اس میں مسلمان ناکام رہے۔ اس کا سبب موسم کی خرابی، سکھوں کی منظم فوجی طاقت اور بعض مسلمان سرداروں کی غداری تھی۔ اُس کے بعد بھی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ بالاکوٹ کی لڑائی آخری تھی۔ اس میں اُن کا لشکر

---

[1] سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہیدؒ: ص ۸۵ [2] مولوی محمد جعفر: سوانح احمدی: ص ۲۰

ایک ساتھی کی غداری سے محصور ہو گیا — اس معرکے میں پہلے شاہ اسمٰعیل شہید ہوئے۔ اور بالآخر ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ یعنی ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو مولانا کو بھی جامِ شہادت پینا پڑا۔ اس کی اصل وجہ افغان سرداروں کی غداری تھی جو بقول سرسیدؒ بندۂ زر اور نہایت طامع ہیں سکھوں کے اغوا سے آپ سے منحرف ہو گئے اور عین معرکۂ جنگ میں آپ سے دغا کی۔ ازبسکہ مشیتِ الٰہی میں دولتِ شہادت آپ کے نصیب میں تھی[۵۱]۔

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں مولانا سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کے نام ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے۔ یہ دونوں عالم باعمل تھے اور انھوں نے انیسویں صدی کے مسلمانوں میں اپنے افکار و خیالات سے زندگی اور جولانی کی لہر دوڑائی۔ انھیں خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ دین کے اسرار و رموز اُن پر روشن کیے۔ حق و صداقت کی اہمیت واضح کی۔ اخوت اور آزادی کا تصور عام کیا اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دینے کی اُمنگ اور آرزو دلوں میں بیدار کی، حوصلوں کے چراغ جلائے اور ولولوں کی شمعیں فروزاں کیں، اور اس طرح اُس زمانے کے مسلمانوں کی زندگی میں ایک انقلاب برپا ہو گیا۔ مولانا سید احمدؒ بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ دونوں اس کام میں پیش پیش رہے اور شاہ ولی اللہؒ کی تحریک کو عمل سے ہمکنار کرنے کا سہرا انھیں دونوں کے سر ہے۔ یہ دونوں شاہ صاحبؒ کی تحریک کے سلسلے کی بنیادی کڑی ہیں۔ ان کے افکار و خیالات میں شاہ ولی اللہؒ کی آواز صاف سنائی دیتی ہے [بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ شاہ صاحب (شاہ ولی اللہ صاحبؒ) کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے] سید صاحب (مولانا سید احمدؒ بریلویؒ) کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ شہید کی منصبِ امامت، طبقات، تقویت الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ صاحب کی زبان بولتی ہوئی نظر آئے گی۔ شاہ صاحبؒ نے عملاً جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ حدیث اور قرآن کی تعلیم اور اپنی شخصیت کی تاثیر سے صحیح الخیال اور صالح لوگوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر دی اور پھر اُن کے بعد اُن کے چاروں صاحبزادوں نے خصوصاً شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس حلقے کو

---

[۵۱] سرسید احمد خاں: تذکرۂ اہلِ دہلی، ص ۳۷

بہت زیادہ وسیع کردیا یہاں تک کہ ہزارہا ایسے آدمی ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل گئے جن کے اندر شاہ صاحب کے خیالات نفوذ کئے ہوئے تھے جن کے دماغوں میں اسلام کی صحیح تصویر اُتر چکی تھی۔ اور اپنے علم و فضل اور اپنی عمدہ سیرت کی وجہ سے عام لوگوں میں شاہ صاحب اور اُن کے حلقے کا اثر قائم ہونے کا ذریعہ بن گئے تھے۔ اس چیز نے اس تحریک کے لئے گویا زمین ہموار کردی جو بالآخر شاہ صاحب ہی کے حلقے، بلکہ یوں کہئے کہ اُن کے گھر سے اُٹھنے والی تھی۔ سید صاحب بریلویؒ اور شاہ صاحب شہیدؒ دونوں روحاً و معناً ایک وجود رکھتے تھے اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجدد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تجدید کا تتمہ سمجھتا ہوں۔[۱] اور اس میں شبہ نہیں کہ مولانا سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک اسی تحریک کا سلسلہ تھی جس کی داغ بیل شاہ ولی اللہ نے ڈالی تھی۔ اور جسے شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ اور شاہ عبدالقادرؒ نے پروان چڑھایا تھا۔

یہ بہ یک وقت ایک ذہنی اور عملی تحریک تھی، جس نے مذہب، دین، سیاست، معاشرت اور ثقافت سب ہی کو متاثر کیا۔ وہ مسلمان جو اورنگ زیب عالمگیر کے وقت سے انحطاط و زوال کی اندھیاریوں میں بھٹک رہے تھے انھیں اس تحریک نے روشنی عطا کی۔ دین اور مذہب کا صحیح احساس اُن کے یہاں پیدا ہوا، اور انھوں نے اُسے ایک نظام عمل کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی۔ مذہب کے جو غلط تصورات عام ہوگئے تھے، اُن کا خاتمہ ہوا، بدعتوں کی بیخ کنی ہوئی اور راہ حق میں جان دے دینے کے خیالات عام ہوئے۔ سیاسی زندگی میں آزادی حاصل کرنے اور جبر و استبداد کے مقابلے میں صف آرا ہونے کا خیال اُس نے پھیلایا۔ معاشرتی زندگی میں صحیح معیار اُس نے قائم کئے۔ معاشی زندگی کے نظامِ اقدار کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی اور ثقافت کو ارتقار کی راہ پر گامزن کرنے کی ایک فضا قائم کی — غرض یہ تحریک ایک وسیع اور ہمہ گیر تحریک تھی۔ جس نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مسلمانوں کو ایک نئی زندگی سے آشنا کرکے اُن کی کایا پلٹ دی۔ یہی سبب ہے کہ اس کا اثر اس زمانے کی زندگی کے ہر شعبے میں اپنی

---

[۱] مولانا مودودی: بحوالہ موج کوثر: صـ ۳۲-۳۳

جھلک دکھاتا ہے۔

(۵)

اس تحریک کے اثرات سب سے زیادہ اُس زمانے کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر نظر آتے ہیں۔ یہ محفل اس سے قبل ایک زمانے سے سونی پڑی تھی۔ اس تحریک کے اثر سے اُس میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی اور صدیوں کے بعد اب یہ محفل از سرِ نو جم گئی۔ ہر چند کہ اُس محفل میں وہ عہدِ اکبری اور عہدِ شاہجہانی جیسی بات تو نہیں رہی تھی لیکن جہاں تک تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے اُس میں اُس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی ایک جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ بقول حالیؔ "تیرھویں صدی ہجری میں جب کہ مسلمانوں کا تنزل درجۂ غایت کو پہنچ چکا تھا۔ اور اُن کی دولت، عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے حسنِ اتفاق سے دارالخلافۂ دہلی میں چند اہلِ کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جن کی صحبتیں اور جلسے عہدِ اکبری و شاہجہانی کی صحبتوں اور جلسوں کی یاد دلاتی تھیں"[۵] انحطاط و زوال کے باوجود ان محفلوں کا جمنا اس بات کا ثبوت ہے کہ اب اُس زمانے کی تہذیبی زندگی نئی ذہنی تحریکوں کے زیرِ اثر ایک نئی زندگی سے آشنا ہو رہی تھی، اور اس سے قبل انتشار اور پراگندگی کے جو بادل تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے افق پر چھائے ہوئے تھے وہ اب چھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اور تہذیب کا آفتاب ایک دفعہ پھر زندگی کے اُفق پر طلوع ہونے لگا تھا۔

مغلوں کی سیاسی طاقت تو یقیناً اس زمانے میں ختم ہو چکی تھی لیکن بعض طاقتوں کی دخل درانداز ی کے باعث، ایک زمانے کے انتشار اور پراگندگی کے بعد اب زندگی کسی حد تک سکون اور اطمینان سے آشنا ضرور ہو گئی تھی۔ انگریزوں کے دلّی میں داخل ہونے سے قبل تو مرہٹوں اور جاٹوں نے وہ ہنگامے برپا کئے تھے کہ لوگوں کا زندہ رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے۔ ان حالات میں تہذیبی معاملات کی طرف توجہ ممکن نہیں تھی۔ اگرچہ دلّی میں انگریزوں کے داخل ہونے اور برسرِ اقتدار آجانے کو لوگوں نے اچھا نہیں

۵؎ حالی: یادگارِ غالب: (شیخ مبارک علی، لاہور) ص۱

سمجھا تھا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کے بعد حالات کسی حد تک معمول پر ضرور آ گئے۔ اور لوگوں کو ایک جگہ جم کر بیٹھنے، غور کرنے اور سوچنے، اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کچھ لکھنے پڑھنے اور علمی کام کرنے کے مواقع ضرور ملے۔ اس ماحول میں وہ ذہنی اور فکری تحریکیں جن کی نوعیت نیم سیاسی اور نیم مذہبی تھی فروغ پاتی رہیں۔ اس تحریک کے علمبرداروں نے اس زمانے کی مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ان میں سے بیشتر نہ صرف مذہبی علوم کے عالم تھے، سیاست اور تاریخ، معاشرت اور عمرانیات سے بھی انھیں واقفیت تھی۔ انھیں اس زمانے کی زندگی کے نشیب و فراز کا پوری طرح علم تھا۔ اور انھوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال بھی کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر صاحب تصنیف بھی گزرے ہیں اور مختلف موضوعات پر اُن کی باقاعدہ کتابیں موجود ہیں —— اُنھوں نے زبان و ادب کے لئے بھی بڑا کام کیا ہے۔ اُن کے اثر سے اُس زمانے کی شاعری میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑی ہے۔ اور اُس نے اس وقت کی سیاسی، تہذیبی، ذہنی اور جذباتی زندگی کے اَن گنت پہلوؤں کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے —— پھر اس زمانے میں انگریزوں کے اثر سے ایک نئی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا آغاز بھی ہوا ہے جس میں مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات نے آپس میں مل کر قوس قزح کی صورت اختیار کی ہے

اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو دیکھا جائے تو سب سے پہلے اُن علماء پر نظر پڑتی ہے جنھوں نے دین اور مذہب کے مختلف پہلوؤں کو مفکرانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اجتہادی شان پیدا کی۔ شاہ ولی اللہ سے لے کر مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید تک اس کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ ان علماء دین کے کارناموں پر سر سید نے تذکرہ اہل دہلی میں روشنی ڈالی ہے۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کیسے بڑے بڑے عالم دلّی کی سرزمین پر موجود تھے اور اُنھوں نے دینی معاملات و مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں کیسا اجتہاد پیدا کیا تھا —— شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ، شاہ عبدالحیؒ، مولانا سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے علاوہ اُنھوں نے مولانا صدرالدین خاں آزردہ، مولوی مخصوص اللہ

مولوی رشید الدین خاں، مولانا محمد اسحٰق، مولوی محمد یعقوب، مولانا قطب الدین خان، مولوی عبدالخالق، مولوی نذیر حسین، مولوی محبوب علی، مولوی نصیر الدین، مولوی کریم اللہ، مولانا فضل امام مولانا فضل حق، مولوی نور الحسن، مولوی کرامت علی، مولوی مملوک العلی، مفتی سید رحمت علی، اخون شیر محمد مولوی امام علی، مولوی امان علی، مولوی محمد جان، مولوی نوازش علی، مولوی رستم علی، مولوی حاجی محمد اور ملا سرفراز کے حالات بیان کئے ہیں، اور ان کے علمی اور دینی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ ان علمائے دین میں نظریاتی اختلافات بھی تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے خیالات و افکار کو اپنے مخصوص حدود میں رہ کر پیش کیا ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کی انفرادیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ان سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن ان کے کارناموں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ مجموعی طور پر یہ سب کے سب اس زمانے کو علم و عمل کی ایک فضا سے آشنا کرنے میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ انھوں نے دینی معاملات و مسائل پر غور و فکر کیا ہے، اور مفکرانہ انداز میں اپنے خیالات عوام تک پہنچائے ہیں، جن کی بدولت صحیح دینی فضا قائم ہوئی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بعد ان کی دینی خدمت کو اس زمانے میں ان کے صاحب زادے شاہ عبدالعزیز نے جاری رکھا۔ وہ چودہ پندرہ برس کی عمر میں اپنے والد ماجد اشرف الاماجد عمدۂ علمائے حقیقت آگاہ شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کی خدمت میں تحصیل علوم عقلی و نقلی اور تکمیل کمالات باطنی سے فارغ ہوئے۔ اس کے چند مدت کے بعد حضرت شاہ موصوف نے وفات پائی اور آپ کی ذات فائض البرکات سے مسند خلافت نے زینت دبہا اور وسادۂ ارشاد و ہدایت نے رونقِ بے منتہا حاصل کی ۔۔۔۔ تمام علوم و فیوض کو انھیں حضرت کی خدمت میں کسب کیا۔ علم حدیث و تفسیر بعد آپ کے تمام ہندوستان سے مفقود ہو گیا۔ علمائے ہندوستان کے خوشہ چیں اسی سرگروہ علماء کے خرمنِ کمال کے ہیں، اور جمیع کملاء اس دیار کے چاشنی گرفتہ اسی زبدۂ ارباب حقیقت کے مائدۂ فضل و افضال کے ہیں۔[۱] ان کے ساتھ شاہ رفیع الدین بھی اس کام میں پیش پیش نظر آتے ہیں اور اس زمانے میں دینی معاملات پر انھوں نے بھی غور و فکر سے کام لیا، اور اپنے خیالات و نظریات درس و تدریس کے ذریعے سے عام کئے۔ "چونکہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب مرحوم و مغفور بسبب

---

[۱] سر سید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص۲۵

کبرسنی اور ضعف مزاج وکثرت امراض کے دماغ تعلیم وتدریس طلبا نہ رکھتے تھے بسلسلہ تدریس کا حضرت کی ذات بابرکات سے جاری تھا۔ فضلائے نامی ہر دیار کے ارباب کمال سے منشور یکتائی حاصل کر چکے تھے۔ جب آپ کی خدمت میں پہنچتے اپنے تئیں طفل ابجد خواں اور مبتدی محض سمجھ کر ابتدا سے انتہا تک پھر تحصیل پر کمر باندھتے۔ اسی واسطے دیار ہندوستان کے جمیع فضلائے نامی انھیں حضرت فیض موہبت کے مستفیضوں میں سے ہیں۔ ہر فن کے ساتھ ایسی مناسبت تھی کہ ایک وقت میں فنون متباینہ اور علوم مختلفہ درس فرماتے تھے۔ جب ایک کی تعلیم سے دوسرے کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوتے، محضار خدمت کو یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسی فن میں جامہ یکتائی اُن کے قامتِ استعداد پر قطع ہوا ہے[۱] کم وبیش یہی حال شاہ رفیع الدینؒ کے بھائی شاہ عبدالقادرؒ کا تھا۔ وہ اپنے زمانے کے محقق مسائل دین، موسس معنی شرع متین، ہادیٔ شریعت اور رہبر طریقت سمجھے جاتے تھے، آپ کے علم وفضل کا بیان کرنا ایسا ہے کہ کوئی آفتاب کی تعریف فروغ اور فلک کی مدح بلندی کے ساتھ کرے —— صاحبِ کشف تھے اور ایسا مکاشف صحیح کم کسی اہل سے اتفاق ہوا ہے[۲] گوشہ نشینی اُن کے مزاج میں داخل تھی۔ اکبر آبادی مسجد میں ساری زندگی گزار دی۔ درس و تدریس، اور وعظ کے ذریعے سے دین کے نکات کو عوام تک پہنچانا اُن کی زندگی کا بنیادی مقصد تھا۔ اس زمانے کے بڑے بڑے لوگوں نے اُن کے سامنے فخر کے ساتھ زانوئے ادب تہہ کیا۔ علما میں مولانا سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور شعرا میں مومن خاں نے اُن سے فیض حاصل کیا۔ مولانا سید احمد بریلویؒ تو اس زمانے کے ایسے زبردست عالم باعمل تھے کہ علم وعمل میں اُن کی مثال نہیں مل سکتی —— اوائل حال میں شوق طالب علمی وطن سے وارد شاہجہان آباد ہو کر حضرت بابرکت مولانا عبدالقادر علیہ الرحمۃ کی خدمت سراسر افادت میں حاضر ہو کر مسجد اکبر آبادی میں فروکش ہوئے اور صرف ونحو میں فی الجملہ سواد حاصل کیا۔ ازبسکہ ذوق درویشی اور مسکینی طینت میں پڑی ہوئی تھی۔ اکثر خدمت مسجد اور اس مقام کے واردوں، خصوصاً درویشان پاک طینت جو دور دراز سے تحصیل علم باطنی کے شوق میں جناب عبدالقادر صاحبؒ مغفور موصوف کی خدمت میں حاضر رہتے۔ خاطر داری اور سرانجام مہام میں ایسے بہ دل

---

[۱] سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص۲
[۲] سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص۵

سرگرم ہوئے۔ گویا اس امر کو اہم مہام سمجھے ہوئے تھے، اور اُس زمانے میں بھی اپنی اوقات کو طاعات و عبادات میں ایسا مصروف کیا تھا کہ جو لوگ صرف اسی امر کے واسطے کنج نشین اور گوشہ نشین تھے، اُن سے بھی اس طرح خاطر مجموع اور حضور قلب سے ظہور میں نہ آتے تھے اکثر مولانائے مغفور رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اس بزرگ کے احوال سے آثار کمال ظاہر ہوتے ہیں، اور مادہ اس سعادت منش کا ترقی مدارج علیا کے قابل نظر آتا ہے۔[1] اُن کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ وہ تحریک جہاد ہے جس نے ہندوستانی مسلمانوں کے جسدِ مُردہ میں جان ڈال دی ہر طرف اسلام کے نام پر جان دے دینے کے خیالات عام ہونے لگے۔ "تیرھویں صدی میں جب ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی طاقت فنا ہو رہی تھی اور دوسری طرف اُن میں مشرکانہ رسوم اور بدعات کا زور تھا مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمدؒ بریلوی کی مجاہدانہ کوششوں نے تجدید دین کی نئی تحریک شروع کی۔ وہ وقت تھا جب سارے پنجاب پر سکھوں کا اور باقی ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے اپنی بلند ہمتی سے اسلام کا علم اُٹھایا، اور مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی جس کی آواز ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لے کر خلیج بنگال کے کناروں تک یکساں پھیل گئی، اور لوگ جوق جوق اس علم کے نیچے جمع ہونے لگے ـــــ سید صاحب کے خلفاء ہر صوبہ اور ولایت میں پہنچ چکے تھے اور اپنے دائرہ میں تجدید، اصلاح اور تنظیم کا کام انجام دے رہے تھے۔ مشرکانہ رسوم مٹائے جا رہے تھے، بدعتیں چھوڑی جا رہی تھیں۔ نام کے مسلمان کام کے مسلمان بن رہے تھے، جو مسلمان نہ تھے۔ وہ بھی اسلام کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔ شراب کی بوتلیں توڑی جا رہی تھیں۔ تاڑی اور سیندھی کے خم لنڈھائے جا رہے تھے۔ بازاری فواحش کے بازار سرد ہو رہے تھے، اور حق و صداقت کی بلندی کے لئے علماء حجروں سے اور اُمرا ایوانوں سے نکل نکل کر میدان میں آ رہے تھے اور ہر قسم کی ناچاری، مفلسی اور غربت کے باوجود تمام ملک میں اس تحریک کے سپاہی پھیلے تھے اور مجاہد تبلیغ اور دعوت میں لگے تھے۔"[2] مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا بھی اس تحریک میں بڑا ہاتھ تھا۔ اور وہ بھی اس تحریک کے بہت بڑے علمبردار تھے۔

۱؎ سر سید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۳۴ ۲؎ سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید: ص ۱۳-۱۵

انھیں مولانا سید احمدؒ کے دست راست ہونے کا شرف حاصل تھا۔ اگرچہ وہ اُن کے مُرید تھے لیکن دینی علوم میں اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ وہ وعظ کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے اور دینی معاملات ایسی قابلیت سے ذہن نشین کراتے تھے کہ ہر بات آئینے کی طرح روشن ہوجاتی تھی۔ معقولات اور منقولات دونوں میں اُن کا پایہ بہت بلند تھا۔ دہلی میں اُن کے وعظ کا اثر یہ ہوا کہ جامع شاہجہانی سے لے کر فسق و معصیت کے مرکزوں تک خدا کا پیغام پہنچایا۔ شریعت کے احکام سنائے۔ اپنی مخصوص اور شہرۂ آفاق جرأت و شجاعت سے شرک و بدعت کا رد کیا، توحید و سُنّت کی منادی کی۔ چند ہی دنوں میں لال قلعہ سے لے کر جھونپڑوں تک زبانوں پر آپ کا نام تھا۔ گھر گھر آپ کے مواعظ اور نئے عقائد کا چرچا تھا[۱]۔ سرسید نے انھیں شاہ کشورِ شریعت گستری، ملک الملوک دیارِ دین پروری، قامع بنیانِ شرک و طغیان حامد موجباتِ علم و ایقان، موسسِ اساسِ کمال، مہذبِ اوضاع حال و قال، سالکِ مسالکِ ہدایت و ارشاد، مجلّئ آئینہ صافی اعتقاد، مرکزِ دائرہ علوم، منطقہ آسمانِ فہوم، مرتقی مدارج درجاتِ عالی، پیشوائے ادانی و اعالی مرجع و مآب فضائل، کام روائے طبائع فاضل، رموز فہم سوائر تفسیر قرآنی، دقیقہ یابِ معالمِ تقدیرات ربانی کہا ہے۔ جامع کمالات صوری و معنوی، نکتہ سنج کلام الہٰی و حدیثِ نبوی، قدوۂ اہالی، پیش گاہ قبول، جلال غوامض معقول و منقول، بانی مبانی فضل و افضال، ممہد قواعد تکمیل و اکمال، جاہدِ حق و یقین، مثبت دلائل دین، کہا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُن کی شخصیت ان تمام خصوصیات کی حامل تھی — کم و بیش یہی حال مولانا عبدالحیؒ، مولانا محمد اسحٰقؒ، مولانا محمد یعقوب وغیرہ کا تھا۔ یہ سب کے سب اپنے زمانے کے بڑے علمائے دین میں شمار ہوتے تھے اور علمی اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت بلند تھا۔

اِن کے علاوہ اس زمانے میں بعض ایسے عالم بھی تھے جو پوری طرح اِن علماء کے ساتھ نہیں تھے۔ اور جنھوں نے ان کی نظریاتی مخالفت بھی کی ہے لیکن علمی اعتبار سے اُن کا پایہ بھی بہت بلند ہے۔ اِن میں سب سے زیادہ نمایاں نام مولانا فضل حق خیرآبادی کا ہے۔ اس زمانے کی دِلّی میں وہ بھی موجود تھے اور اُس وقت کے علمی مباحث میں بڑی گرم جوشی سے حِصّہ

---

[۱] سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہیدؒ ص ۳۸۳

لیتے تھے۔ غالب کو اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ چنانچہ اُنھیں کی تحریک پر غالب نے اپنے اُردو کلام میں سے دو ثلث کے قریب نکال ڈالا[۵۱]۔ سرسیّد نے ان کو مستجمع کمالات صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی کہا ہے اور لکھا ہے کہ "جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انھیں کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر بل فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے کہ اس سرگروہِ اہلِ کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا دیکھا کہ جو لوگ آپ کو یگانۂ فن سمجھتے تھے جب اُن کی زبان سے ایک حرف سُنا دعوائے کمال کو فراموش کرکے نسبت شاگردی کو اپنا فخر سمجھے۔ بایں ہمہ کمالات علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا ہے کہ فصاحت کے واسطے ان کی عبارت شستہ محضر عروجِ معارج ہے اور بلاغت کے واسطے اُن کی طبع رسا دست آویز بلندی مدارج ہے[۵۲]"۔ غدر میں اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور کالے پانی کی سزا ہوئی، وہیں اُنھوں نے ۱۸۶۱ء میں انتقال کیا۔ مولانا فضل حق کے مشہور شاگرد مولانا نور الحسن تھے۔ اُن کا شمار بھی اس زمانے کے مشہور عالموں میں ہوتا تھا۔ اُن کے مزاج میں خلق ایسا تھا کہ بندگانِ الٰہی کی دل شکنی آپ کے اعتقاد میں خانۂ خدا کی بنیاد گرانے سے کم جرم نہیں اور علم ایسا کہ اس کو ایک جگہ فراہم لا کر فرقِ فلکِ نہم پہ رکھ دیں تو بہ سبب گرانی بار کے طبقات کرات کو اس طرح توڑتا ہوا پستی کو مائل ہو اور محیط کے دوسری طرف سے گزر جائے کہ اوج سے حضیض تک نگاہ کو ایک جادۂ مستقیم محسوس ہو اور وقار اس درجہ میں کہ فلک دوّار کی ہزار گردشیں اُن کی تمکین کی ایک نشست میں سرمو تفاوت پیدا نہیں کر سکتیں[۵۳]"۔
اسی طرح مولانا فضل امام خیر آبادی کی بھی سرسید نے بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ "علوم عقلیہ میں اُن کی طبع دقاق سے اعتبار تھا۔ اور علوم ادبیہ میں اُن کی زبان دانی سے افتخار[۵۴]"۔
غرض ایسے بے شمار بلند پایہ عالم اُس زمانے میں موجود تھے جنھوں نے اپنے علم و فضل اور حسنِ اخلاق سے اُس ماحول میں بڑی عالمانہ شان پیدا کر دی تھی۔
یہ علمارِ دین جو اس زمانے کی دلّی میں موجود تھے، بہت بلند مرتبے کے مالک ہیں۔

---

۵۱ حالی: یادگار غالب: ص ۱۰۲
۵۲ سرسید احمد خاں: تذکرۂ اہل دہلی: ص ۸۴
۵۳ سرسید احمد خاں: تذکرۂ اہل دہلی: ص ۹۷
۵۴ سرسید احمد خاں: تذکرۂ اہل دہلی: ص ۸۶

اُن کی کوششوں سے نہ صرف دین داری کی فضا قائم ہوئی بلکہ دینی مسائل کو عالمانہ اور مفکرانہ زاویۂ نظر سے دیکھنے کا ایک رجحان عام ہوا۔ اُن کے افکار وخیالات نے افراد میں ایک ذہنی تہذیب پیدا کی، اور اُن قدروں کا احساس وشعور اُن کے یہاں عام ہوا۔ جو تہذیبی اور ثقافتی زندگی کی بنیاد ہوا کرتا ہے۔ انھوں نے ایک علمی فضا بھی قائم کی جس میں غور وفکر کا صحیح سامان پیدا ہوا۔ اور ان کی درس وتدریس اور مواعظ کی بدولت افراد تزکیۂ نفس کی طرف راغب ہوئے، اور انھوں نے اپنے آپ کو ذہنی، روحانی اور اخلاقی اعتبار سے زیادہ مہذب بنایا۔ ان میں بیشتر صاحبِ تصنیف وتالیف بھی گزرے ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ نے اس سے قبل تصنیف وتالیف کی ایک عظیم روایت قائم کی تھی۔ اور اُن کی تصانیف حجۃ اللہ البالغہ تفہیماتِ الٰہیہ، الفوز الکبیر، لمعات، الطاف القدس، خیر کثیر، انصاف فی بیان سبب الاختلاف انفاس العارفین وغیرہ بہت بلند مقام رکھتی ہیں۔ اس کے بعد اگرچہ اس طرح تو تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری نہیں رہا کیونکہ اُن کے جانشین درس وتدریس اور مواعظ کی طرف زیادہ متوجہ رہے۔ پھر بھی اُن کے صاحبزادوں میں سے بعض نے اہم تصنیفی کارنامے انجام دیئے۔ یہ تصانیف، عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں موجود ہیں۔ شاہ عبدالعزیزؒ کے زمانے میں شیعہ سنی اختلافات زوروں پر تھے۔ آپ نے اِن مسائل پر عربی زبان میں کتابیں لکھیں۔ ان میں سے تحفۂ اثنا عشریہ ایک مناظرانہ کتاب ہے لیکن مخالفین بھی اس کی متانت تہذیب اور شائستگی کے مداح ہیں۔ اس کے علاوہ تفسیر عزیزی میں آپ نے قرآن مجید کے پہلے سوا پارے اور آخری دو پاروں کی تفسیر فارسی میں کی ہے۔ اصول حدیث میں عجالۂ نافعہ اور تاریخ حدیث میں بستان المحدثین اور چند حواشی اور شرح کی کتابیں آپ سے یادگار ہیں۔ آپ کے فتووں کا مجموعہ بھی چھپ چکا ہے۔[۵۱] شاہ عبدالعزیزؒ کے چھوٹے بھائی کا زیادہ وقت درس وتدریس میں صرف ہوا لیکن آپ سے چند نظمیں اور کچھ نثر بھی یادگار رہے لیکن آپ کا سب سے اہم کام کلام مجید کا تحت اللفظ اُردو ترجمہ ہے جو آج تک مقبول انام ہے۔[۵۲] شاہ عبدالقادر صاحب کے مزاج میں ترک زیادہ تھا، اور وہ گوشہ نشین آدمی تھے۔ انھوں نے ساری زندگی اکبرآبادی

---

۵۱ شیخ محمد اکرام: رود کوثر: ص ۲۹۵

۵۲ شیخ محمد اکرام: رود کوثر: ص ۲۹۶

مسجد میں گزار دی۔ درس و تدریس اور وعظ اُن کے محبوب مشاغل تھے۔ اس سبب سے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ نہ کی لیکن قرآن شریف کا بامحاورہ ترجمہ یا موضح القرآن (۱۲۰۵ھ) آپ سے یادگار ہے جس پر بلا مبالغہ ہزاروں کتابیں نثار ہیں۔[۱] شاہ عبدالقادرؒ کے شاگردِ خاص مولانا سید احمدؒ بریلوی بنیادی طور پر ایک مجاہد تھے۔ اُن کی زندگی جہاد کے منصوبے بنانے اور کافروں سے لڑنے میں گزر گئی۔ اس لیے تصنیف و تالیف کی طرف کوئی خاص توجہ نہ کر سکے۔ البتہ اُن کے دست راست مولانا عبدالحیؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ باوجود جہاد کے کاموں سے دلچسپی لینے کے تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان دونوں نے مل کر مولانا سید احمدؒ کے اقوال و ارشادات کو جمع کیا ہے۔ اور یہ کتاب "صراط مستقیم" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلا اور چوتھا باب مولانا اسمٰعیل نے ترتیب دیا ہے اور اس میں طریقِ ولایت اور طریقِ نبوت کے اختلاف کا ذکر ہے اور چوتھے باب میں طریقِ سلوک راہِ نبوت یعنی طریقۂ محمدیہ کا بیان ہے دوسرا اور تیسرا باب مولانا عبدالحیؒ کا لکھا ہوا ہے جس میں ہندوستان کے مشہور سلسلہ ہائے تصوف کے اشغال و وظائف کو عام فہم زبان میں جمع کیا ہے اور بتایا ہے کہ چشتیہ، قادریہ نقشبندیہ اور دوسرے طریقوں کے بزرگ اپنے مریدوں کو کس طرح تعلیم دیتے تھے اور صفائی قلب اور ترقی درجات کے لیے انھیں کون سے مراقبے اور عمل سکھاتے تھے۔[۲] اس کے علاوہ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے ایک مستقل کتاب تقویت الایمان کے نام سے اُردو زبان میں لکھی ہے۔ اس کتاب میں ایمان کے جزو یعنی خدا اور رسول پر بحث ہے۔ اُن کی بعض اور کتابیں بھی اہم ہیں ان میں یک روزی جسے آپ نے مسئلہ امتناع نظیر خاتم النبیین پر مولانا فضل حق خیر آبادی کے جواب میں ایک دن میں لکھا۔ رسالہ اصول فقہ، منصبِ امامت، طبقات، ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح، مثنوی سلک نور اور تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین بھی اُن کی مشہور تصانیف ہیں۔[۳] مولانا سید احمد بریلویؒ کے

۱۔ شیخ محمد اکرام: رود کوثر: ص ۳۹۶ ۲۔ شیخ محمد اکرام: موج کوثر: ص ۱۳
۳۔ شیخ محمد اکرام: موج کوثر: ص ۲۷ تا ۲۸

ساتھیوں میں مولوی کرامت علی جون پوری کی شخصیت بھی خاصی اہم ہے۔ یہ بھی صاحب تصنیف تھے اور ان کی تصانیف ردّ البدعت، دافع الوسواس، ترجمہ شمائل ترمذی، ترجمہ مشکوٰۃ جلد اول، مفتاح الجنّت وغیرہ مشہور ہیں۔[۱] ان علمائے دین کے علاوہ اس زمانے میں بعض دوسرے عالموں نے بھی تصنیف و تالیف کا کام کیا ہے۔ نواب صدرالدین خاں آزردہ سے بہت سی نظم و نثر یادگار ہے۔ مولانا نواب قطب الدین خاں نے اپنی منصبی مصروفیتوں کے باوجود اکثر رسائل زبانِ ریختہ میں واسطے فوائد عوام کے تحریر کیے اور اس میں مسائل ضروریہ ہر طرح کے مندرج فرمائے، اور حق یہ ہے کہ ان رسالوں سے خلق کو بہت فائدہ ہوا کہ ضروریاتِ دین سے ہر شخص مطلع اور آگاہ ہو گیا۔ کتب حدیث سے مشکوٰۃ کا ترجمہ زبان اُردو میں بہت صاف و شستہ و فائدہ مند کیا ہے اور اکثر فوائد کتب متداولہ و غیر متداولہ سے اس پر بڑھایا۔[۲] مولانا فضل حق خیرآبادی بھی نظم و نثر پر پوری قدرت رکھتے تھے، اور ان سے بھی بہت سی تحریریں یادگار ہیں۔ غرض اس زمانے میں ان علمائے دین نے خاصا علمی ماحول پیدا کر دیا تھا اور اس طرح تصنیف و تالیف کی اچھی خاصی فضا قائم ہو گئی تھی۔ اس زمانے کی ثقافتی زندگی میں اس علمی ماحول اور تصنیفی فضا نے ذہنی اور روحانی اعتبار سے بڑے اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔

ان علمائے دین کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی زندگی میں بڑے بڑے اولیا اللہ بھی موجود تھے۔ اور انھوں نے بھی اس وقت کی ثقافتی زندگی پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان بزرگوں نے صرف ریاضت اور عبادت ہی میں کمال حاصل نہیں کیا ہے۔ اخوت اور انسانی محبت کے خیالات بھی عام کیے ہیں۔ اور اپنے ان خیالات کو درس و تدریس، کشف و کرامات اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے عوام تک پہنچایا ہے۔ یہی سبب ہے کہ خلق خدا ان سے متاثر ہوئی ہے اور افراد نے ان کے اثر سے اپنے آپ کو مہذب بنایا ہے اور اس طرح اُن کے فکر و عمل نے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کو بہت متاثر کیا ہے۔ ان مشائخین اور اولیاء اللہ میں حضرت شیخ الشیوخ مولانا شاہ غلام علی، حضرت مولانا ابو سعید، حضرت

---

[۱] شیخ محمد اکرام: موج کوثر: ص ۴۰ [۲] شیخ محمد اکرام: موج کوثر: ص ۸۳

مولانا شاہ عبدالغنیؒ، شاہ محمد آفاقؒ، حاجی علاؤالدین احمدؒ، مولانا فخرالدینؒ، مولانا قطب الدینؒ، حاجی غلام نصیرالدین عرف کالے صاحبؒ، خواجہ محمد نصیر رنجؒ، مولوی یوسف علیؒ، حضرت شاہ غیاث الدینؒ، شاہ صابر بخشؒ۔ جناب میر محمدی صاحب، میران شاہ مانوؒ، شاہ جلالؒ اور مولانا محمد حیاتؒ کے نام خاص طور پر مشہور رہیں۔ ان میں سے اکثر صاحب کشف وکرامات تھے۔ اکثر نے اپنے فیض کو عام کر رکھا تھا۔ اکثر معرفت وحقیقت کے اسرار ورموز کی درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے۔ ان میں بعض صاحبِ تصنیف وتالیف بھی گزرے ہیں اور بعضوں نے شعرو شاعری سے بھی دلچسپی لی ہے۔

حضرت شاہ غلام علی اس زمانے کے بہت بڑے بزرگ تھے۔ "علم اور عمل اور فضل و کمال اور تجرید وتجرد اور حلم وکرم اور سخاوت اتم اور ایثار وانکسار آپ کی ذات پر ختم تھے۔ دن رات اللہ اور اللہ کے رسولؐ کے ذکر میں بسر کی اور دُنیا ومافیہا کی خبر نہ رکھی — آپ کی ذات فیض آیات سے تمام جہاں میں فیض پھیلا اور ملکوں ملکوں کے لوگوں نے اُن کی بیعت اختیار کی ہیں نے حضرت کی خانقاہ میں روم اور شام اور بغداد اور مصر اور چین اور حبش کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ حاضر ہو کر بیعت کی اور خدمات خانقاہ کو سعادتِ ابدی سمجھا۔ اور قریب قریب کے شہروں کا مثل ہندوستان، پنجاب اور افغانستان کا تو کچھ ذکر نہیں کہ ٹڈی دل کی طرح امنڈے آتے تھے۔"[۱] شاہ غلام علیؒ کے خلیفہ شاہ ابوسعیدؒ تھے۔ ان میں صفات ذاتی اور کمالات ظاہری اور باطنی ایسے تھے کہ جن کا کچھ حد وحساب نہیں۔ حافظ کلام اللہ اور عاشق رسول اللہ — اور علوم دینی آپ کو بہت مستحضر تھے اور دن رات انھیں کے درس میں گزرتے تھے۔ علم قرات میں یکتائے روزگار تھے۔ کلام اللہ ایسی خوش آواز اور قرأت سے پڑھتے تھے کہ لوگ دور دور سے سننے آتے تھے۔"[۲] ان کے بڑے بیٹے مولانا شاہ سعید احمدؒ تھے۔ انھیں علم حدیث وفقہ وتفسیر میں کمال حاصل تھا۔ دن رات مشغلہ درس وتدریس جاری رہتا تھا مسائل دینی آپ کے فیض سے حل ہوتے اور فتویٰ شرع شریف آپ کی مہر سے مسجل کئے جاتے۔ قدم بہ قدم اپنے بزرگوں کے طریقے پر چلتے اور اپنے پیروں کا طریقہ برتتے تھے۔

۱؎ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۱۴۔۱۲

۲؎ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۱۸

نسب باطنی بہت مستحکم تھا[1]کم و بیش یہی حال حضرت مولانا عبد الغنیؒ، شاہ محمد آفاقؒ، اور حاجی علاء الدین احمدؒ کا تھا۔ مولانا محمد فخر الدینؒ بھی اس دور کے ایک اہم بزرگ تھے مقبول خدائے لایزال تھے خلق اللہ میں بھی ایسا قبول خاطر بہم پہنچایا کہ گروہا گروہ حصول نجات اور تحصیل ہدایت کے واسطے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور آپ کے ارشاد کو مانند حکم وحی کے راست اور درست جانتے۔ جتنے امرائے ذوی الاقتدار اور سلطان عہد تھے آپ کی بیعت سے مشرف ہو کر آپ ہی کی خاکِ در کو وسیلۂ آبرو اور آپ ہی کے غبار آستاں کو تاجِ عزت و اعتبار سمجھتے تھے ــــ کتاب نظام العقائد اور رسالہ مرجبیہ اور فخر الحسن حضرت ہی کی تالیفات میں سے ہے[2] خواجہ محمد نصیر رنجؔ بھی اس عہد کے بزرگوں میں بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔ آپ کو اکثر علوم خصوصًا ریاضیات میں بہت دخل تھا۔ علم موسیقی بہت خوب جانتے تھے اور تال اور لے سے ایسے واقف تھے کہ بڑے بڑے استاد ان کے سامنے کان پکڑتے تھے اور خاک چاٹ کر نام لیتے تھے۔ علم حساب کو اس سے زائد جانتے تھے۔ اور مسائل حساب میں وہ مہارت بہم پہنچائی کہ مسائل لاینحل بہ آسانی حل فرماتے تھے چنانچہ تال اور حساب میں اُن کی تصنیفات موجود ہیں۔ یہ تو صفات ظاہری تھیں اور کمالات باطنی میں اِن سب سے رتبہ بڑا تھا اور وہ مقام ہی اور تھا۔ بین سے دلچسپی تھی اور ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو مجلس بین نوازی کی آپ کے روبرو ہوا کرتی تھی کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے، رنجؔ تخلص تھا[3] میر محمدی بھی اُس زمانے کے ایک اور پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ مقبولانِ بارگاہ کبریائے الٰہی سے تھے۔ قبول خاطر خاص و عام میں بھی یہاں تک حاصل تھا کہ اُمراء و سلاطین آپ کے دیدار فیض انوار کو نعمت کبریٰ اور آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کو ایک موہبت عظمیٰ سمجھتے تھے، از بس کہ جذب باطن کی تاثیر سے ساکنین تمام شہر کے، خصوصًا صادقین قلعۂ مبارک کے، علی الخصوص شہزادگان جلیل القدر آپ سے بہت رجوع کرتے تھے" ــــ غرض یہ بزرگ بے شمار خصوصیات کے مالک تھے۔ اور انھوں نے اس زمانے

۱؎ سر سید احمد خان: تذکرہ اہل دہلی: ص ۱۹-۲۰ ۲؎ سر سید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۲۳-۲۵
۳؎ سر سید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۲۵

کی ثقافتی زندگی میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ اُنھوں نے عوام سے رشتہ استوار کیا، اور اُن کی ذہنی اور روحانی تہذیب کی، امراء و رؤسا بھی اُن کے زیر اثر آئے، اور اُن کی تہذیب میں بھی اُنھوں نے نمایاں حصّہ لیا۔ اُنھوں نے زندگی کے اعلیٰ معیار قائم کیے۔ علم کے دریا بہائے، درس و تدریس میں مصروف رہے، تصنیف و تالیف کا کام کیا۔ مختلف فنون، خاص طور پر موسیقی اور شاعری سے دلچسپی کی اور انھیں فروغ دینے کے سامان فراہم کیے۔ اس لئے اس زمانے کی ثقافتی زندگی کی بنیادوں کو استوار کرنے میں اِن بزرگوں کا بھی بڑا حِصّہ ہے۔

علمائے دین اور مشائخین کے علاوہ اس عہد کی دلّی میں دوسرے علوم و فنون کے ماہر بھی بڑی تعداد میں موجود تھے ان میں سے ہر ایک اپنے علم اور فن پر پوری قدرت رکھتا تھا اور اس زمانے کی ثقافتی زندگی پر اُن کے نقوش بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ طِب کے علم اور فن کو ان لوگوں نے خاص طور پر ترقی دی اور اس کو معراج کمال پر پہنچا دیا۔ حکیم احسن اللہ خاں کا نام اس سلسلے میں بہت نمایاں ہے۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم فاضل تھے۔ مختلف علوم پر اُن کی گہری نظر تھی۔ بہت قابل اور سمجھ دار سمجھے جاتے تھے۔ لوگوں کو اُن سے بڑی عقیدت تھی۔ اُنھوں نے فنون حکمت و ہندسہ و ہیئت خدمت فضلائے عصر سے حاصل کر کر فنِ طبابت کو اپنے والد ماجد (حکیم محمد عزیز اللہ خاں) سے حاصل کیا، اور از بس کہ حافظہ پارۂ لوحِ محفوظ تھا اور طبیعت جزو تقدیر تھی چند مدّت سے مدارج کمال سے کوئی باقی نہ رہا کہ طے نہ کیا ہو۔ اور شفائے مرضا داد الٰہی ہے جس کی زندگی سے مسیحا نے ہاتھ دھوئے اُن کے نسخے سے جی گیا۔ اسی واسطے ساکنین شہر اور قاطبین دہر سوائے اس زبدۂ اہل کمال کے اور کسی طرف رجوع نہ کرتے ـــــ اُن کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے حضرت معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی عرش آرامگاہ نے اپنے پاس بلا کر عطائے خلعت اور عنایت خطاب عمدۃ الملک حاذق الزماں سے مُشرّف فرما کر خاص اپنے معالجے کے واسطے معین کیا۔ اور تادم زیست یہ سمجھے کہ اگر یہ سلالۂ کرام ایک دم الگ ہو تو زندگی اس بادشاہ گردوں جاہ کی محال ہے۔ اور اُن کے انتقال کے بعد بندگانِ گردوں تواماں حضرت ظل الٰہی

فلک بارگاہی ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہٗ و سلطانہ و افاض علی العالمین برہ و احسانہ نے کمال قدردانی و رتبہ شناسی سے اپنے سنہ جلوس میں طلب کیا اور سعادت نبض گری سے متسعد فرما کر احترام الدولہ اور ثابت جنگ خطاب سابق پر زیادہ کیا۔ اور از بس کہ حضور فیض گنجور حضرت ظل اللہ کے مزاج اقدس میں ان کے کمالات جائے گیر ہوئے۔ روز بروز ترقی مدارج اور ارتفاع مناصب ظہور میں آنے لگا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ یہاں تک بادشاہ جم جاہ طبیعت پر تصرف ہوا کہ کوئی امر جزوی و کلی سے بے مشورہ صلاح اس صاحب تدبیر صائب کے وقوع میں نہیں آ سکتا ہے[۵۱]۔ غرض حکیم احسن اللہ خاں بڑے پائے کے عالم، طبیب، حکیم، اور مدبر تھے۔ ان کے علاوہ اُس زمانے میں حکیم غلام نجف خاں کی بھی خاصی شہرت تھی۔ یہ حکیم احسن اللہ خاں اور حکیم شریف خاں کے شاگرد تھے۔ حکیم احسن اللہ خاں سے قرابت قریبہ بھی تھی۔ اس لئے اُنھوں نے اُن کی تعلیم میں انہماک کا اظہار کیا اور بہت تھوڑے عرصے میں وہ اپنے وقت کے اہم عالم اور طبیب ہو گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے عضد الدولہ کا خطاب دیا۔ ایک زمانے تک طبیب کی حیثیت سے سرکار کمپنی کے ملازم رہے[۵۲]۔ حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں کا شمار بھی اس زمانے کے اہم طبیبوں میں ہوتا تھا۔ حکیم غلام حیدر خاں کے بارے میں سرسید نے لکھا ہے کہ "شفائے کامل اُن کے دست حق پرست میں ودیعت ہے۔ راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے[۵۳]" اور حکیم غلام حسن خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ "کتب طبیہ میں مہارت اور علاج معالجہ میں دستگاہ تمام رکھتے تھے[۵۴]"۔ ان کے علاوہ حکیم نصر اللہ خاں، حکیم صادق علی، حکیم امام الدین، حکیم فتح اللہ خاں حکیم پیر بخش، حکیم حسن بخش خاں، حکیم محمد یوسف خاں وغیرہ کو بھی اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی۔ یہ سب کے سب نہ صرف فن طب کے ماہر اور علاج معالجے میں اعلیٰ درجے کے طبیب تھے، بلکہ دوسرے علوم کے ماہرین کی حیثیت سے بھی اِن کا پایہ بہت بلند تھا۔ اُنھوں نے اپنے زمانے میں علمی، فنی اور انسانی فضا قائم کی، خلق خدا کو فائدہ پہنچایا۔ اس لئے

---

۵۱ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۴۶-۴۷
۵۲ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۴۸
۵۳ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۵۰
۵۴ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۵۱

اُس زمانے کی ثقافتی زندگی میں ان کا مرتبہ بھی بہت بلند ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ اُس کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے اور نکھارنے سنوارنے میں اُنھوں نے بڑا کام کیا ہے۔

پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُس زمانے میں اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ اور اُنھوں نے صحیح ادبی اور شاعرانہ ماحول پیدا کیا ہے۔ اس شاعرانہ ماحول کے اثرات قلعے اور شہر دونوں میں نظر آتے ہیں۔ قلعہ اُس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز تھا، اور لوگ اُسے دلّی کی تہذیب و ثقافت کی علامت سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ محض جذباتی نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہوں نے باوجود اُن ناسازگار حالات کے جن سے انھیں اس وقت دوچار ہونا پڑا حتی الامکان تہذیب اور ثقافت کی طرف خصوصیت کے ساتھ توجہ کی اور اُن کی اس توجہ نے قلعے کو ایک بہت بڑا تہذیبی اور ثقافتی مرکز بنا دیا۔ اس وقت تک اُردو زبان قلعے میں داخل ہو چکی تھی۔ اور لوگ قلعے کی زبان کو معیاری اور مستند زبان سمجھتے تھے۔ فارسی کا اثر بھی باقی تھا لیکن اب رفتہ رفتہ اُس کی جگہ اُردو نے لے لی تھی اور اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے وقت میں تو سارے قلعے میں اُردو زبان ہی کو تہذیب و ثقافت کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ بادشاہ سے لے کر معمولی آدمی تک سب ہی اس کو اپنی مادری اور تہذیبی زبان سمجھتے تھے۔ اس صورتِ حال نے قلعے کو تہذیب و ثقافت کا منبع اور سرچشمہ بنا دیا تھا، اور اس کے اثرات اُس زمانے کی زندگی پر بہت گہرے تھے۔ بہادر شاہ کے زمانے میں اُردو زبان و ادب کو دربار کی سرپرستی حاصل ہوئی اور وہ دبستانِ دہلی کے اُردو ادب کا ایک مرکز بن گیا جس کا سب سے درخشندہ ستارہ عظیم غالب ہے۔[1] اس میں شبہ نہیں کہ غالب اس زمانے کے بہت بڑے شاعر ہیں، اور اُنھوں نے شاعری کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ لیکن اُن کے علاوہ بھی اس زمانے میں بعض اہم شاعر نظر آتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر تھے اور انھیں شاعروں سے دلچسپی بھی تھی۔ اسی لئے اُنھوں نے قلعے میں شعر و شاعری کا اچھا خاصا

---

[1] PERCIVAL SPEAR; TWILIGHT OF THE MUGHALS: P.83

ماحول پیدا کر لیا تھا۔ ذوقؔ اُن کے اُستاد تھے اور انھیں ملک الشعراء کا منصب حاصل تھا۔ اُن کی وفات کے بعد غالبؔ کو یہی حیثیت حاصل ہوئی۔ مومنؔ قلعے میں ملازم تو نہیں تھے لیکن اُن کا وہاں آنا جانا ضرور تھا۔ اگرچہ انھیں ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا نہیں تھی کیونکہ بہت خوددار آدمی تھے لیکن کبھی کبھی کوئی انعام مل ضرور جاتا تھا[۱]۔ قلعے میں باقاعدگی سے مشاعرے ہوتے تھے۔ بہادر شاہ ظفرؔ کو خود ان مشاعروں میں دلچسپی تھی اس لئے اس وقت کے تقریباً تمام اہم شاعروں کو ان مشاعروں میں شریک کر لیتے تھے۔ غرض شاہِ وقت بہادر شاہ ظفرؔ کے دلچسپی لینے کی وجہ سے اُس زمانے نہ صرف قلعے میں اچھا خاصا شاعرانہ ماحول پیدا ہو گیا تھا بلکہ قلعے سے باہر شہر میں بھی گھر گھر شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ غالبؔ، مومنؔ، شاہ نصیرؔ، ذوقؔ، ظفرؔ، آشفتہؔ، نیّرِ درخشاں، عیشؔ، مجروحؔ، ظہیرؔ، عارفؔ، صہبائیؔ وغیرہ کے اُردو فارسی نغموں سے دلّی کی ساری فضا گونجی ہوئی تھی۔ یہ اُردو شاعری کے شباب کا زمانہ تھا۔ بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے[۲]۔

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ قلعے میں ایک زمانے تک بار نہ پانے کے باوجود ایک شاعر کی حیثیت سے غالبؔ کی عظمت اُس زمانے میں بھی تسلیم کی جاتی تھی، اور اس عہد میں اعلیٰ درجے کے شاعرانہ ماحول کو پیدا کرنے میں اُن کا بڑا ہاتھ تھا۔ انھوں نے اُردو اور فارسی دونوں میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی، اور وہ اپنے زمانے میں اِن دونوں زبانوں کے مسلم الثبوت اُستاد سمجھے جاتے تھے۔ شیفتہؔ کے خیال میں وہ ایسے نکتہ سنج نغز گفتار تھے کہ کم دیکھنے میں آتے ہیں[۳]۔ سرسیدؔ نے انھیں موسسِ اساسِ شیوا بیانی بانئ ہائے الفاظ و معانی، عندلیب بہارستان سخن گستری، طوطئ شکرستان معنی پروری[۴] کہا ہے اور لکھا ہے: "میں اپنے اعتقاد میں اُن کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور اُن کے ایک گل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں اور اگر دیکھا جائے تو حق بھی یہی ہے۔

۱؎ مولانا عبدالحیٔ انصاری کا خط راقم کے نام ۲؎ مرزا فرحت اللہ بیگ: دلّی کا ایک یادگار مشاعرہ: مضامین فرحت حصۂ اول: ص۱۴۰

۳؎ شیفتہ: گلشن بے خار: ص۱۳۹ ۴؎ سر سید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص۱۰۴

خوشا حال ان لوگوں کا جو آپ کی خدمت بابرکت سے مستفید ہوتے ہیں اور جوہر گرانمایہ آپ سے حاصل کرتے ہیں اس کو مغتنم جان کر بھی جزو دان حافظہ میں محفوظ اور صندوق بیاض میں امانت رکھتے ہیں[۵۱]" ذوقؔ بھی اس زمانے میں مسلم الثبوت استاد سمجھے جاتے تھے اور چونکہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے، اس لئے اس زمانے میں انھیں کچھ زیادہ ہی اہمیت دی جاتی تھی۔ شیفتہؔ نے اُن کے بارے میں لکھا ہے" قوت مشقے کہ اوراست دیگرے نہ دیدہ شد و معہذا رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویاں است در کلامش کمتر۔ و برجمیع اصناف سخن قدرت تمام دارد۔ بالجملہ از شعرائے مسلم و مقرر است و با ایں ہمہ کثرت فکر و ہجوم اشعار ہنوز بہ ترتیب دیوان نہ پرداختہ صحبتش گاہ گاہ اتفاق می افتد و از منتخبات زماں و مغتنمات دوراں است[۵۲]" اس زمانے کے شاعرانہ ماحول میں اُن کی حیثیت بھی بہت بلند تھی۔ اور وہ بھی بہت مقبول تھے۔ بقول سرسید" دقیقہ سنجان روزگار سے گنے جا سکتے ہیں کہ جس کا کلام وحی نظام فخر متقدمین میں شرف متاخرین میں ہو اس کی ذات فائض البرکات بنی نوع میں کس قدر فضل و شرف رکھتی ہوگی[۵۳]" ذوقؔ کے ساتھ ساتھ مومنؔ نے بھی اس زمانے کے شاعرانہ ماحول میں اضافہ کیا ہے۔ شیفتہؔ اُن کے بارے میں لکھتے ہیں" شاعری دونِ مرتبہ اوست اما چوں سخن دریں فن است اعراض نامستحسن زبان جادو طرازش سحر را بمرتبۂ اعجاز رسانیدہ و سخن دلپذیرش طول را ہمپایۂ ایجاز گردانیدہ، گوہر افشانی طبع نیساں بارش دامن دامنِ کان جواہر در جیب و آستین مفلساں انداختہ و گل ریزی اندیشہ بہار نگارش چمن چمن ریاض جنت بچشم نظارگیاں جلوہ گر ساختہ[۵۴]" اس زمانے کے شاعروں میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے اور اُن کی اس بلندی کو سب ہی نے تسلیم کیا ہے۔ سرسید کے خیال میں اُنھوں نے سخن گوئی کو بحد اعجاز پہنچایا اور شعر نے اُن سے مرتبہ حکمت کا پایا۔ نکات سخن اور دقائق فن اُن کے قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ابر سے بارانِ لطافت[۵۵]" شیفتہؔ بھی اُس زمانے کے مشہور شاعر

---

۵۱ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہلِ دہلی : ص ۱۰۲

۵۲ شیفتہ : گلشن بے خار : ص ۴۴

۵۳ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : ص ۱۶۷

۵۴ شیفتہ : گلشن بے خار : ص ۱۹۶

۵۵ سرسید احمد خاں : تذکرہ اہل دہلی : ص ۱۵۰

ہیں، اور اُنھوں نے نہ صرف اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے بلکہ بعض شاعروں کو اپنی شاعرانہ بصیرت سے نئی زندگی بخشی ہے۔ وہ شاعر ہی نہیں تھے، شاعری کے بہت اچھے نقاد بھی تھے اس لئے اس زمانے کے شاعرانہ ماحول کو عظمت سے ہمکنار کرنے میں اُن کا بھی بڑا حصہ ہے۔

صہبائی اگرچہ اُردو کے شاعر نہیں تھے لیکن فارسی زبان پر انھیں پوری طرح عبور حاصل تھا۔ اور وہ اُس میں اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے تھے۔ نیر درخشاں بھی فارسی کے اچھے شاعر تھے۔ عیش مجروح، عارف اور ظہیر نے اُردو میں شاعری کی۔ اور اگرچہ اُن کی شاعری میں وہ بات تو نہیں جو غالب مومن اور ذوق کے یہاں ہے لیکن اُنھوں نے شاعری کی اُس روایت کو باقی ضرور رکھا ہے جس کی بنیاد ان شعراء نے ڈالی تھی ——— اور پھر بہادر شاہ ظفر تھے، جنھوں نے نہ صرف اُردو میں اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے بلکہ وہ ایک ایسا محور تھے جس کے گرد یہ پورا شاعرانہ ماحول گھومتا تھا۔ ان کی طبیعت میں بڑی عاجزی اور انکساری تھی۔ اس لئے وہ آخر وقت تک ذوق اور پھر غالب سے اصلاح لیتے رہے لیکن اس سے اُن کی قادرالکلامی پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ یہ تو اُن کی بڑائی کی دلیل ہے۔ اُن کے زمانۂ حکومت میں لال قلعہ کی زندگی ناسازگار حالات سے دوچار رہی لیکن ان حالات میں بھی اُنھوں نے اس زمانے کے شاعروں کا خیال رکھا اور حتی المقدور اُن کی پرورش اور دیکھ بھال کی شعر و شاعری سے انھیں گہرا لگاؤ تھا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ وہ اُس میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے اپنے آس پاس اس زمانے کے تقریباً تمام شاعروں کو جمع کر لیا تھا۔ اور لال قلعے میں اُردو شاعری کی ایک فضا قائم ہو گئی تھی۔

شاعری کے ساتھ اُس زمانے میں دوسرے فنون کو بھی بہت فروغ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر نے مصوری سے بھی دلچسپی لی اور اُس وقت کے نامور مصوروں کو نوازا۔ اُنھوں نے مصوری کے دبستانِ دہلی کی روایت کو باقی رکھا جس نے اُس زمانے میں کم از کم دو اہم مصور راجہ جیون رام اور حسین نظیر پیدا کئے[1]۔ ان کی وجہ سے دلی میں مصوری کا شوق بھی عام ہوا۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کو موسیقی سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ اور

---

[1] PERCIVAL SPEAR : TWILIGHT OF THE MUGHALS: P. 83

اُن کے دورِ حکومت میں لال قلعہ موسیقی کا بھی اچھا خاصا مرکز بن گیا تھا۔ موسیقی کی باقاعدہ محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور اُس میں بڑے بڑے موسیقار حصہ لیتے تھے۔ ناصر نذیر فراق نے نبی خانم کی زبانی ان محفلوں کی روداد بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:" میرا قاعدہ تھا کہ میں ایک مہینے میں لال قلعے سے بارہ دری کے دو پھیرے کیا کرتی تھی۔ ایک دوسری کو ایک چوبیسویں کو۔ ان تاریخوں کے اندر خواجہ میر درد کے صاحب کے وقت سے راگ کی دو محفلیں ہوتی تھیں اور اس دھوم دھام سے ہوتی تھیں کہ لال قلعے کے بادشاہ اور بادشاہزادے پسند کرتے تھے جب میں جہاں پناہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہو جاتی تو حضور والا فرماتے ہم سمجھ گئے آج چاند کی دوسری یا چوبیسویں ہے۔ بارہ دری جانے کی چھٹی چاہتی ہو، اچھا جاؤ یہ خواجہ صاحب کے یہاں کی بڑی پُر برکت محفلیں ہیں۔ محمد شاہ پیا اور شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی اور ولی عہدی تک میں بھی اُن میں شریک ہوا ہوں۔ جب میں پلٹ کر لال قلعہ میں آتی تو حضور کو آداب بجالاتی۔ حضور فرماتے" کہو خانم اس تاریخ میں محفل کیسی رہی۔ کون کنچنی اچھا گائی؟ کس گویّے نے خواجہ محمد نصیر سے زیادہ داد لی ــــــ جو کچھ مجھے حال معلوم ہوتا عرض کر دیتی"[۱]۔

ایک اور جگہ لکھا ہے "سب شاہزادوں کو گانے بجانے کا بڑا شوق تھا۔ اچھے اچھے گویّے اور کلاونت نوکر رکھ کر اس بات کو اُن سے سیکھتے تھے۔ کوئی قسم گانے کی ایسی نہ تھی جسے یہ لوگ ادا نہ کرتے ہوں، کوئی ساز ایسا نہ تھا جو یہ لوگ سلیقے سے نہ بجاتے ہوں۔ اچھے اچھے اُستاد اس کام میں اُن کے آگے کان پکڑتے تھے۔ مگر سارنگی اُن میں سے کسی ایک کو نہ آئی۔ کہتے تھے "اماں یہ ٹیڑھی کھیر ہے، نہ اس میں کوئی پردہ ہے، نہ سندری ہے، رستہ کیونکر چلایا جائے یہ پیشہ وروں کا ہی حصہ ہے ان کی ہڈی بولتی ہے۔ مرزا گوہر صاحب، مرزا کالے صاحب مرزا اچڑیا صاحب ستار بجانے میں اُستاد ہو گئے تھے"[۲]۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں موسیقی سے لوگوں کو کتنی دلچسپی تھی اور وہ اُس میں کس طرح ڈوبے ہوئے تھے۔ خوش نویسی کا بھی اُس زمانے میں بڑا چرچا تھا۔ اور اُسے بھی لوگ ایک اہم فن کی طرح سیکھتے تھے۔ بادشاہزادوں اور اُن کے باپ دادوں کو بھی شوق ضرور ہوتے تھے۔

---

[۱] ناصر نذیر فراق: لال قلعہ کی ایک جھلک: ص۶۵ [۲] ناصر نذیر فراق: لال قلعہ کی ایک جھلک: ص۲۸

ایک نجوم، مصوری، ایک خوش نویسی کا، اور ان سب میں کمال پیدا کرتے تھے —— بادشاہ کو بھی اس فن سے دلچسپی تھی، اور وہ عربی فارسی خط کے کامل تھے۔ خوش نویسی میں اُن کے اُستاد میر کلو صاحب تھے۔ اور بادشاہ نے بھی اس ہنر میں سیکڑوں کو شاگرد کیا تھا[۵۱]۔ اس زمانے کے خوش نویسوں میں سید محمد امیر، آغا صاحب، مرزا عبداللہ بیگ امام الدین احمد خاں، محمد جان، اخوند عبدالرسول قندھاری، حافظ کلو خاں، میر امام الدین مولوی حیات علی، پنڈت تنکھ ناتھ، بدرالدین علی خان مہرکن فیض علی خاں، مرزا شاہرخ بیگ اور محمد عالم خاص طور پر مشہور ہیں، اور ارباب موسیقی میں ہمت خاں، راگ رس خاں، میر ناصر احمد، بہادر خاں ستار زن، رحیم سین ستار زن، نظام خاں، قائم خاں، گلاب سنگھ پکھاوجی، اور مکھو اپکھاوجی کے نام سرفہرست آتے ہیں۔ ان سب نے اس زمانے کی دلی میں ان فنون کی صحیح فضا پیدا کر کے انھیں منتہائے کمال پر پہنچا دیا تھا۔

یہ تو اس تہذیبی اور ثقافتی روایت کی تفصیل تھی جس کا تعلق مشرق سے تھا لیکن اُس زمانے میں مشرق کی یہ تہذیبی اور ثقافتی روایات مغرب کی تہذیبی اور ثقافتی روایات کے ساتھ شیر و شکر ہوئی ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد سے یہ سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوا، اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں شدت پیدا ہوتی گئی۔ لال قلعے تک اس کے اثرات پہنچے اور وہاں بعض لوگوں کے رہن سہن تک پر اس کا اثر ہوا بعض شہزادوں نے قلعے کے اندر مغربی طرز کی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ انگریزی لباس پہنا اور رہن سہن کا انگریزی انداز اختیار کیا۔ اکبر شاہ ثانی کا دوسرا بیٹا مرزا بابر انگریزی طرز اختیار کرنے کے لئے خاص طور پر مشہور ہے۔ اس نے لال قلعے میں دیوان عام کی پشت پر رنگ محل کے احاطے میں مغربی طرز کا ایک مکان تعمیر کرایا۔ وہ مغربی طرز کا لباس پہنتا تھا جس کی کیفیت وردی کی سی تھی۔ اس کے مغربی طرز کے کوٹ پر سینے کے دونوں طرف ستارے لگے ہوتے تھے۔ وہ پاؤں میں بھاری بوٹ پہنتا تھا، اور اس کے ہاتھ میں ایک بھاری سی چھڑی ہوتی تھی۔ اس انداز سے وہ چھ گھوڑوں کی گاڑی میں بیٹھ کر شہر میں نکلتا تھا[۵۲]۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں

---

۵۱ ناصر نذیر فراق: لال قلعے کی ایک جھلک: ص ۲۸-۲۹

۵۲ PERCIVAL SPEAR: TWILIGHT OF MUGHALS P. 64-65

کی تہذیب وثقافت کے اثرات کس طرح اندر ہی اندر مشرقی تہذیب وثقافت پر اپنا رنگ چڑھا رہے تھے۔ ہر چند کہ شروع شروع میں اس کی حیثیت تقلید اور نقالی کی تھی لیکن جب انگریز باقاعدہ دلّی پر حکمراں ہو گئے، اور انھوں نے اس سرزمین پر اقامت اختیار کر لی تو مشرق ومغرب کی تہذیبوں کا یہ اتصال اس زمانے کی زندگی کا بنیادی جزو بن گیا۔ جب انگریز دلّی میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو بیشتر لوگوں نے کوئی خاص مزاحمت نہیں کی۔ بلکہ ان کے اس اقدام کو ایک حد تک پسند کیا۔ کیونکہ ان کے اس اقدام سے وہ ہنگامے ختم ہو گئے جن کی وجہ سے دلّی ایک زمانے تک انتشار کی آماجگاہ بنی رہی تھی۔

انگریزوں نے اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد تعلیمی اور علمی معاملات کی طرف توجہ کی جس کا اثر اس زمانے کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر بڑا گہرا ہوا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم دہلی کالج کا قیام تھا، جو بہت تھوڑے عرصے میں ایک علمی اور تعلیمی ادارے سے زیادہ ایک تہذیبی اور ثقافتی مرکز بن گیا۔ مسلمانوں نے اس کی مخالفت بھی نہیں کی۔ بلکہ اُس وقت بعض اہم علماء نے اس ادارے کے ساتھ تعاون کیا۔ خود مولانا شاہ عبدالعزیزؒ اس سلسلے میں پیش پیش نظر آتے ہیں "جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے دہلی کالج قائم کیا، اور لوگ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے متعلق متامل تھے تو آپ نے ان سب شبہات کو رفع کیا اور علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پچاس سال پہلے انگریزی درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کا فتوی دیا۔[۵۱] اس لئے مسلمان اس ادارے کے ساتھ وابستہ ہونے لگے۔" کالج کا افتتاح ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ اور اُس شاہانہ عطیے میں سے اس کالج کے لئے پانسو روپے ماہانہ مقرر کئے گئے۔ مسٹر جے۔ ایچ ٹیلر مقامی مجلس کے سکریٹری ایک سو چھتر روپے ماہانہ پر اس کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ ہیڈ مولوی کی تنخواہ ایک سو بیس روپے قرار پائی اور دو اور مولوی پچاس پچاس کے رکھے گئے۔ باقی پچیس پچیس اور تیس تیس کے تھے۔ طلباء کے لئے بھی وظائف مقرر ہوئے۔ سالانہ رپورٹیں باقاعدہ مجلس تعلیم عامہ کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں جن میں مولویوں کے عزل ونصب، سالانہ امتحان کے نتائج اور دوسرے امور متعلق کالج درج ہوتے تھے۔[۵۲] وقت کے ساتھ ساتھ یہ کالج دن دونی رات چوگنی ترقی

---

۵۱ شیخ محمد اکرام: رودِ کوثر: ص ۳۹۵

۵۲ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج: ص ۶

کرتا گیا، اور اس نے دلّی کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں اپنے لئے جگہ بنالی۔

دہلی کالج کا سب سے اہم تہذیبی اور ثقافتی کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے اُردو زبان کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اُردو زبان اس وقت تک فارسی کی جگہ لے چکی تھی اور دلّی میں ہر شخص اس کا شیدائی تھا۔ اس زمانے میں جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، بڑے بڑے عالم ادیب اور شاعر موجود تھے۔ اور وہ درباری اور سرکاری زبان بھی سمجھی جاتی تھی۔ اس کالج نے اردو زبان کو بہت اہمیت دی اور اس کی ترقی کے لئے بڑا کام کیا۔ اس کالج کی بڑی خصوصیت یہ تھی، اور اسی میں اُس کی کامیابی کا راز تھا کہ ذریعۂ تعلیم اُردو تھا، عربی، فارسی، سنسکرت کی تعلیم تو خیر اُردو میں ہوتی ہی تھی لیکن دوسرے علوم جو داخل نصاب تھے، اُن کی تعلیم کا ذریعہ بھی اُردو تھا[۱]۔ سائنس کی تعلیم تک اُردو میں ہوتی تھی، اور ماسٹر رام چندر اور دوسرے اساتذہ نہایت خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیتے تھے[۲]۔ ادب کی طرف بھی اس کالج نے خاص توجہ دی۔ مختلف موضوعات پر کتابوں کے ترجمے بھی یہاں خاصی تعداد میں ہوئے یہاں مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ ادبی محفلیں بھی ہوتی تھیں تصنیف و تالیف کا کام بھی جاری تھا۔ اور ان سب باتوں نے مل کر اس کالج کو ایک ثقافتی مرکز کی حیثیت دے دی تھی۔ جو لوگ اس کالج سے وابستہ تھے، اُن میں بیشتر بڑے لائق اور قابل تھے اور اُنھوں نے علم و ادب میں اضافہ کیا ہے۔ مسٹر بٹروس، ڈاکٹر اسپرنگر اور مسٹر ٹیلر یہ کالج کے تین پرنسپل ایسے گزرے ہیں کہ اُنھوں نے کالج کی سچی خدمت کی، اور اُس کی ترقی و اصلاح میں دل سے کوشش کی۔ طلبہ و اساتذہ پر اُن کا بڑا اثر تھا اور شہر والے بھی اُن کا ادب کرتے تھے۔ خاص کر مشرقی شعبے کی اصلاح اور اُردو زبان میں مغربی علوم کے ترجموں کے متعلق مسٹر بٹروس اور ڈاکٹر اسپرنگر نے جو بے ریا کوشش کی وہ بہت قابل قدر ہے[۳]۔ عربی کے اساتذہ میں مولوی مملوک العلی بڑے جید عالم تھے اور دور دور اُن کے علم و فضل کی شہرت تھی مولوی امام بخش صہبائی صدر مدرس فارسی اپنے وقت کے بہت بڑے فارسی ادیب تھے۔

---

۱ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج: ص ۱۵ ۲ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج: ص ۲۶

۳ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج: ص ۱۴۷

مصنّف اور شاعر بھی تھے۔ اُن کی کتابیں نصاب تعلیم میں داخل تھیں۔ شہر میں اُن کی بڑی عزّت تھی۔ فارسی کتابوں کے علاوہ اُنھوں نے اُردو کی صرف و نحو لکھی اور شمس الدین کی تصنیف حدائق البلاغۃ کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ شعرائے اُردو کا انتخاب بھی کیا تھا۔ جو اس زمانے میں چھپ گیا تھا۔[51] مولوی سبحان بخش بھی کالج میں مدرّس تھے، اُن کی کتاب محاوراتِ ہند مشہور ہے۔ ابن خلکان کی تاریخ کا ترجمہ وفیات اعیان انھیں کا کیا ہوا ہے۔ تذکرہ مفسّرین اور تذکرہ حکما بھی ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ ماسٹر رام چندر سائنس اور ریاضی کے اُستاد تھے اور اِن موضوعات پر اُنھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔ مولوی احمد علی فارسی کے مدرّس تھے۔ اُنھوں نے تاریخ کشمیر کا فارسی سے اُردو میں ترجمہ کیا۔ پنڈت رام کشن دہلوی بھی کالج میں مدرّس تھے۔ اُنھوں نے علم طب پر ایک رسالے کا اُردو میں ترجمہ کیا تھا اور ڈاکٹر اسپرنگر کے ساتھ مل کر قواعد صرف و نحو تالیف کی تھی۔ ایک کتاب زراعت پر بھی اُن سے یادگار ہے ماسٹر حسین اگرچہ بچوں کو پڑھاتے تھے لیکن تصنیف و تالیف کا شوق تھا۔ اُنھوں نے تاریخ مغلیہ کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ اس کے علاوہ میکناٹن کی شرح شریف، قانون محمدی فوجداری، قانون وراثت وغیرہ کے ترجمے بھی انھیں کے کیے ہوئے ہیں۔ ہر دیو سنگھ بھی کالج میں منشی تھے، اُنھوں نے اُصول حساب پر ایک کتاب کا ترجمہ کیا۔ ماسٹر نور محمّد نے بنگال اور تاریخ مغلیہ کا ترجمہ کیا۔ مولوی حسن علی خاں نے قانون مال، گلستان سعدی اور الف لیلہ (منتخب) کے ترجمے اُردو میں کیے۔[52] ان کے علاوہ کالج کے طالب علموں نے بھی تصنیف و تالیف میں بڑا نام پیدا کیا۔ ماسٹر رام چندر، مولوی نذیر احمدؔ، مولوی ذکاء اللہ، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر ضیاء الدین متعدد کتابوں کے مصنّف ہیں اور ان کی تصانیف اُردو زبان میں بڑا درجہ رکھتی ہیں۔ مولوی کریم الدین بھی کالج کے طالب علم تھے۔ اُن کی تعلیم النساء، گلستانِ ہند، تذکرہ شعرائے ہند (طبقات شعرائے ہند)، گلدستہ نازنینان، تذکرۃ النساء، ترجمہ ابوالفداء، تاریخ شعرائے عرب وغیرہ مشہور ہیں ـــــ ان اساتذہ اور طلباء نے اس کالج کے نام کو روشن کیا، اور تصانیف سے چار چاند لگا دیئے۔ انھیں کی بدولت کالج ایک

---

۵۱ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج: ص ۱۴۸

۵۲ ڈاکٹر مولوی عبدالحق: مرحوم دہلی کالج: ص ۱۴۸-۱۵۲

تعلیمی، علمی، تہذیبی اور ثقافتی ادارہ بن گیا، اور مشرق و مغرب کی تہذیبی روایات کو انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ یہی اُن کے سب سے بڑے کارنامے ہیں۔

غرض دلّی اُس زمانے میں تہذیب و ثقافت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور اس میں بڑے لائق اور قابل لوگ جمع تھے۔ بادشاہ کو خود تہذیبی اور ثقافتی معاملات سے دلچسپی تھی، اور اُن کی اِس دلچسپی نے لال قلعے کو ایک ثقافتی مرکز بنا دیا تھا۔ قلعے کے باہر شہر میں بڑے بڑے عالم، مفکّر، شاعر اور ادیب تھے جنھوں نے اپنے فکر و عمل سے تہذیب و ثقافت کی صحیح فضا قائم کر دی تھی۔ انگریز بھی اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ اور اُن کا سب سے بڑا کارنامہ دہلی کالج کا قیام تھا جس نے اُس زمانے میں صحیح علمی اور ادبی ماحول پیدا کیا اور اس طرح ایک اہم تہذیبی اور ثقافتی ادارے کی حیثیت اختیار کر لی۔ اگرچہ انگریز اس کے روح رواں تھے لیکن اس میں مشرق کی تہذیبی اور ثقافتی روایات بھی پروان چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ انھوں نے مشرقی علوم و ادبیات کے بعض اہم علمبرداروں کو اس ادارے میں جمع کیا تھا۔ یہ لوگ کشادہ دل اور روشن خیال تھے اس لئے انھوں نے اس عہد کے تقاضوں کو سمجھا اور وقت کی ضرورتوں کو محسوس کیا۔ چنانچہ اُن کی علمی اور ادبی کاوشوں نے اس ادارے کو مشرق و مغرب کی ثقافتی روایات کا ایک سنگم بنا دیا۔ اس صورت حال نے اس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی ماحول میں ایک نئی زندگی پیدا کی، اور اس طرح دلّی ایک دفعہ پھر تہذیب و ثقافت کا ایک اہم مرکز بن گئی۔

(۶)

یہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی ماحول تھا جس میں مومن پیدا ہوئے۔ اُن پر اس ماحول کا گہرا اثر نظر آتا ہے، اور وہ اُس کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ اس ماحول نے انھیں پیدا کیا ہے اور اُن کی شخصیت اپنی بساط بھر خود بھی اُس کو پیدا کرنے کا باعث بنی ہے۔ خاص طور پر اس زمانے کے علمی اور ادبی ماحول کو پیدا کرنے میں اُن کا بڑا ہاتھ ہے۔ ظاہر ہے کہ اُس زمانے کے سیاسی حالات سے انھیں براہ راست

کوئی سروکار نہیں تھا اس لئے وہ خود تو ان حالات کو متاثر نہ کرسکے لیکن ان کا اثر انھوں نے براہ راست نہیں تو بالواسطہ طور پر قبول ضرور کیا۔ یہی حال کم وبیش معاشی حالات کا ہے۔ اس زمانے کے معاشی حالات کو وہ خود تو متاثر نہ کرسکے لیکن ان حالات کے اثرات اُن پر ضرور موجود ہیں۔ البتہ اس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے وہ خود بھی متاثر ہیں اور اُن کی شخصیت نے زندگی کے ان شعبوں کو متاثر بھی کیا ہے۔ مومنؔ کی شخصیت اُس زمانے کی معاشرتی زندگی کی علامت ہے۔ وہ تہذیب وثقافت کی صحیح نمایندگی کرتے ہیں۔ اُنھوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت اُس زمانے کے تہذیبی اور ثقافتی اُفق پر ایک نہایت ہی درخشندہ ستارہ نظر آتی ہے۔

مومنؔ سیاسی آدمی نہیں تھے، اس لئے اس زمانے کی سیاست میں اُن کا کوئی خاص حصّہ ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سیاسی نظام کی اصل صورت حال اس کی اجازت بھی نہیں دیتی تھی۔ شخصی حکومت اور شاہیت کا اُس وقت دور دورہ تھا، اور عام طور پر لوگ اسی کو معیار تصوّر کرتے تھے۔ سیاسی نظام کا کوئی اور تصوّر اُس زمانے میں موجود نہیں تھا۔ یہ شخصی حکومت اور شاہیّت مومنؔ کی آنکھوں کے سامنے دم توڑ رہی تھی۔ اس زمانے کے لوگوں کو اس کا بڑا غم تھا۔ کیونکہ اُن کے نزدیک وہ اُن کی حکومت تھی جس کے سائے میں وہ کئی سو سال سے زندگی بسر کرتے آئے تھے۔ یہ حکومت اُن کے نزدیک دین ومذہب، تہذیب و ثقافت کی علامت تھی۔ اس لئے اُس کی زبوں حالی کو اُنھوں نے بھی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ چنانچہ اس زبوں حالی کا جو اثر اُس زمانے کی زندگی پر ہوا ہے۔ اُس پر وہ کُڑھتے ہیں۔

حکومت وقت کی اس زبوں حالی اور کمزوری کا نتیجہ انگریزوں کا عمل دخل تھا۔ اور وہ انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی دلّی پر صحیح معنوں میں حکمراں ہو گئے تھے۔ اُن کے آنے سے اُس انتشار اور افراتفری کا بڑی حد تک خاتمہ ضرور ہو گیا تھا جو اس سے قبل تقریباً سو سال تک زندگی پر مسلط رہی تھی۔ چنانچہ عام لوگوں نے اُن کے حکمراں ہو جانے کے بعد ایک سکون اور اطمینان سا محسوس کیا تھا۔ لیکن جو لوگ سیاسی بصیرت رکھتے تھے، اور جن کے پاس مذہبی اور قومی شعور تھا، اُنھوں نے اس ماحول سے مطابقت پیدا نہیں

کی تھی۔ وہ اپنی حکومت ہی میں اپنی نجات دیکھتے تھے، اور اُن کے دل میں اُس کو برقرار رکھنے کا چراغ روشن تھا۔ مومن انھیں لوگوں کے زُمرے میں آتے ہیں۔ اگرچہ انھیں شاہ ہیئت سے کوئی لگاؤ نہیں تھا، وہ اس نظام کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن مغلوں کی حکومت اُن کے نزدیک مسلمانوں کی حکومت تھی اور اُس کے زیرِ سایہ مسلمانوں کا مذہب اور کلچر ترقی کر سکتا تھا، اور افراد اطمینان کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اُس کو اپنی دینی اور ثقافتی زندگی کی علامت سمجھا، اور انگریزوں کو وہ ساری زندگی مسلمانوں کا دشمن سمجھتے رہے۔ اُنھوں نے ان لوگوں کو غاصب اور کافر قرار دیا، اور انھیں معاشی معاشرتی انتشار کا ذمّہ دار ٹھہرایا۔ انشائے مومن میں ایک خط اُن کے چچا حکیم غلام حسین خاں کے نام ہے، اُس میں اِس پریشانی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"چوں دریں دیارِ خراب کہ بہ دستِ کفرہ جاہل بے قدر افتادہ قدرِ شریف نجیب حکیم کیمیاگر گرفت و دولت و اقبال ترجمہ عنقا شد، لاجرم سفر لکھنؤ صواب دیدِ خاطر است۔ اگر دراں جا رشتۂ مطلب گرہ کشود نیکوتر ورنہ عزم آں دیار ہم می خلد کہ بسیار کس قدر دانی راجہ چندو لال بہادر نسبت بارباب کمال سیما شعرا وانمودہ اند و ایں ہیچ مداں را بوئے از بس اگر ازبہ دماغ اندیشہ رسیدہ باالجملہ اگر خواستہ شکرے تعالیٰ است بدولت قدم بوس سرمایہ اندوز می شوم"[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن انگریزوں کی حکومت کو جاہل، ناقدر دانوں اور کافروں کی حکومت سمجھتے تھے جس میں شریفوں اور نجیبوں کا بُرا حال تھا۔ دولت اور اقبال مندی اس زمانے میں عنقا ہو گئی تھی چنانچہ وہ اس سے تنگ آ گئے تھے۔ اور لکھنؤ اور حیدرآباد کے سفر کا خیال دل میں پیدا ہوا تھا جہاں اس لئے شاعروں کی قدردانی ہوتی تھی کہ وہاں ابھی تک مسلمانوں کی حکومت تھی۔ اور انگریزوں کا سکہ نہیں چلتا تھا۔ یہ باتیں اگرچہ مومن کی ذات کے ساتھ تعلق نہیں رکھتی لیکن اِن سے اُن کے سیاسی خیالات کا اندازہ ضرور ہو جاتا

---

[1] مومن: انشائے مومن: ص ۱۲۵-۱۲۶

ہے اور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ ملکی حکومت کے پرستار تھے اور غیر ملکی کا فروں کی حکومت کو اپنی معاشرتی، معاشی اور تہذیبی زندگی کے لئے سم قاتل سمجھتے تھے۔ اِن خیالات کا اظہار سیاسی بصیرت اور شعور کے بغیر ناممکن تھا۔ مومن کے ان خیالات میں اُن کے پیر و مرشد مولانا سید احمد بریلویؒ کے خیالات کی صدائے بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ اُن کی تحریک کو عام طور پر صرف سکھوں کے خلاف جہاد کی تحریک سمجھا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی یہ تحریک انگریزوں کے خلاف بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس غیر ملکی اقتدار کو ختم کرنے کے لئے ہندوؤں سے تعاون کرنے کے لئے آمادہ تھے۔ اس کے ثبوت میں اُن کا وہ خط پیش کیا جا سکتا ہے جو اُنھوں نے راجہ ہندو راؤ کو لکھا تھا۔ اس میں صاف صاف لکھتے ہیں:۔

"بررائے عالی روشن و مبرہن است کہ بیگانگاں بعید الوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ و تاجرانِ متاع فروش بپایہ سلطنت رسیدہ امرائے کبار و ریاست رؤسائے عالی مقدار برباد نمودہ اند و عزت اعتبار ایشاں بالکل ربودہ، چوں اہل ریاست و سیاست در زاویہ خمول نشستہ اند، ناچار چندے از اہل فقر و مسکنت کمر ہمت بستہ ایں جماعت ضعفا محض بربنا خدمت دین رب العالمین برجستند، ہرگز ہرگز از دنیا داران جاہ نیستند محض بربنا خدمتِ دین رب ذوالجلال برخاستہ اند نہ بربنا طمع مال و منال رفتے کہ میدان ہندوستان از بیگانگان دشمناں خالی گردیدہ و تیز سعیٔ ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ آیندہ مناصب ریاست و سیاست بطالبین آں مسلّم باد۔"[1]

یعنی

"جناب کو خوب معلوم ہے کہ یہ پردیسی سمندر پار کے رہنے والے دنیا جہاں کے تاجدار اور یہ سودا بیچنے والے سلطنت کے مالک بن گئے ہیں۔ بڑے بڑے امیروں کی امارت اور بڑے بڑے اہل حکومت کی حکومت اور اُن کی

---

[1] مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہنچا: ص ۲۷۳-۲۷۴

عزت و حرمت کو انھوں نے خاک میں ملا دیا ہے۔ جو حکومت اور سیاست
کے مرد میدان تھے وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ اس لئے چند غریب
اور بے سرو سامان کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو گئے اور محض اللہ کے دین
کی خدمت کے لئے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ یہ اللہ کے بندے ہرگز
دنیادار اور جاہ طلب نہیں ہیں محض اللہ کے دین کی خدمت کے لئے
اٹھے ہیں۔ مال و دولت کی ان کو ذرہ برابر طمع نہیں جس وقت ہندوستان
ان غیر ملکیوں سے خالی ہو جائے گا اور ہماری کوششیں بارآور ہوں گی،
حکومت کے عہدے اور منصب ان لوگوں کو ملیں گے جن کو ان کی طلب ہو گی۔[1]

مومن کے بھی یہی خیالات و نظریات تھے لیکن مولانا سید احمد بریلویؒ کی طرح ان کی زندگی
میں عمل کا پہلو غالب نہیں تھا لیکن ان خیالات و نظریات کو جنم دینے والی سیاسی بصیرت
ان میں موجود تھی، اور ان کے پاس ان سیاسی حالات کا مکمل اور صحیح شعور تھا، جو ان کے
آس پاس اور گرد و پیش موجود تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس بصیرت اور شعور کو عمل کے
سانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت ان میں نہیں تھی۔ بہر حال وہ سوچتے ضرور تھے، اور
ان کے دل میں اس خواہش کی شمع ضرور فروزاں تھی کہ حشر کو جلد از جلد زمین کو تہہ و بالا
کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اگر انقلاب میں کچھ اور نہ ہو تو کم از کم ایک امید تو ہوتی ہے ؎

اے حشر جلد کر تہہ و بالا زمین کو
گر کچھ نہیں امید تو ہے انقلاب میں

مومن یہ سیاسی انقلاب چاہتے تھے۔ کیونکہ انھیں یقین تھا کہ ان کے زمانے کے
سیاسی حالات بغیر اس انقلاب کے صحیح راستے پر گامزن نہیں ہو سکتے اور ان کی وجہ
سے زندگی کے مختلف شعبوں میں جو گتھیاں پڑ گئی ہیں وہ سلجھ نہیں سکتیں۔ بہر حال مومن
کی اپنے زمانے کے سیاسی حالات سے دلچسپی اور انھیں راہ راست پر لانے کا خیال
اپنی جگہ مسلم ہے:

---

[1] خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت: ص ۲۲۹

ان سیاسی حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بدحالی کو بھی اُنھوں نے شدت سے محسوس کیا تھا، اور وہ یہ جانتے تھے کہ اس کی اصل وجہ درحقیقت ملکی اقتدار کی کمزوری اور غیر ملکی اقتدار کی مضبوطی ہے۔ انھیں یقین تھا کہ اس صورتِ حال نے ہندوستانی معیشت کی بنیادیں ہلا دی ہیں، اور نظامِ اقدار کو ڈانواڈول کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اِن حالات کے شکوہ سنج نظر آتے ہیں۔ اُنھوں نے بظاہر تو جگہ جگہ اپنی ذاتی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے لیکن درحقیقت اس کے پردے میں وہ اُس عہد کی عام معاشی بدحالی کو واضح کرتے ہیں۔ انشائے مومن میں اُن کے کئی خطوط ایسے ہیں جن میں انھیں پریشانیوں کا بیان ہے۔ یوں مومن بڑے خوددار آدمی تھے، اُنھوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا لیکن جگہ جگہ ایسی باتیں اُن کے قلم سے ضرور نکل گئی ہیں جن سے اُس عام معاشی بدحالی کا اندازہ ہوتا ہے جو مومن کے آس پاس اور گرد و پیش موجود تھی۔ بادشاہ اور امیر زادے تک اُس کے شکار تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے کبھی قلعے سے وابستہ ہونے کی تمنا نہیں کی۔ حکیم احسن اللہ خاں سے اُن کی رشتہ داری تھی۔ وہ اُس زمانے میں وزیر تھے، اور قلعے میں اُن کا بڑا اثر تھا۔ وہ چاہتے تو اُن کے توسط سے وہاں رسائی حاصل کر سکتے تھے لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شاہ وقت کا اقتدار ختم ہو چکا ہے اور عام معاشی بدحالی اُس کو بھی چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، وہ جانتے تھے کہ انگریزوں نے حکومت کو غصب کر لیا ہے، اور وہ صحیح معنوں میں بادشاہ بن بیٹھے ہیں۔ اجتماعی اور انفرادی طور پر ان لوگوں نے نوچ کھسوٹ شروع کر دی ہے۔ اس کا جو اثر دتی کی عام معاشی زندگی پر ہوا ہے مومن اُس کا شعور رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے انگریزوں کو کافر کہا ہے اور انشائے مومن میں ایک جگہ لکھا ہے کہ انگریزوں کے حاکم ہو جانے کی وجہ سے شریفوں اور نجیبوں کی قدر باقی نہیں رہی ہے اور اُن کی آبرو خاک میں مل گئی ہے۔ اسی احساس نے اُن کے یہاں دتی چھوڑنے اور لکھنؤ اور حیدرآباد میں پناہ لینے کا خیال پیدا کیا ہے۔ کیونکہ وہاں نسبتاً معاشی حالات بہتر تھے اور شرفا کی عزت معاشی اعتبار سے دتی کی طرح آندھیوں کی زد پر نہیں تھی۔ غرض مومن اپنے

زمانے کے معاشی حالات کا شعور رکھتے تھے۔ ان معاشی حالات کا اُن کی زندگی پر اثر بھی ہے اور وہ ان حالات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کو ایک لمحے کے لئے بھی نظر انداز کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔

مومن کو اپنی معاشرت اور تہذیب سے گہری دلچسپی تھی، اور وہ بنیادی طور پر ایک مجلسی آدمی تھے۔ یہ صحیح ہے کہ اُن کے مزاج میں کم آمیزی تھی۔ ہر ایک سے ملنا جُلنا اُنھیں پسند نہیں تھا۔ وہ چند مخصوص احباب سے مِلتے جُلتے تھے۔ انھیں احباب کی دلچسپ صحبتوں میں اُن کا وقت گزرتا تھا۔ یہ سب کے سب اس معاشرت اور تہذیب کے صحیح علمبردار تھے جو مومن کو بہت عزیز تھی، اور جس کو وہ زندگی میں بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اُن کے احباب میں اُس زمانے کے تقریباً تمام اہم لوگ شامل تھے۔ بعضوں سے اُن کی بے تکلفی بھی تھی۔ کچھ شاگردوں کو بھی اُنھوں نے اپنا دوست بنالیا تھا۔ ان میں سے تقریباً تمام کے مزاج کو مومن کے مزاج کے ساتھ مناسبت تھی۔ ان میں سے بیشتر کی شب میکدے میں اور دن خانقاہ میں گزرتا تھا، اور انھیں دولتِ دُنیا و دیں نصیب تھی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ غلام علی خاں وحشت، تفضل حسین خاں، میر عظمت اللہ خاں عظمت، مُنوّر علی آشفتہ وغیرہ اسی قبیل کے لوگ تھے۔ ان کے ساتھ مومن کا اچھا وقت گزرتا تھا۔ شعر و شاعری ہوتی تھی۔ راگ رنگ کی محفلیں جمتی تھیں۔ حسن و عشق کے کھیل کھیلے جاتے تھے، اور اس طرح دادِ عیش دی جاتی تھی۔ شطرنج ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ شام کے وقت دلّی کے بارونق بازاروں کی سیر ہوتی تھی۔ غرض مومن اپنے زمانے کی معاشرتی زندگی میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے، اور اُن کی ذات میں اُس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔

اُن کے رہن سہن کا ایک خاص انداز تھا۔ وہ امیرانہ ٹھاٹ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ نے اُن کی اس زندگی کی حقیقت سے بڑی ہی بھرپور تصویر کھینچی ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دیوان خانہ اچھا خاصا دربار تھا۔ جہاں وہ بادشاہوں اور شہزادوں کی طرح بیٹھتے تھے۔ احباب اور شاگردوں سے محفل گرم رہتی تھی۔ انھیں خود درباروں میں جانا پسند نہیں تھا، اس لئے اُنھوں نے خود اپنے آس پاس اور گرد و پیش

ایک چھوٹے موٹے دربار کی فضا قائم کرلی تھی۔ اس میں وہ تمام معاشرتی اور تہذیبی خصوصیات موجود تھیں جن سے اُس زمانے کی زندگی پہچانی جاتی ہے۔ لال قلعہ اُس زمانے میں معاشرت تہذیب اور مجلسی زندگی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے کبھی لال قلعے میں ایک شاعر یا درباری کی حیثیت سے جانے کی آرزو نہیں کی۔ البتہ وہاں کے معاشرتی اور تہذیبی ماحول سے انھیں لگاؤ تھا۔ اس لئے وہ کبھی کبھی شعر و شاعری کی اُن محفلوں میں ضرور شریک ہوتے تھے جو قلعے میں باقاعدگی سے منعقد ہوتی تھیں، اور جن میں ذوقؔ، غالبؔ اور خود شاہ ظفرؔ حصہ لیتے تھے لیکن مومنؔ کی دنیا قلعے سے باہر تھی۔ وہ اسی دنیا میں رہتے تھے، اور اس دنیا میں انھوں نے قلعے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی سے کچھ ملتا جلتا سا انداز پیدا کرلیا تھا۔ وہ بڑے وقار اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ لئے دیئے رہنا اُن کے مزاج میں داخل تھا۔ انھوں نے کبھی اپنے زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی معیاروں سے چشم پوشی نہیں کی۔ بلکہ انھیں ان ناسازگار حالات میں بھی برقرار رکھا جو سیاسی انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی معاشی بدحالی کی وجہ سے اُس زمانے کی زندگی کا جز بن گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی ذات میں اُس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا عکس نظر آتی ہے۔

مغلوں کے دورِ آخر کی اس تہذیبی اور معاشرتی زندگی میں رندی اور مذہبیت کا ایک عجیب و غریب امتزاج تھا، اور یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ ایک طرف تو اس زمانے کی تہذیب و معاشرت کے علمبردار رات دن بادۂ و صنم میں مصروف رہتے تھے اور دوسری طرف پرہیزگاری کا خیال بھی اُن کا دامن نہیں چھوڑتا تھا۔ کم از کم وہ اُس کا خیال کسی حال میں بھی دل سے نہیں نکالتے تھے۔ دنیا کی ہوس اور زندگی سے رس نچوڑ لینے کی خواہش، روحانیت، عرفان اور معرفت کے خیالات کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ غرض یہ تضاد اس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں موجود تھا اور مومنؔ اس کی صحیح نمایندگی کرتے ہیں۔ اُن کے یہاں صورت پرستی، رندی، شاہد بازی اور عشق و عاشقی کے دوش بدوش اُن دینی اور مذہبی تحریکوں سے دلچسپی بھی ملتی ہے جن کی بدولت

اس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں زندگی اور جولانی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی اور جن کے پیش نظر مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو بحال کرنا۔ اُن کی معاشی حالت کو سُدھارنا اور اُن کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کو نکھارنا اور اس مقصد کے لئے افراد کے دلوں میں ولولہ و شوق کی بجلیاں بھرنا تھا۔ مومنؔ پر اپنے مذہبی ماحول کے اثرات بہت گہرے تھے۔ اپنے زمانے کی بعض اہم شخصیتوں کا اثر بھی انھوں نے قبول کیا تھا۔ اس لئے وہ بہت جلد ان تحریکوں کے قریب آگئے جو اُس زمانے میں چل رہی تھیں۔ ان تحریکوں کے سب سے بڑے علمبردار مولانا سید احمد بریلوی تھے۔ مومنؔ اُن کے مُرید ہوئے اور انھیں اپنا پیر و مرشد تصوّر کیا۔ اس زمانے کے شاعروں میں صرف مومنؔ ہی ایسے تھے، جن کی ذات اس تحریک سے اتنی شدّت کے ساتھ متاثر ہوئی، شیخ محمد اکرام نے "موج کوثر" میں لکھا ہے کہ سید صاحب کے مُریدوں میں کئی بلند پایہ ہستیاں تھیں۔ ان میں سے ایک قابل ذکر ہستی اُردو کا شاعر مومنؔ ہے۔ بعض لوگوں کو تعجب ہوگا کہ ایک حکیم، نجومی اور تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو کے عاشقانہ گیت گانے والا مومنؔ کس طرح ان لوگوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ جن کی زندگیاں سادہ اور سپاہیانہ تھیں لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ مومنؔ بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہا۔ جو شمالی ہندوستان میں بڑے زور سے جاری تھی۔ وہ مولانا سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔ اور ایک مثنوی میں حضرت کی تعریف میں لکھتا ہے

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خدا — کہ جو پیرو اُس کا ہے، سو پیشوا
وہ نورِ مجسم وہ ظلِّ الٰہ — کہ سائے سے جس کے خجل مہر و ماہ
زہے سید احمد قبول خدا — سرِ اُمتانِ رسولِ خدا

اس مثنوی میں جہاد کی فضیلت بتائی ہے، اور لوگوں کو حضرت کے جھنڈے تلے جمع ہونے کی ترغیب دی ہے ؎

جو داخل سپاہِ خدا میں ہوا — فدا جی سے راہِ خدا میں ہوا
حبیبِ حبیبِ خداوند ہے — خداوند اس سے رضامند ہے
امامِ زمانہ کی یاری کرو — خدا کے لئے جاں نثاری کرو

اخیر میں دعا کی ہے ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب	یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرہ کار	بہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے	عروج شہید اور صدیق دے[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومنؔ کو اُس زمانے کی ذہنی اور فکری تحریکوں کے ساتھ کتنا لگاؤ تھا، اور وہ اس تحریک کے علمبرداروں کے ساتھ کس قدر والہانہ وابستگی رکھتے تھے۔ دراصل یہ اُس ماحول کا اثر تھا جس میں زندگی کو سنوارنے کا شعور بڑھ گیا تھا اور افراد کے دلوں میں عمل کی خواہش بیدار ہونے لگی تھی۔ مومنؔ عملی طور پر تو اس تحریک میں حِصّہ نہ لے سکے لیکن ذہنی طور پر انھوں نے اس کا ساتھ دیا۔ اور اپنی شاعری کے ذریعے اس کی پوری حمایت کی۔ چنانچہ اس راہ میں اُن کی رنگین مزاجی اور رندی بھی حائل نہ ہوسکی۔ بقول علی میاں "رنگین طبع، رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس اور عاشق مزاج آدمی تھے۔ غزل دردناک آواز اور دلپذیر ترنم سے پڑھتے تھے، بایں ہمہ دین داری کے خیال سے بھی خالی نہ تھے۔ جوانی میں حضرت سید احمد شہیدؒ کے مرید ہوئے اور آخر عمر تک عقائد میں انھیں کے متبع اور پیرو رہے۔ کلیات میں ایک مثنوی جہادیہ ہے جو اُس وقت لکھی تھی جب سید صاحب سکھوں سے جہاد کر رہے تھے"[2] اس صورت حال نے ایک شاعر کی حیثیت سے مومنؔ کی اہمیت بہت بڑھا دی ہے اور اکرام صاحب نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ "حالی کو بالعموم مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر سمجھا جاتا ہے لیکن جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ مولانا سید احمد بریلویؒ نے پہلی دفعہ مسلمانانِ ہند کو دوسری قوموں کے مقابلے میں جمع کیا۔ اور اُن کے ایک طبقے کو مذہبی آزادی دلانے کے لئے اپنی جان قربان کر دی تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ مسلمانانِ ہند کی جداگانہ قومیت کا اظہار سب سے پہلے انھوں نے کیا۔ اس صورت میں مومنؔ کو مسلمانانِ ہند کا پہلا قومی شاعر ماننا پڑے گا کیونکہ اس نے مولانا سید احمدؒ کے خیالات کی ترجمانی اسی طرح

۱؎ شیخ محمد اکرام: موجِ کوثر: ص ۴۱-۴۲ ۲؎ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہیدؒ: ص ۴۵۸

کی جس طرح بعد میں سرسید کی حالی نے [۵۱] اور اس میں شبہ نہیں کہ مومن اس لحاظ سے ایک بلند مرتبے کے مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے زمانے کی صحیح نباضی کی، اور براہ راست نہیں تو کم از کم بالواسطہ طور پر ان تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر صداقت اور اخلاص مندی کے ساتھ حصّہ لیا جو اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے اہم تحریکیں تھیں۔
مومن کا ان تحریکوں سے اس طرح وابستہ ہونا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی حالات کا گہرا شعور رکھتے تھے اور اس ماحول کا اُن پر گہرا اثر تھا جس کی تشکیل ان حالات کے زیر اثر ہوئی ہے۔

یہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مومن کی نشوونما اسی کے سائے میں ہوئی ہے؛ اور اُنھوں نے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر اس کے گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی شخصیت اس ماحول کی صحیح آئینہ دار ہے، اور اُن کے عادات و اطوار، افکار و خیالات، تصورات و نظریات اور رہن سہن کے معمولات سب میں اس ماحول کے اَن گنت روپ مختلف زاویوں سے رونما ہو کر اپنی جھلکیاں دکھاتے ہیں۔

---

۵۱ شیخ محمد اکرام: موجِ کوثر: ص۴۳

مومن کی تصانیف

(۱)

کلیاتِ مومن

"کلیاتِ مومن" مومن خاں کے اُردو کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کو سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ۱۲۴۳ھ میں جمع کیا۔ مومن نے خود اس پر نظرِ ثانی کی اور ترمیم و اضافہ کے بعد کلیات کی شکل دی۔ اس کلیات کو کریم الدین نے ۱۸۴۶ء میں مطبع رفاہِ عام دہلی میں چھپوا کر شائع کیا۔ شیفتہ نے اپنے تذکرے گلشن بے خار میں لکھا ہے کہ "با ایں ہمہ صفات کہ مذکور شد بے تحریک محرکے بہ فکر سخن نمی پرداز د۔ چنانچہ اکثر کلامش بخواہش داعی آثم صورت ظہور گرفتہ وہم تدوین افکارش را فقیر باعث گشتہ۔ دیباچۂ آں کہ ریختۂ خامۂ من است دراں بہ تفصیل ایں ماجرا باز کردہ ام"[1] اور دیباچے میں حمد و نعت کے بعد پہلے مومن اور اُن کے کلام کی تعریف کی ہے، اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ کس طرح اُنھوں نے (شیفتہ نے) کوشش اور کاوش سے اس کلام کو جمع کیا ہے۔ اس تفصیل کو شیفتہ ہی کی زبانی بیان کرنا مناسب ہے۔ لکھتے ہیں:-

---

[1] شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۶

"فروغ بزم آفرینش، چراغ چشم دانش و بینش، دقیقہ کشائے مشکل کشادہ، خاطر آگاہ دل گزیدہ دور زماں حکیم محمد مومن خاں است کہ ہر حرفش گنجینۂ مضامین و معانی است و سخن غیر را با کلامش نسبت ہذیانات مسیلمہ و آیات قرآنی منگاد طبعش را چرخ چارمیں در زیر گام اولیں است تا رم بجولان توسن خیالش کہ فراز فلک تازد و پندارد کہ برزمین است، تعالی اللہ کہ دانش آئینی کہ شعر را پیرایۂ حکمت پوشانیدہ و مقصودش ازیں بلند آہنگی نہ بتراز بطلیموس گردیدن است۔ بل معنی ان من الشعر لحکمۃ را جلوۂ اظہار بخشیدن۔ حبذا سحر بیانی کہ نظم را ہم اثر افسون گردانیدہ و مدعایش نہ دکان ہاروتی چیدن است بلکہ مضمون ان من البیان لسحراً را بعرصۂ بروز کشیدن۔ اگر بقدح چنگ و رباب نغمہ سازی کند زہرہ بہ چرخ در آید و بے دانشی خمکدہ نشیناں سخن طرازی دید فلاطون را در خم نشستن دور از خرد نماند ؎

ابیات

سبحان اللہ چہ نکتہ دانی است — یک حرف طلسم صد معانی است
در سینۂ پاک او ز مضموں — گنجے و چہ گنج گنج قاروں
مضموں بہ سرش چو دُر بہ دریا — معنی بہ دلش چو مے بہ مینا
ہر غنچۂ او چمن بہار است — ہر گوہر فکرش آب دار است
رشح قلمش چو ابر آذار — گلشن گلشن و ماندہ گلزار
خرم گل گلشن معانی است — نوبادۂ باغ نکتہ دانی است
نفطش چو دم مسیح اعجاز — در قالب مردہ جاں دمد باز

اکنوں لفے ازیں دراز نفسی ہائے کوتاہ می آساید و بہ راستی ہائے دروغ نمانمی گراید و بر خود و بر دیگراں می بخشاید کہ مبادا ناپارسا گوہرے را دیگ حسد بہ جوش آید و راقم ایں تازہ نقوش را غبار آلودۂ تہمت و خویشتن را دامن معصیت نماید و لختے بہ وصف سخنش سخن می آراید۔ ابیات قصیدہ در فراوانی چوں ثوابت و در درخشانی چوں سیارہ۔ اشعار غزل ہم مانند ماہ فروغ نظر و ہم مانند مہتاب سوز نظارہ مطلعش ہم جلوہ مطلع آفتاب

عالم‌تاب، مصرعش بسان مصرع قامت یار بے جواب مُخمّس چوں پنجۂ خورشید فروزاں، مثمن ہم رنگ ہشتم باغ جناں، مسدساتش در شش جہت مشہور، رباعیاتش در چار دانگ عالم مشہور و مراعاتے کہ پئے تہذیبِ سخن افزودہ است گفتن را بیانش کالیوہ کند و شنیدن را شوریدہ کہ از روزِ آغازِ این فن نہ زبانے چنیں نغزہا گفتہ و نہ گوشے چنیں نوادر شنیدہ انموذج را مثلے چند بیاورم کہ علی سبیل الالتزام ہر جنس سخن وے از شعر پر کن تہی است سنگریزہ ہائے الفاظ غلط کہ پاستانی شعرا آں را با لعل و گوہر برابر شمردہ اند۔ باغیر نگیر در درہائے شاہوارش منسلک دغیر منتظم و دوشیزہائے فکرتش بہ زیور گوناگوں صنائع آراستہ و چناں بے تکلف کہ گوئی گویندہ را بلفظ پیرائے سرے نبودہ تنہا آرائش صورت معنی در نظر داشتہ طرز گزیں روشن متین الفاظ شگفتہ و دل پسند معانی تازہ و بلند چستی اسلوبش تراکیب شوکت کلمات تنومندی اندیشہ نزاکتِ خیال رشاقت مضمون رعایت مقتضائے مقام شوخی انداز جزالت عبارت الفاظ آشنا معنی بیگانہ تہ نشینی غور حسن ادا وقت فکرت اوست و براحتراز از استعارات بعید و تشابیہ رذیلہ و تصوراتِ رکیکہ و تدقیقات وہمی و پیچش گدازش و محسنات صورت آرایندہ و معنی خراب کنندہ و معانی ناآشنا و مضامین بیگانہ صرفِ ہمت اونا طورۂ اندیشہ اش از لباسِ عاریتی ہمہ تن عور ست و بہ تقاضائے یکتائی از متاع دست فرسودۂ روزگار نفور، اما از آنجا کہ زلیست آزادانہ گزیدہ است در بندِ بے تعلقیہا اُفتاد و نیز دل شورش پسند و خاطر ناآرمیدہ مجالے نہ دادہ از رام کردنِ وحشی غزالانِ شہری کہ رم کردن سبق بر آہوان صحرائی می برند فرصتش کو کہ صید وحشی مضامین بسمل را بہ دام آورد۔ صیادان کار آگاہ دانند کہ اگر نخچیر بہ دست آمدہ و شکار بہ دام افتادہ رم خورد۔ چہ خوں ہا کہ نباید خورد و چہ دل ہا کہ کباب نباید کرد، حسرتی را تماشائے ایں شگرف ماجرا دل بہ سوخت و ایں ستم طاقت گداز ناشکیبی آفریں را حوصلہ برنتافت در گرمِ آں شد کہ این گراں ارز جواہر را کہ چوں دُررِ منثور پراگندہ است بہ رشتہ کشد و منتہا بر خویشتن و شناسندگانِ سخن ہند۔ لاجرم با دل شرحہ شرحہ و جگر پارہ پارہ آبلہ پائیِ وادیٔ تردد و تلاش گشت۔ پس فراواں جستجو و ہزاراں تگاپو اندکے از بسیارے بہ دست آورد۔ حیف کہ بسیارے

تلف گردیدہ بیشتر کہ اندک ہم بہم رسید و چوں آں ابیات متفرق را بہ شیرازہ جمعیت آورد مشکل پسند خاطرش پارہ حذف فرمود و لختے افزود کہ باغباں را از رفتن خس و خاشاک ناگزیر است و مشاطۂ در آئین بستن نگار ناچار، ازیں گفت حاصل من آں ست کہ جز ایں ہرچہ بہ نامش نگرند از انش ندانند و آنچہ ایں وقت از خیالاتش یک جا شدہ قیاس شش ہزار بیت می داند، پس ہر نہالے کہ نخل بند فکرتش بہ پرورد بو کہ دریں چمن زار بہ جلوہ در آید چہ سرو مصاحبتِ گل و قمری ہمدمی بلبل را شاید و بہ زمانہ کہ تہذیب ایں دل فریب بستاں اتفاق افتاد از ہجرت ہزار و دو صد و چہل و سہ سال بر وفق ہلال گشتہ بود و سنین عمرش کہ چوں عمر خضر از حد شمارہ برکراں بادیہ بست و نہ رسیدہ و از بس کہ ایں دیوان بے نظیر است تاریخش دیوان بے نظیر است۔ الا اے سینہ ریشان سوختہ دل اگر یکے از شمار بروز سخت جانی ہا ازیں شمشیر ہندی کار بہ تمامی نکشند زود اکہ بہ آتش فارسی دود از نہاد برآورم سخن آفریں را نیائیش و سخن شناساں را مژدہ کہ بیا دری بخت و تنو مندی ہمت سعیٔ من مشکور آمد و لیوبہ کہ از دیرباز گرد دل می گشت بہ خوب ترین وجہی سرانجام یافت بنام ز دو نکو تر از ارژنگ مانی مرقعے آراستہ شد۔ دیدہ ورانِ تصویر یوسف را بہ ہیچانہ ہم نگیرند کہن ناسور تازہ جراحتِ تمنایاں را مرہمے گشت، مشک و نمک بہم سرشتہ تشنہ کامانِ دریا طلب را شربتے آمد قند با گلاب آمیختہ محفل دلبراں را گرمیٔ ہنگامہ افزوں شد۔ دل رفتگاں را سر رشتۂ آہ و نالہ بہ چنگ آمد۔ گویندگان قانونِ دل نوازی بہ دست افتادہ سخن را ساز و برگ دیگر گشت بد مستان آگہی را جام جہاں نمائے دانش بہ کف رسید جنوں زدگان را بہارے تازہ آمد۔ زہرہ نازید، عطارد بالید، الٰہی چناں کہ ایں آغاز بہ نکوئی انجامید، فرجام حسرتی نامہ سیاہم بخیر و سعادت باد۔[۵۱]

غرض شیفتہ نے مومن خاں اور اُن کے کلام کی اہمیت کو محسوس کیا اور کریم الدین نے اس کو پہلی بار ۱۸۴۶ء میں چھاپ کر شائع کیا۔ اس کے بعد اُس کے کئی اڈیشن نکلے۔ ۱۸۵۲ء میں اسی نسخے کو کنھیا لعل نے مجلس پریس دہلی میں چھاپا اور ۱۸۵۵ء میں انڈین پنچ پریس دہلی نے چھاپ کر

---

۵۱ کلیات مومن: ص ۲۔۷

شائع کیا۔۔۔ اس کا ایک اور اڈیشن ۱۸۷۲ء میں نول کشور نے لکھنؤ سے شائع کیا۔۔۔ اس نسخے کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ وہی نسخہ ہے جس کو عبدالرحمٰن آہی نے ترتیب دیا تھا اور مومن کی بیماری کے زمانے میں اُن سے خود تصحیح کرائی تھی۔۔۔ نول کشور نے اس کے بعد بھی اس کے کئی اڈیشن چھاپے۔ آخری بار اس کا چھٹا اڈیشن نول کشور پریس سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا یہی نسخہ آج کل رائج ہے۔ اس کے آخر میں "خاتمہ" کے عنوان سے عبدالرحمٰن آہی کی لکھی ہوئی وہ عبارت بھی شامل ہے جس میں اس نسخے کی ترتیب کے بارے میں تفصیلات درج ہیں۔ اصل عبارت یہاں نقل کی جاتی ہے :۔

"سپاس و منت مر خدائے راجل شانہ وعز اسمہ کو سخن بر زبان آفریدہ و گوش را ازاں بہرہ ور ساخت و ابر راگہرافشانی آموخت و صدف را بداں آبستنی کرد یعنی بے بضاعتاں از گراں مایگاں قدرے فزوں تر نواخت و عارض معنی را فروغ مہر جہاں تاب وار و نقاب الفاظ براں باز کشید و جمال مطلق را از بند مستوری بدر آورد و پردۂ بیگانگی درمیان انداخت یعنی فرقے نازک درمیانہ محرم و نامحرم نہاد ؎

ہر کس نشناسندۂ راز ست و گرنہ
ایں ہا ہمہ راز ست کہ معلوم عوام است

درود نامحدود بر روحِ مقدس سید الفصحا ابلغ البلغا خواجۂ عالم و عالمیاں سیدنا و مولانا و نبینا حضرت احمد مجتبےٰ محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ واصحبہ وسلم کہ بہ دولت گفتار بلاغت آثار سخن بہ پایۂ اعجاز رسید و بہ تاثیر کلام معجز نظامش کارے کہ از خنجر و سنان بر نیاید از زبان برآید نطق را آں مایۂ شرف و امتیاز شد کہ ملائکہ از بہر ادراک ایں فضیلت از لباس ملکی ورزی انسانی فرود آمدند و لسان عربی را مزیتے ورجحانے بہم رسید کہ لغت ناشناسان تازی زبان را شایستہ خطاب گویائی نہ دانستہ ملقب بہ عجم ساختند ؎

حق جلوہ گر طرز بیانِ محمد است
آرے کلام حق بہ زبانِ محمد است

اما بعد بندۂ ہیچ مداں عبدالرحمٰن خلف میر حسین تسکین غفر لہما سیئاتہما وتجاوز عن خطیاتہما بخدمت نکتہ سنجاں دقیقہ گزیں واداپرستان سخن آفریں التماس می دارد کہ ایں گل کدۂ معانی و گنج طلسم وجدانی و شبرۂ خانہ نورانی نسخۂ سحر حلال و مرقع تماثیل خیال و بیت الشرف مہر کمال صفۂ عرائس مضامین غرّا و روضۂ ریاحین اشعار مطرّا مصداق ان من البیان لسحرا ناسخ زبر اولیں دستور العمل آخریں مجموعۂ افکار نو آئین یعنی دیوان بلاغت آگین کہ ہمین نتیجۂ ایست از نتائج طبع بلند و نفائس فکر ارجمند مقنّن قواعد سخن وری و سخن دانی و مروج احکام نکتہ سنجی و نکتہ رانی، غواص قلزم تحقیق و شناور دریائے تدقیق، نبض شناسِ سخن و مزاج دانِ گفتار، عروج کوکبِ فن و فروغ طالع اشعار، نازک خیال، ژرف نگاہ، والا اندیشہ، بلند نظر، رنگین بیان، ادا فہم، دقت آفریں، معنی پرور، سقراط وقت، بقراطِ زماں، فلاطون عصر، جالینوس دوراں، اُستادی و مولائی، حکیم غفراں مآب مومن خاں متخلص بہ مومن سلک اللہ تعالیٰ بجبوحۃ الجنان نا ابدالابدین وافاض علیہ من شابیب الرحمۃ والرضوان فی اعلیٰ علیین، بس کہ وارستگی و آزادگی لازم طبیعت خان مبرور بود و از بس رو بتالیف و ترتیب کلام خویش، چہ ریختہ و چہ فارسی سرے نہ داشتند مدت ہا در زمانِ حیاتِ ایشاں از حلیۂ انتظام معطّل و از پیرایۂ ترتیب معرا بود عاقبت چوں تشنگی طلب ارباب ذوق بغایت رسید و غوغائے خریداراں از حد درگذشت۔ جناب مستطاب نواب عالی درجات قدسی صفات محمد مصطفےٰ خاں بہادر مدظلہ العالی بہ جمع و تدوینش ہمت عالی مصروف داشتند و در فراہم آوردن اصناف کلام ریختہ حضرت مصنّف دقیقہ از دقائق فرونہ گذاشتند۔ اما از آں جا کہ ہنوز آں قلزم فیض در روانی و آں ابر رحمت در گہر افشانی بود کلام بلاغت نظامش آناً فاناً متزائد و متضاعف و یوماً فیوماً متکاثر و متوافر می شد تا آں کہ بدر کمال را زماں خسوف فرا پیش آمد و آفتاب ہنر نزدیک لب بام رسید، یعنی جناب خانِ ممدوح را مرض الموت در گرفت و آثار مرگ از آغاز مرض بر ناصیۂ حال ایشاں آشکارا گشت چوں آں رواں فرسا زحمت قدرے دیر کشید بندہ کمینہ کہ از بدو صبا تا آخر عمر

حضرت سابق الوصف در کنار عاطفت ایشاں منظور نظر تربیت ماندہ و با وجود نسبت برادر زادگی علاقۂ پسر خواندگی باآں جناب ہم دارد فرصتِ وقت راکہ فی الحقیقت فرصت پروانۂ محفل در آخر شب و فرصتِ مرغِ چمن در آمد ز مہر بیش نبود غنیمت شمردم ونسخہ کہ بجہدِ بلیغ وسعیٔ موفور مطابق مجموعہ فراہم آوردۂ نواب معلی القاب ہا از بسیارے از غزلیات و رباعیات و مخمسات و مثنویات و افراد دیگر کہ بعد از ترتیب اولیں از صفحہ اندیشہ بر لوح بیان ریختہ بود بقلم خود نگاشتہ بودم۔ از اول تا آخر بامید تصحیح و تقریر بہ نہج ترتیب خویش پیش گاہِ مصنف علیہ الرحمۃ برخواندم۔ چنانچہ پارہ را بہ زیور اصلاح و حلیۂ تہذیب آراستند و پارہ بحال خود گزاشتند وسہ روز در وفات ایشاں باقی با ماندہ بود کہ دیوان تشریف تمامی در برکشید وایں مصرعہ از زبان حال خان مغفور تراوش یافت ؎ —— حوالت باخدا کردیم ورفتیم —— اکنون بجزم الیقین می تواں گفت کہ بعد ایں تدوین و ترتیب کہ مرۃ بعد اولیٰ وثانیاً بعد اُخری بر روئے کار آمدہ ہر کہ بیروں ازیں سفینہ بیتے از ابیات یا فردے از افراد از نتائج فکر صاحب دیوان نشان دہد۔ باید دانست کہ الحاقی بیش نیست یا خود از کلام او نیست یا مطروح و منسوخ سخن کوتاہ کتابے است عدیم النظیر ونسخہ ایست فقید البدل حروفش دلنشیں و معانیش نو آئیں۔ آنچہ در گفتار میر و میرزا جستہ جستہ تواں یافت ایں جا دستہ دستہ می تواں دہد منصفی باید صاحب ذوق و ماہر فن تا دارسد کہ سخنور شاعری نہ کردہ است بلکہ ساحری کردہ۔ پایۂ سخنش چنداں کہ کاوی بالا تریابی و در گفتارش چنداں کہ سنجی گراں تر بینی، شعر را بدیں جا کہ رسانیدہ و ریختہ را ایں مرتبہ کہ بخشیدہ۔ کتاب نیست گوہر نایاب است و دیوان نیست انتخاب است ؎

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ثنا وران سخن را مژدہ باد کہ دیوان مومن حلیۂ انطباع پوشید و جنس گراں ارز و خزفے چند بیارند و بضاعتے باخود برند و لختے بہ دیدنش بہ پردازند و صحائف پیشیناں را

از دست ببند از مدرسہ

ہاں اہل نظر وقت وداع دل و دیں است
یوسف بخریدہ آمدہ در قافلۂ ما

فقط الحمد للہ اولاً و آخراً و ظاہراً و باطناً والصلوۃ والسلام علی خیر خلقہ سیدنا محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین تمام شد[۱]

اس نسخے میں سب سے پہلے قصیدے ہیں پہلے قصیدے کا عنوان ہے "گہر ریزی خامہ لبتائش یگانہ ایست کہ دُر یک دانہ آب رسانندۂ اوست و گوہر شب چراغ آوردۂ او" — اور جیسا کہ اس کے عنوان سے ظاہر ہے یہ اللہ تعالیٰ کی حمد میں لکھا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس قصیدے کی خصوصیات واضح ہوتی ہیں ؎

والحمد لواہب العطایا	اس شور نے کیا مزا چکھایا
والشکر لصانع البرایا	جس نے ہمیں آدمی بنایا
احسان ہیں اُس کے کیا گرانبار	سر سبع شداد کا جھکایا
کیا پایۂ منت سلیماں	اک بات میں تخت پر بٹھایا
کیوں شکر کریں نہ آلِ داؤد	افسونِ شہنشہی سکھایا
وہ نیّرِ آسمانِ تقدیس	جاں سوز مناظر و مرایا
اب بھی نظر اس مجاز میں ہے	کیوں مہر نگاہ میں سمایا
نے عقل بسیط اُس کا پرتو	نے نورِ مجرد اُس کا سایا
سبحانک یا الٰہ عالم	عالم ترا عجز نے دکھایا
ہر جائے ہے تیرا جلوہ لیکن	دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا
یاں عقل ہے گم کہ بس تجھی کو	پایا ہر شے میں پر نہ پایا
اللہ ری تیری بے نیازی	یعقوب کو مدتوں رُلایا
یوسف سے عزیز کو کئی سال	زندانِ عزیز میں پھنسایا

---

[۱] کلیات مومن (نول کشور): ص ۴۲۳، ۴۲۲

یاں شعلے کو سرکشی کی کیا تاب
ابلیس کو خاک میں مِلا یا

تجکو ہی سزا ہے کبریائی
کرسی کا نہ عرش کا یہ پایا

مومن کو بقا ہے بعد دیدار
کیا مژدۂ جاں فزا سُنایا

گو وصف ہے یومنوں بالغیب
پر بندہ تو اس سے باز آیا

یاں تاب کسے کہ خاک خوں ہیں
بیتابیٔ شوق نے لٹایا

اللہ دکھا دے اپنا دیدار
اکشف بجمالک الغطایا

عظمت نے سجود کی فلک کو
گرد کرۂ زمیں پھرایا

وہ خاتم مرسلین محمدؐ
جس نے ہمیں شرک سے بچایا

جب بندہ ہے تیرا تو رہا کون
پھر لائق بندگی خدایا

اللہ مرے گناہ بے حد
وہ ہیں کہ شمار کو تھکایا

ہے عام خطاب یا عبادی
اس نے تو کچھ آسرا بندھایا

عالم میں نہ ہوئے گا وگرنہ
مجھ سا کوئی منکرا لسجایا

کیوں کر نہ ہو تیری آس تو نے
افلاک کو بے ستوں تھمایا

اس دام سے مجھ کو تو چھڑا دے
داؤد نے جس میں دل پھنسایا

دل زلف سے ہو رہا تو جانوں
زندانِ فرنگ سے چھڑایا

وہ عشق دے جس کا نام اسلام
وہ شیوہ نبی نے جو بتایا

وہ نعرۂ علم، کہ بجھائے
جس نے کہ اُس آگ کو بُجھایا

کچھ آب زنی کہے نہیں تو
سر نارِ جحیم نے اُٹھایا

مجھ کو بھی بچا لے جیسے تو نے
یوسف کو گناہ سے بچایا

وہ رخصت حال دے کہ جس نے
منصور کو دار پر چڑھایا

اس کا مرے دل پہ ایک پرتو
جس شعلے نے طور کو جلایا

مومن کہے کس سے حال آخر
ہے کون ترے سوا خدایا

دوسرا قصیدہ نعتیہ ہے اور "زمزمہ سنجی طبع بہ مضمون بادخوانی نسیم گلشن نبوت و شمال چمن رسالت" کے عنوان سے اس نسخے میں درج ہے۔ اس میں تین مطلعے ہیں اور ایک قطعہ ہے۔ یہ قصیدہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے ؎

چمن میں نغمہ بلبل ہے یوں طرب مانوس | کہ جیسے صبح شب ہجر نالہائے خروس
ہے اس طرح فرح انگیز کوکوئے قمری | کہ جیسے فوج مظفر میں شور و غلغل کوس
نوائے طوطی شکرفشاں کی لذت سے | سماع و رقص میں اہل مذاق جوں طاؤس
غبار صحن چمن کیمیائے عیش و نشاط | بہار لالہ و گل سیمیائے عرض شموس
صفا سے وہ در و دیوار باغ کا عالم | کہ آشیانے میں دشوار طائروں کا جلوس

اور ان اشعار پر خاتمہ ہوتا ہے ؎

اگر کہے مدد اے یا محمد عربی | صفیر مرگ ہو رستم کو نعرۂ لاکوس
مخالفوں کو ترے دو جہاں جہنم ہے | کہ تاب مہر سے جلتے رہے ہیں یاں بھی مجوس

خدا کے واسطے گرم دعا ہو مومن بس | کہ منتظر ہے ازل سے اجابت فردوس
ہے جب تلک گل و برقسمت نہال و شجر | ہے جب تلک دل لالہ میں داغ حسرت دوس
مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخل مراد | رہین داغ عدو کا رہے دل مایوس

تیسرے قصیدے کا عنوان ہے "بیعت معانی بردست عبارت سراپا اعجاز بفیض مدیح اولیں دستور صداقت طراز" اور اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی منقبت کی گئی ہے۔ قصیدے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ؎

کوئی اس دور میں جیے کیوں کر | ملک الموت ہے ہر ایک بشر
دادخواہوں کے شور سے دیکھو | چونک پڑتا ہے فتنۂ محشر
آئینے نے بھی اس زمانے میں | تیغ کے سے نکالے ہیں جوہر
آتش لعل سینہ جاں سوز | آب نیساں ہے ایک بدگوہر
جس کو دیکھو سومایۂ بیداد | کیا ہوا گر نہیں ہے سیمیں بر

ذکر انساں سے دیو مجنوں ہو | آدمی سے پری کو آئے حذر
ہے پئے اشتیاق ویرانی | شاہ فرہاد و بے ستوں کشور
نہ امیروں کو پائے بندئ عدل | نہ رعایا مطیع و فرماں بر

اور آخر میں یہ اشعار ملتے ہیں ؎

اے مسیح دم رواں پرور | زندگی بخش دین پیغمبر ؐ
گرمئ التفات سے تیری | خشک ہو عاصیوں کا دامن تر
ہے سراپا تو مہرۂ تریاق | تجھ کو کیا نیش مار سے ہو ضرر
ہے ترے خار جیب کا قصّہ | شریانِ حسود کو نشتر
تو وہ سلطاں کہ بارگہ کا تری | پشت کا شانہ ہے فلک منظر
قصر جاہ و جلال میں تیرے | فخر کیواں ہے پاسبانئ در

مومن اب کر دعا کہ سنتا ہے | تیری تقریر گوش دل سے اثر
جب تلک گردشِ سپہر سے ہے | انتساب بِ حدوث نیکی و شر
تیرے احباب نیک بخت مدام | تیرے اعدا ہمیشہ فال اختر
جب تک اس تیرہ خاکداں میں ہے | کوئی گم کردہ رہ کوئی رہبر
تیرے حاسد ہوں غول صحرائی | تیرے پیرو ہوں پیشوائے خضر
نیک خواہ اور خوبئ دارین | بد سگال اب سے خوار تا محشر

چوتھا قصیدہ جس کا عنوان ہے "خطبہ خوانی دل وزباں بامید ثواب باثبات خلافت امیر امیر المومنین عمرؓ بن الخطاب" اور اس میں حضرت عمرؓ کی منقبت ہے۔ یہ قصیدہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے ؎

جو اس کی زلف کو دوں اپنے عقدۂ مشکل | تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل
تم اور حسرتِ ناز آہ کیا علاج کروں | میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
امیدِ حورِ بہشتی پہ لاؤں کیا ایماں | کہ برہمن ہوں تو زرد کردۂ بتانِ چگل

وہ شوخ برقِ عناں خاک میں ملا دیوے — اگر بہ حسرت دُنبالہ گردی محمل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا — غضب ہے شوقِ رسائی و دوری منزل
میں کیونکہ مطربۂ مہر وش کو رام کروں — چلے نہ زہرہ پہ زنہار جادوئے بابل
مثال دیتے ہیں روزِ فراق سے کیا دور — بلائیں ہوں شبِ یلدا میں چرخ سے نازل

اور مندرجہ ذیل دعائیہ اشعار پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے ؂

کلام حد سے زیادہ سزا نہیں مومن — مبادا طعنۂ طولِ مقال دے مبطل
خموش تابہ کجا لاف ہائے بے معنےٰ — خموش تا بہ کجا ترہات لاطائل
دعا پہ ختم سخن کر کہ شور آمیں سے — اُٹھا بٹھائیں گے مُردوں کو عرش کے حامل
نصیب رو رجزا جب کرے نزول جلال — زمیں پہ چرخ سے تخت شہنشہ عادل
موافقوں کو بہشت و ترقیِ درجات — مخالفوں کو جہنم کا طبقۂ سافل

پانچواں قصیدہ حضرت عثمانؓ کی شان میں ہے۔ اس کا عنوان ہے ”راجبہ راجبہ چوں مہرو ماہ نورانیست بہانا بفیض مدیح ذوالنورین دُر افشانی است“ اور یہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے ؂

ہے یہی حسرتِ دیدار تو مرنا دُشوار — دم شماری کی مری عمر ہے تا روزِ شمار
بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ — رازِ دل غیر سے کس طرح میں کرتا اظہار
دور اتنے رہے محرومیِ قسمت سے کہ ہم — سمجھے ہندی صنموں کو بھی بتانِ فرخار
دیکھ اتنا میں ترے عشق میں رویا کہ ہوئی — جلوہ گر مہر گیا دشت سے لے تا کہسار
بے سبب قتل سے آیا نظر انجام اپنا — سُرمۂ دیدۂ دشمن ہے مری خاکِ مزار

اور مندرجہ ذیل دعائیہ اشعار پر ختم ہوتا ہے ؂

مومن اے ہرزہ درا نالہ و افغاں سے حصول — ذکر کیا راہ پر آئے فلکِ ناہنجار
بس بس آہنگ دعا سنجیِ ممدوح کہ ہے — متصل عرشِ معلےٰ سے نزولِ آثار
جب تلک گردشِ افلاک سے اس عالم میں — ایک کے دل کو قلق ایک کے دل کو ہے قرار
تیرے احباب ہیں تکیہ زنِ مسندِ عیش — تیرے حاسد ہوں آوارۂ دشتِ ادبار

چھٹے قصیدے کا عنوان ہے "تیزی زبان کلک گوہر نثار برہان ساطع حقیقت امامت خدا وندِ ذوالفقار" اور اس میں حضرت علی مرتضیٰؓ کی منقبت ہے۔ یہ قصیدہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے

کٹتی ہے میری تیغِ زبان سے زبانِ تیغ — کیوں کر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ
میرے نفس کی دیکھ کے معجز نمائیاں — کیا دور ہے کہ دم نہ رہے درمیانِ تیغ
فردوسی ایک خارجنانِ بیان تھا — گل ریز میرے دم سے ہوئی داستانِ تیغ
حسّاد سر سے پاؤں تلک خوں میں ڈوب جائیں — جوہر اگر دکھاؤں میں اپنے لسانِ تیغ
میدانِ کشت وخوں میں مرا دست بے سوار — جاوے عناں کشیدہ تو ہو ہم عنانِ تیغ
یہ دل خراشیاں مرے اشعار شوخ کی — سینے پہ منکروں کے ہیں لاکھوں نشانِ تیغ

اور ان اشعار پر ختم ہوتا ہے ۔

ہر بار کیوں نہ ہو تری تلوار تیز تر — دشمن کی ہے قساوتِ قلبی فسانِ تیغ
سیف وقلم ہیں دونوں ستون کاخِ دین کے — حیراں ہوں باب علم کہوں یا جہانِ تیغ
رنگین بیاں ہو گر ترے غزوہ کے ذکر میں — پڑھنے لگے درودِ لب خوں چکانِ تیغ
غازی بھی تو، شہید بھی تو تیرے دم سے ہے — سرگرم جلوہ فصل بہار و خزانِ تیغ
زہراب دیں اگر ترے دولت کے دور میں — عمر خضر ہو زندگی جاودانِ تیغ
گرم دعائے شاہ ہو مومنؔ کہ کب سے ہے — آہیں سرا زبان اجابت فشان تیغ
روز نبرد حادثہ ریز شکست و فتح — جب تک کہ ہے نشیب و فراز جہانِ تیغ
تاج ظفر ہو زیب دہ فرق دوستاں — اعدا کا سر رہے تہہ بارِ گرانِ تیغ

ساتواں قصیدہ حضرت امام حسنؓ کی شان میں ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ۔

چاہنا خلق کو صہبا وصنم سے محروم — ایسی نیت پہ بہشت آپ کو واعظ معلوم
محتسب نے خم مے چھین لیا یا قسمت — ایسے کمبخت کو ہاتھ آئے ہمارا مقسوم

اور اختتام اس طرح ہوتا ہے ۔

مومن آہنگ دعا ختم سخن کا ہے یہ وقت — آپ تو آپ ہیں دانائے قوانین و رسوم
تیرے احباب مطاع اور توابع رہیں شاد — تیرے حسّاد خراب اور ترے اعدا مغموم

آٹھویں قصیدے کا کوئی عنوان نہیں ہے۔ اس میں کسی ممدوح کا نام بھی نہیں آتا۔ نول کشور کے اس نسخے میں یہ نوٹ درج ہے "غالباً یہ قصیدہ مدح حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ میں لکھا ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ قیاس یہ ہے کہ یہ قصیدہ وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ والئ ریاست ٹونک کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ قصیدے کا آغاز ان اشعار سے ہوتا ہے ؎

یاد ایام عشرت فانی ۔۔۔ نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں ۔۔۔ کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں رشکِ آسماں سے ملی ۔۔۔ ہائے کیسی بلند ایوانی
کر دیا گردشِ سپہر نے حیف ۔۔۔ برج خاکی مسیر کیوانی
ایسی وحشت سرا میں آئے کون ۔۔۔ بے دری کر رہی ہے دربانی
نکتہ سنجوں سے جی میں ہے پوچھوں ۔۔۔ کہ میں شہری ہوں یا بیابانی

اور قصیدے کے خاتمے پر یہ اشعار ملتے ہیں ؎

مومن اب ختم کر دعا پہ سخن ۔۔۔ تا کجا لاف ہائے طولانی
جب تلک باعثِ نشاط و ملال ۔۔۔ ہے وصال و فراق جانانی
تیرے حساد و رنج گوناگوں ۔۔۔ تیرے احباب اور تن آسانی

تیرا اقبال روز افزوں ہو
جیسے مومن پہ لطفِ رحمانی

نواں قصیدہ مہاراجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی تعریف میں ہے۔ یہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری ۔۔۔ کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری
چشم ستارۂ سحر یوں ہے زحل سے سرمہ سا ۔۔۔ دشنۂ ترک چرخ سے تیز نگاہ مشتری
خط بیاض صبح وہ شعلہ دم اژدر سفید ۔۔۔ عکس ہے جس کے آب ہو آئینۂ سکندری
یاد ہوا ہے کوئی یار خانہ خراب دجاں گداز ۔۔۔ خفیہ شمال میں سموم باد صبا میں صرصری

اور آخر میں ان دعائیہ اشعار پر اس کا اختتام ہوتا ہے ؎

ختم سخن دعا پہ ہو تا نہ اثر میں ہو کلام — آپ یہ قصۂ مختصر ختم ہوئی سخنوری
تا کہ ہے بیت ہفتمیں قوت لوئی فلک — تا کہ نہم میں ہے فرح بہر عروس خاوری
تجکو نصیب دولت صحبت نوجوان نگار — تجکو ہمیشہ عشرت تازہ عروس دلبری
تا رہے الفت آزما ناز و غرور دلربا — تا رہے آرزو فزا طرز ادائے دلبری
جور پہ تیری جاں نثار غارتیانِ دین و دل — وصل سے تیرے کامیاب لب شکران عسکری
تا کہ ہو نو بہار میں قسمت رند مشربان — مستی و بے حجابی و نغمہ زنی و مے خوری
بہرِ حسود جام زہر ساغر مے ترے لئے — تا نہ ہو ناگوار طبع تلخی بادہ شکری
رقص و سرود سے تری انجمن نشاط گرم — شعلۂ دود و عارض روشن و زلفِ عنبری
سوئے ہزار گوش جاں روئے زمین زر فشاں — باغ میں جب تک اس طرح جلوہ کرے گل تری
تجھ کو نصیب بزم میں داد دہی صلہ دہی — مجکو مبارک ایک سو مدح گری گداگری

اس طرح اس کلیات میں مومن کے صرف نو قصیدے شامل ہیں۔ ان میں سے، سات کے موضوعات دینی ہیں۔ صرف دو قصیدے دنیاوی شخصیتوں کے بارے میں ہیں۔ ان میں بھی مومن نے قصیدے کا روایتی انداز اختیار نہیں کیا ہے۔ برخلاف اس کے ایسی باتیں زیادہ کہی ہیں جن سے اُن کے مخصوص مزاج پر روشنی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قصیدے عام قصیدوں کے مقابلے میں مختلف نظر آتے ہیں۔ اور ان میں ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا ہے۔ بقول ضیاء احمد بدایونی "مومن سے پہلے جس قدر شعرا گزرے ہیں، قصیدے میں (باستثنائے سودا) مومن کا کوئی ہمسر نہیں۔ اگرچہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے تاہم زور اور ندرت میں اُن کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ اُن کی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے اور اُس کے ساتھ ہی ہر قصیدے میں تعلی اور شکایت زمانہ کہ سنت الشعراء ہے اس شکوہ اور زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دھوکا ہوتا ہے تخلیص یا گریز البتہ کمزور ہوتا ہے۔ کلام میں عقیدت کی جھلک اکثر نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ کہیں کہیں مذہبی تعریض بھی کر جاتے ہیں۔ قصائد میں علمی مضامین بہ کثرت لاتے

ہیں اور چونکہ خود نجوم و رمل و طب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اس لئے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اغلاق بڑھا دیتے ہیں کہیں کہیں تلمیحات اور آیات و احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے اور عربی جملوں کو تو اس خوبی سے تضمین کر جاتے ہیں کہ انگوٹھی میں نگینے کا گمان ہوتا ہے[۵] قصیدوں کے جو اقتباسات اوپر پیش کئے گئے ہیں، اُن سے یہ خصوصیات واضح ہوتی ہیں۔

قصیدوں کے بعد اس کلیات میں غزلوں کا حصّہ ہے۔ اور اس حصّے میں مومن کی کل دو سو اٹھارہ (۲۱۸) غزلیں اور کچھ متفرق اشعار (فردیات) شامل ہیں۔ ان غزلوں کے صرف مطلعے یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ کون کون سی غزلیں اس کلیات میں شامل ہیں ؎

نہ کیوں کر مطلع دیوان ہو مطلع مہر وحدت کا — کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرعِ انگشتِ شہادت کا

آگ اشکِ گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا — آنسو جو اُس نے پونچھے شب اور ہاتھ جل گیا

لگے خدنگ جب اُس نالہ سحر کا سا — فلک کا حال نہ ہو کیا مرے جگر کا سا

گر وہاں بھی یہ خموشی اثر افغاں ہوگا — حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

بے سبب کیوں کہ لبِ زخم پہ افغاں ہوگا — شورِ محشر سے بھرا اُس کا نمک داں ہوگا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا — دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

موئے نہ عشق میں جب تک وہ مہرباں نہ ہوا — بلائے جاں ہے وہ دل جو بلائے جاں نہ ہوا

سم کھا موئے تو دردِ دلِ زار کم ہوا — بارے کچھ اس دوا سے تو آزار کم ہوا

۵؎ ضیاء احمد بدایونی: مجموعہ قصائد مومن: (مقدمہ)

گر غیر کے گھر سے نہ دل آرام نکلتا
دم کاہے کو یوں اے دل ناکام نکلتا

وصل کی شب شام سے میں سو گیا
جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

رات کس کس طرح کہا نہ رہا
نہ رہا پر وہ مہ لقا نہ رہا

ٹانکنے چاک گریباں کو تو ہر بار لگا
ہاتھ کٹواؤں جو ناصح رہے اب تار لگا

شب غم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا
دم رکے تھا سینے میں کمبخت جی گھبرائے تھا

ہماری جان تجھ بن شب دل ناکام لیتا تھا
خدنگِ آہ سے تیر قضا کا کام لیتا تھا

وقت جوشِ بحر گریہ میں جو گرم نالہ تھا
حلقہ گرداب رشکِ شعلۂ جوالہ تھا

میرے کوچے میں عدو مضطر و ناشاد رہا
شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

میں نے تم کو دل دیا تم نے مجھے رسوا کیا
میں نے تم سے کیا کیا اور تم نے مجھ سے کیا کیا

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہو گا کسی کا

محشر میں پاس کیوں دمِ فریاد آ گیا
رحم اس نے کب کیا تھا کہ اب یاد آ گیا

وعدۂ وصلت سے دل ہو شاد کیا　　تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

دل بیتاب کو گر باندھ کر رکھوں نہ ٹھہرے گا　　سوا اس ور کی زنجیروں کے یہ مجنوں نہ ٹھہرے گا

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا　　میں الزام اُن کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

روزِ جزا جو قاتلِ دل جُو خطاب تھا　　میرا سوال ہی مرے خوں کا جواب تھا

مجکو تیرے عتاب نے مارا　　یا مرے اضطراب نے مارا

دیکھ لو شوقِ ناتمام مرا　　غیر سے جائے ہے پیام مرا

ناز بے جا سے سوا شرم کے حاصل نہ ہوا　　غیر پر ظلم کئے میرے مقابل نہ ہوا

فراقِ غیر میں ہے بیقراری یاب اپنا سا　　بنایا تو نے اس کو بھی دلِ بے تاب اپنا سا

کیا مرتے دم کے لطف میں پنہاں ستم نہ تھا　　وہ دیکھتے تھے سانس کو اور مجھ میں دم نہ تھا

غیر کو سینہ کھلے سے سیمبر دکھلا دیا　　تم نے کیا کچھ کس کو اتنی بات پر دکھلا دیا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا　　میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

کہہ رہا ہے کون کس سے بے شکیبائی ملا　　مجھ کو قسمت سے نصیحت گر بھی سودائی ملا

ہم رنگ لاغری سے ہوں گُل کی شمیم کا — طوفانِ باد ہے مجھے جھونکا نسیم کا

جوں نکہتِ گُل جنبش ہے جی کا نکل جانا — اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

کیا قعرِ طعن بوالہوس بے ادب ہوا — جرمِ رقیب قتل کا میرے سبب ہوا

اے آرزوئے قتل ذرا دل کو تھامنا — مشکل پڑا مرا مرے قاتل کو تھامنا

لے اُڑی لاشہ ہوا لاغر بس تن ہو گیا — ذرۂ ریگِ بیاباں اپنا مدفن ہو گیا

میں ہلاکِ اشتیاقِ طرزِ کشتن ہو گیا — دوستی کیا کی کہ اپنا آپ دشمن ہو گیا

قابو میں نہیں ہے دلِ کم حوصلہ اپنا — اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا

رازِ نہاں زبانِ اغیار تک نہ پہنچا — کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

وعدے کی جو ساعت دمِ کُشتن ہے ہمارا — جو دوست ہمارا ہے سو دشمن ہے ہمارا

ہم سری اُس زلف سے اب یہ بھی ایسا ہو گیا — تو مرے بختِ سیہ کو اور سودا ہو گیا

میں تو دیوانہ تھا اُس کی عقل کو کیا ہو گیا — قیس کہتا ہے مجھے ناصح کو سودا ہو گیا

کیا رشکِ غیر تھا کہ تحمّل نہ ہو سکا — میں جان کر حریفِ تغافل نہ ہو سکا

شوخ کہتا ہے بے حیا جانا　　دیکھو دشمن نے تم کو کیا جانا

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آگیا　　ناصح تو میری جان نہ لے دل گیا، گیا

وہ ہنسے سن کے نالۂ بلبل کا　　مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

اشک دادو نہ اثر باعثِ صد جوش ہوا　　ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا

چلون کے بدلے مجھ کو زمین پر گرا دیا　　اُس شوخِ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا

دِل قابل محبتِ جاناں نہیں رہا　　وہ ولولہ وہ جوش وہ طغیاں نہیں رہا

کیا رم نہ کروگے اگر ابرام نہ ہوگا　　اُلزام سے حاصل بجز الزام نہ ہوگا

گر میں کم بخت وہ بخیل ہوا　　مجھ کو چھیڑ آسماں ذلیل ہوا

غصہ بیگانہ وار ہونا تھا　　بس یہی تجھ سے یار ہونا تھا

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا　　رنج راحت فزا نہیں ہوتا

کیا ہوا ہو اگر وہ بعدِ امتحاں اپنا　　بے گنہ سزا پائے اب وہ دل کہاں اپنا

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا　　مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے اسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا

گئے وہ خواب سے اُٹھ غیر کے گھر آخرِ شب
اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخرِ شب

قتلِ عدو میں عذرِ نزاکت گراں ہے اب
مجھ میں ستم اُٹھانے کی طاقت کہاں ہے اب

تم بھی رہنے لگے خفا صاحب
کہیں سایہ مرا پڑا صاحب

تھی وصل میں بھی فکرِ جدائی تمام شب
وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

یاں سے کیا دنیا سے اُٹھ جاؤں اگر کہتے ہیں آپ
رک گیا میرا ابھی دم کیوں اس قدر رکتے ہیں آپ

کیا دیکھتا خوشی سے ہے غیروں کے گھر بسنت
پھولی ہے یاں کچھ اور ہی اے بے خبر بسنت

سودا تھا بلا کے جوش پر رات
بستر پہ بچھائے نیشتر رات

کرتے ہیں عدو وصل میں ہجراں کی شکایت
تھی بارے موثر غمِ ہجراں کی شکایت

اظہارِ شوق شکوہ اثر اُس سے تھا عبث
یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

ہو نہ بے تاب ادا تمھاری آج
ناز کرتی ہے بے قراری آج

پنجۂ شانہ سے تو زلفِ گرہ گیر نہ کھینچ
دلِ دیوانہ کو مت چھیڑ یہ زنجیر نہ کھینچ

گر چھُٹے اور یہ رہی یار کی طرح — ہم بھی نہیں گے بوالہوس اغیار کی طرح

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح — اٹکا کہیں جو آپ کا دِل بھی مری طرح

عدو نے دیکھے کہاں اشکِ چشمِ گریاں سُرخ — نہ آستیں ہے نہ رومال ہے نہ داماں سُرخ

ہم دامِ محبت سے اِدھر چھوٹے اُدھر بند — پرواز بھی کی آہ تو جوں طائرِ پربند

غُربت میں گل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد — جیسے قفس میں مُرغِ چمن کو چمن کی یاد

نامہ رونے میں جو لکھا تو یہ بھیگا کاغذ — کہ بنا ہم کو مگر صفحۂ دریا کاغذ

نہ کیوں کر بس مُوا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر — وہ تیرا مُسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

اے تُند خو آ جا کہیں تیغا کمر سے باندھ کر — کن مُدّتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

جانتے تھے صبح رہ گئے بے تاب دیکھ کر — طالع ہمارے چونک پڑے خواب دیکھ کر

یاد اس کی گرمیٔ صحبت دلاتی ہے بہار — آتشِ گُل سے مرا سینہ جلاتی ہے بہار

بے مُروّت ناتواں میں ہنس دے روتا دیکھ کر — دل دیا میں نے اُسے کیا جانیے کیا دیکھ کر

مومن خدا کے واسطے ایسا مکاں نہ چھوڑ — دوزخ میں ڈال خُلد کو کوئے بتاں نہ چھوڑ

ہے چشم بند تو بھی ہیں آنسو رواں ہنوز　　جی سرد ہو گیا ہے و لے دل تپاں ہنوز

ہجراں کا شکوہ لب تلک آیا نہیں ہنوز　　لطفِ وصال غیر نے پایا نہیں ہنوز

لب پہ دم آیا و لے نالہ نہیں ہے ہنوز　　نغمۂ غم بھی ترا پردہ نشیں ہے ہنوز

یوں ہے شعاعِ داغ مرے دل کے آس پاس　　ہالہ ہو جس طرح مہ کامل کے آس پاس

کھا گیا جی غمِ نہاں افسوس　　گھل گئی غم کے مارے جاں افسوس

کل دیکھ کے وہ عذارِ آتش　　کیا کیا ہی جلی ہے یار آتش

کہاں نیند تجھ بن مگر آئے غش　　تو اک صورتِ خواب دکھلائے غش

روز ہوتا ہے بیاں غیر کا اپنا اخلاص　　چشم بد دور تمھیں ہم سے بھی ہے کیا اخلاص

بے صبر کو کہاں تپِ داغِ جگر سے فیض　　گُل چیں کو کب ہوا شجرِ بارور سے فیض

ہاں مان کہا بیچ بوئے زلفِ دوتا قرض　　جاں اب تو نہیں حشر کے دن دیں گے صبا قرض

ہر غنچہ لب سے عشق کا اظہار ہے غلط　　اس مبحثِ صحیح کی تکرار ہے غلط

ہاں تو کیوں کر نہ کرے ترکِ بتاں اے واعظ　　ایسی حوریں تری قسمت میں کہاں اے واعظ

کس ضبط پر شرار فشاں ہے فغانِ شمع — اک برق تھی جو لال نہ ہوتی زبانِ شمع

محفل فروز تھی تپِ تابِ نہانِ شمع — پروانہ جل گیا کہ نہیں رازدانِ شمع

مت کہہ شبِ وصال کہ ٹھنڈا نہ کر چراغ — ظالم جلا ہے میری طرح عمر بھر چراغ

گلشن میں لالہ ہیں ہوں کہ ہے دل میں جائے داغ — اپنے تو دل نشیں نہیں کچھ بھی سوائے داغ

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف — دیکھے ہے مجھ کو دیکھ کے اغیار کی طرف

وہ جو زندگی میں نصیب تھا وہی بعدِ مرگ رہا قلق — یہ قلق ہے کیا کہ ہے ستم گئی جان پر نہ گیا قلق

قہر ہے، موت ہے، قضا ہے عشق — سچ تو یوں ہے بُری بلا ہے عشق

امتحاں کے لئے جفا کب تک — التفاتِ ستم نما کب تک

ہم ہیں اور نزع شبِ ہجر میں جاں ہونے تک — صبر آتا ہے کوئی تاب و تواں ہونے تک

پھر نہ چھوڑوں گر وہ کردے چاک جیبِ جاں تلک — ہاتھ پہنچا چاہیئے اُس شوخ کے داماں تلک

لگائی آہ نے غیروں کے گھر آگ — ہوئے کیا کیا وہ اتنی بات پر آگ

مجھ پر بھی تجھ کو رحم نہیں اے کرخت دل — کم ہوئے گا جہاں میں تجھ سا بھی سخت دل

مژدۂ عشقِ ستیزہ کار ہے دل ملک الموت سے دوچار ہے دِل

کیا کروں، کیونکر رکوں ناصح رُکا جاتا ہے دل بیش کیا چلتی ہے اس سے جس پہ آجاتا ہے دِل

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

سُرمہ ہیں اس چشمِ جادو فن میں ہم خاک ڈالیں دیدۂ دشمن میں ہم

پائے تھے چین کب غم دوری سے گھر میں ہم راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم

غمِ ابرو میں بھرتے ہیں دمِ شمشیر اکثر ہم کیا کرتے ہیں اپنے قتل کی تدبیر اکثر ہم

کب چھوڑتے ہیں اُس ستم ایجاد کے قدم سر ہے ہمارا اور ہیں جلّاد کے قدم

ٹھانی تھی دِل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

جو پہلے دن ہی سے دِل کا کہا نہ کرتے ہم تو اب یہ لوگوں کی باتیں سُنا نہ کرتے ہم

اُلجھے نہ زلف سے جو پریشانیوں میں ہم کرتے ہیں اُس پہ ناز ادا دانیوں میں ہم

دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم کیا جانے کسے جلائیں گے ہم

اب اور سے لو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم

صفحۂ جیحوں پر جو کبھی ہم سوزشِ دل لکھواتے ہیں ــــ سارے حباب لبِ دریا تبخالے سے بن جاتے ہیں

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں ــــ کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں

لاش پر آنے کی شہرت شبِ غم دیتے ہیں ــــ اے پری ہم ملک الموت کو دم دیتے ہیں

ناصحِ ناداں یہ دانائی نہیں ــــ دل کو سمجھاؤں میں سودائی نہیں

کہے ہے چھیڑنے کو میرے گر سب ہوں مرے بس میں ــــ نہ دو دل ملنے کسی معشوق اور عاشق کو آپس میں

چین اتنا ہی نہیں سوتے ہیں جس پہلو ہمیں ــــ اضطراب دل غرض جینے نہ دے گا تو ہمیں

ہو گئی گھر میں خبر ہے منع واں جانا ہمیں ــــ وہ بھی رسوا ہو خدا جس نے کیا رسوا ہمیں

غیر بے مروت ہے آنکھ وہ دکھا دیکھیں ــــ زہر چشمہ دکھلائیں پھر ذرا مزہ دیکھیں

بزم میں اُس کی بیانِ دردِ غم کیونکر کریں ــــ وہ خفا جس بات سے ہو وہ ہم کیونکر کریں

نہ تن ہی کے ترے بسمل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں ــــ ہے پاش پاش جگر دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

ہے جلوہ ریز نورِ نظر گردِ راہ میں ــــ آنکھیں ہیں کس کی فرش تری جلوہ گاہ میں

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خواب ناز میں ــــ ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

جیبِ درست لائقِ لطف و کرم نہیں　　ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

غنچہ ساں خاموش بیٹھے ہیں سخن کی فکر میں　　قافیہ کیا تنگ ہے وصفِ دہن کی فکر میں

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہے فراقِ یار میں　　کاہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

کون کہتا ہے دمِ عشق عدو بھرتے ہیں　　کہ ہوا باندھنے کو آہ کبھو بھرتے ہیں

مانے نہ مانے منعِ تپش ہائے دل کروں　　میں غیر تو نہیں کہ تماشائے دل کروں

بے مزا ہو کر نمک کو بے وفا کہنے کو ہیں　　کھل گئے زخموں کے منہ کس کے برا کہنے کو ہیں

وہ علی الرغمِ عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں　　ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

صورت دکھائیے جو کبھو جاکے خواب میں　　بے دید آنکھ کھول دے جھنجلا کے خواب میں

سوزِ دل کے ہاتھ سے ڈھونڈوں جو مَن آب میں　　ہو وے ہر ہر قطرہ داغ افزائے گلخن آب میں

دکھاتے آئینہ ہو اور مجھ میں جان نہیں　　کہو گے پھر بھی کہ میں تجھ سا بدگمان نہیں

ہجراں میں بھی زیست کیوں نہ چاہوں　　جاں دادۂ شوخِ بے وفا ہوں

شکوہ نہیں غیر کے ستم کا　　انصاف کرو تو میں بھی کیا ہوں

ہر دم رہینِ کشمکشِ دستِ یار ہیں
چلون کے بند کس کے گریباں کے تار ہیں

شب وصل اُس کے تغافل کی زبس تاب نہیں
تلخیٔ مرگ ہے آنکھوں میں شکرِ خواب نہیں

آہِ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں
جو فتنہ خیز اب ہے زمین آسمان نہیں

تاثیر صبر میں نہ اثر اضطراب میں
بے چارگی سے جان پڑی کس عذاب میں

جلتا ہوں ہجر شاہد و یادِ شراب میں
شوقِ شراب نے مجھے ڈالا عذاب میں

بیم بیداد و ستم کچھ دلِ مضطر میں نہیں
یوں ہوں نالاں کہ وہ گویا صفِ محشر میں نہیں

سرمہ گیں آنکھ سے نامے کو لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے مِلاتے کیوں ہو

اگر زنجیر کش سوئے بیاباں اپنی وحشت ہو
تو پائے قیس کا ہر ایک چھالا چشمِ حیرت ہو

کیسے مجھ سے بگڑے تم اللہ اکبر رات کو
ذبح کرتے ہی جو ہوتا پاس خنجر رات کو

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

یہ قدرت ضعف میں بھی ہے فغاں کو
کہ دے پٹکے زمیں پر آسماں کو

ایسے سے کیا درستیٔ پیمان بستہ ہو
جو قول دے تو رنگِ حنا کا شکستہ ہو

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو / وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن گئے ہو / جوں سوزِ دل کہا ہے تم آگ بن گئے ہو

پونچھنے سے ہمدمو! دریا ہے کیونکر خشک ہو / سب کے دامن تر ہوں پر کب دیدۂ تر خشک ہو

اے ناصحو! آ ہی گیا وہ فتنۂ ایام لو / ہم کو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو

یہ مایوسی دل و جاں نالۂ شبگیر تو کھینچو / کھینچے گا اُس کا دل آہِ فسوں تاثیر تو کھینچو

اعجازِ جاں وہی ہے ہمارے کلام کو / زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو / عُذر کچھ چاہیے ستانے کو

صد حیف سینہ سوز فغاں کا اگر نہ ہو / یاں جان پر بنے ترے دل پر اثر نہ ہو

خالی ہوائے فتنہ سے گاہے جہاں نہ ہو / اس دم قیامت آئے اگر آسماں نہ ہو

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ / اے شبِ ہجر تیرا کالا منہ

جو تیرے منہ سے نہ ہو شرمسار آئینہ / تو رُخ کرے سوئے آئینہ دار آئینہ

سیماب ہے پہلو میں مرے دل تو نہیں یہ / اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ

دل بستگی سہی ہے کسی زلفِ دوتا کے ساتھ
پالا پڑا ہے ہم کو خدا کس بلا کے ساتھ

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

تکلیف سے جوں پنجۂ گُل لال ہوا ہاتھ
نازک ہے وہ بس چھوڑ دے اے رنگِ حنا ہاتھ

ہم ہیں فلک نگہ کی بھی طاقت نہ چھوڑ دیکھ
دستِ مژہ سے پنجۂ خور کو مروڑ دیکھ

منظور نظرِ غیر سہی اب ہمیں کیا ہے
بے دید تری آنکھ سے دِل پہلے پھرا ہے

خوشی نہ ہو مجھے کیوں کر قضا کے آنے کی
خبر ہے لاش پہ اُس بے وفا کے آنے کی

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے
پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

تیری پابوسی سے اپنی خاک بھی مایوس ہے
نقشِ پا پر نقشِ پا ظالم کفِ افسوس ہے

دیتے ہو تسکیں مرے آزار سے
دوستی تم کو نہیں اغیار سے

زہر ٹپکے ہے نگاہِ یار سے
موت سوجھی نرگسِ بیمار سے

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بے مروّت کس سے دیکھا جائے ہے

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی
رہ گئی بات بے قراری کی

دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے ۔۔۔ فلس ماہی کے گُل شمع شبستاں ہوں گے

سینہ کوبی سے زمیں ساری ہلا کے اُٹھے ۔۔۔ کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اُٹھے

منہ کو نہ سیا ناصح کی بخیہ گری اپنی ۔۔۔ لوں ہیں بھی ابھی لیتے ہیں پردہ دری اپنی

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں سر میں بھرتے ۔۔۔ دشت یاد آتے ہیں آہو ہیں نظر میں پھرتے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے ۔۔۔ اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

نہ دینا بوسہ پا گو فلک جھکتا زمیں پر ہے ۔۔۔ کہ یہ جتنا زمیں کے نیچے ہے اُتنا زمین پر ہے

مجھے یاد آ گئی بس وہیں اس کے قدِ قامت کی ۔۔۔ چمن میں دیکھ کر گل سرو میں نے کیا قیامت کی

دہ گردوں دیکھ یہ حالت ہوئی تغیر شیشے کی ۔۔۔ کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیر شیشے کی

کشتۂ حسرتِ دیدار ہیں یارب کس کے ۔۔۔ نخل تابوت میں جو پھول لگے نرگس کے

مجھ پہ طوفاں اُٹھائے لوگوں نے ۔۔۔ مُفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے

تمھیں تقصیر اس بت کی کہ ہے میری خطا گنتی ۔۔۔ مسلمانو! ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی

سرگیں چشم سے کیوں تیز نظر کرتا ہے ۔۔۔ کب مرا نالہ ترے دل میں اثر کرتا ہے

دیکھ کر گریاں مجھے وہ چشم کو تر کرتا ہے　　　اشک غماز بھی آنکھوں میں جو گھر کرتا ہے

فغاں کیا دم بھی لینا پاس ہائے دل اُڑاتا ہے　　　کہوں کیا دردِ پنہاں کی کلیجہ منہ کو آتا ہے

کیوں بنی خوں نابہ نوشی بادہ خواری آپ کی　　　کس لئے ہے بے خودی غفلت شعاری آپ کی

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے　　　کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

جہاں سے شکل کو تیری ترس ترس گزرے　　　جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گزرے

نہ انتظار میں یاں آنکھ ایک آن لگی　　　نہ ہائے ہائے میں تالو سے شب زبان لگی

کیا مرے قتل پہ حامی کوئی جلاد بھرے　　　آہ جب دیکھ کے تجھ سا ستم ایجاد بھرے

کرتا ہے قتل عام وہ اغیار کے لئے　　　دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لئے

کہاں تک دم بخود رہیئے نہ ہوں کیجیے نہ ہاں کیجیے　　　کہاں تک کھائیے غم کب تلک ضبطِ فغاں کیجیے

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال تو ہے　　　نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے

تسلی دمِ واپسیں ہو چکی　　　ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

در بہ در ناصیہ فرسائی سے کیا ہوتا ہے　　　وہی ہوتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے

اجل جاں بلب تیرے شیون سے ہے یہ نادم مرے زودِ کشتن سے ہے

ہے دل میں غبار اُس کے گھر اپنا نہ کریں گے ہم خاک میں ملنے کی تمنا نہ کریں گے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی کتنی ہی طاقت آزمائی کی

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چُرا گئے کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

از بس جنوں جُدائی گل پیرہن سے ہے دِل چاک چاک نغمۂ مُرغِ چمن سے ہے

وہ کہاں ساتھ سُلاتے ہیں مجھے خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

جذبِ دِل زور آزمانا چھوڑ دے پائے نازک کا ستانا چھوڑ دے

پھر سینہ سوز داغ غمِ شعلہ فام ہے پھر گرم جوشیٔ دل و سودائے خام ہے

میں احوالِ دل مر گیا کہتے کہتے تھکے تم نہ بس بس سُنا کہتے کہتے

مشورہ کیا کیجیئے چرخِ پیر سے دِن نہیں پھرتے کسی تدبیر سے

کیونکہ پوچھے حال تلخی عاشقِ دلگیر سے ہو گئے ہیں بند لب شیرینی تقریر سے

جل گئے اختر یہ کس کے حُسن کی تنویر ہے ہے منوّر تر شبِ غم مہرِ عالمگیر سے

ہے فسانہ ساتھ سوئے کب کسی تدبیر سے نیند آتی ہے ہمارے خواب کی تعبیر سے

مومن سوئے شرق اُس بُت کافر کا تو گھر ہے ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے

دل میں اُس شوخ کے جو راہ نہ کی ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی

بندھا خیالِ جناں بعدِ ترکِ یار مجھے کیا ہے یاس نے کیا کیا اُمیدوار مجھے

دُعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لئے سخن بہانہ ہوا مرگِ ناگہاں کے لئے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

نہ ربط اُس سے نہ یاری آسماں سے جفا بہرِ عدو لاؤں کہاں سے

جن غزلوں کے مطلعے اوپر درج کئے گئے ہیں۔ اُن کے علاوہ مومن کی غزلیں نہیں ملتیں۔ اس نسخے کے بعد مومن کے کلیات کے جو نسخے چھپے ہیں، اُن میں صرف یہی غزلیں ہیں۔ کیونکہ اُن کے مُرتب کرنے والوں نے بھی اسی نُسخے کو اپنے سامنے رکھا ہے —— بہر حال ان غزلوں سے مومن کے اندازِ کلام اور اُن کی غزل گوئی کی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ غزلیں اس حقیقت کی وضاحت کرتی ہیں کہ مومن ایک منفرد غزل گو شاعر تھے اور اُنھوں نے اس صنف میں ایک مخصوص لب و لہجہ پیدا کیا ہے۔ اُن کے کلام میں غزل کا ایک نیا رنگ و آہنگ ملتا ہے۔ اور اردو غزل کی روایت میں اُن کی آواز بالکل اچھوتی اور نئی معلوم ہوتی ہے۔

غزلوں کے بعد کلیاتِ مومن کے اس نسخے میں "منفرقات" کے عنوان کے تحت قطعات

اور رباعیات کو جمع کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے چند معمے ہیں جن میں معما باسم مومن، معما باسم غلام علی خاں، معما باسم میر محبوب علی، معما باسم مہتاب رائے اور معما باسم نواب مصطفےٰ خاں بہادر اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے بعد قطعات ہیں جن سے مومن کی زندگی اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں سے ایک قطعہ سہسوان کے سفر کے بارے میں ہے ؎

صاحبو! میرا حال مت پوچھو　　بندۂ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلی کو سہسواں آیا　　ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

اور تین طویل قطعات میں مومن نے اپنے عشق کے واقعات کو بیان کیا ہے۔ پہلا قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

وہ نوجوان عابد و زاہد کہ سب جسے　　کہتے تھے مومن اور بہت دین دار تھا
کل ایسے حال سے نظر آیا کہ کیا کہوں　　جو تھا سو اُس کو دیکھ کے زار و نزار تھا

دوسرا قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

عمّ بزرگوار کہ ہیں عیسیٔ زماں　　نسخے کا جس کے معجزے سے مشکل امتیاز
سقراط زہر خوردہ کا گر چارہ وہ کریں　　عمرِ خضر سے ہو نفس واپسیں دراز

اور تیسرا قطعہ اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

مرا جاتا ہوں اب جی میں ہے اس بیدرد کو لکھوں　　کہ مجھ کو تختۂ مشق اطبّا کیوں بنایا ہے

ان قطعات کے بعد اس حصّے میں قطعات تاریخ درج ہیں۔ ان میں تاریخ وفات جد مومن، تاریخ وفات شاہ عبدالعزیزؒ، تاریخ وفات سید احمد بریلویؒ، تاریخ وفات مولوی محمد عمر خلف الصدق مولوی محمد اسمٰعیل، تاریخ کد خدائی یعقوب بیگ، تاریخ وفات حکیم غلام نبی خاں تاریخ عقد عبدالعلی خاں، تاریخ تذکرہ گلشن بے خار، تاریخ جلوس محمد سعید خاں، تاریخ وفات کالے صاحب، تاریخ وفات دختر مومن وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔

ان قطعات کے بعد رباعیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہ رباعیات مختلف موضوعات پر ہیں صرف چند رباعیات یہاں درج کی جاتی ہے ؎

کیا گوشۂ خفا میں انجمن میں بھی تو تھا　　کیا دشت کہ تنگ دل چمن میں بھی تو تھا

کچھ اور نہیں چمن میں ایذا لیکن
اک درد ہے دل میں سو وطن میں بھی تو تھا

جب سے وہ گئے اُدھر نہیں یاد کیا
بھیجی نہیں کچھ خبر نہیں یاد کیا
ہم یاد میں جس کی آہ سب کچھ بھولے
اُس نے ہمیں بھول کر نہیں یاد کیا

مومن ہے اگرچہ سب اُسی کا یہ ظہور
توحیدِ وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے
بندے کو خدا بنائے کس کا مقدور

مومن شوق گناہگاری کب تک
اے تیرہ دروں سیاہ کاری کب تک
مان اپنے خدا کو باز آ بہرِ خدا
اے دشمنِ دیں بتوں سے یاری کب تک

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں
ہے معرکۂ جہاد چل دیجیے وہاں
انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز
وہ جاں جسے کرتے تھے بتوں پہ قرباں

مومن رہ عشق آہ کچھ خوب نہیں
واللہ بتوں کی چاہ کچھ خوب نہیں
آمان کہا نہ جا سوئے بت خانہ
کچھ خوب نہیں یہ راہ کچھ خوب نہیں

پھر کوئی صنم پسند آئے مجھ کو
کوئی بُت پھر جلوہ بھائے مجھ کو
جس دن نے دکھائیں یہ اندھیری راتیں
وہ دن اللہ پھر دکھائے مجھ کو

وصلت میں بھی مزہ نہ پایا ہم نے
عشق ایک فریب تھا کہ کھایا ہم نے
اے کاش کہ جان دل سے بہلے دیتے
جی کے یہ عبث عذاب اُٹھایا ہم نے

ان رباعیات کے بعد اس نسخے میں تضمینیں ہیں۔ ان میں مثلث برغزل عرفی شیرازی، تخمیس

غزل خواجہ حافظؒ (۳ عدد) تخمیس غزل نظیری تضمین مصرع وحشی یزدی مخمس برغزل مرزا قلی میلی (۲ عدد) تخمیس غزل ابوطالب کلیم، تخمیس غزل شیفتہ، تخمیس شعر خواجہ میر دردؒ (مسدس) تضمین طوطی شکرستانِ ہند، تضمین برغزل قدسی (نعتیہ مخمس) اور تضمین شعر فضل عظیم (مسدس) اہمیت رکھتے ہیں۔

دو مسدس بہ مضمون واسوخت، ایک مثمن بعنوان روضۂ گلستان دلفروز و گل فشانی مضامین واسوز اور ایک ترجیع بند بھی اس نسخے میں شامل ہیں ان کے بعد ایک ترکیب بند بہ مضمون مرثیہ معشوقہ، حور طلعت ملک شیم، وصلنی وصالها فی جنت النعیم بھی ہے، جو اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

خمیازۂ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج — آغوش رشک حلقۂ اہل عزا ہے آج
برباد شور رعد ہوا آب اشک ابر — کیسا وفور شیون و جوش بکا ہے آج
جیتے رہے تو لال طمانچوں سے منہ کیا — تغییر رنگ شرم خجالت فزا ہے آج
پانی کے بدلے منہ میں بھر آئے ہے لہو — لب کاٹنے میں ہائے کہاں وہ مزا ہے آج

آخر میں مثنویاں ہیں۔ پہلے شکایت ستم ہے جو فارسی کے اس شعر سے شروع ہوتی ہے۔

ایں نالہ شکایت ستم نام — با من خود گفت سال اتمام

دوسری مثنوی قصۂ غم ہے اور یہ فارسی کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

نام ایں چند نالۂ پیہم — ہم چوں تاریخ گشت قصۂ غم

تیسری مشہور مثنوی قول غمیں ہے، جس کا آغاز فارسی کے اس قطعے سے ہوتا ہے ؎

تازہ فغانے کہ کشیدم ز دل — واں سخن غم کہ شنیدم ز دل
ہست خوش افسانۂ شیریں بنام — قول غمیں آمدہ سالش چو نام

چوتھی مثنوی تف آتشیں ہے۔ اس کی ابتدا فارسی کے اس قطعے سے ہوتی ہے ؎

چہ در پردہ دل فغاں بختیم — کہ طرح چنیں مثنوی ریختیم
دم شعلہ افشاں جاں حزیں — بود نام و سالش تفِ آتشیں

پانچویں مثنوی حنین مغموم ہے اور اس کے شروع میں فارسی کا یہ قطعہ درج ہے ؎

ایں تازہ فغاں کہ بر کشیدم — ایں نالہ کہ از جگر کشیدم

حرفے ست بخونِ دیدہ مرقوم　　　　نام و سالش حنینِ مغموم

چھٹی مثنوی کا عنوان آہ و زاریِ مظلوم ہے اور اس کا آغاز فارسی کے اس شعر سے ہوتا ہے ؎

نام و تاریخ ایں فسانۂ غموم　　　　نیست جز آہ و زاریِ مظلوم

اس کے بعد دو منظوم خط ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "نامۂ مومن جانباز بجانب محبوبہ دلنواز" اور دوسرے کا عنوان ہے "نامۂ باسوز و گداز بہ سمتِ معشوقۂ طناز" ـــــ ان خطوط کے بعد ایک ناتمام مثنوی کے چند اشعار درج ہیں اور آخر میں مومن کی مشہور مثنوی بہ مضمون جہاد ہے جو اس طرح شروع ہوتی ہے ؎

پلا مجھ کو ساقی شرابِ طہور　　　　کہ اعضا شکن ہے خمارِ فجور
کوئی جرعہ دے دیں فزا جام کا　　　　کہ آجائے بس نشّہ اسلام کا
بزنگ مے ایماں کو آجائے جوش　　　　نہ اپنا رہے اور نہ دنیا کا ہوش
عنادِ نہفتہ کو ظاہر کروں　　　　دمِ تیغ سے قتل کافر کروں

اور جس کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

الٰہی! مجھے بھی شہادت نصیب　　　　یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
الٰہی! اگرچہ ہوں میں تیرہ کار　　　　پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار
تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　　　عروجِ شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے　　　　ملادے امامِ زماں سے مجھے
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں
اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

کلیاتِ مومن کے کچھ نسخے نول کشور کے اس نسخے کے بعد بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان میں اہم ترین نسخہ مولانا ضیاء احمد بدایونی کا مرتب کیا ہوا ہے، جو انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوا ہے ـــ لیکن اس میں صرف غزلیں ہیں۔ ان غزلوں کو محنت سے مرتب کیا گیا ہے، اور صحت کے ساتھ چھاپنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مولانا ضیاء احمد نے مومن کے قصائد بھی الگ کرکے شائع کئے

ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن مجموعۂ قصائد مومن کے نام سے ۱۹۲۵ء میں الناظر پریس سے شائع ہوا۔ اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وہی قصیدے ہیں جو نول کشور کے نسخے میں موجود ہیں۔ البتہ عنوانات بدل دیئے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے اس کے علاوہ مومن کا کلام نہیں ملتا۔ عرش نے حیات مومن میں کلام مومن کے ایک ایسے نسخے کا ذکر کیا ہے جو نایاب ہے۔ لکھتے ہیں :-

"کلیات اُردو مع قصائد و مثنوی و جمیع اقسام نظم مرتبہ آہی مرحوم۔ یہ بے انتخاب مختلف مطبع میں نہایت غلط چھپا ہے اور مشکوک بھی ہے۔ یہی وہ کلیات ہے جو مرض الموت میں جمع کیا گیا تھا۔ اس کے پہلے مجموعۂ دیوان نوشتہ میر حسین تسکین شاگرد مومن جس کے حاشیے پر خود خان والا صفات کی جا بجا تحریریں ہیں مرتب پایا تھا۔ مگر چونکہ تسکین مومن سے چند ماہ قبل مر گئے اس لئے یہ دیوان کہ اُن کی تحویل میں تھا دوران علالت مومن میں نہ مل سکا مجبوراً دوستوں اور شاگردوں کی کوشش سے کچھ غزلیں فراہم کی گئیں اور وہی بصورت کلیات مرتب ہوئیں دیوان مذکور کے نسبت حضرت ناصر نواسۂ مومن فرماتے ہیں کہ (وہ دیوان آپا میمونہ بیگم مرحومہ نے جو پوتی تسکین کی تھیں پیر عبدالصمد صاحب ساکن کوچۂ پنڈت دہلی کو دے دیا تھا۔ میں نے خود دیکھا اور بے حد کوشش کی کہ وہ نسخہ یا کم سے کم اُس کی نقل مل جائے مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے، ناصر صاحب فرماتے ہیں کہ اُس کے حاشیے کی نظری جانچ کی تو مجھ کو قطعی یقین ہو گیا کہ یہ مومن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے کیونکہ میں نے اُن کی تحریر دیکھی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ خاکسار عرش نے پیر عبدالصمد کو بہت کچھ لکھا کہ آپ مومن کی روح کو نیز اُن کے خیر طلبوں کو تکلیف نہ دیں مگر اُنھوں نے ۲۸ رماہ صیام ۱۳۴۷ھ کو صاف جواب دیا کہ کیسا دیوان میرے پاس کوئی تصنیف ہی مومن کی نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے اسی ملال کے سبب اُن سے دلّی میں ملنا پسند نہ کیا۔ اب اصلی حال سنیئے کہ مومن کی حقیقی بہن کی لڑکی آہی سے منسوب تھیں اور میمونہ بیگم انھیں کی صاحبزادی

کا نام ہے جن کی شادی سیف الدین مرحوم سے ہوئی تھی جو ماماں زاد بھائی
پیر عبدالصمد صاحب کے تھے۔ اور پیر عبدالصمد صاحب کالے صاحب کے گھرانے
کے ہیں جن کی تاریخ مرگ مومن نے لکھی ہے۔ غرض جب یہ تعلقات مومن خاں
صاحب کے گھرانے سے وابستہ ہوئے اور سید احمد صاحب امام مسجد جامع
کی کچھ اندرونی تحریک ہوئی تو سالہا سال کے بعد یہ دیوان منتقل ہوتا ہوا پیر
عبدالصمد صاحب تک پہنچ گیا۔ اب تو دانی و خداوند کے سوا کیا فیصلہ کیا جاسکتا ہے

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

میں کم سے کم بڑی کاوشوں کے بعد یہ بتائے جاتا ہوں، کوئی خدا کا بندہ ایسا
پیدا ہو جائے گا جو گڑے ہوئے خزانے کو اکھاڑ ہی لے گا۔ تذکرہ نویسوں نے
اسی رشتے کو سن کر آہی کو مومن کا داماد لکھا ہے، درحقیقت وہ اُن کی اُس
بہن کے داماد تھے جن کو مومن بہت مانتے تھے، معلوم ہوتا ہے اسی سبب سے
یہ دوران علالت مومن میں بھی موجود رہے۔ اب بات اتنی ہے کہ جب تک
کہ دیوان سامنے نہ آئے فیصلہ نہیں ہو سکتا ہے کہ اس میں وہی غزلیں ہیں جو
موجودہ کلیات میں ہیں یا کیا۔[۵۱]

ہو سکتا ہے کہ اس نایاب نسخے میں مومن کا کچھ اور کلام موجود ہو لیکن چونکہ یہ ابھی تک نایاب ہے اس لئے نول کشور کا یہ نسخہ ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

(۲)

دیوانِ مومن

(فارسی)

دیوان مومن، مومن خاں کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔ اس کو حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا اور یہ ۱۲۷۱ھ میں مطبع سلطانی سے چھپ کر شائع ہوا۔ اس نسخے کے سرورق پر مندرجہ ذیل

---

۵۱ عرش: حیات مومن: ص ۶۲-۶۳

عبارت ملتی ہے :-

"بعون اللہ تعالیٰ و حسن توفیقہ نسخہ الموسوم بہ دیوان مومن خان، مولفۂ احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر در مطبع سلطانی در ۱۲۷۱ھ نبوی مطبوع شد"[۱] شروع میں حکیم احسن اللہ خاں کا لکھا ہوا مختصر دیباچہ ہے جس میں اس نسخے کی اہمیت واضح کی گئی ہے۔ لکھتے ہیں :-

"کلامے کہ در افتتاح ہر کتاب بر نعت مقدم تواند نشست۔ حمد خداوند جہاں کہ ما خلقت الجن والانس توقیع کمال کبریائی اوست و حدیثے کہ در ہر باب بلا فصل با حمد تواند پیوست۔ ہماں نعت خاتم المرسلین است کہ ما ارسلنک الا رحمۃ للعلمین آئینۂ جمال جہاں آرائی اوست۔ اما بعد از شرف اندوزی لحن و صوت بہ ترنم حمد و نعت از صریر قلم اصطکاک در دولت سرائے سخن بہ گوش می خورد۔ دیدہ ہائے بینا و دل ہائے دانا را فتح الباب نور و سرور مبارک باد حقا کہ حقیقت شناساں کار اگر ایں دیباچہ را کہ عارض است لوح طلسم خوانند رواست و عارفان اسرار اگر ایں دیوان را کہ دیباچۂ مبدار آنست طلسم لفظ و معنی دانند بجاست۔ رہے دیوان کہ بہ التزام قدرت لفظ اعجاز خسروی است و باعتبار ندرت معنی نمونۂ انفاس عیسوی اگر ناظم ایں نظم شعری شعار بالفرض بجائے الفاظ تاب دارہ ہمیں مقدار انجم بر صفحہ می افشاند سطح فلک ثامن مثال تمثال عرش اعظم از کوکب سادہ می ماند۔ بالغ نظراں منظر علم و فن دم نظارۂ ایں سواد اعظم سخن بشرط آں کہ از حق نگزرند دریں صحیفہ از ہر صفحہ در اثنائے ورق گردانی فرو ریختن سرمۂ سلیمانی نگرند حیف صد حیف کہ فارس مضمار خیال یوسف کنعاں کمال بہ نیروئے فکر قلم و سخن را بہ قہرمانی مسلم، از روئے رتبۂ معنی بر شرف اندوختگان تقدم زمانی مقدم عطار و پیشکار مشتری آموزگار، شوکت شکوہ فیضی فیض کلیم، کلام مومن خاں عالی مقام را اجل اماں نہ داد و نیز در ایام حیات بہ حکم استغنا لازمۂ کمال

۱؎ دیوان مومن : سر ورق

است بہ گفتن شعر در زبان دری، ہرچہ گفت آں را بہ فراہم آوردی کمتر پرداخت معہذا ایں ہم آثار قوت طبع رواں واسرار سرعت رسائی آں ہمہ دانست کہ در عالم مرض الموت کہ بعارضۂ افتادن از بام وصدمۂ شکستن استخواں ساعد رنجور بود واز تحریر معذور چوں در سنہ یک ہزار ودوصد وشصت و ہشت ہجریہ قدسیہ علی صاحبہا الفا الفا صلوٰۃ وتحیۃ مطابق ۱۲۶۸ھ موافق سنہ شانزدہم جلوسیہ از جانب ایں بے دستگاہ، خاکسار نامہ سیاہ احسن اللہ درباب صیقل گری مرات ردیف باقی حروف تہجی ابرام رفت۔ درچنیں ضیق فرصت کہ ازاں وقت تا حین وقوع فشار قبر یک دو ہفتہ مدت بیش نہ بود در قبول التماس مضائقہ نہ فرمود دست بہ پیوند شکستگی حمائل گردن وزبان دراں خستگی غزل سرائی او می گفت ودگراں می نوشتند دانشمنداں کار آگاہ دانند کہ بدیں ساں سخن گفتن نہ کار ہرکس است و بر اشراق ضمیر پرتنویر ش ہمیں واقعہ از بہر شہادت بس است آں کہ تفرقۂ کمیت وکیفیت در نظر دارد داند کہ بودن ابیات در شمار منافی خوبی نظم نہ پندارد۔ اگر نظارگی سخن داں باشد وپائے انصاف درمیان ایں تنگ نباشد با دیگر دیوان ہائے کثیر الابیات ہماں نسبت چشمۂ آب حیات است با نیل وجیحون وفرات مداد از مردمک دیدۂ خور باید آورد وقلم از شاخ شجر طور تا ازیں اوراق سواد سویدا مثال در دیدہ ودل جہانیاں نشاں ماند۔[۱]

مومن کے اس فارسی دیوان کا آغاز قصیدوں سے ہوتا ہے۔ کُل چھ قصیدے اس میں شامل ہیں۔ پہلا قصیدہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ہے۔ اس کے اہم حصے یہ ہیں ؎

کجا شد آں کہ انظار لطف لیل ونہار | بلا بخواب عدم بود وطالعم بیدار
کجا شد آں کہ فلک برمراد می گشت | کجا شد آں کہ بہ من یار بود ایں اغیار
کجا شد آں کہ ز ریش خدنگ غمزہ او | نبود دل ہمہ خوں دیدہ دیدہ ام خونبار
کجا شد آں کہ بہ راحت زمانہ می بردم | نہ درد بود دواکش نہ چارہ گر ناچار

۱؎ دیوان مومن : ص۵۲

کجا شد آں کہ دلم زاضطراب خالی بود | کجا شد آں کہ نہ پیچیدمے بخود چوں مار
کجا شد آں کہ سحر کردمے بہ بستر گل | کجا شد آن کہ ندانستمے خلیدن مار
کجا شد آں کہ دلم در کنار راحت بود | کجا شد آں کہ بُدے راحتِ دلم بہ کنار
کجا شد آں کہ بایں علم روز افزونم | زلوحِ دِل ہمہ حک بود معنی شتّار
کجا شد آں سرورِ غم بساز و برگ نشاط | کجا شد آں سر و کارم بخاطر بیکار
کجا شد آں کہ بدل ہرچہ بود حاصل بود | زجام و ساقی صہبا و مطربِ دلدار
کجا شد آں کہ ازیں داغہا کہ می دارم | ہزار مایہ فزوں بود درہم و دینار
کجا شد آں کہ پریشاں شدم اگر شعرے | بشرح زلفِ پریشاں نمود در اشعار
کجا شد آں کہ غم بود کمترک از کم | نشاط و مشغلہ بسیار بود از بسیار
کجا شد آں کہ زبس خندہ ہائے پے در پے | گہے ہوس متقاضی شدے بہ گریۂ زار
کجا شد آں کہ دماغ مرا پریشاں کرد | اگر وزید بکویم نسیم عنبر بار
کجا شد آں کہ خیال فسانۂ کردم | اگر حکایت رنجے گذشت در تذکار
زہے زمانۂ عشرت فزا کہ بر بادش | کشیم جامِ ہلاہل بہ ذوق نوش گوار

آگے چل کر کہتے ہیں ؎

شہنشہا بہ مدیح تو عجز ہا گوید | زبان من کہ قدیر است بر ہمہ گفتار
زفخر نعت تو طرفِ کلاہ می شکنم | چناں کہ دارم از اوصاف تاج داراں عار
منم کہ نیست قرانم بہ ہیچ قرن و زماں | منم کہ نیست نظیرم بہ ہیچ شہر و دیار
ہوائے نظمم بپیچید در دماغ کسے | کہ صد ہزار گلستاں دمیدش از دستار

اعوذ باللہ ازیں قول و فعل من اکنوں | زگفتہ توبہ کنم چوں زکردہ استغفار
نگویم ارچہ بگویم حدیث خوش گویم | مرادم ایں کہ ز دردِ دروں کنم اظہار

بصدق حضرت صدیق رضی آسمان پایہ | مصاحب تو شریک تو و مصاحب غار

به لطفت عمرؓ و شرمگینی عثمانؓ بقوت اسد اللہ حیدر کرارؓ
به پاکدامنی فاطمہؓ به خلق حسنؓ به خون ناحق غمگین حسینؓ بیکس و بار

به آں جفا که من از روزگار می بینم به آں فریب که کرد است با من ایں غدار
به آں امید که می دارم از عنایت تو به آں نوید که آساں به من کند دشوار
که بے کسیم و بجز لطف تو نه می دارم به روز حشر شفیع و دریں زماں غم خوار
گرم تو دست گرفتی ز پا نمی افتم ورم ز پائے فگندی به ماندم از رفتار
اگر تو می نه نوازی کدام بنوازد اگر تو می نه کشائی که می کشاید کار
ترحمے بکن افدیک یا رسول اللہؐ نیم از ان تو آخر نمی پسندم خوار
چو جاں نواز توئی من چرا نه غم میرم چو چارہ ساز توئی من چرا شوم ناچار
بس است سوئے ادب مومن ایں نمی فہمی که دارد از همه حال تو علمش استحضار
چو هر زه گو شدهٔ ایں حدیث آزاد است تو بندهٔ همه کارت بصاحبت بگذار
به بیں که با تو چها می کند عنایت او چساں ز ورطهٔ اندوه می رہی به کنار
اگر زبان سخن هست از دعایش کو که بر زبان تو بروانگی کند آثار

دوسرا قصیدہ بھی نعتیہ ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

اے جسم تو جان آفرینش جان تو جہان آفرینش
اے خاتم انبیا به مہرت منشور امان آفرینش
ہنگام ستائش تو جنبش عاشق به زبان آفرینش
در مبحث دانش تو ناداں عقل همه دان آفرینش
در گوش تو گفته مادر دہر صد راز نہان آفرینش
بے گرمی تو بہار عشقت دمے ماہ خزان آفرینش
هر لقمه ز خوان نعمت تو در کام و دہان آفرینش

اور ان اشعار پر ختم ہوتا ہے ؎

اے پایۂ ہستی دو عالم — مہ سند زبانِ آفرینش
ترسم کہ ز برش واگذارند — گلگشت جنانِ آفرینش
شد پیر فلک براہ رستم — کو بخت جوانِ آفرینش
ایں عیسویاں بہ لب رسانند — جانِ من و جانِ آفرینش
بگذار کہ پائمال کردیم — زاہیمہ سرانِ آفرینش
نکشود گرہ زکار و فرسود — ناخن کہ بنانِ آفرینش
تا چند بہ خواب ناز باشی — فارغ ز فغانِ آفرینش
مومن شدہ ہم زبانِ عرفی — از بہر امانِ آفرینش
برخیز کہ شور کفر برخاست — اے فتنہ نشانِ آفرینش

تیسرا قصیدہ ان اشعار سے شروع ہوتا ہے ؎

سر وصال عدو دارد وز عیاری — چناں رود ز بر من کہ کس بہ ناچاری
فغاں ز نرگس جادوئے او کہ خلقے را — کند بہ حسرتِ نظارہ نگہ داری
ذلات صبر بہ نازت ندامتے دارم — گواہ چیں جبین است زرد رخساری
چہ کم بہاست متاع وفا کہ گردیدم — غلام آں کہ ندارد سر خریداری
خرابہ ایست مرا و خراب تر خواہم — کجا کہ خوانم فرہاد را بہ معماری

اور ان اشعار پر ختم ہوتا ہے ؎

خراش سینۂ حساد تا کجا مومن — بہ تیغ غمزۂ جاناں بہل دل افگاری
چو ہر کلام تو احسنت گفت حسن قبول — دعائے شاہ ہماں بہ کہ بر زباں آری
ہمیشہ تا کہ بود دل نشیں ہر معشوق — بہ وصل خواہش عاشق ز ہجر بیزاری
چو فرق دل شدہ داستانِ یار ازاں — بہ دوستان تو قرب جناب غفاری
ز دشمنان تو بس دور رحمت ایزد — چناں کہ از دلِ اہل ہوس وفاداری

چوتھے قصیدے کے اہم اشعار یہ ہیں ؎

گر چنیں است گردش افلاک — زود چوں گنج می روم در خاک

دارم از عشق ظالمے کہ ازو — ہم فلک کردہ ظلم استدراک
دل بریاں و خاطر مایوس — جان غمناک و دیدۂ نمناک
دل کہ سوزش اگر کنم تقریر — شعلہ خیزد ز ریشۂ مسواک
خاطرے ار برم زگلزارش — نشود غنچہ تا ابد ضحاک

دور را نا بہ مدح تو راندم — توسن طبع شد چناں چالاک
کہ بگرد دو رنگ او نرسید — تیز بالیٔ طائر ادراک
از لبِ قدسیاں خورد گوشم — احسن اللہ لطفہ جزاک
منم امروز قہرمانِ سخن — فاش می گویم و ندارم باک
رتبہ ام گلشنے کجا یابد — کے بہ ریحاں رسد خس و خاشاک
انوری گر مہ است من خورشید — بو الفرج گر زر است من سباک
می نہ گویم ز قدر خاقانی — چہ تواں کرد نیستم نزاک
ہر کہ شعرم شنید مژدہ باد — کہ مضمون شد ز احتمال ہلاک
گر کنم یاد مردہ بہ سخن — لالہ بے تخم رویدش از خاک
بس کہ شعرم عزیز شد شاید — بر کرم طعنہ زن شود امساک
اے بہ ذاتِ تو عقل کل حیراں — دے صفات تو آں سوئے افلاک
دعوی لاف ناحق است بگو — در جہاں کیست ہم چو تو دراک
مومن ایں لاف تا بہ کے دارد — انتظار دعات ایزد پاک
تا رود آب در حضیض زمیں — تا کند نخل سر سوئے افلاک
دشمن و دوست تو مائل باد — بہ نشیب ثریٰ بہ اوج سماک

پانچواں قصیدہ مولانا سید احمد بریلویؒ کی شان میں ہے۔ اور اس طرح شروع ہوتا ہے۔

اے آفتاب روے ترا شیر آفتاب — شیرے زند بہ دور تو چشمک بر آفتاب
بے بردہ ام ز کثرت ہم بزمی مسیح — جاں می دہد بر آں لب جاں پرور آفتاب

آید اگر بروے تو از روے سادگی — خندد شکستہ رنگیٔ عاشق بر آفتاب
لطفے نہ کرد یار برافغانم اے خدا — چوں می شود مسخر افسوں گر آفتاب

آگے چل کر اس قصیدے میں کہتے ہیں ؎

از فیض عام کیست نہ دانم کہ ایں زماں — زر می کند نثار بہر کشور آفتاب
اے خاکیاں نوید کہ خورم زمانہ ایست — نیکوست چرخ با ہمہ نیکوتر آفتاب
در دوست بستہ واد کشادہ گرہ فلک — بر فرق بے کلاہ نہاد افسر آفتاب

سبطِ نبی امام زماں زاحتساب او — بر روئے خاک ریخت ز ر افسر آفتاب

لشکر کشی چناں کہ بہ فوج تو می رود — مریخ پیش پیش و پس لشکر آفتاب
از رایت بلند تو لرزید آسماں — در مہچہ منیر تو شد مضطر آفتاب
تا در مجاہداں بشمار ند ہر سحر — بر خصمت از شعاع کشد چادر آفتاب

آخر میں قصیدے کو اس طرح ختم کیا ہے ؎

مومن چہ لاف می زنی اے غافل از دعا — بر کش دمے کہ صاعقہ ریزد در آفتاب
وقت است امید خواہ کز آئیں ذخیرۂ — دارد بسر زباں اثر از مظہر آفتاب
تا ماہتاب جانبِ مشرق شود نہاں — تا جلوہ ریزد از طرف خاور آفتاب
ایں مہر دیں کہ از تو بنا بست جلوہ گر — باشد بہر مکان چو بہر کشور آفتاب
اندر ضمیر روشن اخلاص مند تو — باد از فروغ نور یقیں مضمر آفتاب
خصم دواں سیاہ تو روزش سیاہ باد — گر گرد د آسماں و زمیں یکسر آفتاب

چھٹے اور آخری قصیدے میں بھی مولانا سید احمدؒ بریلوی کی تعریف ہے۔ اس کا مطلع اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

ز سر فرازیٔ ایں پست طالعی فریاد — گرہ بود ز فتادن نمی رسم بہ مُراد
حسد برد ز سیہ بختیم دلِ کافر — ز بس کہ مشعل اسلام ہم نبردہ سواد

به اوج سر نه کشند کاه از حضیض زمیں — شب برات قم داغِ جبهہ زہاد
دبیر چرخ به مضمون نامه پے نه برد — ز تیره روزی من گر بود بغرض مداد
به طالعے چو منے ارتفاع شمس کجا — بغیر شعلۂ آہے که رو به چرخ نهاد
چناں ز صحبت خورشید مه نگردد سیر — که از وصال عروسی قمر لقا داماد

آگے چل کر مولانا سید احمدؒ کی تعریف اس طرح کرتے ہیں ؎

سپهر مرتبه ممدوح قدسیاں احمدؒ — امیر لشکر اسلام امام پاک نهاد
گدائے کوچۂ او شان و شوکت خسرو — ذلیل درگہِ او جاه و احتشام قباد
پے شمار عطایش قواعد دگر است — رقم کنند پس صد ہزار صفر احاد
ز حفظِ جود و سخایش کنند ضرب اگر — کسور راه نیابد به قسمت اعداد
گرفته مبحث تنصیف حکم جذر اصم — بجز مدارج تضعیف کس ندارد یاد
محاسب کرمش خوش تصرفے کرد است — که می شود عددِ کمتر از زیاده زیاد

آخر میں دعا کی ہے ؎

لب دعائے شه دادگر کشا مومن — چه می کنی گله از فراق ظلم نژاد
همیشه تا که به دور دو چشم یار بود — خراب دشتِ وفا خانهٔ ہوس آباد
همیشه تا که کشاید اشاره ابرو — گره ز کار فرو بستهٔ دل ناشاد
اجل به جام مخالف چو باده ریز ز زہر — فلک به کام موافق چو نوش دارو باد
چو عقده قلعه کشا باد ناخن شمشیر — نگار بند سرِ انگشت دشنه فتح بلاد

قصیدوں کے بعد غزلیں شروع ہوتی ہیں۔ ان غزلوں کو ردیف کے حساب سے ترتیب دیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۴۱ سے یہ غزلیں شروع ہوتی ہیں اور ۱۲۵ صفحے تک اس کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ غزلوں کے اہم اشعار جن سے مومن کے خاص رنگ کا اندازہ ہوتا ہے درج ذیل ہیں ؎

ز اعجاز سخن گردیده و لب ایمانِ ما — در وِردِ زباں دیریاں بسم الله دیوانِ ما
لختے نصیب کس نه شد هر چه ما را داده اند — با خوانِ الوانِ سخن حسرت خورد مهمانِ ما

دارم سرِ و برگِ سخن با علم و دانش کار نیست　　اُمّی بود پیغمبرم افصح بود قرآنِ ما
از جملہ امت سرکشی لختے فزوں تر کردہ ام　　اے رحمۃ للعالمین اے شافعِ عصیانِ ما
بارے بہ عشقے آں صنم جاں بر لب آمد رحمتے
کافر مبادا سر کشد از خاکِ مومن خانِ ما

بختِ عاشق بہ حسد شورِ نمکدانِ ترا　　تپشِ دل نہ رسد شوخیٔ مژگانِ ترا
خار در بسترم افشاندہ خیالِ غمِ عشق　　نہ برد چوں ہمہ شب خواب نگہبانِ ترا
شبِ ہجراں ز سیہ روزیٔ من صبح نداشت　　کردہ ام یاد لبے چاکِ گریبانِ ترا
مومن ایں لاف گزاف از تو بیاری بتاں
چہ شد اے دشمنِ دیں دعویٔ ایمانِ ترا

از حجاب ست و گر غنچہ شدن دلستم　　سر فرو بردن گلہائے گریبانش را
نازکی بیں کہ نگہ عذر رسیدن دارد　　سنگِ رہ سرمہ بود جنبشِ مژگانش را
صنمے بخش خدایا ز کرم تا بہ کجا
برہمن طعنہ زند مومن و ایمانش را

ظالم چنیں کہ خو بہ جفا می کنیم ما　　خوش می کنیم ترکِ تو نامی کنیم ما
رہ ہش بہ خلد کوچہ آں گل نمی دہند　　بے ہودہ انتظارِ صبا می کنیم ما
باآں کہ مومن آں بت کافر نمی کشد
خود را ہلاک بہرِ خدا می کنیم ما

ہم تابِ وصل نیست منِ بے نصیب را　　خود دشمنِ خودم نشناسم رقیب را
شادم بہ صد اُمید نہ دانم کہ می شود　　وصلت کجا نصیبِ منِ بے نصیب را

مومن زدیں ملاف بہ بہشتم کہ آگہم
ایماں سپردۂ بُتِ زاہد فریب را

نہ از کیں می خشنگا فدا آں ستمگر سینۂ ما را
کہ بہر آرزوئے خویش خالی می کند جاں را
چساں بر نالہ ام گوشے نہد بیدردمی داند
محبّت ہائے پنہاں را شکایت ہائے پیدا را

جانم بہ لب رسید کجائی بیا بیا
وقت است گر بہ پرسشم آئی بیا بیا
دیگر من و ستائش ہم بزمی رقیب
باز آمدم ز شکوہ سرائی بیا بیا
در اشتیاق دیدہ بر خسار سودنم
از دور جلوہ ہا چہ نمائی بیا بیا
روزِ فراق طرز خرامت بہ یاد داد
دیگر نماند تاب جُدائی بیا بیا
اکنوں ستیزہ چیست کہ انداختم سپر
دانم ز جور باز نیائی بیا بیا

از کفِ دُشمن گرفتم جام را
می شناسم گردش ایّام را
نیم جانی بر لبش کردم نثار
بخت سوزم لذّت دشنام را
مردِ مومن دیدہ بر روئے صنم
بُرد با خود نیکی انجام را

چہ نالہ ہائے فلک سوز کردہ ام امشب
بہ یاد مہر رُخت روز کردہ ام امشب
برایں طپیدنِ دلِ زلبستن گماں دارم
خیال طاقتِ دیروز کردہ ام امشب
بنورِ جبہۂ مومن نگر بپائے بُتاں
سجود ناصیہ افروز کردہ ام امشب

نالیدن از تو حوصلۂ دادخواہ نیست
گوئی کہ بے گناہ کُشی ہم گناہ نیست

موٗمن برائے ظلمت کفر است رحمتش
رویت سیاہ باد اگر دل سیاہ نیست

ہمت ز ستیزہ ہائے من چیست   من کیستم و وفائے من چیست
عاشق شدم و ہلاک گشتم   [illegible] ماجرائے من چیست
موٗمن صنمے نہ دہر خواہم
تا خواستہ خدائے من چیست

خواہم ز درو پنہاں او را خبر نہ باشد   ترسم فریب داند عشق ایں قدر نہ باشد
از رشک نیک خواہم شادم ز شادیٔ خلق   دانم نہ دیدہ او را چشمے کہ تر نہ باشد
صد سال می تواں زیست گر در ہجر نبود   صد بار می تواں مرد حسرت اگر نہ باشد
شادِ سریرِ عشقم باید نثار کردن   بر سر کفِ غبارے گر مشتِ زر نہ باشد
چوں در کف آرم امشب داماںِ وصل آں مہ   دل گفت شامِ غم را ہرگز سحر نہ باشد
موٗمن ملک سرشتم گر گفت اسیر گوید
ہم چشمیٔ نظیری حدِ بشر نہ باشد

من کیستم کہ توبہ گرم بر زباں رسد   مینائے مے بہ دست ملک ز آسماں رسد
اے جذبِ دل مکش کہ مبادا ز بزمِ غیر   مست و قبا دریدہ و دامن کشاں رسد
پامال آسمانم و مردودِ روزگار   بر من اگر بلائے رسد سرگراں رسد
موٗمن فدائے کیسہ چنیں بے مے و سرود
ایں کس چہا کند چو بہ باغِ جناں رسد

بسمل شد و جلاد تر انداز بے باکش نگر   خورد آب پیکاں بلا مژگانِ نمناکش نگر

بر خود کند بیداد ہا خو کردہ طبعش با ستم برسر زند دست از قلق بازوے چالاکش نگر
در سجدہ آخر تا کجا نالیدن از دست صنم
مومن جبینِ ہم چو گل مالیدہ بر خاکش نگر

از انجمن مغانہ برخیز برخاست ز دل زمانہ برخیز
بد مستم و خلوت است با یار اے صبر تو از میانہ برخیز
می سوزم و گل خبر نہ دارد اے شعلہ ز آشیانہ برخیز
مومن تو وصل حور از دہر
با حسرتِ جاودانہ برخیز

بہ آتش سازو خوش مستانہ می رقص سمندر باش چوں پروانہ می رقص
بہ خونِ خویش منزل دست و پائے بہ یاد شوخیٔ جانانہ می رقص
بسے گشتی بہ گردِ کعبہ مومن
زمانے نیز در بُت خانہ می رقص

بس کہ لرزد مرگ از آزارِ عشق بشکند جاں دیر تر بیمارِ عشق
تا کجا ناشاد باید زیستن بر خود آساں می کنم دشوارِ عشق
بر تماشا گریہ می آید مرا نیست رسم خندہ در گلزارِ عشق
کیست مومن بستہ د طاعت کمر
کہنہ گیری بر میاں زنارِ عشق

اے فتنہ ہائے نازت بر آسماں مبارک گر خود نیست خونم منت بجاں مبارک
از جادہ آگہی نیست آخر کجا گریزم بر ہیچ کس ندیدم ایں خاکداں مبارک

با مومن آں چناں کن یارب کہ بر ترا ود
در عرصہ گاہ محشر از ہر زماں مبارک

بہ بزم مے کشاں لبریز خوں پیمانہ دارم — چو قلقلہا بہائے گریہ مستانہ دارم
پے تسکین دل تا صد لو ید وصل گفت و من — نگاہ از سادگی ہر سوئے بے تابانہ دارم
ملامت گر کہ منعم می کند از ہرزہ گردیہا — نمی داند کہ رہ در کوچۂ جانانہ دارم

خداوندا بہ حال مومن گم کردہ رہ رحمے
بت غیر آشنائے آشنا بیگانہ دارم

ایں دل کہ بہ راہِ او شکستہ — صد شیشہ بہ چار سو شکستہ
از حال شکستہ ام چہ پرسی — گیسوئے تو مو بمو شکستہ
با غیر بود درست پیماں — رنگش ز حیا برو شکستہ

مومن ز شکست دل بست زلفش
دل بستہ و آرزو شکستہ

دشمن من خوار بودے کاش کے — ایں دل از اغیار بودے کاش کے
من ز دل بیزارم از بیتابیش — دل ز من بیزار بودے کاش کے
بردلم جورے کہ ہجراں می کند — پیش چشمِ یار بودے کاش کے
آہ از دستِ تغافل ہائے او — در پئے آزار بودے کاش کے

مومن از بیداد در کیش تو نیست
آں صنم دیں دار بودے کاش کے

غزلوں کے بعد مومن کے فارسی دیوان میں کچھ تاریخیں ہیں۔ ان تاریخوں کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں اور یہ مختلف اوقات میں لکھی گئی ہیں۔ ان تاریخوں سے

مومن کی دلچسپیوں کا اندازہ ہوتا ہے اور اُن کی اُفتادِ طبع پر روشنی پڑتی ہے چند اہم تاریخیں یہ ہیں:۔

تاریخ مسجد

حمید الدین بنائے مسجدے کرد　　بسے محکم تر از بنیادِ افلاک
برائے سالِ تعمیرش بہ ایماں　　رقم کردم عبادت خانۂ پاک

تاریخ وفات میر صفدر علی

میر صفدر علی بہ عزرائیل　　با صد اکراہ و صبر جاں بسپرد
سال خورد کز آدم و حوّا　　بیشتر خوشہ ہائے گندم خورد
فکر تاریخ مردنش ما را　　دل بیفشرد و جاں بہ لب آورد
دوستے گفت از سر افسوس　　صد و دہ سال بود آخر مرد

تاریخ کتخدائی عباس علی خاں

کتخدا گشت چو عباس علی خاں امسال　　با ہمہ شوق و مسرت ہمہ زینت و زین
سال تاریخ بہ جستم بہ حروف ملفوظ　　گفت با خلق منجم کہ قِرانِ السعدین

تاریخ وفات شحنۂ لکھنؤ

شحنۂ لکھنؤ چو شد ز جہاں　　دست افسوس عالمے سوداست
بہ رضا رفتہ است تا رفتہ است　　بہ طرب بودہ است تا بوداست
سال تاریخ مرگ او مومن　　تا ز رضواں شنید فرموداست
میرزائے زماں مسیتا نام　　خوش بہ دار القرار آسوداست

تاریخ وفات (پدر)

پدرم شد اسیر دام اجل　　روحش از بند آخشیجاں رست
طائرے بود آسماں پرواز　　رفت بر شاخسار قرب نشست
بہ من الہام گشت سال وفات　　کہ غلام نبی بہ حق پیوست

تاریخ وفات غلام حیدر

دردا کہ ازیں جہانِ فانی　　شد سوئے جناں غلام حیدر

گفتم پئے سال رحلت او | بگذاشت جہاں غلام حیدر

تاریخ وفات تفضل حسین خاں

جہانِ فضل تفضل حسین خاں ناگاہ | جدا شد از من و گشتم غریب ہم بہ دیار
شنید مومن و زد ہیں غصہ آہ بہیم زد | دو لبست بود چو اندیشہ ام گرفت شمار
بگفتمش کہ بہ ہر حرف تست مضمونے | تو شاعری نبود آہ و نالہ ات بیکار
مگر بہ طرز نوی گفتہ باشی ایں تاریخ | نگفت ہیچ مگر زد ششش آہ دیدہ یار

تاریخ وفات نواب صلابت خاں

پے سال تاریخ رفتم بہ فکر | چو شد مہربانم بہ زیر زمیں
سروشے ندا زد کہ نور الہدیٰ | شدہ بے بلد در بہشت بریں

تاریخ تولد فرزند

اد رخوبی پدر گلاب است | فرزند گل جنانِ خوبی
تاریخ تولدش نوشتم | نو بادہ گلستانِ خوبی

تاریخ وفات ماہ خانم

ماہ خانم چو رفت زیرِ زمیں | روز خورشید طلعتاں شد تار
سال تاریخ جستم از مومن | گفت ہاتف غروب ماہ نگار

تاریخ فتح کابل

ارباب ایماں در آویختند | زبس کافران ہزیمت نصیب
بما آورد سر مومن ما و گفت | کہ نصر من اللہ فتح قریب

تاریخ افتادن مومن خان از بام

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت، گفتا | خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ بایدت گفت تاریخ ایں مصیبت | گفتا خموش، گفتم بشکست دست و بازو

ان تاریخوں کے بعد مومن کے فارسی دیوان میں رباعیاں ہیں۔ رباعیوں کا انداز یہ ہے ۔

یارب کرمے کہ روسیاہ آمدہ ام | شرمندہ ز افراطِ گناہ آمدہ ام

دوزخ چه بروز آستانت مارا　　جائے امن است در پناه آمده ام

گر در رهِ هندی صنماں چند شوم　　ارزم به خس و خار رضامند شوم
کو بخت که در کعبه رسانم خود را　　جاروب کش در خداوند شوم

مائیم و حراست خدائی آخر　　داریم امید رہنمائی آخر
شیطاں ز رہم بُرد و آوارہ شدم　　اے خضر طریقتم کجائی آخر

عشقے خواہم کہ جاودانی باشد　　یاسے خواہم کہ کامرانی باشد
عمرے خواہم کہ بہتر از مرگ بود　　مرگے خواہم کہ زندگانی باشد

از سود و زیان نا امیدی چه حصول　　ارزنده بود طراز دامان قبول
بازار جزا غم تہی دستی چیست　　در دست من است دامن آل رسول

یارب زین جا بشرم عصیانم بُر　　با کلمۂ توحید ز تن جانم بُر
آسودگی ہر دو جہاں بخش مرا　　کافر ہمہ زیستم مسلمانم بُر

بے صرفہ نکیرین چه پاسخ طلبی است　　گویم ز کیش خود اگر بے ادبی است
آگاه نیم ز کفر و اسلام که چیست　　من عاشق و شاہدم رسول عربی است

لبیک به کعبه باز گوید مومن　　با غیر رہ وفا نپوید مومن
کافر شد و از دلش ہوائے تو نرفت　　یارب صنمے یگانہ جوید مومن

دانی احوالِ من زبوں شد چوں شد | دریائے سرشک لالہ گوں شد چوں شد
برسینہ نہادی کف ورنگیں گردید | آخر دلم ایں قدر کہ خوں شد خوں شد

در مشرب ما کہ بُت پرستی کفر است | گر بادہ ناب نیست مستی کفر است
گو بندۂ حق شناس حق می گویم | از بندگیم خدا پرستی کفر است

رباعیوں کے بعد اس دیوان میں ایک قطعہ مناجات ہے جو اس طرح شروع ہوتا ہے ؎

اے کہ بہ یثرب گذرے می کنی | رہبری دخوش سفرے می کنی
خاک بہ راہ تو مبادا بلند | خار بہ پایت نہ رساند گزندِ

اور یہ دیوان مندرجہ ذیل قطعے پر ختم ہوتا ہے ؎

بادشاہاں بہ ایں متاع قلیل | مدح از چوں منے چرا خواہی
بے بہائے متاعی از مومن | گوہر ولعل بے بہا خواہی
صلۂ شعر نیست تشریفے | کہ نیرزد بہر کجا خواہی
بے ثنا چوں گرفتہ ام صد بار | ہجو گویم اگر ثنا خواہی
دیگراں دیگر اند ومن دیگر | ہرچہ از بوم از ہما خواہی
شاعرانے کہ بے خبر یابی | کہ خبر ہم بہ مبتدا خواہی
لفظ دل خواہ ہم نمی ہینم | چہ معانی و مدعا خواہی
در پست حرف ناسزا گویند | گر جزا حرف شہر طرا خواہی
قدرے پیش ازیں توانم داد | بے نیز گر زما خواہی

گر مدیح من آرزو داری
باید اول زر از خدا خواہی

آخر میں یہ عبارت درج ہے :-

"الحمد للہ والمنۃ کہ دیوان مومن خان مرحوم در ماہ ذیقعد بتاریخ سیزدہم شہر ذیقعد ۱۲۷۱ھ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم باتمام رسید و در مطبع سلطانی مطبوع شد"

(۳)

انشائے مومن

انشائے مومن، مومن کے فارسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ ان خطوط کو حکیم احسن اللہ خاں نے مرتب کیا اور یہ ۱۲۷۱ھ میں مطبع سلطانی سے چھپ کر شائع ہوئے۔ اس نسخے کے سرورق پر مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے۔

"بعون اللہ تعالیٰ و حسن توفیقہ نسخہ الموسوم بانشائے مومن خاں مولفہ احترام الدولہ حکیم محمد احسن اللہ خاں بہادر در مطبع سلطانی در ۱۲۷۱ھ مطبوع شد۔"[۱]

شروع میں حکیم احسن اللہ خاں کا مختصر دیباچہ ہے جس سے ان خطوط پر روشنی پڑتی ہے۔ حمد اور نعت رسولؐ کے بعد وہ لکھتے ہیں :۔

"اما بعد مضمونیکہ خامہ را جنبش و طبع را در جوش آوردہ فقیر نامہ سیاہ احسن اللہ المتہم بہ طبیب عرضہ می دہم ایں ہنگام کہ بیاضے از نثر قدما و متاخرین فراہم آوردم و بر متعلمین معنی طلب ملتمنا گزاشتم و خود ہم از برکت انفاس آں معجز کلاماں فیض ہا برداشتم بدیں تقریب زادۂ طبع خان زادہ خود را باگراں مائگاں سنجیدم و گراں تر یافتم و نو ہم اگر انصاف را کار فرمائی و سگ آسا باستخوانے چند مکرائی زبان بہ تصدیق دعوئ صادقم، برکشائی، انصاف ہم از دست کہ خود می فرماید۔ از قصیدہ ؎

منم کہ نیست قرانم بہیچ قرن و زماں　　منم کہ نیست ضمیرم بہیچ شہر و دیار
نبود و نیست عدیل من امتحاں اینک　　ز زندگاں لب خامہ ز مردگاں اشعار

خواستم تا گہر ہائے پریشانش بیک رشتہ درکشم و چناں کہ یگانۂ زماں و وحید دوراں نواب مستغنی الالقاب محمد مصطفےٰ خاں بہادر بدست آوردن اشعارش سعی ہا کردہ و بصد تردد و تلاش لختے فراہم آوردہ صلائے عام بر چشم و

---

[۱] انشائے مومن : سرورق

گوش نکتہ سنجاں دقیقہ یاب زدہ من ہم ہر چہ از دُر ہائے منثور بدستم افتد درج در کنم۔ چوں آں بزرگوار آزاد منش والا بالی فطرت آمدہ باظہار ہنر ہا کمتر می پردازد و بے ضرورت کارے و تحریک دوستی حرفے از نوک قلم نمی ریزد و آں ہم۔ بیت ؎

آں چناں زود کہ گر خامہ کند　　　　دیر اندیشہ کند استعجال

تا بہ نقل برداشتن دنجیر و کبر در گذاشتن چہ رسد نیل تمنا صورت نہ بست و انجاح مرام نقش دلخواہ نہ گرفت لاجرم بہ دل بپیماں بستم و عہد از دل گرفتم کہ ازیں باب ہر نامہ کہ بہ نامم رقم زند یا بہ ابرام کساں برطراز د بہمہ سعی در دست آرم و ازیں خدمت بار منت بر گردن خود گذارم صحیفہ دل پسندی شیرازہ بندم و مجموعہ مضامین و معانی پراگندہ نہ پسندم۔ آخر نقش مراد دلخواہ نشست و حصول آرزو صورت بست جزوے چند فراہم آمد۔ اگر چہ بعضے ازاں آں پایہ نہ داشت کہ بہ نام نامی او نسبت کنم و بدیں سفینہ بہ نگارم چہ بضرورت نافہمی مخاطب تا الفاظ ہندی نژاداں بکار بردہ از بلندی معنی چہ سخن اما ہم ازاں کہ کم پایگاں نیز بے بہرہ نمانند و ہم بہ تقاضائے محبتے کہ از روز نخست من و آں یکتائے زماں چوں بادام دو مغز بہ یک پیرہن گنجیدہ ایم و مانند سرو سہی یک جا بالیدہ دل نہ داد کہ بر باد دہم۔ لاجرم ایں کتاب بہ سہ باب کردم

باب اول:۔ نامہ ہائے کہ مشعر بر طرز تحریر آں منشی بے نظیر است

باب دوم:۔ رطب و یابسے کہ نظر بہ نافہمی مخاطب نگاشتہ

باب سیوم:۔ تقاریظ و خطب بعد ازیں ہر چہ بہ دستم می افتد ہم دریں سہ فصل ثبت می نمایم و از عہدۂ کار خویشتن بر می آیم و دریں دیباچہ کہ خلاف رسم مستمرہ در محامد و اوصاف و توصیف فنون علومش خلو نہ کردہ ام و فضائل کمالاتش یک یک نہ شمردہ از آنست کہ صیت ہنر ہایش اطراف گیتی را فرا گرفتہ و شہرت دانش و خرد بال سوئے عالم رفتہ، کدام کافر کیش است از حال

محمدؐ خاں گرامی برادرم آگاہ نیست و کدام بد اندیش است کہ سر نہادہ آں درگاہ نیست، ہر گرامی دانم از من نکوتر می داند و ہر گرامی بینم از من فزوں تر می شناسد۔ از خامہ فرسائی بے صرفہ چہ حاصل و از ہرزہ درائی بے ہودہ چہ فائدہ۔ الا اگر ایں دو سہ بیت کہ ہم از قصیدۂ آنجناب فطنت مآب است نگاشتہ آید جا دارد۔ از قصیدہ ؎

منم کہ فخر بود بو فراس و اخطل را ۔۔۔ گر از تلامذۂ خویشتن کنم تعداد
حدیث شاعری قیس در برابرِ من ۔۔۔ بہ طعن زمزمۂ بلبل است شیون خاد
نہ امتی متنبی ز بندگاں بودے ۔۔۔ اگر شنیدی طرزے کہ کردہ ام ایجاد
محیط فکر و خیالم بعالم معنے ۔۔۔ بہ سپہر کمالم ز خاطرِ وقاد
اگر بہ شہد برابر بود چہ خواہد کرد ۔۔۔ بسر بلندی بلیغم و کانچہ قنّاد
بہ نظم من ز شتر گربہ نیست دُر باشد ۔۔۔ چہ اُشتر اُشتر صالح چہ گربہ گربہ زباد
فدائے نامہ عطارد شود دم تحریر ۔۔۔ بہ رقص زہرہ در آید ز لذتِ انشاد

تا زبانِ انسان بہ نطق آشناست ایں نثر دل پسند وردِ زبان نکتہ سنجاں باد"[۱]

جیسا کہ اس دیباچہ سے ظاہر ہے یہ خطوط تین حصّوں پر مشتمل ہیں۔ پہلے حصّے میں وہ خطوط ہیں جن میں مومن کا مرصّع اور مشعر طرز تحریر نمایاں ہے۔ دوسرے حصّے میں وہ خطوط ہیں جو مخاطب کی نافہمی کے پیش نظر نسبتاً سادہ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ اور تیسرے حصّے میں ان دیباچوں اور تقریظوں کو یک جا کر دیا گیا ہے جو مومن نے وقتاً فوقتاً مختلف موضوعات پر لکھے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مجموعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے مومن کی شخصیت اور اُن کے حالات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ان میں سے بیشتر خطوط حکیم احسن اللہ خاں کے نام لکھے گئے ہیں۔ چند خطوط دوسرے لوگوں کے نام بھی ہیں۔ یہ سب کے سب اہم ہیں کیونکہ ان میں مومن کی صحیح تصویر نظر آتی ہے۔

اس مجموعے کا پہلا خط غالباً حکیم احسن اللہ خاں ہی کے نام ہے۔ اس میں انھوں نے

---

[۱] انشائے مومن: ص ۵-۸

بیماری اور اس کے اسباب و علل پر بحث کی ہے۔ اس میں متعدد بیماریوں اور اُن کے اسباب کا ذکر ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مومن کو طب کے معاملات و مسائل سے گہری دلچسپی تھی، اور وہ اُس فن کے نشیب و فراز سے پوری طرح آگاہ تھے۔

دوسرا خط بھی حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہے۔ اس میں مومن نے اپنے آپ کو شوریدہ نوا کہا ہے اور اپنی شاعری اور شاعرانہ مرتبے کی وضاحت کی ہے۔ اس میں کہیں کہیں تعلّی کا پہلو ضرور نمایاں ہے لیکن درحقیقت اس کا بنیادی موضوع زمانے کی ناقدری اور سخن ناشناسی کا گلہ اور شکایت ہے۔ اپنی پریشانی اور زبوں حالی کی تفصیل بھی بیان کی ہے اور اس کا سبب معاشی حالات کی ناسازگاری ہے۔ اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ اُن کی موروثی زمین سرکار انگریزی کی طرف سے ضبط کرلی گئی ہے۔ اور اس کی وجہ سے حالات نامساعد ہیں۔ بیکاری کا عالم ہے۔ زمانہ اور زندگی سے بیزار ہیں اور ترک وطن کا ارادہ رکھتے ہیں۔ آخر میں اُس تقریظ کا ذکر ہے جو اُنھوں نے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے تذکرے گلشن بے خار پر لکھی ہے۔

اس خط کے بعد جو خط شامل ہے وہ بھی حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہے اور اُن کے خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ اس میں مومن نے اپنے اشعار کا ذکر کیا ہے اور یہ بات واضح کی ہے کہ ان اشعار کو لوگ سمجھتے نہیں کیونکہ سخن فہمی سے وہ دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتے۔ برخلاف اس کے یہ نافہم اشعار پر لعن طعن کرتے ہیں۔ اس میں شکایت کا پہلو نکلتا ہے۔ البتہ اس خط میں نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کی سخن فہمی کو سراہا ہے اور اُن کی قدردانی کی تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک شخص شہاب الدین جو اُن کا (مومن کا) شاگرد تھا اُس نے بڑی بے وفائی کی ہے اور کلام کے کچھ جز چرا کرلے گیا ہے۔

حکیم احسن اللہ خاں کے نام ایک اور خط میں بھی جمعیت خاطر کے فقدان کا اظہار کیا ہے۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ مجھے اتنا سکون نہیں کہ چند سطریں اطمینان سے لکھ سکوں جو کچھ لکھتا ہوں اُس سے پریشانیٔ خاطر ٹپکتی ہے۔ اس کے ثبوت کے طور پر اپنے لکھے ہوئے ایک رسالے کا ذکر کیا ہے جس کے مضامین کی بے ربطی اُن کی اس پریشان خاطری کو ظاہر

کرتی ہے۔ مومن نے اس خط میں اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ فراغ خاطر کے بغیر نکتہ دلنشیں کو واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت سے کسی نکتہ شناس اور عالی نگاہ کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ اسی خط میں شعر و شاعری کے بعض پہلوؤں پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ خاص طور پر صنائع لفظی پر روشنی ڈالی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اُن کا استعمال کتنا مشکل کام ہے خصوصاً اُن حالات میں جب لکھنے والے کی طبیعت پریشان خاطری کی وجہ سے حاضر نہ ہو۔ مومن لکھتے ہیں کہ اسی وجہ سے انھیں صحیح مرصع عبارت لکھنے میں دشواری پیش آتی ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اُس سے انھیں اطمینان نہیں ہوتا۔

اس کے بعد اس مجموعے میں ایک ایسا خط شامل ہے جس کا عنوان ہے "رقعہ در طلب قفل بہ فرمان یکے از احباب برطرز مطبوع او نوشتہ"۔ یہ خط محض ایک دوست کی پسند خاطر طرز پر ایک قفل کی طلب کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔ اس میں بھی حرماں نصیبی، پریشان خاطری اور ناپائیداری کا ذکر ہے۔ اس خط میں رعایت لفظی کا اہتمام ہے قفل کلید، دیوار اور زنجیر کے الفاظ کے استعمال میں اس رعایت کو ملحوظ رکھا ہے۔

مومن خاں نے ایک اہم خط حکیم احسن اللہ خاں کی والدہ کے نام لکھا تھا۔ اس میں اپنے حالات کی وضاحت کی ہے اور زندگی میں جن پریشانیوں سے انھیں دوچار ہونا پڑا ہے اور جو سانحے اُن پر گزرے ہیں اُن کو بیان کر دیا ہے۔ یہ خط بھی انشائے مومن میں موجود ہے۔ اس کا عنوان ہے رقعہ بہ جناب مستطاب والدہ ماجدہ خاکسار عمہ بزرگوار نامہ نگار باشد۔ اس خط میں انھیں قبلۂ مومن وفا پرست سلامت کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس میں اپنی پریشانیوں کا ذکر ہے اور لکھا ہے کہ سب سے پہلی جفا تو مجھ پر یہ ہوئی کہ والد شفیق کا سایہ میرے سر سے اُٹھ گیا۔ پھر مادر مشفق کی موت میرے لئے سینہ خراشی کا باعث ہوئی۔ ان صدموں کی وجہ سے یہ عالم ہے کہ ایک ایک عضو بیکار ہو گیا ہے۔ زندگی غموں کی آنچ سے پگھلتی جاتی ہے۔ چاروں طرف پریشانیوں کے لشکر مسلط ہیں۔ اس عالم میں صرف عمہ محترمہ کی ذات ہی ایک سہارا ہے اور انھیں کی شفقت کے سہارے زندگی ممکن ہے۔ اگر یہ شفقت انھیں حاصل رہی تو ماں کی موت کا غم غلط ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس خط میں اُنھوں نے اسی کی آرزو کی ہے۔

اس سے ملا جلا ایک اور خط بھی حکیم احسن اللہ خاں کی والدہ کے نام ہے۔ اس میں سب سے پہلے تو اس بات کی شکایت کی ہے کہ حکیم صاحب اپنی والدہ کو اُن کا خط حرف بحرف نہیں سُناتے۔ اس کے بعد اپنی جادو بیانی کی طرف اشارے کئے ہیں۔ پھر اُن دنوں کو یاد کیا ہے جب خط کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی، رو برو بات چیت کرنے کے مواقع حاصل تھے۔ آخر میں اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

اس کے بعد جو خط اس مجموعے میں ملتا ہے اس میں حکیم احسن اللہ خاں کے علم و فضل کی تعریف کی ہے۔ اس کے بعد نجوم اور طب میں اپنی قابلیت کا اظہار کیا ہے اور انوری اور عرفی پر اپنے آپ کو فوقیت دی ہے۔ اس خط میں تعلّی کا پہلو غالب ہے۔

انشائے مومن میں دو خط وہ ہیں جو مومن خاں نے اپنے شاگرد غلام ضامن کرم کو لکھے تھے۔ پہلے خط میں اپنے ایک سفر کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ کس طرح وطن کو چھوڑ کر سفر اختیار کیا۔ غم و اندوہ کے عالم میں گھر سے نکلے۔ کشتی کے ذریعے دریا کو پار کیا۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوئے۔ کبھی کبھی کس مپرسی کے عالم میں پیدل چلے۔ اس خط میں ایک صحرا اور ایک ویران باغ کی تفصیل بھی لکھی ہے۔ دوسرے خط میں اس سفر کا مقصد بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ سفر کی تمام صعوبتیں اُٹھا کر سرونہ پہنچا لیکن وہاں کوئی پُرسان حال نظر نہ آیا۔ افسوس ہے کہ کیوں جہاں آباد چھوڑ کر مسافرت اختیار کی اور اس طرح ذلیل و رسوا ہوئے۔ رشتے کے سلسلے میں جو صورت حال پیدا ہوئی ہے، اُس کا بھی ذکر کیا ہے۔ اُن کی والدہ کے بارے میں کوئی بات لکھی گئی ہے اُس کے متعلق کہتے ہیں کہ اُن کی (مومن کی) والدہ اس مرتبے کی حامل ہیں کہ اُن کی شان میں کچھ کہنا مریم و فاطمہ علیہما السلام کی شان میں کچھ کہنا ہے۔ آخر میں اپنے عالی خاندان ہونے کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں لکھا ہے کہ اگرچہ اُن کا خاندان پریشاں حال ہے اور اُس کے افراد بے سروسامان ہیں لیکن اُن کے عالی مرتبہ ہونے پر حرف نہیں آتا۔ اسی سلسلے میں سعد قلی خاں بہادر کا ذکر آگیا ہے۔ اُس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ شخص اُن کے خاندان کے غلاموں میں سے ہے۔ آخر میں غلام ضامن کرم کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں کہ اُن کے یہاں کے لوگ کبھی انھیں کوئی نازیبا

بات نہ لکھیں اور نہ اپنے یہاں آنے کی دعوت دیں۔

ان خطوط کے بعد چند خطوط حکیم احسن اللہ خاں کے نام اور ہیں پہلے خط میں اپنی بیماری کا حال لکھا ہے اور حب مسکین نواز اور کشتہ زر خالص طلب کیا ہے۔ ان دواؤں کو بہم پہنچانے کا وعدہ حکیم صاحب نے کیا تھا۔ دوسرے خط میں لکھا ہے کہ نواب فیض محمد خاں بہادر کے ہاں سے زر سالانہ کی ادائگی ابھی تک نہیں ہوئی۔ اس کی طرف حکیم صاحب کو توجہ دلائی ہے۔ تیسرے خط میں بھی اسی زر سالانہ کے ادا نہ ہونے کا ذکر ہے۔ چوتھے خط میں لکھتے ہیں کہ حکیم احسن اللہ خاں نے انھیں مدت سے ایک پیغام سے یاد نہیں کیا۔ یہ بھی دریافت کیا ہے کہ آخر اس خاکسار بھائی (مومن خاں) کو فراموش کرنے کی وجہ کیا ہے۔ اس کے حال پر تو لطف و کرم واجب ہے۔

ان خطوط کے بعد ایک خط اس مجموعہ میں شامل ہے جس کو یہ عنوان دیا گیا ہے "رقعہ بہ فرمان یکے از خاتونانِ محتشمہ بنام دادر نازش"۔ اس خط میں مومن خاں نے اسے عزیز از جان من کہہ کر مخاطب کیا ہے اور یاد نہ کرنے کی شکایت کی ہے۔ اور لکھا ہے کہ اُس کی یاد اُن کے دل سے نہیں نکلتی۔ لوگ اُن کی حالت میں جنون کے آثار پاتے ہیں۔ راتوں کو اُسے خواب میں دیکھتے ہیں۔ اُس کے خط کے انتظار میں دروازے پر بیٹھ کر راہ دیکھنا اور صبا سے مصروف گفتگو رہنا اُن کا مشغلہ ہے۔ چونکہ وہ خو کردہ جدائی نہیں۔ اس لئے یہ سب باتیں اُن کے دِل پر بہت گراں گزرتی ہیں۔ آخر میں اُس کے دیدار کی آرزو کی ہے۔

اس خط کے بعد ایک خط فرزند دلبند کے نام ہے۔ اس میں بیٹے کی بیماری پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ دردِ گردہ کی بیماری نے اُسے جو تکلیف پہنچائی ہے اُس پر اظہار پریشانی ہے۔ لکھا ہے کہ یہ پریشانی اُس پریشانی پر مستزاد ہے جو اُن کے نصیب میں لکھی ہیں۔ اور جن سے انھیں زندگی بھر دوچار رہنا پڑا ہے اور ہر بلا جو عدم سے وجود میں آئی ہے۔ اور ہر مصیبت جو کارخانہ ارادت سے منصۂ ظہور میں پہنچی ہے، وہ انھیں کے لئے ہے۔ آخر میں ماں کی پریشانی اور بہنوں کی دعاؤں کا ذکر ہے۔

اس کے بعد جو خط اس مجموعے میں شامل ہے اُس میں مومن نے اپنی بیماری کی کیفیت بیان کی ہے۔ یہ خط حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہے اور اُس میں انھوں نے لکھا ہے کہ اُن کا رنگ زرد ہے۔ دل جل گیا ہے۔ اعصاب جواب دے چکے ہیں۔ غرض سخت پریشانی کا عالم ہے۔

ان خطوط کے بعد انشائے مومن میں چند خطوط ایسے شامل ہیں جو رسمی ہیں۔ ان میں سے ایک خط تو میر فضل علی کے نام ہے جس میں اُن کی رسمی سی تعریف ہے۔ دوسرا خط مرزا کریم بیگ کو اُن کی ماں کی تعزیت کے طور پر لکھا گیا ہے۔ اس میں صبر کی تلقین ہے۔ تیسرا خط میر عظمت اللہ خاں کے نام ہے۔ اس میں بھی رسمی دلدہی کی گئی ہے۔

ان خطوں کے بعد اس مجموعے میں وہ خطوط شامل ہیں جو مومن خاں نے تفضل حسین خاں کو لکھے تھے۔ پہلا خط اس معذرت نامے کے جواب میں ہے جو رفع کدورت کی اُمید سے لکھا گیا تھا۔ مومن نے اس خط میں خلوص، محبت اور یگانگت کے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ دوسرے خط میں دیر سے خط لکھنے کی معذرت کی ہے۔ تیسرے خط میں کرم احمد کی طرف سے اُن کے دل میں جو رنجش پیدا ہو گئی ہے۔ اس کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے فضائل بیان کیے ہیں اور خلوص کا اظہار کیا ہے۔ چوتھے خط میں اُن کے لکھے ہوئے خط کا تذکرہ کیا ہے اور قدردانی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اُن کے محامد اور فضائل کا بیان ہے اور گردش زمانہ اور غم دوراں کا اظہار ہے۔ ان خطوط کے درمیان ایک خط منشی امیر علی کے نام بھی ملتا ہے جس میں ملاقات کا شوق ظاہر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ آستان بوسی کے لئے حاضر ہونے کی آرزو ہے۔ اس خیال کی وضاحت بھی کی ہے کہ ہر خواہش رسم اہل زمانہ کے مطابق چاپلوسی یا شاعری نہیں ہے بلکہ خلوص پر مبنی ہے۔ آگے چل کر لکھا ہے کہ افضل کاملان جہاں تفضل حسین خاں جب سے دلّی میں آئے ہیں، اور یہاں سکونت اختیار کر لی ہے۔ میرے حال پر بہت مہربان ہیں۔

انشائے مومن میں ان خطوط کے بعد ایک خط وہ ہے جو مومن نے مطربہ ماہ جبینی زہرہ نوا کے نام لکھا ہے۔ اس میں اُس کے تغافل اور ناز بے جا کا گلہ ہے۔ اُس نے جو ظلم و ستم روا رکھے ہیں

اُن کی شکایت ہے۔ اس شکوہ شکایت کے بعد مومن نے اپنی بے تابی اور جدائی کا حال بیان کیا ہے اور مطربہ کے جور و ستم کی وجہ سے اُن کی جو حالت ہوئی ہے اُس کی تفصیل پیش کی ہے۔ آخر میں یہ لکھا ہے کہ وہ عاشق باوفا گر غیرت مند اور بندۂ حق ہیں۔

اس خط کے بعد کئی خط حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہیں۔ ان خطوط میں سے بیشتر میں مومن نے اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ اس سال خزانے سے صرف ۸۸۰ روپے ملیں گے۔ حالانکہ پچھلے ۹۲۰ روپے ملتے تھے۔ اس سال کس جرم میں یہ روپے غبن کر لئے گئے۔ اگر یہ تخفیف خزانچیوں کی سقیم حالی کے پیش نظر ہے تو یہ بھی نواب کی طرف سے ہے ۔۔۔ ایک اور خط میں حکیم صاحب کو زر سالانہ کے لئے لکھا ہے کیونکہ سرکار کا تقاضہ ہے اور وہ بدگمانی کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایک اور خط میں اپنی پریشاں حالی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی ذہنی کیفیت کا بیان ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس زندگی میں زمانے کے ہاتھوں بڑے ستم اٹھائے ہیں۔ غمِ روزگار نے کہیں کا نہیں رکھا ہے۔ آہیں بھرنے اور نالے کرنے میں ساری زندگی گزار دی ہے۔ صبح کو اُٹھتا ہوں اور شام تک یہی سلسلہ جاری رہتا ہے حالات نے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ صبح کو جب مؤذن کی آواز آتی ہے تو لاحول ولا قوۃ کہتا ہوں، اور آسائش سے ہاتھ دھوتا ہوں۔

ایک اور خط میں قرض مانگا ہے۔ اپنی پریشاں حالی اور سخن نافہمی کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور خط میں رقم نہ ملنے کے متعلق لکھا ہے۔ اس خیال کا اظہار بھی کیا ہے کہ شاید اس کی وجہ دفتر والوں کی تساہلی ہے۔ اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ زر سالانہ بغیر طلب کئے ہوئے مل جایا کرے۔ ایک اور خط میں اپنی مالی پریشانیوں کا ذکر ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ مجھے دولت کی طمع نہیں۔ میری دولت تو میری شاعری ہے۔ اس کے بعد جو خط ہے اس میں بھی مالی پریشانیوں کا بیان ہے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ جب کوئی میری طرف ملتفت نہ ہوا تو لالہ جوالہ پرشاد نے نقد دے کر میری مدد کی ۔۔۔ اس کے بعد کئی اور خط زر سالانہ کی ادائگی کے بارے میں ہیں۔

ان خطوں کے بعد ایک خط حکیم غلام حسین خاں کے نام ہے۔ اس میں ایک دوست

کے لڑکے کی سفارش کی ہے۔ عم بزرگوار کو یہ بھی لکھا ہے کہ سولہ مہینے ہوئے جد امجد کا انتقال ہو گیا ہے جس کا بڑا صدمہ ہے۔ شیام لال کی سفارش کی ہے تاکہ اُسے مشیر الملک کے رسالے میں ملازمت مل جائے۔ آخر میں یہ لکھا ہے کہ اب اس دیار میں شریفوں اور نجیبوں کی کوئی قدر نہیں۔ چنانچہ لکھنؤ کا سفر مناسب ہے۔ راجہ چندو لال جس طرح شعرا اور اہل کمال کی قدر دانی کرتے ہیں وہ بھی کشش رکھتی ہے

اس خط کے بعد دو خط حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہیں۔ پہلا خط تو رسمی سا ہے دوسرے خط میں پہلے تو اپنے عقائد کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ میں ائمۂ شریعت کا مقلد ہوں۔ اس کے بعد زر سالانہ کا تقاضا کیا ہے۔ اس کے بروقت وصول نہ ہونے کی وجہ سے جو دشواریاں پیش آتی ہیں اُن کو واضح کرنے کے لئے ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ دو شنبہ کو گندم فروش جو زر سالانہ کی امید پر نان نمک پچھلے سال میں بہم پہنچا رہا تھا رقم کا طالب ہوا۔ وہ (مومن) درشتی سے پیش آئے، نوبت جھگڑے تک پہنچی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ شور ہوا تو مومن کے چچا بھی نکل آئے لیکن یہ اعتراف کیا ہے کہ غلطی خود اُن کی تھی — اس کے بعد زر سالانہ کو جلد بھجوانے کی طرف توجہ دلائی ہے تاکہ آئندہ ایسی صورت پیدا نہ ہو۔

انشائے مومن میں چند خطوط نواب صاحب (غالباً نواب فیض محمد خاں) کے نام بھی ہیں۔ ان خطوں میں سے بیشتر میں اپنی پریشانی کا اظہار کیا ہے اور رقم طلب کی ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ آپ کا خط فیروز پور سے جھجر اور جھجر سے جہاں آباد پہنچا۔ آخر میں یہ لکھا ہے کہ بصد پریشانی وطن پہنچ گیا ہوں اور اب رقم کی ضرورت ہے — ایک اور خط میں اپنی پریشانی کی تفصیل پیش کی ہے اور نواب سے عقیدت کا اظہار کیا ہے — ایک اور خط میں نواب صاحب کی بیماری پر اظہار افسوس کیا ہے اور اُن کی صحت یابی کی خواہش ظاہر کی ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں کہ جس رقم کا محرم کے مہینے کے لئے وعدہ تھا وہ صفر میں ملی ہے۔ زر سالانہ کی طرف بھی متوجہ کیا ہے۔

اس کتاب کے دوسرے باب میں بھی چند خطوط مختلف لوگوں کے نام ہیں۔ پہلے خط کے بارے میں یہ علم نہیں ہوتا کہ کس کے بارے میں ہے۔ مضمون یہ ہے کہ مکتوب الیہ

کے والد علیل ہیں۔ اس کی منشا کے مطابق مریض کو دیکھنے جاتے ہیں مگر دیکھ نہیں پاتے۔ حال معلوم کرکے چلے آتے ہیں۔ اس طرح مکتوب الیہ کو بیمار کے حال سے آگاہ کیا ہے۔

دوسرا خط حکیم احسن اللہ خاں کے نام ہے۔ اس میں زرِ سالانہ کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ رقم نصر اللہ خاں اور ایک دو اور لوگوں کی کوششوں سے وصول ہوئی۔

تیسرا خط اس عنوان سے اس باب میں شامل ہے "رقعہ بنام مطربہ زن۔ برادرش کہ ذریعہ پیغام با زن محبوبہ اش۔ بود و آخر خود میلِ خاطر رسانید اما بکام نرسید"۔

چوتھا خط کسی ایسے شخص کے بارے میں لکھا گیا ہے جس کی شادی کا اہتمام مومن نے کیا ہے وہ وقت پر نہ پہنچے۔ مومن کو شرمندگی ہوئی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ ابھی وقت ہے فوراً آجائیں تاکہ مزید تشہیر اور سبکی نہ ہو۔

اس کے بعد کئی خط ایسے ہیں جن کے بارے میں یہ علم نہیں ہوتا کہ کن لوگوں کو لکھے گئے ہیں۔ ایک خط میں لکھا ہے کہ ماہِ صیام بخیر و خوبی گزر گیا۔ عید ہوگئی۔ ملاقات کا انتظار ہے۔ سفر کرنے کا خیال ہے۔ ایک اور خط میں کدورت کی طرف اشارہ ہے۔ جو مومن کی طرف سے اُن کے دل میں پیدا ہوگئی ہے۔ لکھتے ہیں کہ ایسا کون سا جرم ہوگیا ہے کہ آپ کے ایسے قدر دان نے بے اعتنائی برتنا شروع کردی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ـــــ اسی سلسلے کے دوسرے خط میں کدورت کے رفع نہ ہونے کے باعث دُنیا سے علیحدگی اختیار کرنے اور گوشہ نشیں ہونے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔

اس کے بعد ایک خط میں ایک دوست کی آمد کے انتظار اور اپنی بیماری کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک اور خط میں کسی دوست کو لکھتے ہیں کہ مہربانی نامہ کے ساتھ کاغذ زر ملا ـــــ نو سو بیس روپے کی جو رقم خزانچی نے میرے ذمے نکالی ہے، وہ درست نہیں ہے ـــــ ایک اور خط غالباً اسی سلسلے میں ہے لکھتے ہیں کہ کاغذ زر میر ہاشم علی کی خدمت میں بھیجا ہے۔ رسید نہیں ملی، سبب معلوم کرکے لکھیئے ـــــ ایک اور خط فرزند سعادت مند کے نام ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ تاج محمد سے خیریت معلوم ہوئی، آنے کے متعلق علم ہوا۔ مسرت ہے ـــــ ایک خط کسی دوست کو لکھا ہے اُس میں یہ لکھا ہے کہ مجھے ہیضہ ہوگیا تھا۔ آج کل احتیاط برتنی چاہئے۔

ایک اور خط میں کسی دوست کے آنے کی خبر پر شوق و اشتیاق کا اظہار کیا ہے۔ پھر ایک خط اپنی بہن کے نام ہے جس میں اپنی بیماری کا بیان ہے۔ اس خط سے ملتے جلتے کئی خط ایسے ہیں جن میں عزیزوں اور دوستوں کو یا تو بیماری کی اطلاع دی ہے یا مزاج پرسی کی ہے۔

اس سلسلے میں مومنؔ کے وہ خط خاص طور پر اہم ہیں جو انھوں نے اپنی بہن، بیٹے، بیٹی اور بعض دوسرے عزیزوں کو لکھے ہیں۔ ان میں سے چند کا ذکر اس سے قبل بھی کیا جا چکا ہے۔ "انشائے مومنؔ" کے اس باب میں کئی خط بہن کے نام ہیں۔ ایک خط میں بہن کو اپنی بیماری کا حال لکھا ہے۔ ایک خط میں بہن کے خفقان میں مبتلا ہونے پر بیقراری اور تشویش ظاہر کی ہے۔ ایک اور خط میں بہن کو ہمشیرۂ شیریں تراز جان کہہ کر مخاطب کیا ہے اور اُن کے خط کو موجبِ حیرت اور باعثِ رنج و ملال گردانا ہے۔ آخر میں اپنی غزلوں کا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ حسب حال غزل کہنا چاہتا ہوں لیکن مجھے علم ہے کہ معانی نازک اور مضامین کو سمجھنے والے نہیں ہیں۔ ان خطوں کے بعد کئی خط لڑکی کے نام ہیں۔ ان میں سے کسی میں دوری اور غمِ جدائی کا ذکر ہے، کسی میں محبت کا اظہار ہے۔ ایک خط میں لڑکی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی ہے اور لکھا ہے کہ برسات کے بعد اگر تم آئیں تو بشرطِ زندگی تمھیں دیکھ لیں گے بیٹے کے نام بھی کم و بیش اسی مضمون کے خط ہیں۔ ایک خط میں بیٹے کے خط نہ آنے پر اظہارِ ملال اور بے تابی کیا ہے۔ ایک خط میں اپنی کیفیت بیان کی ہے اور آنتوں اور معدے کے غسل (جلاب) کا ذکر ہے۔ ایک اور خط میں برسات کی وجہ سے چھتوں کے ٹپکنے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ سامان وغیرہ ایک حجرے میں رکھ دیا ہے۔ ایک اور خط میں بیٹے کو لکھا ہے کہ تمھارا خط بھائی کے سوا کسی نے نہیں دیکھا اور چونکہ وہ دیوانہ ہے، اپنی بات ہی نہیں کہہ پاتا اس لئے تمھاری بات کسی پر کیا ظاہر کرے گا۔ اس کے بعد کئی خط بیٹے کے نام ملتے ہیں۔ سب میں بیماری کا حال، رنج فراق کا ذکر اور دیکھنے کی خواہش کا اظہار ہے بعض خطوں میں اپنی پریشانی اور بے زری کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس باب میں ایک خط بھانجے کے نام بھی ہے اس میں اُس کی بیماری پر اظہارِ افسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ

میں تمھیں دیکھنے آؤں تو کیسے آؤں، میں خود بیمار ہوں اور ساتھ ہی تہی دست بھی ہوں اس کے علاوہ ایک خط بہنوئی کے نام بھی ملتا ہے۔ اس میں بیماری اور دردِ گردہ کا ذکر اور اُن کی بیگانگی کی شکایت ہے۔ اس طرح بہت سے ایسے خطوط انشائے مومن میں ملتے ہیں جو انھوں نے اپنے عزیزوں کو لکھے ہیں۔ ان خطوط میں نجی باتیں ہیں اور ان عزیزوں کے ساتھ محبت کا اظہار ہے۔

اس باب میں کچھ اور خطوط ہیں جو بعض حیثیتوں سے اہمیت رکھتے ہیں۔ کسی نے مومن کو خط میں بے ایمان اور بدمعاملہ ہونے کا طعنہ دیا ہے۔ مومن جواب میں لکھتے ہیں کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اکابر اور شرفا، بدمعاش اور بے ایمان ہیں تو میں سفلوں اور رذیلوں سے تعلق پیدا کرتا۔ میں اس اعتبار سے بہت بلند ہوں۔ کسی کرم فرما کا طرزِ عمل ناگوار گزرا ہے اس سلسلے میں جو خط لکھا ہے اُس میں اپنی عزت اور حمیت کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ کسی کو اپنی بیماری کے بارے میں لکھا ہے۔ کوئی بیمار ہے تو اس کا مزاج پوچھا ہے۔ کسی کو کسی کے آنے جانے کی خبر دی ہے۔ کسی سے کچھ دریافت کیا ہے۔ کسی سے معذرت کی ہے۔ غرض اس قسم کے کئی خط انشائے مومن میں موجود ہیں۔ ان کا انداز کچھ رسمی سا ہے۔ اس لئے اُن کی تفصیل میں جانے سے کچھ حاصل نہیں۔ اس باب کے آخر میں ایک منظوم خط بھی شامل ہے۔ جو نواب صاحب (غالباً نواب فیض محمد خاں) کے نام ہے لیکن اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔

انشائے مومن کے تیسرے باب میں مومن کے خطبے، دیباچے اور تقریظیں شامل ہیں حکیم احسن اللہ خاں نے اس کا عنوان یہ قائم کیا ہے " باب سیوم مشتمل بر خطبہ و دیباچہ و تقریظ۔ خطبہ کہ بواسطۂ فقیر بہ فرمان امیرے رقم زدہ بود و فقیر سخن ناشناس بافتہ براو عرض نکردو برخود داشت " اس باب میں سب سے پہلے وہ خطبہ ہے جو ایک امیر کے حکم پر حکیم احسن اللہ خاں کے واسطے سے لکھا گیا۔ اس کے شروع میں اخلاقی مضامین ہیں، دنیا کی ناپائیداری اور بے وفائی کا ذکر ہے۔ پھر اس کا اظہار ہے کہ میں نے وابستگان دولت کے لئے کیا کیا۔ لکھا ہے کہ پریشانیاں اُٹھائی ہیں۔ اس کے بعد

طب میں کمال حاصل کرنے کا ذکر کیا ہے ــــ اس کے بعد دیباچہ تقویم ہے جو ہندؤوں کے طرز تحریر پر لکھا گیا ہے ۔اس میں علم نجوم وغیرہ کی باتیں ہیں ۔اس میں یہ ظاہر کیا ہے کہ آنے والے حالات پریشانی ، خرابی اور افراتفری پر مشتمل ہوں گے ــــ اس کے بعد تین دیباچے اور ہیں جو مختلف سالوں کی تقویم پر لکھے گئے ہیں ۔ان میں نجوم کی باتیں ہیں اور حالات کے خراب ہونے کی پیش گوئی ہے ۔آخری دیباچے میں جو تقویم ایک ہزار دوسو باون سال ہجری پر لکھا گیا ہے ، ہندی ، پارسی اور انگریزی تقویم کا ذکر ہے ۔نجوم وفلکیات کے بارے میں اظہار خیال ہے ۔آخر میں علم وفضل کی وضاحت اور ناقدری اور سیہ بختی کا گلہ ہے ۔ یہ بھی لکھا ہے کہ نجوم کے حساب سے خرابیاں ہی خرابیاں ہیں ــــ اس باب میں وہ تقریظ بھی شامل ہے جو مومن نے شیفتہ کے گلشن بے خار پر لکھی تھی ــــ اس میں نواب صاحب کے علم وفضل ، شعر گوئی اور شعر فہمی ، نثر نگاری اور اعلیٰ اخلاق کی تعریف کی ہے اور "انتخاب دل پسند بے بدل" سے گلشن بے خار کی تاریخ نکالی ہے ۔

اس کتاب کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :-

الحمد للہ والمنۃ کہ انشاء مومن خاں در ماہ رمضان المبارک ۱۲۷۱ھ در مطبع سلطانی واقع ارک خاقانی پیرایۂ طبع پوشید تمت بالخیر۔ کتبہ العبد المذنب محمد بخش غفرلہ[۱]

۱؎ انشائے مومن : ط ۲۵۶

مومن کی غزل

مومن نے یوں تو تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اور ان میں سے ہر ایک میں اپنا ایک مخصوص رنگ نکالا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں — اس صنف کو انھوں نے بڑی خوش اسلوبی سے برتا ہے، اور ایمان کی بات یہ ہے کہ ان کے جوہر اسی صنف میں کھلتے ہیں — بات یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے صحیح ماحول میں پرورش پائی ہے اور ان کی ذہنی اور جذباتی نشوونما میں اس مخصوص تہذیبی اور معاشرتی ماحول کا ہاتھ ہے جس نے غزل کی صنف کو پیدا کیا ہے، اور جو خود غزل کے ہاتھوں پیدا ہوا ہے۔ — یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل میں اس تہذیب اور معاشرت کا مزاج پوری طرح بے نقاب ہے جس کے سائے میں انھوں نے زندگی بسر کی ہے، اور جس کی بنیادی خصوصیات خود ان کے مزاج میں پوری طرح رچی ہوئی نظر آتی ہیں — لیکن اس صورتِ حال نے ان کی غزل میں عمومیت، یکسانیت اور یک رنگی نہیں پیدا کی ہے۔ وہ ایک بڑی انفرادیت کے مالک تھے اور ان کی شخصیت کی یہ انفرادیت ان کی غزل میں بھی اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ محض قافیہ پیمائی کی شاعری نہیں ہے۔ اس میں تو ان کے ذاتی اور

انفرادی تجربات کا لہو دوڑا ہوا ہے۔ اسی لئے اس میں ایک نئی زندگی نظر آتی ہے اور ایک نیا رنگ روپ دکھائی دیتا ہے، جو قدم قدم پر دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اُن کے انفرادی اور ذاتی تجربے کی صداقت صحیح جمالیاتی اقدار کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر اُن کی غزل کو ایک کرشمہ بنا دیتی ہے جو دیکھنے والے کے دل کو لبھاتا ہی نہیں اُس کو چونکاتا بھی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مومن کی غزل میں بہ اعتبارِ مضامین و موضوعات وُسعت اور ہمہ گیری، تنوع اور رنگا رنگی نہیں ہے۔ وہ بڑی حد تک محدود ہے۔ اُس میں تو صرف حسن و عشق اور اُس کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ہے ـــ اور اس ترجمانی میں بھی کسی خاص مفکرانہ گہرائی کا پتہ نہیں چلتا ـــ بس جذباتی زندگی کے بہت ہی عام معاملات ہیں جن کو مومن نے اپنا موضوع بنایا ہے لیکن اس موضوع میں بہ ذاتِ خود بڑی وُسعتیں ہیں۔ مومن نے اپنے رنگا رنگ تجربات سے اس کو کچھ اور بھی وسیع اور ہمہ گیر بنا دیا ہے۔ اور یہی اُن کا سب سے بڑا کمال ہے کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع کو، جو بہت عام ہے، اور جس کو ہر شاعر اپنی غزلوں میں پیش کرتا رہا ہے ایک ایسی صورت دی ہے کہ اُس کی وسعت اور ہمہ گیری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مومن صرف حُسن و عشق کے شاعر ہیں اور یہی اُن کی غزلوں کا بنیادی موضوع ہے۔ لیکن اُن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان موضوعات سے متعلق اَن گنت تجربات کو کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اُن کے ذاتی اور انفرادی تجربات بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن ساتھ ہی اُن میں عام انسانوں کے تجربات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومن نے اپنی آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے ـــ اور حُسن و عشق کی دُنیا میں جو کچھ بھی ہو سکتا ہے، جو واقعات بھی ظہور میں آ سکتے ہیں، جن معاملات سے بھی انسان دوچار ہو سکتا ہے، جو کیفیات بھی اُس پر طاری ہو سکتی ہیں ـــ اُن سب کی تفصیل مومن نے اپنی غزلوں میں پیش کی ہے۔ اسی لئے باعتبار موضوع محدود ہونے کے باوجود یہ غزلیں اپنے دامن میں وسعت رکھتی ہیں اور ان میں تنوع اور رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے۔ مومن اسی دنیا کے انسان تھے، اور انھوں نے اپنی زندگی صورت پرستی، شاہد بازی اور عشق و عاشقی میں گزاری تھی یہی وجہ ہے کہ اُن کے اِن تجربات میں حقیقت اور واقعیت کا رنگ

نمایاں نظر آتا ہے اور ساتھ ہی تنوع اور رنگا رنگی کے پہلو اُبھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔
یہ ان گنت تجربات جن کی تصویر کشی مومنؔ نے اپنی غزلوں میں کی ہے اُس روایتی انفعالیت پسندی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے جو اردو غزل کی روایت میں عام رہی ہے۔ ان میں تو مجموعی طور پر وہ رنگ و آہنگ ملتا ہے جس کی تشکیل ایک صحت مند ذہن کی فعال پسندی ہی کر سکتی ہے۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی مومنؔ کو بہت عزیز ہے۔ وہ اس کو بسر کرنا جانتے ہیں۔ اُس کے مختلف پہلوؤں سے لطف اندوز ہونا انھیں آتا ہے۔ وہ اُس کی مسرتوں کے شیدائی ہیں ــــــ اور ان مسرتوں سے سینہ بھر لینے کو وہ بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں سے رس نچوڑنا؛ اُن کے نزدیک بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور وہ اس سلسلے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزلوں میں شگفتگی اور شادابی کی چاندنی سی کھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ (کبھی کبھی اس چاندنی کو غم کے بادل آنکھوں سے اوجھل ضرور کر دیتے ہیں لیکن غم کے ان بادلوں کے پیچھے اس چاندنی کا وجود باقی رہتا ہے، اور وہ ان غزلوں میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتی رہتی ہے) بلکہ یہ منظر تو اُن کی غزلوں میں کچھ زیادہ ہی دل موہ لینے والا ہوتا ہے جب شگفتگی اور شادابی کی یہ چاندنی غم اور احساس غم کے پردوں میں سے جھانکتی ہے۔ مومنؔ کے یہاں غم اور احساسِ غم ضرور ہے لیکن وہ اتنا شدید نہیں ہے کہ اُن کی غزلوں کی مجموعی فضا کو تمام تر تاریک بنا دے۔ یہ غم اُن کے یہاں مسرتوں سے آنکھ مچولی سی کھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مناظر بھی مجموعی طور پر اُن کی غزلوں میں حسن ہی کی ایک فضا کو پیدا کرتے ہیں۔ اور ان سے زندگی کا احساس بڑھتا ہے۔ اس کو بسر کرنے کے خیال میں اضافہ ہوتا ہے، اور وہ کچھ زیادہ ہی رنگین اور پُر کار نظر آنے لگتی ہے۔ اسی لئے اُن کے یہاں قنوطیت کا گزر نہیں ہوتا۔ یاسیت اُن کی غزلوں کے پاس نہیں کھٹکتی۔ اُس میں بیزاری کا ماحول نام کو بھی نہیں ملتا۔ وہ تو جینا سکھاتی ہیں اور دلوں میں ولولہ و شوق کی بجلیاں سی بھرتی ہیں۔ اُن میں تو زندگی حسن اور حسن زندگی سے عبارت ہے۔ وہ تو محبوب کو ایک منبع نور اور سرچشمہ کیف و سرور بنا کر پیش کرتی ہیں۔ اُن میں تو عشق انسان کا ایک عام جذبہ ہی نہیں بلکہ عالم سرخوشی میں ایک ایسی لغزش مستانہ ہے، جو نہ جانے اُس کو

کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

بات یہ ہے کہ مومن کی غزل اُن کی شخصیت کی صحیح آئینہ دار ہے، اُن کا مخصوص مزاج اُس میں پوری طرح بے نقاب نظر آتا ہے۔ وہ حسن کے شیدائی تھے۔ اُنھوں نے اپنے آپ کو صورت پرست کہا ہے۔ اُن پر ساری زندگی ایک سرخوشی کی سی کیفیت طاری رہی۔ عشق کی لغزشِ مستانہ ہی کو اُنھوں نے زندگی سمجھا اور وہ اسی عالم میں زندگی بسر کرتے رہے۔ اُن کی غزل میں شخصیت کے یہی رنگ رچے ہوئے ہیں۔ اُن کی مخصوص جذباتی اور ذہنی کیفیت کا عکس ان غزلوں میں نظر آتا ہے اور ان سے اس کیفیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اُن کی زندگی کے بعض اہم واقعات کی طرف بھی ان غزلوں میں بہت واضح اشارے مل جاتے ہیں۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ ان غزلوں سے اُن کے حالات کا سُراغ لگایا جاسکتا ہے۔ بعض مقامات تو ان غزلوں میں ایسے آتے ہیں جہاں وہ خود اپنے آپ کو پوری طرح بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اُن کی اُفتادِ طبع، ذہنی رجحانات، افکار و خیالات اور عقائد و توہمات، سب کی ایک مکمل تصویر ان غزلوں میں نظر آتی ہے۔ کہیں تو انھوں نے بالواسطہ طور پر اشاروں اور کنایوں، علامتوں اور تمثیلوں میں زندگی اور شخصیت کے ان پہلوؤں کو پیش کیا ہے اور کہیں براہِ راست ان کی وضاحت کی ہے۔ اُن کی غزلوں کے مقطعے اس اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتے ہیں۔ اُن میں مومن کی شخصیت، اُن کے مزاج کی کیفیت اور اُن کی طبیعت کے انداز سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ۔۔ اور یہ پہلو اُن کی غزلوں میں وہ انفرادی شان پیدا کرتا ہے جو عام غزل گو شعرا کو ذرا مشکل ہی سے نصیب ہوتی ہے۔

مومن محسوسات کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں فکر نہیں ہے۔ اسی لئے اُن کی غزلوں میں ذہن کم ملتا ہے۔ انفرادی زندگی کے داخلی اور محسوساتی پہلوؤں کی ترجمانی، اُن کا خاص میدان ہے۔ تصوف کے راستے سے یہ فکری اور فلسفیانہ پہلو غزل میں داخل ہو جاتا ہے لیکن مومن کو تصوف سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف اور فلسفہ سے اُن کی غزل خالی ہے۔ البتہ محسوسات کے راستے سے کہیں کہیں اُنھوں نے اپنے زمانے کے بعض اجتماعی معاملات کی ترجمانی ضرور کی ہے، اور اُس وقت کے عام انتشار اور افراتفری کو

پیش کیا ہے ــــ ہرچند کہ زندگی کے اجتماعی پہلوؤں کی یہ ترجمانی اُن کے یہاں غزل کے عام اشاروں اور کنایوں میں ملتی ہے لیکن اس کی تہہ تک پہنچنے اور اُن کے اصل مفہوم سے آشنا ہونے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آتی۔ مومنؔ اپنے آس پاس اور گردوپیش کی زندگی کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اُن کے سامنے اُس آشوبِ قیامت کا پورا نقشہ موجود تھا جس سے اُن کے زمانے کی اجتماعی زندگی دوچار تھی ــــ مومنؔ اس صورتِ حال سے خود بھی متاثر ہوئے ہیں، اور اُنھوں نے اس سے دوسروں کو بھی متاثر ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ اسی لئے اس کی جھلکیاں اُن کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں نمایاں ہوگئی ہیں۔ زمانے کا غم، اپنی عظمتوں کے فنا ہوجانے کا احساس، پامال اور پابہ زنجیر ہونے کا خیال، ایک عالمِ کس مپرسی اور بےبسی سے باہر نکلنے کی خواہش، انقلاب کی تمنا، کچھ کرنے کی آرزو ــــ اجتماعی زندگی کے یہ تمام پہلو اُن کی غزلوں میں جگہ جگہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں ــــ اور اُن سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مومنؔ ایک اجتماعی شعور رکھتے تھے۔ اور اسی کی بدولت اُن کی غزلوں میں اُس زمانے کی زندگی کے اجتماعی معاملات کی ترجمانی اور عکاسی نظر آتی ہے۔ ہرچند کہ اس ترجمانی اور عکاسی میں وہ کوئی فکری گہرائی پیدا نہیں کرسکے ہیں۔ کیونکہ اس میں محسوسات کا پہلو غالب ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کی وجہ سے اُن کی غزل زندگی اور زمانے کی مزاج دانی کے شعور سے آشنا ہوئی ہے اور اس طرح اُس میں اُس زمانے کے عمرانی معاملات کو سمجھنے کا رجحان پیدا ہوا ہے۔

(فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی مومنؔ کی غزل ایک امتیازی شان رکھتی ہے۔ اُنھوں نے نہ صرف غزل کے بنیادی اصولوں کو اپنی غزل میں برتا ہے بلکہ اُن میں کچھ اضافے بھی کئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل میں ایک نیا انداز ملتا ہے اور وہ اپنے ایک مخصوص رنگ و آہنگ سے پہچانی جاتی ہے۔ اُس میں داخلیت اور خارجیت کا حسین اور متوازن امتزاج ہے محسوساتی اور جسمانی پہلو نے اُس میں بڑی رنگینی اور رچاؤ کی کیفیت پیدا کی ہے ــــ تخئیل کی رنگین کاریوں نے اُس کو حد درجہ رنگین اور پُرکار بنا دیا ہے۔ اُس میں ہر بات ایک نئے انداز سے کہی گئی ہے اور ہر خیال ایک نئے زاویے سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی لئے اُس میں جدّت اور اُپج کا پہلو اتنا نمایاں نظر آتا ہے۔ اشارے اور کنائے اُس میں بڑا کام کرتے ہیں اور

اُن کی بدولت رمزیت اور ایمائیت کی صحیح فضا اُس میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک مخصوص لب و لہجہ اُس میں خاصے کی چیز ہے۔ اس لب و لہجہ نے اس میں بڑی تہہ داری اور تیکھے پن کو پیدا کیا ہے۔ زبان اُس میں بڑے سلیقے سے استعمال کی گئی ہے۔ اس زبان میں بڑی سادگی اور صفائی، بڑی شگفتگی اور شادابی، بڑی حلاوت اور شیرینی ہے۔ الفاظ کے صحیح اور متناسب استعمال نے اس میں کچھ عجیب گُل کاریاں کی ہیں ـــــ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بڑی ہی دلکش اور دل آویز نظر آتی ہے اور اُس کا اثر براہِ راست حواس پر ہوتا ہے۔ وہ دلوں میں اُترتی اور روح پر سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔

اُردو غزل کی روایت میں مومن کی غزل ایک نرالی شان سے جلوہ گر ہے۔ موضوع اور فن دونوں اعتبار سے وہ اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتی ہے۔ اس میں ایک ایسے انسان کے جذباتی اور ذہنی تجربات کی تفصیل ہے جو زندگی کو عزیز رکھتا ہے اور اُس کو برتنا اور بسر کرنا جانتا ہے۔ جس کو یہ زندگی بڑی ہی رنگین اور پُرکار، بڑی ہی دلکش اور دل آویز نظر آتی ہے۔ مومن کی غزل اسی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ان گنت تصویروں کا نگارخانہ ہے ـــ ان میں سے ہر تصویر ایک نئی آن بان اور ایک نئی سج دھج رکھتی ہے۔ اس کے خطوط بہت ہی تیکھے اور رنگ بہت ہی شوخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل دلکش اور جاذب نظر ہونے کے ساتھ ساتھ چونکاتی بھی ہے اور اس کا اثر دل و دماغ دونوں پر بہت گہرا ہوتا ہے۔ وہ صرف جذبات میں ارتعاش ہی پیدا نہیں کرتی۔ اُن کو تحریک ہی نہیں لاتی۔ اُن کی تہذیب کا اہم کام بھی انجام دیتی ہے۔ وہ خود بھی بہت مہذب ہے۔ تہذیب کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں کے ساتھ اُس کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ ایک عظیم تہذیب کی روح اُس میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔ دراصل وہ اسی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو مختلف روپ میں پیش کرتی ہے، اور اس صورت حال نے خود اُس کو ایک تہذیب بنا دیا ہے۔

(۲)

مومن کی غزل میں جو انفرادی شان ہے اُس کے خط و خال کا صحیح اندازہ اُس پس منظر ہی میں ہو سکتا ہے جس میں اُس نے آنکھ کھولی ہے اور جو کسی نہ کسی زاویے سے اُس پر

اثر انداز ہوتا رہا ہے --- اس پس منظر کی تشکیل و تعمیر اُردو غزل کی روایت اور تجربے کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ مومن کی غزل کے لئے روایت اور تجربے کی اس مجموعی فضا سے دامن بچانا مشکل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اپنی ایک مخصوص انفرادیت رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنی ایک الگ دنیا بھی بنا لی ہے۔ طبعًا ان کے لئے کسی کا اثر قبول کرنا بھی مشکل تھا۔ لیکن زندگی اور ادب دونوں میں وراثت اور ماحول کا جادو سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ کوئی اگر شعوری طور پر ان سے اثرات قبول نہ کرے تب بھی یہ اثرات مختلف راستوں سے اُس میں داخل ہو جاتے ہیں اور شاعر کی شخصیت اور شاعری دونوں میں اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بظاہر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وراثت اور ماحول کا کسی پر کتنا اثر ہے لیکن اگر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا جائے تو شاعری کے اجزاء خود ان اثرات کی نشان دہی کرنے لگتے ہیں۔ انفرادیت تک کی تشکیل میں ان اثرات کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی کی انفرادیت بھی خلا میں تشکیل نہیں پاتی۔ اُس کی کوئی نہ کوئی بُنیاد ہوتی ہے۔ مومن کی اس انفرادیت کی تشکیل میں بھی وراثت اور ماحول کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہر چند کہ اُنھوں نے اس سے شعوری طور پر اثر قبول نہیں کیا ہے لیکن غیر شعوری طور پر وہ ان سے ضرور متاثر ہوئے ہیں اور ان کے اثرات اُن کے یہاں کسی نہ کسی زاویے سے اپنی جھلک ضرور دکھاتے ہیں۔

اُردو غزل کی روایت کا سنگ بنیاد ولی نے رکھا، اور نہ صرف اس صنف کو اُردو سے روشناس کرایا بلکہ اس میں اضافے بھی کیے۔ ولی کی غزلوں میں خارجیت پسندی کا رُجحان ہے اور اس خارجیت پسندی ہی کا نتیجہ ہے کہ اُس میں ظاہری حسن کے بیان کی طرف بھی توجہ ملتی ہے لیکن اس بیان کی نوعیت حسیاتی ہے۔ اسی لئے اُن کی غزلوں میں اِس حسن اور حُسنِ نظر کے تمام پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ اِس حسن اور احساسِ حُسن ہی نے ولی کو پوری طرح جمال پرست بنا دیا ہے۔ اور وہ اپنی بیشتر غزلوں اور غزلوں کے اشعار میں اسی حُسن و جمال کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ اس حسن کا بیان اکثر اُن کے یہاں سراپا نگاری کی صورت بھی اختیار کر لیتا ہے، اور اس میں شُبہ نہیں کہ اُنھوں نے اعلیٰ درجے کی سراپا نگاری کی ہے --- اُن کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اپنی اس سراپا نگاری کو صرف مشاہدے ہی تک محدود نہیں رکھا ہے۔ بلکہ اُس کو

محسوسات کے سانچے میں ڈھالا ہے ۔۔ اور اکثر جگہ تو ایسا ہوا ہے کہ اُنھوں نے اپنی اس خارجیت پسندی کو داخلیت پسندی کے ساتھ کچھ اس طرح شیر وشکر کر دیا ہے کہ دونوں کا الگ الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اُن کے یہاں کہیں کہیں عشقیہ واردات وکیفیات کی ترجمانی کے بھی بعض بہت اچھے نمونے ملتے ہیں اور اُن میں تمام تر داخلی رنگ و آہنگ نظر آتا ہے۔ اس سے ملی جلی عشقیہ معاملات کی ترجمانی بھی اُن کے یہاں موجود ہے۔ لیکن ان کے دوش بدوش تصوف کے اسرار ورموز بھی اُن کے یہاں گھُلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک صوفی شاعر کے یہاں جمال پرستی اور معاملہ بندی کے پہلوؤں کا اس طرح نمایاں ہونا بہت عجیب معلوم ہوتا ہے لیکن بہر حال ولی نے ان سب کو یکجا کیا ہے اور اس اعتبار سے وہ منفرد ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے جمالیاتی اظہار کے بعض نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ اُنھوں نے فارسی غزل کی روایت سے استفادہ کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُس میں اپنے نئے انداز بیان اور طرز اظہار سے اضافہ بھی کیا ہے ۔۔ اسی لئے تو اُردو غزل کی روایت میں اُن کی آواز بھی اچھوتی اور نئی معلوم ہوتی ہے۔

ولی کی غزل کے اثرات اس زمانے میں شمالی ہندوستان کے بیشتر شعرا نے قبول کئے۔ شاید ہی کوئی اُن کے اثر سے بچا ہو ۔۔۔ یہ اثرات بہت نمایاں تو نظر نہیں آتے لیکن ولی کے بعد غزل کی روایت کو جن شاعروں نے برتا ہے، اُن کے اسالیب میں اس کی جھلکیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ مثلاً سودا ولی سے متاثر نہیں ہیں لیکن غزل کی جو روایت ولی کے ہاتھوں قائم ہوئی ہے اُس کا اثر اُن کی غزلوں میں موجود ہے۔ اُن کے یہاں خارجیت کو غزل کے مزاج کے ساتھ ہم آہنگ کرنے اور گوارا بنانے کا جو تجربہ ملتا ہے اُس کی بنیاد وہی روایت ہے جو ولی نے قائم کی تھی۔ سودا کو عام طور پر لوگ غزل کا اہم شاعر نہیں سمجھتے حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اُنھوں نے غزل کی روایت میں بعض بہت ہی اہم اضافے کئے ہیں۔ اُن کے یہاں موضوعات کا جو تنوع ملتا ہے، اور اُن موضوعات کو پیش کرنے میں وہ جو ایک نشاطیہ آہنگ نظر آتا ہے، وہ سودا ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس نشاطیہ آہنگ کے ساتھ سودا نے انسانی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کی ترجمانی بڑی خوش اسلوبی سے

کی ہے۔ اُن کی قادرالکلامی نے غزل کی روایت کو بڑی رچی ہوئی شکل میں پیش کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُن کی غزل میں نہ صرف غزل کی روایت اپنی اصل صورت میں رونما ہوتی ہے بلکہ اُس میں کچھ اضافے بھی نظر آتے ہیں۔ سوداؔ کے یہاں تخیّل کا کمال ہے، اور اسی تخیّل کی بدولت اُن کی غزل میں ایک طرف تو وسعتیں پیدا ہوئی ہیں اور دوسری طرف رنگینی اور رچاؤ کے پہلو نمایاں ہوئے ہیں۔

غزل کی اس روایت میں دردؔ کی شاعری بھی اضافے کا باعث بنی ہے۔ کیونکہ انھوں نے تصوّف کو تغزل کے سانچے میں ڈھالنے کا اہم تجربہ کیا ہے اور اس طرح نہ صرف باعتبار مضامین و موضوعات اُردو غزل کی روایت میں وسعتیں پیدا کی ہیں بلکہ اظہار و ابلاغ کے نئے رستوں کا سراغ بھی لگایا ہے۔ اُن کے یہاں انسانی زندگی کے بنیادی حقائق کا شعور بھی ملتا ہے۔ اور وہ صوفی ہونے کے باوجود انسانی رشتوں کو سمجھتے ہیں۔ اُن کے یہاں انسانی اقدار کا خیال بھی موجود ہے۔ انسان دوستی کی فضا بھی اُن کی غزلوں میں بہت نمایاں ہے وہ عام انسانی سطح پر بات کرتے ہیں یہی لئے اُن کا لہجہ سیدھا سادہ ہے۔ اور اُن کی لے میں کوئی پرپیچ کیفیت نہیں پائی جاتی۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کو آسان زبان اور آسان زبان کو شاعری بنا دیا ہے۔

میرؔ کے یہاں بھی اُردو غزل کی یہ روایت بعض اہم تجربات سے آشنا ہوتی ہے۔ اُن کی غزل میں انسانی زندگی کے داخلی اور جذباتی معاملات کی ترجمانی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اپنے دل پر بیتی ہوئی کیفیات کو غزل کے سانچے میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل سوز و گداز کا ایک مرقع بن گئی ہے اور اُس میں مجموعی طور پر ایک غنائی آہنگ پیدا ہوگیا ہے۔ یہ غنائی آہنگ اُن کی غزل کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔ غزل کی روایت کے لئے یہ خصوصیت بالکل نئی تھی اور اُس سے اُردو غزل کو آشنا کرنے کا سہرا میرؔ ہی کے سر ہے۔ میرؔ زندگی کی محرومیوں کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے ان محرومیوں کو حقیقت بنا کر کچھ اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اُن کی ذاتی اور نجی باتیں ہونے کے باوجود عام انسانوں کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کے یہاں غم اور غم کا جو عرفان ہے وہ انسان کے لئے اجنبی اور

نامانوس نہیں ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مجموعی طور پر اُن کی غزل میں حزن و یاس کی ایک فضا چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور اسی وجہ سے انفعالیت پسندی کا میلان بھی اُس میں بہت نمایاں ہے۔ اس میں زندگی کی مسرتوں کا خیال نسبتاً کم ہے۔ اُس کی المناکیوں کا بیان زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود میر نے انسان کی بلندی اور انسانیت کی برتری کے گیت گائے ہیں۔ انسانی زندگی کی عظمت کا احساس اُن کے یہاں بہت نمایاں ہے ___ اجتماعی زندگی کا سماجی شعور بھی کہیں کہیں اُن کی غزلوں میں اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ اور وہ اس زمانے کی زندگی کے عام انتشار اور افراتفری کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں کہ صنف غزل کے کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس نہیں لگتی ہے ___ میر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غزل کی صنف کے مزاج کو پوری طرح سمجھا ہے، اور ان موضوعات کو پیش کرتے ہوئے صنف غزل کے بنیادی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ غزل کے اسلوب کی روایت اُن کے یہاں بڑی رچی ہوئی صورت میں ملتی ہے لیکن اُنھوں نے اپنے آپ کو یہیں تک محدود نہیں کیا ہے۔ اُنھوں نے اسلوب کی اس روایت میں وسعت اور کشادگی پیدا کی ہے ___ غزل کے عام اشاروں اور علامتوں سے بھی اُنھوں نے بڑے بڑے کام لئے ہیں، اور نئی علامتوں اور اشاروں کی تخلیق کر کے اُن کو استعمال بھی کیا ہے۔ یہ علامتیں انھوں نے اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے لی ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میر نے غزل کی ایک زبان بھی پیدا کی ہے جس میں غضب کی حلاوت اور شیرینی ہے۔ اُن کا لب و لہجہ بھی خاصے کی چیز ہے جس کے تیور نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ان تمام باتوں نے مل کر میر کی غزل کو اُردو غزل کی روایت میں بڑی نمایاں حیثیت دے دی ہے۔

ایک اور اہم شاعر جس نے کم و بیش اسی زمانے میں اُردو غزل کی روایت میں اضافہ کیا ہے وہ جرأت ہے۔ جرأت کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ وہ غزل کے اچھے شاعر نہیں تھے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جرأت نے اُردو غزل میں قابل قدر اضافے کئے ہیں معاملہ بندی اُن کا خاص میدان ہے اور اس سلسلے میں انسان کی جذباتی اور جنسی زندگی کے جو مرقعے اُنھوں نے پیش کئے ہیں وہ اُردو غزل کی روایت میں کہیں اور نہیں ملتے۔ اُن کے یہاں زندگی کے رنگین اور لطیف پہلوؤں کا بیان زیادہ ہے۔ اس بیان میں تفصیل و جزئیات

کا حسن ہے اور اس تفصیل و جزئیات کی نوعیت حسیاتی ہے۔ یوں جرأت کے یہاں غم کا بیان بھی ملتا ہے اور کلام کے خاصے بڑے حصے میں زندگی کے انفعالی پہلوؤں کی ترجمانی بھی نظر آتی ہے لیکن یہ اُن کا خاص میدان نہیں ہے۔ اُن کا میدان تو حسن اور حسن پرستی ہے۔ وصل اور متعلقات وصل کے معاملات ہیں۔ خواہش پرستی اور شاہد بازی ہے ــــ اور انسانی زندگی کے ان پہلوؤں کو اُنھوں نے خارجی اور حسیاتی زاویہ نظر سے اپنی غزلوں میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں غزل کی سیدھی سادی شاعری ہے جس میں رنگینی اور رعنائی کا رنگ غالب ہے اور ایک نشاطیہ پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ لذت پسندی اور تعیش پرستی اُس کی بنیاد ہے لیکن اس کی نوعیت بڑی حد تک ذہنی ہے ــــ جرأت نے انھیں موضوعات کی نسبت سے غزل میں ایک نیا اسلوب بھی پیدا کیا ہے۔ اس اسلوب میں خارجیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اسی پر جرأت کے فن کی بنیادیں استوار ہیں۔ اُن کے یہاں رمزیاتی اور ایمائی فضا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ کھل کر بات کرتے ہیں۔ اشاروں اور کنایوں کی زبان میں اظہار نہیں کرتے ــــ اُن کے اظہار و بیان کا حسن تو توضیحی اور بیانیہ انداز میں ہے ــــ بات یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل میں حواس کی شاعری کی ہے اور حواس کے لئے جو شاعری کی جاتی ہے اُس کے لئے توضیح و تفصیل درکار ہے۔ جرأت کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اس توضیح و تفصیل میں بڑے شوخ اور تیکھے رنگ بھرے ہیں اور اس طرح غزل کی صنف کو رنگینی اور پُرکاری، شگفتگی اور شادابی سے آشنا کیا ہے۔

جرأت کے بعد اُردو غزل کی اس روایت نے دلّی اور لکھنؤ دونوں میں کچھ نئی صورتیں اختیار کی ہیں۔ دلّی میں ایک طرف تو شاہ نصیر اور ذوق کے ہاتھوں اُس میں مشکل پسندی مضمون آفرینی، اور زبان کو صحت اور صفائی کے ساتھ استعمال کرنے کے رجحانات پیدا ہوئے ہیں اور دوسری طرف غالب کی عظیم شاعرانہ شخصیت نے اس کو معنوی اور صوری دونوں اعتبار سے وسعت دی ہے۔ شاہ نصیر اور ذوق اپنی اپنی جگہ اہمیت تو رکھتے ہیں لیکن اُن کے اثرات اُردو غزل کی روایت پر دیرپا اور دور رس نہیں ثابت ہوئے۔ برخلاف اس کے غالب نے اس روایت میں نئی زندگی پیدا کی اور اس کو بعض بالکل ہی نئے رجحانات سے آشنا کیا۔ اُنھوں نے

غزل کی صنف میں وسعتیں پیدا کی ہیں۔ حسن و عشق جو اُن کی غزل کا اہم جزو ہے۔ خود اس کے نہ جانے کتنے رُوپ اُنھوں نے دکھائے ہیں۔ اُن کے یہاں حُسن و عشق کے اَن گنت اسرار و رموز کُھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس میں عشق کا نشاطیہ پہلو بھی ہے، اور اُس کے غم کا عرفان بھی۔ــــ غالب نے اس نشاط اور غم دونوں کو زندگی کے بُنیادی حقائق بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی لئے اِن میں بُنیادی طور پر ایک انسانی رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے اور آفاقیت کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غالب نے انسانی زندگی کی محرومیوں کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے، کہ اُن کے خیال میں یہ اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے انسان کو عظیم ثابت کیا ہے اور اس کی عظمت کے گیت گائے ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کے یہاں ایک اجتماعی شعور بھی ملتا ہے اور اُس زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی مسائل کی تصویر کشی بھی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں غالب نے بڑی بصیرت کا اظہار کیا ہے۔ مجموعی طور پر غالب نے اُردو غزل کی روایت کو ایک مفکرانہ رنگ و آہنگ سے بھی آشنا کیا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اُن کی غزل اپنے فلسفیانہ مزاج سے پہچانی جاتی ہے۔ فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بھی اُنھوں نے غزل کو وسیع کیا ہے اور اُس میں بعض جدتیں پیدا کی ہیں۔ وہ ناز و غمزہ کی گفتگو دشنہ و خنجر اور مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر میں کرتے ہیں۔ اُنھوں نے غزل کی مروجہ علامتوں کو نئی معنویت میں استعمال کیا ہے اور اس کے لئے نئی علامتوں کی تخلیق بھی کی ہے۔ اس میں غالب کی تخئیل نے بڑے کمال دکھائے ہیں۔ اور اُن کے فن میں کچھ عجیب گل کاریاں کی ہیں۔ فارسی زبان کی رنگینی نے اس کے لئے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے اور اس کی بدولت اُن کی غزل میں بڑی رنگین اور پُرکاری سی فضا پیدا ہوئی ہے۔ غرض غالب نے مجموعی طور پر غزل میں بعض نئے تجربات کئے ہیں اور اُن کے تجربات سے اُردو غزل کی روایت بعض نئے حالات سے روشناس ہوئی ہے۔

لکھنؤ میں اگرچہ اُردو غزل کی روایت میں کوئی خاص قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہوا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غزل کی صنف کو نوک پلک سے درست کرنے میں لکھنؤ کے غزل گو شاعر ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں، اور غزل کے اسلوب میں نئے نئے پہلوؤں کا پیدا کرنا اُن اہم کارنامہ ہے۔ ناسخ اور آتش دونوں کا مرتبہ اس اعتبار سے بہت بلند ہے۔ ناسخ نے غزل کے اسلوب

کو خوب مانجھا ہے اور باوجود اس کے کہ اُن کے یہاں جذبہ شدید نہیں ہے، وہ اپنی غزل میں ایک ترشی ہوئی کیفیت کو پیدا کرنے میں خاطر خواہ کامیاب ہوئے ہیں۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا اسلوب دیا ہے۔ اُس کے لئے ایک نئی زبان بنانے کا تجربہ کیا ہے اور اس تجربے سے واقعی غزل کی ایک نئی زبان تیار ہوئی ہے۔ ناسخ کے یہاں بلاشبہ اسلوب اور فن کی شاعری ہے۔ رطب و یابس اُس میں ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر اُس میں بڑا نکھرا اور ترشا ہوا انداز ہے۔ یہ سجی سجائی اور ڈھلی ڈھلائی شاعری ہے اور اُس پر بڑی محنت کی گئی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ اُس پر فن سے زیادہ ہنر کا گمان ہوتا ہے۔ آتش ذرا مختلف مزاج کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں ناسخ کے مقابلے میں جذبہ نسبتاً زیادہ شدید ہے اور اُن کی غزل میں جذبے کی اس صداقت نے بڑی جان پیدا کی ہے۔ اُن کی غزل میں زندگی کے اعلیٰ معیاروں کی ترجمانی بھی موجود ہے۔ رندی اور درویشی کے خیالات کو اُس میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ زندگی سے بے نیازی کے خیالات بھی اُس میں بہت نمایاں ہیں۔ انسان کی عظمت کا بھی اُس میں واضح تصوّر ملتا ہے لیکن آتش کا سب سے بڑا کمال اُن کے فن کا نکھار ہے۔ وہ شاعری کیا ہے اچھی خاصی مرصّع سازی ہے۔ الفاظ کی بندش اُس میں کچھ اس طرح نظر آتی ہے کہ اُس پر سلیقے سے جڑے ہوئے نگوں کا گمان ہوتا ہے۔ آتش کا اسلوب بھی ناسخ کے اسلوب کی طرح بہت ترشا اور نکھرا ہوا ہے اور اُس میں بھی سجی سجائی فضا نظر آتی ہے۔ ناسخ اور آتش کا یہ اسلوب اُردو غزل کی روایت میں اہم اضافے کا باعث بنا ہے کیونکہ اس نے اسلوب کو نکھارنے اور سنوارنے اور انداز بیان کو نوک پلک سے دُرست کرنے کی ایک فضا قائم کی ہے۔

مومن کے سامنے غزل کی روایت اور تجربے کا یہ تسلسل تھا اور وہ اس کے مختلف پہلوؤں سے پوری طرح آشنا تھے۔ اُن کی غزل نے اُس فضا میں آنکھ کھولی جو روایت اور تجربے کے اس تسلسل نے قائم کی تھی۔ اسی لئے اس کے اثرات اُن کی غزل نے قبول کئے۔ اور اُس کی انفرادیت انھیں اثرات کا نتیجہ ہے۔ اُن کی غزل میں جو خارجیت ملتی ہے اور اس خارجیت کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کا جو تجربہ نظر آتا ہے۔ وہ ولی، سودا اور جرأت کے یہاں موجود تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ان شعرا کے یہاں تجربہ روایت کا جزو بنتا ہوا نظر نہیں آتا۔

مومن نے اس کو پوری طرح غزل کے مزاج کا جزو بنا دیا ہے۔ اور وہ اُن کے یہاں اس کی روایت سے الگ نہیں معلوم ہوتا۔ مومن کے یہاں حُسن و عشق کے جو تصورات ملتے ہیں اُن میں ولی، سودا، میر، جرأت اور غالب کے اثرات اپنی جھلک دکھاتے ہیں لیکن اُن کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ حسن و عشق کے وہی تصورات پیش نہیں کرتے جو اُن کے پیش رووں نے پیش کئے ہیں اور جن میں بعض کا رجحان پوری طرح انفعالیت پسندی کی طرف ہے اور بعض فعالیت کی طرف جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً میر کی غزل کا سا سوز و گداز اُن کے یہاں نہیں ہے اور نہ جرأت کے کلام کی سی لذت پسندی اور عیش پرستی کی فضا ہے۔ اُن کی غزل میں تو زندگی کا غم اور اُس کا عرفان بھی ہے لیکن ساتھ ہی وہ لذیذ اور لطیف پہلوؤں کو بھی بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے یہاں ان دونوں کا متوازن امتزاج ملتا ہے۔۔۔ اُن کے یہاں فکری اور فلسفیانہ پہلو غالب نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ انسانی زندگی کے بنیادی حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انسان کی بلندی، برتری اور عظمت کا احساس ان کی غزل میں ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ میر اور غالب نے اس اعتبار سے اُن کی خاصی رہنمائی کی ہے، اور اُن کے یہاں کہیں کہیں اجتماعی شعور کی جو جھلک نظر آتی ہے، اُس میں بھی میر کی قائم کی ہوئی روایت کا ہاتھ ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ مومن کی غزل میں وہ جو ایک نکھار نظر آتا ہے اور ایک لطافت و نفاست ملتی ہے۔ اور زبان و بیان کی طرف جو وہ اس قدر توجہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اُس میں اُردو غزل کے لکھنوی دبستان کے علمبرداروں کا خاصا اثر ہے۔۔۔ ناسخ اور آتش اُن کے ہمعصر تھے اور اُنھوں نے غزل کو نوک پلک سے درست کرنے کی طرف جو توجہ کی اُس کو مومن نے بھی اپنے لئے شمع راہ بنایا ہے اور وہ اس راستے پر آگے بڑھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس طرح اُن کی غزل میں، ایک ہیرے کی طرح ترشی ہوئی کیفیت پیدا ہوئی ہے۔ غرض مومن نے اُردو غزل کی روایت کے ارتقائی مدو جزر کو اپنے سامنے رکھا ہے، اور غزل کی صنف میں جو نئے تجربات اُنھوں نے کئے ہیں اُن کا رشتہ اس روایت سے ضرور جوڑا ہے جو مختلف زمانوں میں مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی ہے۔ اسی لئے اُن کے یہاں غزل کے نئے تجربات روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور اُن میں کسی قسم کی اجنبیت اور ناموانست کا

احساس نہیں ہوتا۔ اُن کی انفرادیت ایک مضبوط بُنیاد رکھتی ہے۔ کیونکہ اُس کی جڑیں غزل کی روایت میں پیوست ہیں۔ وہ ایک ایسے تناور درخت کی طرح ہے جس کی سرسبزی و شادابی اُس زمین کی مرہونِ منت ہوتی ہے جس میں وہ جڑ پکڑتا اور پروان چڑھتا ہے۔ مومن کی غزل کے لئے یہ زمین اُردو غزل کی وہی روایت ہے جس پر اُن کی انفرادیت استوار نظر آتی ہو۔

(۳)

مومن نے اپنے آپ کو صورت پرست کہا ہے، اور اس میں شُبہ نہیں کہ یہ صورت پرستی اُن کے مزاج میں داخل تھی۔ چنانچہ اُن کی غزل میں بھی اُن کی اس صورت پرستی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ اُن کے یہاں حُسن پرستی کا رُجحان جو اتنا نمایاں ہے وہ اُن کی اسی صورت پرستی کا نتیجہ ہے۔ لیکن حُسن پرستی کا یہ رجحان صرف حُسن کے خارجی پہلوؤں کے بیان ہی تک محدود نہیں رہا ہے اس کے داخلی پہلوؤں کی طرف بھی اُنھوں نے توجہ کی ہے۔ اس طرح اُنھوں نے اپنی غزلوں میں حسن کی تمام تفصیلات پیش کی ہیں۔ ان تفصیلات میں سے اُن کے تصوّرِ حُسن کا ایک واضح پیکر اُبھرتا ہے۔ وہ حسن کا کوئی مجرّد تصوّر پیش نہیں کرتے۔ برخلاف اس کے حسن اور احساسِ حسن کو ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ کر کے پیش کرتے ہیں۔ حُسن اور حسنِ نظر دونوں کو اُنھوں نے اس طرح ایک لڑی میں پرو دیا ہے کہ ان کے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ اُن کے یہاں حُسن کے مشاہدے کے ساتھ محسوسات کا پہلو غالب نظر آتا ہے، اور وہ حسن کے ساتھ حسن کے ردِّعمل کی تفصیلات کو زیادہ پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کے یہاں حُسن عام حسن کے بجائے محبوب کا حُسن بن جاتا ہے۔ وہ اس کو محبوب کی ذات میں محدود کر دیتے ہیں، اور اُن کی غزل میں حُسن کے ساتھ محبوب اور محبوب کے ساتھ حسن کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس حُسن کے مختلف پہلوؤں کے مشاہدے سے صرف محظوظ ہی نہیں ہوتے اُس کی بدولت پیدا ہونے والے مختلف حقائق کو محسوس بھی کرتے ہیں۔ اور اُن کے یہاں حُسن سے زیادہ اُس حسن کا ردِّعمل نمایاں نظر آتا ہے۔ ویسے وہ حسن کے کسی پہلو کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اُس کے ایک ایک پہلو سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزل میں ان کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ حُسن کے ان مختلف پہلوؤں کو مومن نے مختلف زاویوں سے مختلف روپ میں دیکھا ہے۔ اور وہ

ان سے اس حد تک متاثر ہوئے ہیں کہ انھیں اپنا ہوش نہیں رہا ہے۔ وہ اُن میں کھوئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان پہلوؤں کو اپنے آپ میں جذب کر لیا ہے اور وہ خود ان میں جذب ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حُسن کے ساتھ اُن کی یہ والہانہ شیفتگی اُن کی غزل میں اکثر محسوسات کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ اور اُن کے حُسن کا یہ خارجی بیان بھی کیفیات کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے۔

اس حُسن پر مومنؔ کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے۔ وہ اُس سے متاثر ہوتے اور اس کو خود بھی متاثر کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حُسن کے مختلف پہلوؤں کا بیان اُن کے یہاں کاروبارِ شوق کی ایک داستان بن جاتا ہے۔ مومنؔ اس داستان کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ داستان خود بھی لذیذ سے لذیذ تر ہو جاتی ہے۔ مشاہدے کے ساتھ احساس اور جذبے کی ہم آہنگی اس میں ایک نیا لُطف پیدا کر دیتی ہے اور اس طرح حُسن اور اُس کے مختلف پہلوؤں کا یہ بیان گہرائی اور گیرائی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

مومنؔ نے اپنی غزلوں میں قد و قامت، زلف و گیسو، خمِ کاکل، لبِ نازک، چشمِ سرمہ سا، نزاکت آواز، خرامِ ناز، گل پیرہنی، شرم و حیا اور اس طرح کے اَن گنت پہلوؤں کے مختلف روپ دکھائے ہیں، اور اس طرح اُن میں نئے گوشوں کو تلاش کیا ہے، اور خود بھی کچھ نئے زاویے پیدا کئے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزل میں حسن کے ساتھ حسنِ نظر اور حسنِ احساس نے بھی خاصی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ مومنؔ نے اِن کے ساتھ اپنے حُسنِ بیان کو بھی شامل کر دیا ہے اور اس طرح ان سب کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

یہ حُسن کا بیان مومنؔ کی غزل میں کہیں بھی سراپا نگاری کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ حُسن کے مختلف پہلوؤں کو محض خارجی زاویۂ نظر سے نہیں دیکھتے۔ اُن کی داخلیت پسندی اُس میں شامل ہوتی ہے۔ مثلاً جب انھیں قد کا خیال آتا ہے اور وہ اُس کو بیان کرتے ہیں تو اُن کے یہاں یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے ؎

اُس قیامت قد کو شب دیکھا تھا ہم نے خواب میں
دل نے محشر کا سماں وقتِ سحر دکھلا دیا

یہاں مومنؔ قیامت قد کو دیکھتے بھی ہیں تو خواب میں اور اُس کے ظاہری پہلوؤں کی تعریف کرنے کے بجائے قیامت کی نسبت سے وقت سحر محشر کا سماں دیکھتے ہیں اور اس طرح قد کے ظاہری حسن کو بیان کرنے کے بجائے اپنی کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

مومنؔ کی غزل میں زلف و گیسوئے حسن کا بیان جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس بیان میں یقیناً خارجی زاویۂ نظر موجود ہے جب وہ اس قسم کے شعر کہتے ہیں ؎

دل جُدائی زلفِ جاناں کی نہیں　　　پیچ و تاب طرۂ شمشاد کیا

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں　　　لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

پاؤں تک پہنچی وہ زلف خم بہ خم　　　سرو کو اب باندھیے آزاد کیا

تو یقیناً زلف دراز کی تعریف کرتے ہیں، اور اس تعریف میں ان زلفوں کے حُسن کا خارجی پہلو سامنے آتا ہے لیکن یہ تعریف زلف ہی کی تعریف نہیں رہ جاتی بلکہ مجموعی طور پر محبوب کے حُسن کی تعریف ہو جاتی ہے۔ زلف کا حُسن تو اُس کے حُسن میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور اس بیان میں لطف و کشش اسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے ـــ لیکن زلف کا بیان اُن کے یہاں صرف یہیں تک محدود نہیں رہتا کیونکہ دیکھنے والے کی آتشِ شوق بھی اُس کو دیکھ کر بھڑکتی ہے۔ وہ جب ان زلفوں کو دیکھتا اور اُن کی بُو کو محسوس کرتا ہے تو ایک عالم پیچ و تاب میں پہنچ جاتا ہے اور اُس پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مومنؔ نے اس کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے ؎

کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی　　　ہے بلا آج پیچ و تاب ہمیں

اور پھر اسی کیفیت کو اپنے مخصوص انداز میں اس طرح بھی پیش کرتے ہیں ؎

میں تو اُس زلف کی بو پر غش ہوں　　　چارہ گر مشک سونگھاتے ہیں مجھے

یہاں اگرچہ موضوع ذرا سا مختلف ہو جاتا ہے اور چارہ گر کے مشک سونگھانے کی بات ایک دوسرے مضمون کو پیش کرتی ہے لیکن زلف کا خیال اور اُس کی بو کا شدید احساس بہر حال

باقی رہتا ہے۔ یہاں تک کہ چارہ گر کے مشک سونگھانے کے خیال سے بھی اُسے خوشبوئے زلف کی یاد آتی ہے، اور وہ اِن دونوں میں ایک نسبت قائم کر لیتا ہے۔ یہاں مومن کا انداز محسوساتی ہے اور وہ اس احساس ہی کو پیش کرنا چاہتے ہیں جو خوشبوئے زلف سے اُس کے حواس پر طاری ہوتا ہے۔

مومن کو اُس زلف سے والہانہ وابستگی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ حواس کو متاثر کرتی ہے، اسی لئے اُس کا خیال اُن کے حواس پر چھایا رہتا ہے۔ چنانچہ جب وہ نظر نہیں آتی اور وہ اُس کو پوری طرح دیکھ نہیں سکتے تو اُنھیں اُس کا دھیان رہتا ہے۔ وہ خیال کی دُنیا میں اُس کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں ـــــ اس شعر میں مومن نے اسی زلف کے خیال کو سامنے رکھ کر ایک اور کیفیت کی ترجمانی کی ہے ؎

کس کی زلفوں کا دھیان تھا کہ شب   محو دودِ چراغِ خانہ رہا

یہ کیفیت بالکل نئی ہے اور یہ اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ زلف کا خیال شاعر کے احساس پر طاری ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ محوِ دودِ چراغِ خانہ ہوتا ہی اس وجہ سے ہے کہ اس کو کسی کی زلفوں کا خیال ہے۔ ظاہر ہے کہ زلف اور دودِ چراغِ خانہ میں ایک مناسبت اور مشابہت ہے۔ اسی لئے ایک کے خیال سے مومن کے یہاں دوسرے کا خیال پیدا ہوا ہے۔

اُردو غزل میں زلف کا تصور پریشانی کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ خود بھی پریشان تصور کی جاتی ہے اور دیکھنے والا بھی اس کو دیکھ کر پریشان ہوتا ہے لیکن مومن کو یہ زلف پریشان نہیں کرتی ـــــ برخلاف اس کے اُن پر اس کا اثر بہت ہی لطیف ہوتا ہے کبھی تو اُس کا خیال اُنھیں سوچ میں گم کر دیتا ہے اور کبھی اُس کے ذکر سے اُنھیں نیند آنے لگتی ہے اس لئے کہ اُس کا فسانہ حواس پر لطیف اثرات چھوڑتا ہے اور اُس سے عام طور پر تسکین ہوتی ہے۔ مومن کے اس شعر کی بنیاد یہی خیال ہے ؎

نیند آئی ہے فسانۂ گیسو و زلف سے   وہم و گمانِ خواب پریشاں نہیں رہا

یہاں فسانۂ گیسو و زلف کے ساتھ نیند آنے کا خیال، اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مومن

اس زُلف میں حُسن و لطافت کے عجیب و غریب پہلو دیکھتے ہیں، اور حسن و لطافت کی یہ کیفیت اُن کے لئے لُطف و تسکین کا باعث بنتی ہے۔

اس طرح مومن نے زُلف و گیسو کے لطیف پہلوؤں کے ردِ عمل کا بیان اپنی غزل میں جگہ جگہ کیا ہے۔ اس بیان میں وہ روایت سے انحراف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اسی لئے زلف کے ساتھ وہ تصور اُن کے یہاں پیدا نہیں ہوتا جس کو عام طور پر غزلوں میں پیش کیا جاتا رہا ہے — اور اس کی وجہ اُن کے تجربے کی صداقت ہے۔ مومن نے زلف و گیسو کے حسن کو اسی طرح محسوس کیا ہے اور اسی لئے اُن کی غزل میں اس مخصوص احساس کی ترجمانی اتنی شدومد کے ساتھ نظر آتی ہے۔

زُلف و گیسو کے ساتھ ساتھ مومن کی غزل میں نگہ سُرمگیں اور چشم سُرمہ سا کے حُسن کا خیال بھی بہت نمایاں ہے — اس موضوع پر بھی اُنھوں نے بعض ایسے شعر کہے ہیں جس میں ظاہری حُسن کے بیان کی بجائے اُن تجربات کی تفصیل ہے جو اس سلسلے میں اُنھیں پیش آئے ہیں مومن نے ان اشعار میں کیسے پُر لُطف تجربات کی ترجمانی کی ہے۔

سُرمہ گیں چشم سے کیوں تیز نظر کرتا ہے | کب مرا نالہ ترے دل میں اثر کرتا ہے

سُرمگیں چشم کی گردش جو نہ بھا جاتی تو | خاک یوں کاہے کو ہم ڈالتے سر میں پھرتے

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح | طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز تو دیکھ

دیکھئے خاک میں ملاتی ہے | نگہِ چشمِ سُرمہ سا کب تک

اک نگاہِ سرسری دیوانہ ہم کو کر گئی | گردشِ چشم پری رو ساحرِ بنگالہ تھا

شبِ فرقت میں خاک جھپکے آنکھ | یاد ہے چشمِ نیم خواب ہمیں

ایسی لذتِ خلشِ دل میں کہاں ہوتی ہے　　　رہ گیا سینے میں اُس کا کوئی پیکاں ہو گا

یہ تجربات نئے ضرور ہیں لیکن ان میں صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ مومن نے یہاں بھی محض اس حسن کے ظاہری پہلوؤں ہی کو پیش نظر نہیں رکھا۔ صرف اُس کی فسوں سازی کا ذکر کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ فسوں سازی ایک کیفیت ہے جس کے نتیجے میں کبھی تو وہ سر میں خاک ڈالتے پھرتے ہیں، کبھی اُن پر وحشت طاری ہوتی ہے، کبھی اُنھیں اس بات کا احساس ہوتا ہے۔ کہ وہ خاک میں مل رہے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس میں لذت سی محسوس کرتے ہیں اور انھیں اس کاروبار میں بڑا لطف آتا ہے۔

مومن نے اس حسن کے سلسلے میں لبِ لعل اور لبِ نازک کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہی صورت پیدا ہوتی ہے کہ خارجی طور پر ان کے حسن کی تصویر کشی کے بجائے وہ اُس کیفیت کی ترجمانی زیادہ کرتے ہیں جو ان سے دلچسپی لینے والے پر طاری ہوتی ہے۔ ایک شعر میں کہتے ہیں ؎

مر گئے اُس کے لبِ جاں بخش پر　　　ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

ایک اور شعر میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں ؎

اُس لبِ لعل کی شکایت ہو　　　کیونکہ رنگیں نہ ہو کلام مرا

ایک اور شعر میں اس صورت حال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

اُس لبِ نازک کو برگِ گل سے دیتی ہو مثال　　　ہونٹ برگِ لالہ تھے اور نیل داغِ لالہ تھا

اس طرح مومن کے یہاں ایسے مواقع پر بھی محض ظاہری حسن کا بیان نہیں ملتا اور صرف خارجی زاویہ نظر ہی سے اُس کی ترجمانی نظر نہیں آتی۔ برخلاف اس کے اُن کی اصل حقیقت پر روشنی پڑتی ہے اور اُن کے اثرات کا بیان ملتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے مومن کے مختلف حواس حسن کے مختلف پہلوؤں سے مختلف اور متنوع اثرات قبول کرتے ہیں مثلاً خرامِ یار کے حسن کا اثر اُن پر بہت گہرا ہوتا ہے اور وہ اُس کا بیان مزے لے لے کر بڑے پُرلطف انداز میں کرتے ہیں۔ ان اشعار میں خرامِ یار کے کتنے مختلف روپ پیش کیے گئے ہیں اور ان کا اثر دیکھنے اور محسوس کرنے والے پر کتنے مختلف

زاویوں سے ہوتا ہے ؎

اب شور ہے مثال جو دی اُس خرام کو
یوں کون جانتا تھا قیامت کے نام کو

ہے زمیں سب فتنہ خیز اس کے خرامِ ناز سے
یہ قیامت کیسی آئی آسماں باقی رہا

پھر کچھ صدائے پا سے دلِ مُردہ جی اُٹھا
پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم
طرزِ خرام و شوخیٔ رفتار کے لئے

ہر ذرّہ میری خاک کا برپا ہو چکا
بس اے خرام نازکہ تاب وتواں نہیں

خرام ناز نے کس کے جہاں کو کر دیا برہم
زمیں گرتی فلک پر ہے فلک گرتا زمیں پر ہے

دکھاؤں ناقہ لیلےٰ خرام ناز تجھے
کبھی اِدھر سے جو اُس شوخ کا فرس گزرے

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ مومن خرام یار کو صرف دیکھتے ہی نہیں، اس کو محسوس بھی کرتے ہیں اسی لئے اس کے ساتھ انھیں قیامت کا خیال آتا ہے اور وہ اُس کو قیامت سے مناسبت دیتے ہیں کیونکہ خرام یار سے داخلی اور خارجی طور پر جو ہنگامہ برپا ہوتا ہے اُس کی وضاحت صحیح طور پر قیامت ہی کے خیال سے ہو سکتی ہے — لیکن مومن کا خیال صرف قیامت ہی تک محدود نہیں رہتا۔ وہ اس طرح محسوس کرتے ہیں کہ خرام ناز کے سامنے قیامت کی بھی کوئی حقیقت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قیامت خود انھیں طرزِ خرام و شوخیٔ رفتار کے قدم لیتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس قیامت خرامی کا اثر نہ صرف اُن پر ہوتا ہے بلکہ ساری کائنات اُنھیں اس سے متاثر نظر آتی ہے۔ زمین کا فلک پر اور فلک کا زمین پر گرنا اس صورتِ حال کو صحیح طور پر پیش کرتا ہے۔

خرامِ ناز کے ساتھ ساتھ مومنؔ آواز کے حُسن سے بھی متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے اپنی غزل میں آواز کی مختلف کیفیتوں اور ان کے اثرات کو پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آواز بھی انسان کے حواس پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مومنؔ کے حواس نے بھی آواز کا اثر قبول کیا ہے اور وہ اپنے مخصوص لب ولہجہ میں اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔ ایک شعر میں کسی غیرتِ ناہید کی تان کا بیان ہے۔ اس تان میں انھوں نے دیپک راگ کی کیفیت محسوس کی ہے۔ اسی لئے اس کی آواز میں انھیں شعلہ سا چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ کیسا عجیب شعر ہے ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو

اس شعر میں ظاہر ہے کہ ایسی آواز کے حسن کا بیان ہے جو محض آواز نہیں ہے بلکہ جس آواز میں موسیقی کا فن بھی شامل ہے۔ اس لئے اس سے حواس کا متاثر ہونا تو ایسی کوئی عجیب بات نہیں۔ مومنؔ کے حواس نے اس سے اثر قبول کیا ہے اور اس سے ان کے احساسِ لطیف پر روشنی پڑتی ہے لیکن بعض شعر ان کے یہاں ایسے بھی ملتے ہیں جن میں محض آواز سے متاثر ہونے کا بیان ہے ــــ یہ آواز دشنامِ یار ہی کی صورت میں کیوں نہ ہو انھیں متاثر کرتی ہے۔ یہ دو شعر اسی کیفیت کے ترجمان ہیں ؎

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں اے ہمنشیں! نزاکتِ آواز دیکھنا

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

دشنامِ یار کا طبیعت پر گراں نہ گزرنا اور اس میں نزاکتِ آواز کے حُسن کو محسوس کرنا۔ گالیوں کا اس کے منہ سے بھلا لگنا اور مکرر ان گالیوں کو سننے کی فرمائش کرنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ آواز بھی مومنؔ کے حواس کے لئے ایک جذب وکشش رکھتی ہے۔ اسی کا یہ اثر ہے کہ یہ اشعار رس میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان میں رنگینیوں کا بسیرا نظر آتا ہے۔

مومنؔ کی غزل میں حُسن کی حیا اور حیا کے حُسن کی طرف بھی خاص توجہ ملتی ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر زیادہ تعداد میں اشعار ان کے یہاں موجود نہیں ہیں لیکن جو اشعار

بھی اُنھوں نے اس موضوع پر کہے ہیں، اُن سے اس حقیقت کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ اُنھیں حُسن کے اس پہلو سے کتنی دلچسپی ہے اور اُنھوں نے اس سے کیسا گہرا تاثر قبول کیا ہے۔ اُسی گہرے تاثر کا یہ اثر ہے کہ اس موضوع کی ترجمانی میں اُنھوں نے بعض نئے پہلو پیدا کئے ہیں اور اس طرح اُن میں کچھ نئی باتیں پیدا ہو گئی ہیں جن میں حیا کے حُسن سے زیادہ اُس تاثر کا بیان ہے جو حُسن کی حیا کے ہاتھوں پیدا ہوتا ہے۔ یہ دو شعر اس صورتِ حال کو پوری طرح واضح کرتے ہیں ؎

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

جو بے حجاب نہ ہو گی تو جان جائے گی کہ راہ دیکھی ہے اُس نے حیا کے آنے کی

یہاں بوالہوسوں پر ستم کرنے اور نازدکھانے کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے حیا ٹپکنے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اور بے حجاب نہ ہونے کے ساتھ جان کے جانے اور اُس کے حیا کی راہ دیکھنے کا جو خیال پیش کیا گیا ہے، اُن میں حیا کے حُسن کو اور اُس کے گہرے تاثر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

اُردو غزل میں دستِ حنائی کے حُسن کی تعریف تقریباً ہر دور میں کی گئی ہے۔ مومن کی غزل میں بھی دستِ حنائی کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ صرف اُس کے ظاہری اور خارجی پہلوؤں ہی کو اپنے پیشِ نظر نہیں رکھتے، اُس کے حیاتی اور محسوساتی پہلوؤں کا بیان بھی کرتے ہیں۔ ان اشعار سے اس صورتِ حال کی وضاحت ہوتی ہے ؎

رنگیں ہیں خون سر سے وہ ہاتھ آج کل ہے جس ہاتھ میں وہ دستِ حنائی تمام شب

تو نے تو وہاں لگائی مہندی یاں دل میں لگی بکارہ آتش

مومن نے پہلے شعر میں دستِ حنائی کے تمام شب ہاتھ میں رہنے کے اثرات کی جو مصوری کی ہے، اور دوسرے شعر میں مہندی کے اثر سے دل میں آگ لگنے کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس میں اس حسن سے زیادہ اُس کے اثر کو پیش کیا گیا ہے۔

اور یہ کہ اس کی نوعیت حسیاتی اور محسوساتی ہے۔

مومن کی غزل میں حسن کے ان مختلف پہلوؤں اور ان مختلف پہلوؤں کے حسن کا بیان اس حسیاتی رنگ و ڈھنگ کے ساتھ ملتا ہے۔ یہ پہلو دراصل حسن کے مختلف مظاہر ہیں جن پر مومن کی نظر پڑتی ہے اور وہ ان سے متاثر ہوتے ہیں لیکن ان کے یہاں مجموعی طور پر بھی حسن کا بیان موجود ہے۔ اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اُن کے سامنے ایک گوشت پوست کا انسان ہے جس کے حسن کی مجموعی کیفیت سے وہ متاثر ہوئے ہیں اور انھوں نے ایک عالمِ سرخوشی میں اس کا اظہار کر دیا ہے۔ ایسے مقامات پر مومن عموماً تاثر کو پیش کرتے ہیں لیکن اس تاثر سے حسن کی کیفیت پر پوری روشنی پڑتی ہے اور اس کی خصوصیات کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ شعر اسی صورتِ حال کے ترجمان ہیں ؎

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے　　تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

اُن سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی　　مجھ کو میری شرم نے رسوا کیا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے　　اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

تاثیرِ بے قراریِ ناکام آفریں　　ہے کام اُن سے شوخ شمائل کو تھامنا
دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے　　اے چرخ اپنے تو مہِ کامل کو تھامنا

جلوؤں کے حملے مجھ کو زمیں پر گرا دیا　　اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا

پڑی لوٹتے ہیں انگاروں پہ دوزخ میں پڑی حوریں　　تمہارا حسن عالم سوز کس کس کو جلاتا ہے

آمد آمد ہے چمن میں کس صنم انداز کی　　سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار

دل کا کیا حال کرے دیکھئے یہ گرمیِ حسن　　　ٹھہرتا آئینۂ یار میں سیماب نہیں

حیرتِ حسن سے یہ شکل بنی　　　کہ وہ آئینہ دِکھاتے ہیں مجھے

یہاں حسن کا یہ بیان بڑے رچے ہوئے انداز میں کیا گیا ہے۔ اس بیان سے حسن کی ایک صحیح تصویر آنکھوں کے سامنے آتی ہے، اور ساتھ ہی اُس کے ردِ عمل کا بھی اندازہ ہوتا ہے ـــ یہ ردِ عمل صرف انسانوں ہی پر نہیں ہوتا۔ خارجی مناظر تک اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح حسن کی یہ جلوہ گری ساری فضا پر ایک جادو سا کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں سارا عالم حسین معلوم ہونے لگتا ہے اور کائنات پر رنگینیاں پھٹ پڑتی ہیں۔

ان رنگینیوں کے جھرمٹ میں مومن کا روبارِ شوق کی مختلف منزلیں طے کرتے ہیں۔ اس عالم میں خود اُن پر ایک سرخوشی کی سی کیفیت چھا جاتی ہے اور اس منزل پر پہنچ خارجی حسن کے بجائے اُس کے ناز و انداز اُنھیں زیادہ حسین نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ ناز و انداز کے حسن کی تصویر کشی بڑے شوخ اور تیکھے رنگوں میں کرتے ہیں۔ مومن کے ایسے اشعار میں حسن کے مزاج اُس کی داخلی کیفیت اور اُس کے معاملات سب کی تفصیل سامنے آتی ہے۔ یہ اشعار انھیں پہلوؤں کی عکاسی کرتے ہیں ؎

اُس دہن کو غنچۂ گُل کیا کہوں　　　ڈر لگے ہے مُسکرانا چھوڑ دے

کیوں ہے رنگِ زرد پر گلگونہ اشکِ سُرخ کا　　　کس لئے مِلنے لگی رنگت ہماری آپ کی

یہاں ہے چاک گریباں تو واں بھی چستی سے　　　قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

پھوے جامے میں سماتے ہی نہیں　　　وصلِ شوخِ چست پیراہن میں ہم

روز کا بگاڑ آخر جان پر بنا دے گا　　　اُن کو شوقِ آرائش دِل ہے بدگماں اپنا

۶۷ نیند میں یارب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا ہے زمیں سے روشنی افلاکِ نور افشاں تلک

دشمنی دیکھو کہ تا اُلفت نہ آجائے کہیں لے لیا اُس نے دوپٹہ حال میرا دیکھ کر

مومن کی غزلوں میں اس قسم کے اشعار خاصی تعداد میں موجود ہیں، اور ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مومن نہ صرف حسن سے دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اُس کی مزاج دانی کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ اس شعور کا اظہار اُنھوں نے بڑے لطیف پیرائے میں کیا ہے، اور اس صورتِ حال نے اُن کے ایسے اشعار میں بھی لطافت اور رنگینی پیدا کر دی ہے۔

یہ تو حسن کے وہ پہلو ہیں جن کا مومن نے مشاہدہ کیا ہے، جو اُن کے حواس پر اثر انداز ہوئے ہیں اور جن سے اُنھوں نے لذت حاصل کی ہے لیکن ان کے علاوہ اُن کی غزل میں حُسن کے بعض ایسے پہلو بھی ہیں جن کو وقت نے آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے لیکن جن کی حسین یادیں دل میں باقی رہ گئی ہیں — یہ یادیں بہ ذاتِ خود بھی بہت حسین ہوتی ہیں اور پھر جب ان یادوں کی بنیاد حُسن ہو تو ان میں کچھ زیادہ ہی لطیف اور دل آویز کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مومن نے ان یادوں کے حُسن، اُن کی لطافت اور دل آویزی کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ اسی لئے اُن کی ترجمانی کا پہلو اُن کی غزل میں اتنا نمایاں ہے۔ ان یادوں سے دلچسپی لینے کا سبب یہ ہے کہ مومن پر حُسن کے مختلف پہلو سرخوشی بن کر چھائے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وقت نے اُن پہلوؤں کو آنکھوں سے اوجھل کر دیا ہے تو اُنھوں نے دل میں یادوں کی صورت اختیار کر لی ہے — مومن نے حسن کی ان حسین یادوں کی ترجمانی میں بڑے حُسن کو پیدا کیا ہے — اس کا سبب یہ ہے کہ یہ یادیں اُن کے دل میں داغ نہیں بنی ہیں۔ برخلاف اس کے ان یادوں نے رنگینی اور لطافت کو باقی رکھا ہے۔ کہیں کہیں ہلکے سے درد کی کیفیت ان یادوں کی ترجمانی میں ضرور پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کی وجہ انسانی زندگی کی تبدیلی اور اس تبدیلی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محرومی کا احساس ہے لیکن ویسے مجموعی طور پر مومن کے یہاں حُسن کی یادوں کو پیش کرنے میں ایک نشاطیہ میلان کا احساس ہوتا ہے۔ اور ایک رنگین اور پُرکار سی فضا نظر آتی ہے۔ یہ چند اشعار مومن کی غزل کے اس پہلو کو

پیش کرتے ہیں ؎

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگ گل ‏ ‏ پھر مجھ کو آ گئی کسی گل پیرہن کی یاد

نہ کیوں کر بس مر جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر ‏ ‏ وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

کیونکہ نہ آدھی رات جاگے وہ جس کا دھیان ہو ‏ ‏ آہوئے نیم خواب میں، نرگسِ نیم باز میں

پھر دل ہے داغ مطلع خورشید دیکھ کر ‏ ‏ از بس کہ یاد جلوۂ بالائے بام ہے

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں ‏ ‏ بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

کسی گل پیرہن کی یاد میں خود اپنے پیرہن کا برنگ گل ٹکڑے ہونا، ہونٹوں میں کچھ کہہ کہہ کر مسکرانے کی یاد میں مرا جانا، آہوئے نیم خواب اور نرگس نیم باز کی یاد میں آدھی آدھی رات تک جاگنا جلوئے بالائے بام کی یاد میں مطلع خورشید کو دیکھ کر دل کا داغ ہو جانا اور کچھ جلووں کو یاد کر کے شب ماہتاب میں بے بادہ مست ہو جانا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ مومن ان یادوں میں حسن کو دیکھتے ہیں اور انھیں ان میں بڑی لذت محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی سے منہ نہیں موڑتے۔ وہ تو اس پر جان چھڑکتے ہیں۔ اسی لئے اس زندگی کا ہر حسین اور لطیف پہلو ان کے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور وہ اس میں گم ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ اور یہ ان کی ذہنی اور جذباتی صحت مندی کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن بنیادی طور پر ایک حسن پرست شاعر ہیں۔ اور انھوں نے اپنی غزل میں اس حسن اور حسن پرستی کے ان گنت روپ پیش کئے ہیں لیکن اس سلسلے میں انھوں نے صرف خارجی حسن اور حسن کے خارجی پہلو ہی کو پیش نظر نہیں رکھا ہے۔ وہ حسن میں گم ہو گئے ہیں اور خود حسن کو اپنے اندر اس طرح گم کر لیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں معلوم ہوتے۔ اسی لئے ان کے یہاں صرف حسن کے مشاہدے ہی کا پہلو نمایاں

نہیں ہوتا، اُس کے محسوسات کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اور وہ حسن کی تصویر کشی کے ساتھ احساسِ حُسن کی مُصوّری بھی کرتے ہیں۔ مومن نے حُسن کے اُن پہلوؤں کو دیکھا اور محسوس کیا ہے جو اس پر کچھ اس طرح چھائے رہتے ہیں کہ اُن کا نقش کبھی مٹتا نہیں۔ اُن پر یہ احساس طاری رہا ہے اور وہ اسی احساس کے مختلف پہلوؤں کو مختلف زاویوں سے اپنی غزل میں پیش کرتے رہے ہیں۔ اسی لئے اس پہلو نے اُن کے یہاں ایک اہم رجحان کی صورت اختیار کرلی ہے۔ یہ رجحان بہت اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس کی بدولت مومن کی غزل میں حُسن اور احساسِ حُسن کی مزاج دانی کا شعور پیدا ہوا ہے اور اس طرح وہ حسن کی نفسیات اور نفسیات کے حُسن کے مختلف پہلوؤں کا ایک حسین مرقع بن گئی ہے۔

(۴)

اس حُسن اور حُسن پرستی کے ساتھ ساتھ مومن کی غزل میں محبوب کا بھی ایک واضح تصور ملتا ہے، اور اُن کی غزل کے بیشتر مضامین اسی محبوب کے تصور ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ویسے مومن کے یہاں محبوب کا موضوع بہ ذات خود بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی لئے وہ اُس کی ایک واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ اور اُن کے یہاں اُس کے کردار اور سیرت کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور روشنی پڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حُسن کے جن مختلف پہلوؤں کا بیان مومن نے کیا ہے، اُن کا تعلق بھی درحقیقت محبوب ہی کی ذات اور شخصیت سے ہے۔ حُسن اُن کے یہاں محبوب ہے اور محبوب حُسن ہے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جاسکتا اور مومن نے یقیناً اپنی غزل میں ان دونوں کو ایک جان دو قالب بناکر پیش کیا ہے۔ اُن کے یہاں حُسن کے جو مختلف روپ ملتے ہیں، اُن میں اُن کے محبوب کی تصویر صاف نظر آتی ہے۔ لیکن انھوں نے صرف اسی حد تک اپنے آپ کو محدود نہیں کیا ہے، اپنی غزل میں محبوب کی شخصیت کے داخلی پہلوؤں کی طرف بھی بہت واضح اشارے کئے ہیں اور ان اشاروں سے محبوب کے طور طریقوں، عادات و اطوار، افکار و خیالات اور عقائد و توہمات کا بھی پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔ محبوب کی شخصیت جن حالات کو پیدا کرتی ہے اور ماحول پر ان حالات کے جو اثرات ہوتے ہیں اُن کی تفصیل بھی مومن کی غزل میں نظر آتی ہے۔ غرض یہ کہ مومن کی

غزل کا ایک اہم موضوع محبوب اور اُس کی شخصیت اور کردار کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی ہے۔

مومن کا یہ محبوب ایک مخصوص ماحول کی مخلوق ہے اور اس ماحول کے اثرات اُس کی شخصیت میں بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ اس ماحول ہی کا یہ اثر ہے کہ مومن نے اُس کے پردہ نشیں ہونے کا تذکرہ اتنی شد و مد سے کیا ہے۔ اپنی غزلوں میں بار بار وہ اُس کو پردہ نشیں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں لیکن اس پردہ نشیں ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن کا یہ محبوب میر کے محبوب کی طرح کوئی گھریلو مخلوق ہے جو کبھی باہر نہیں آتا۔ اور ہمیشہ پردے کے پیچھے رہتا ہے۔ مومن کا محبوب تو اس کے برخلاف پردہ نشیں ہونے کے باوجود بزم آرائیاں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اُس کے آس پاس اور گرد و پیش چاہنے والوں کے جمگھٹے رہتے ہیں۔ وہ اُن کے ساتھ نہ صرف ہنستا بولتا ہے بلکہ کھل کھیلنے تک کے لئے تیار رہتا ہے۔ کاروبارِ شوق کے مختلف مرحلے اُس کی محفلوں میں طے ہوتے ہیں۔ یہ محفلیں پردے کے پیچھے گرم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پردہ نشیں ظاہر بھی کرتا ہے۔ اُس کی محفلوں میں شریک ہونے والے بھی اسے پردہ نشیں ہی سمجھتے ہیں —— لیکن اُس کی یہ پردہ نشینی ایک آڑ کا کام کرتی ہے۔ اور وہ اس پردہ نشینی کی آڑ میں نہ جانے کیا کیا کچھ ہوتا ہے۔ مومن نے جہاں محبوب کا ذکر کیا ہے وہاں اِسی کی تفصیل پیش کی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مومن نے اپنی غزل میں جس پردہ نشیں محبوب کا تذکرہ کیا ہے وہ پردہ نشین ہے لیکن یہ پردہ نشینی ایک اصطلاحی مفہوم رکھتی ہے۔ اُس زمانے کی معاشرتی زندگی میں ان پردہ نشیں محبوبوں کا بھی ایک طبقہ تھا جس کی نوعیت مجلسی تھی۔ اسی لئے مومن نے اس پردہ نشیں محبوب کی جو خصوصیات واضح کی ہیں وہ اسی مجلسی طبقے سے تعلق رکھنے والے محبوب کی خصوصیات ہیں۔ اس میں وہ سادگی اور معصومیت نہیں جو سیدھے سادے گھریلو قسم کے پردہ نشین محبوب میں ہوتی ہے۔ مومن کا یہ پردہ نشیں محبوب تو خاصا ہنگامہ آرا ہے — ان کی غزل میں جہاں بھی اس پردہ نشیں محبوب کا ذکر ملتا ہے وہاں ان ہنگامہ آرائیوں کی تفصیل سامنے آتی ہے۔ یہ اشعار اسی تفصیل کو پیش کرتے ہیں ؎

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

بے پردہ پسِ چلون یک بار تم آ بیٹھے
ہے تاب نظر کس کو کیوں جلوہ گری اتنی

پردے کی کچھ حد بھی ہے پردہ نشیں
کھل کے مل بس منہ چھپانا چھوڑ دے

چلون کے بدلے مجھ کو نزع میں پردہ گرا دیا
اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا

اب یہ صورت ہے کہ اے پردہ نشیں!
تجھ سے احباب چھپاتے ہیں مجھے

غیروں سے ہو وہ پردہ نشیں کیوں نہ بے حجاب
دم ہائے بے اثر مرے پردہ اُٹھا گئے

کس وقت کیا مردمکِ چشم کا شکوہ
اے پردہ نشیں ہم تجھے رسوا نہ کریں گے

یا پردہ اُٹھا ورنہ کھلا شوقِ نہانی
اب مجھ سے تو چھپتا نہیں اے پردہ نشیں یہ

پردہ نشیں کے عشق میں پردہ دری نہ ہو کہیں
ہوتی ہیں بے حجابیاں جانِ نہفتہ راز میں

اہلِ ماتم اپنے روئیں کس طرح منہ ڈھانک کر
مرتے مرتے پاس اُس پردہ نشیں کا نبھائیں

بس کہ پردہ نشیں پہ مرتے ہیں
موت سے آئے ہے حجاب ہمیں

اے پردہ نشیں نہ چھپ کہ تجھ سے
پھر دل بھی یوں ہی چھپائیں گے ہم

یا الٰہی مجھ کو کس پردہ نشیں کا غم لگا　　سینے میں اندر ہی اندر کچھ گھلا جاتا ہے دل

جو نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا　　کچھ نہ سوجھا عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر

اے پردہ نشیں چلون اٹھا دے کہ نہ جل جائے　　کرتا ہوں میں سوزِ غمِ پنہاں کی شکایت

ان اشعار سے مومن کے محبوب پردہ نشیں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے ماحول کا پورا نقشہ سامنے آتا ہے۔ یہ محبوب پردہ نشیں ہونے کے باوجود اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ لوگ اس جلوے سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اپنے گریبانوں کو چاک کرنے کا کاروبار شروع کر دیتے ہیں۔ وہ پس چلون بے پردہ بیٹھتا ہے اس لئے کہ اس کی جلوہ گری لوگوں کی نظروں میں کھپ جائے۔ لیکن وہ کھل کر نہیں ملتا۔ کیونکہ منہ چھپانا اس کے مزاج کا لازمی جز ہے۔ اور اس منہ چھپانے اور کھل کے نہ ملنے میں ایک اندازِ دلبری اور طرزِ دل ربائی بھی ہے۔ لوگ اس کی اسی ادا پر دل دے دیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ضرور ہے کہ وہ اپنے رخ سے پردہ اٹھا دیتا ہے اور بے حجاب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ یہ بے حجابی کبھی کبھی غیروں کے سامنے بھی ہوتی ہے کہ وہ بھی اس کی محفل میں باریاب ہیں — عاشقِ صادق کو اس کی یہ بات پسند نہیں، اور وہ اس کے اس انداز پر کڑھتا ہے۔ کیونکہ محبوب کی پاسداری کا خیال اس کو بہت عزیز ہے — وہ اس پر جان فدا کرتا ہے — اندر ہی اندر اس کے غم میں گھلتا ہے — اور اس کی محفل میں باریاب ہونے کے باوجود یہ سلگنے اور اندر ہی اندر گھلنے والی کیفیت اس کے یہاں باقی رہتی ہے — غرض اس طرح اس محبوب پردہ نشیں کے ہاتھوں عاشق کی داخلی اور خارجی زندگی میں خاصے ہنگامے برپا ہوتے ہیں۔

مومن کی غزلیں انھیں ہنگاموں کی تفسیر ہیں۔ ان غزلوں میں محبوب کے پردہ نشیں ہونے اور مستقل طور پر پردے کے پیچھے رہنے کے باوجود وہ خاصا فعال نظر آتا ہے اور کاروبارِ شوق کو آگے بڑھانے میں اس کی ہستی بڑا کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مومن نے اپنی غزلوں میں جہاں ان معاملات کی ترجمانی کی ہے وہاں خاصا ڈرامائی رنگ و آہنگ پیدا ہو گیا ہے۔

محبوب کی شخصیت ایسے مواقع پر ایک باقاعدہ کردار کی صورت میں اُبھرتی ہے۔ اس سلسلے میں مومن نے اُس کے ناز و انداز اور عشوہ و ادا کے مختلف پہلوؤں کی تصویریں بڑے مصوّرانہ انداز میں پیش کی ہیں۔ اور ساتھ ہی اُن کے ردِّ عمل کو بھی پوری طرح واضح کیا ہے — یہ ردّ عمل روایتی نہیں ہے۔ اس میں ایک نئے احساس اور نئے جذباتی تجربات کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ محبوب اور محبت کرنے والے دونوں کے نئے احساسات اور نئے جذباتی تجربات ان اشعار کی جان ہیں ؎

شوخیٔ قاتل کے میں قرباں ہوں — کہتے رہے سب یہ گیا وہ گیا

کوئی دن تو اُس پہ کیا تصویر کا عالم رہا — ہر کوئی حیرت کا پُتلا دیکھ کر بن جائے تھا
ناز و شوخی دیکھنا وقتِ تظلّم دم بہ دم — مجھ سے وہ عُذرِ جفا کرتا تھا اور شرمائے تھا

اک نگاہِ سرسری دیوانہ ہم کو کر گئی — گردشِ چشمِ پری رو ساحرِ بنگالہ تھا

کیا تم نے قتلِ جہاں اک نظر میں — کسی نے نہ دیکھا تماشا نہ دیکھا

مجھ جفا سستم کشِ الطاف کب ہوا — رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

کیا کیجئے دل شوخیٔ فطرت پہ جو آجائے — یہ تو میں سمجھتا تھا کہ وہ رام نہ ہوگا

دیکھ مضطر کیوں نہ پھرے دشنہ پھر — یار ہے وہ کچھ تماشائی نہیں

آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو — اعجاز سے زیادہ ہے سحر اُس کے ناز کا

مومن نے ان اشعار میں صرف محبوب کی شوخی، اُس کے تظلّم، اُس کے ناز و انداز ہی کا

نقشہ نہیں کھینچا ہے۔ ان سب کے نتیجے میں جو صورتِ حال پیدا ہوتی ہے اُس کی تصویر کشی بھی کی ہے۔ اسی لیئے اُن کے بیان میں زیادہ گہرائی اور حسن کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں اور محبوب کے ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ اُس کی شخصیت اور شخصیت کے اثرات کے مختلف پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اسی لیۓ ان میں سے ہر شعر کسی ڈرامے کا ایک سین بن جاتا ہے۔ اور اس ڈرامائی سین میں محبوب کا کردار نہ صرف ہنستا بولتا، شوخیاں کرتا، دشنہ پھیرتا خنجر چلاتا اور سحر کرتا ہوا نظر آتا ہے بلکہ لوگ بھی اس پر قربان ہوتے، حیرت کے پتلے بنتے، اور دیوانگی اختیار کرتے ہوۓ دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس طرح اس کے ظاہری حسن کے بیان میں بھی کاروبارِ شوق کا کھیل جاری رہتا ہے۔ اس کھیل میں محبوب اور محبت کرنے والا دونوں برابر کے شریک نظر آتے ہیں۔

اس محبوب میں بڑی زندگی کا احساس ہوتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں بڑی جولانی نظر آتی ہے۔ وہ صرف ظلم و ستم اور جور و جفا ہی نہیں کرتا۔ زندگی سے لطف اندوز ہونا بھی جانتا ہے۔ بذلہ سنجی اُس کے مزاج کی اہم خصوصیت ہے۔ وہ ایک لطیف احساسِ مزاج بھی رکھتا ہے اور اُس کے مزاج کے ان تمام پہلوؤں کی جھلکیاں اُن معاملات میں نظر آتی ہیں جو اُس کو پیش آتے ہیں۔ مثلاً محبت کرنے والا جب اُس سے اظہارِ شوق کرتا ہے اور اُس کو یہ بتاتا ہے کہ وہ اُس پر جان دیتا ہے تو وہ صرف اتنا جواب دیتا ہے کہ یہ سب کچھ لاحاصل، بیکار اور عبث ہے۔ مومن نے اس خیال کی ترجمانی اس طرح کی ہے ؎

اظہارِ شوق شکوہ اثر اُس سے تھا عبث
یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

یہاں محبوب کے جواب میں سنجیدگی نہیں ہے بلکہ ایک لطیف سا مزاح ہے جس سے اُس کے مزاج کی شوخی اور طبیعت کی بذلہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور شعر میں مومن نے اس مضمون کو پیش کیا ہے کہ جب محبت کرنے والا روتے روتے تھک کر سو جاتا ہے تو محبوب اُس پر طعن کرتا ہے اور خواب میں آکے یہ کہتا ہے کہ وہ اُس کے بغیر سو رہا ہے

سو جاؤں روتے روتے تو کیا ہنس کے طعن سے　　کہتا ہے سوتے ہو مرے بن آکے خواب میں

ظاہر ہے کہ اِس سے اُس کا مقصد صرف شکوہ و شکایت ہی نہیں ہے۔ وہ تو محبت کرنے والے کا مذاق اُڑاتا ہے اور اُس کی تساہلی اور تن آسانی پر طنز کرتا ہے۔ اس طنز میں اُس کی شوخی اور بذلہ سنجی اپنے شباب پر نظر آتی ہے ــــ ایک اور شعر میں جب محبت کرنے والا محبوب کے سامنے آزارِ غیر کا شکوہ کرتا ہے تو وہ اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا۔ صرف اُس کے منہ سے افسوس کا لفظ نکلتا ہے۔ مومنؔ اس کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں ؎

شکوہ آزارِ غیر کا جو کروں ہنس کے کہتا ہے وہ کہ ہاں افسوس

یہاں محبوب کی طرف سے افسوس اور صدمے کا اظہار نہیں ہوا ہے بلکہ محبت کرنے والے کی حالتِ زار پر طنز کیا گیا ہے۔ اور اس طنز کی بنیاد محبوب کے مزاج کی وہ شوخی اور بذلہ سنجی ہے جس نے اُس کو چرب زبانی اور حاضر جوابی میں لاثانی بنا دیا ہے۔

یہ تو خیر اظہارِ شوق اور شکوۂ آزارِ غیر کی باتیں ہیں، اور ان میں شوخی اور طنز کے پہلو کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب بھی نہیں لیکن ایک جگہ تو مومنؔ نے موت کا ذکر کیا ہے لیکن اس موقع پر بھی محبوب کو شوخی اور مزاح سے بھرپور دکھایا ہے۔ خیال یہ ہے کہ محبوب عاشق کی موت کی خبر سُنتا ہے لیکن بجائے اظہارِ افسوس کرنے کے اُلٹا اُس پر اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ کیونکہ عاشق کی ذات تو اُس کے لئے ایک مسئلہ بنی ہوئی تھی اور وہ اس کو ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا ؎

سُن کے میری مرگ بولے مر گیا اچھا ہوا کیا بُرا لگتا تھا جس دم سامنے آجائے تھا

یہاں بھی مومنؔ نے محبوب کے بیان میں شوخی اور مزاح کے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ لہجے سے اطمینان کی کیفیت ضرور ٹپکتی ہے لیکن اس کی تہہ میں عاشق کی عجیب و غریب شخصیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کا خیال ہے اور اس کے اظہار میں مزاح کا رنگ ہے۔

غرض مومنؔ کا محبوب کبھی نچلا نہیں بیٹھتا۔ اُس میں بڑی زندگی نظر آتی ہے۔ وہ بلا کا شوخ ہے، اس میں غضب کا تیکھا پن ہے، ہنسنا ہنسانا تو اُس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ اسی لئے جہاں بھی اُس کی حرکات و سکنات کا بیان ہوتا ہے وہاں بڑی ہی رنگین اور پُرکار سی فضا پیدا ہوتی ہے۔ مومن نے محبوب کے بیان میں درد و کرب اور حزن و یاس کے پہلوؤں کو نمایاں نہیں کیا ہے۔ برخلاف اس کے ایسے معاملات اور حالات و واقعات کی ترجمانی

کی ہے جن کی بنیاد شگفتگی اور شادابی ہے۔

اُردو غزل کی روایت میں محبوب کے لاش پر آنے کا مضمون بہت عام ہے۔ مومن کی غزل میں بھی اس محبوب کے لاش پر آنے کا ذکر بار بار آتا ہے لیکن اس موقع پر بھی وہ اپنی شوخی سے باز نہیں آتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ اُس کی شوخی ہی اُس کو محبت کرنے والے کی لاش پر کھینچ کے لے آتی ہے۔ مومن کا مشہور شعر ہے ؎

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

اس شعر میں مومن نے لاش پر آنے کا سبب محبوب کی اُن شوخیوں کو قرار دیا ہے جو آسودگی پسند نہیں ہیں —— لاش پر آ کر ان شوخیوں کو جولانیاں دکھانے کا موقع ملتا ہے اور اُن کے محبوب کے کردار میں یہ عجیب و غریب خصوصیت موجود ہے۔ اس عجیب و غریب خصوصیت نے یہاں موت میں بھی زندگی پیدا کر دی ہے۔ ایک اور شعر میں محبوب کے لاش پر آنے کا ذکر اس طرح کیا ہے ؎

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھو آ کے مری نعش پہ وہ رو گیا

یہاں بھی اصل موضوع لاش پر آنا نہیں بلکہ ساتھ نہ چلنے کا بہانہ ہے جس کی وجہ سے محبوب لاش پر آتا ہے۔ ایک اور شعر میں لاش پر آنے کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے ؎

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر دکھلا دیا

یہاں بھی محبوب کے بے پردہ ہو کر آنے نے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جو بہ ذات خود اپنا ایک حسن رکھتی ہے۔ غرض مومن کے یہاں لاش پر آنے کا روایتی مضمون ضرور ملتا ہے لیکن اس سے محبوب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے کردار کے بعض اہم پہلوؤں کی وضاحت ہوتی ہے۔

اس محبوب کے محفل آرا ہونے کا ذکر بھی مومن نے اپنی غزلوں میں بار بار کیا ہے۔ اور اس سے مجلسی زندگی کی پوری تصویر سامنے آتی ہے۔ محبوب اس محفل اور مجلس کا بنیادی کردار ہے۔ وہ محفلیں سجاتا ہے مجلسیں منعقد کرتا ہے اور ان محفلوں میں طرح طرح کے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ان واقعات سے بھی محبوب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور

اُس کے کردار کے خدوخال پوری طرح واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ مومن نے ان اشعار میں محبوب کی محفلوں اور مجلسوں کے کیسے دلچسپ پہلوؤں کو پیش کیا ہے ؎

ہر ایک سے اُس بزم میں شب پوچھتے تھے نام
تھا لطف جو کوئی مرا ہم نام نکلتا

مجلس میں تا نہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے مجکو دیکھ کے اغیار کی طرف

یاں جو تو اے مہروش تھا جلوہ گستر رات کو
چھٹ رہی تھی کیا ہوائی منہ کے اوپر رات کو

مجلس میں میرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سائے سے مرے وحشت اے رشک پری آتی

یہاں محبوب کا محفل میں ہر ایک سے محبت کرنے والے کا نام پوچھنا اور محبت کرنے والے کا یہ خیال کہ اگر وہاں اُس کا کوئی ہم نام نکل آتا تو کیسی دلچسپ صورت حال پیدا ہوتی۔ مجلس میں اغیار کی طرف دیکھ کر محبوب کا محبت کرنے والے کی طرف دیکھنا تاکہ وہ محبت کرنے والا محبوب کی طرف نہ دیکھ سکے۔ غیروں سے محفل میں اس کا گرم صحبت رہنا، اور محبت کرنے والے کا یہ دیکھ کر جلنا۔ محبت کرنے والے کا نام آتے ہی محبوب کا محفل سے اُٹھ جانا اور اُس کے سائے تک سے وحشت کا اظہار کرنا۔ ان تمام باتوں سے محبوب کے کردار کی وضاحت ہوتی ہے اور کاروبار شوق کے لطیف اور رنگین پہلوؤں کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ مومن نے ان سب کو اپنی غزل میں تجربات کی شکل دے دی ہے۔

محبوب کے خیال کے ساتھ مومن کی غزلوں میں غیر کا ذکر اکثر آتا ہے۔ اور اس ذکر سے محبوب کے کردار کی وضاحت ہوتی ہے۔ وہ محبت کرنے والے کے مقابلے میں غیروں کی طرف نسبتاً زیادہ التفات کرتا ہے۔ غیروں کے ساتھ ہم صحبت ہونا اُس کے مزاج میں داخل ہے محبت کرنے والا اُس کے مزاج کی اس خصوصیت کو دیکھ کر اندر ہی اندر جلتا ہے اور

بالآخر رشک کی آگ اُس کے یہاں بھڑک اُٹھتی ہے ؎

زبس غیروں سے ہے وہ گرمِ صحبت　　مرا جلتا ہے جی کیا دیکھ کر آگ

وہ محبت کرنے والے سے لڑ سکتا ہے، اور یہ لڑائی اکثر جاری رہتی ہے۔ اُس سے روٹھتا ہے تو منتا نہیں، البتہ غیر سے جب روٹھتا ہے تو بہت جلد مَن جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ محبت کرنے والے کی اہمیت کو محسوس نہیں کرتا اور اُس کی محبت کو خاطر میں نہیں لاتا ؎

رُوٹھے سو روٹھے ہم سے مَنتے نہیں ہو اکثر
غیروں سے جب لڑے ہو لڑتے ہی مَن گئے ہو

پھر غیر کے سامنے اس محبوب پیماں شکن کی عجیب وغریب کیفیت اس صورتِ حال کو بھی پیدا کر لی ہے ؎

بل بے عیّاری عدو کے آگے وہ پیماں شکن
وعدۂ وصل آج پھر کرتا تھا اور شرمائے تھا

یہاں مومنؔ نے وعدۂ وصل کے ساتھ ساتھ محبوب کے شرمانے کا جو ذکر کیا ہے، اُس سے اُس کے مزاج کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بہر حال مومنؔ نے غیر اور عدو کے ساتھ اس محبوب کا ایک رشتہ دکھایا ہے۔ اس رشتے کی بنیاد اخلاص مندی پر استوار نہیں ہے۔ وہ اُس کے ساتھ تعلق ضرور رکھتا ہے لیکن اس تعلق میں صداقت کو دخل نہیں اس رشتے اور تعلق کے مختلف پہلوؤں کو مومنؔ نے بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے اور اس سے محبوب کے کردار کی بعض بنیادی خصوصیات کی وضاحت ہوتی ہے۔

یہ تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ مومنؔ کے محبوب کا اغیار کے ساتھ بھی ایک رشتہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ محبوب عاشق کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ ایسا نہیں ہے۔ عاشق صادق کے ساتھ بھی اُس کا تعلق بہت گہرا ہے اور وہ محبوب کا ذکر کرتے ہوئے اس تعلق کو ضرور واضح کرتے ہیں۔ مومنؔ نے محبوب کو عاشق سے بالکل ہی بے نیاز نہیں دکھایا ہے۔ اُس کو اپنے حُسن کا احساس ضرور ہے اور یہ احساس اُس کے

یہاں اس حد تک بڑھا ہوا نظر آتا ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا لیکن مثبت یا منفی انداز میں بہر صورت عاشق سے اپنے لگاؤ کا اظہار ضرور کرتا ہے۔ بلکہ بعض اشعار تو اُن کی غزلوں میں ایسے ملتے ہیں جن میں اس کی طرف بالواسطہ طور پر اظہارِ التفات بھی ہوتا ہے۔ یہ اشعار اسی صورت حال کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

محو جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا　　　رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

جوشِ قلق نے اُس کو بھی دیوانہ کر دیا　　　پہلے تو ورنہ طبعِ تحمل میں رم نہ تھا

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں　　　اُس کی نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

ان اشعار میں محو جفا کا ستم کشِ الطاف ہونا، جوشِ قلق کا اُس کو دیوانہ بنانا، اور نگاہِ شرم سے سب کچھ عیاں ہو جانا، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ مومن کا محبوب عاشق کی طرف ملتفت بھی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس التفات کا اظہار براہ راست نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے اشاروں اور کنایوں میں اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

ظاہر ہے کہ محبوب کے اس التفات کا جواب تو عاشق کو دینا ہی چاہیئے۔ چنانچہ وہ بھی محبوب کی طرف ملتفت ہوتا ہے اور اپنے جذب و شوق کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ اُس کی انفرادیت کو ٹھیس نہیں لگتی۔ محبوب کے حسن سے متاثر ہونا، اُس کے ایک ایک انداز سے لطف حاصل کرنا اور اُس کی ایک ایک ادا پر جان چھڑکنا عاشق کے مزاج کا جزو بن جاتا ہے اور اس طرح محبوب کی ذات اُس پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتی ہے۔ یہ اشعار اسی عالم سرخوشی کے مختلف مراحل کی عکاسی کرتے ہیں ؎

ہر چند اضطراب میں میں نے کمی نہ کی　　　تو بھی وہاں تغافلِ بسیار کم ہوا

کوئی دن تو اُس پہ کیا تصویر کا عالم رہا　　　ہر کوئی حیرت کا پُتلا دیکھ کر بن جائے تھا
ناز و شوخی دیکھنا وقتِ تظلّم دم بہ دم　　　مجھ سے وہ عذرِ جفا کرتا تھا اور شرمائے تھا

ہر ایک سے اُس بزم میں شب پوچھتے تھے نام
تھا لُطف جو کوئی مرا ہم نام نکلتا

اک نگاہِ سَرسَری دیوانہ مجھ کو کر گئی
گردشِ چشمِ پری رو ساحرِ بنگالہ تھا

برق آہ کو جو میں نے کہا مسکرا دیا
دِل گرمیوں نے اُس کی کلیجہ جلا دیا

کیا دل کو دے گیا کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

باتیں وہ تیری ہوش رُبا ہیں کہ کیا کہوں
جو کوئی راز داں ہے مرا راز داں نہیں

یاں جو تو اے مہروش تھا جلوہ گستر رات کو
چھٹ رہی تھی کیا ہوائی منہ کے اوپر رات کو

بوئے گل کا اے نسیمِ صبح اب کِس کو دماغ
ساتھ سویا ہے ہمارے وہ سمن بر رات کو

آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن سے گئے ہو
جوں سوزِ دل کہا ہے تم آگ بن گئے ہو
بادِ بہار میں ہے کچھ اور عطر بیزی
تم اس فضا میں شاید سوئے چمن گئے ہو

نہ جانے کیوں دلِ مرغِ چمن کہ سیکھ گئی
بہار وضع ترے مسکرا کے آنے کی

سامنے سے جب وہ شوخ دل رُبا آجائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

چلون سے کس پری کا نظارہ ہوا نصیب
پھر اپنے تنکے چُننے کی کیوں دھوم دھام ہے

جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا   کہ تو نے کس توقع پر وفا کی

مومن نے یہاں محبوب کے ساتھ عاشق کے رشتے کی وضاحت کی ہے۔ اس رشتے کی بنیاد صحت مندی پر استوار ہے کیونکہ محبوب اور عاشق دونوں اس میں برابر کے شریک ہیں۔ اسی لئے اُس میں محبوب کے حُسن اور عاشق کے حسنِ نظر دونوں کا شباب نظر آتا ہے اور اس طرح اس رشتے کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں وہ رنگینی پیدا ہو جاتی ہے جو کاروبار شوق کی جان ہے۔

غرض یہ کہ مومن نے اپنی غزل میں محبوب کا ایک واضح تصور پیش کیا ہے اور اس محبوب کی شخصیت اُن کی غزلوں میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اس کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خاصی پہلو دار شخصیت رکھتا ہے۔ اُس میں بلا کا حُسن ہے، غضب کی رنگینی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ حسن کی رنگینی اور رنگینی کا حسن دونوں اس کی شخصیت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ اُس میں بڑی زندگی کا احساس ہوتا ہے، جولانی نظر آتی ہے اور وہ خاصا فعال دکھائی دیتا ہے۔ وہ پردہ نشیں ضرور ہے لیکن اُس میں پردہ نشینی کی خصوصیات نہیں ہیں۔ وہ تو محفلیں سجاتا اور مجلس آرائیاں کرتا ہے۔ ان محفلوں اور مجلسوں میں اس کو طرح طرح کے تجربات ہوتے ہیں، طرح طرح کے لوگوں سے سابقہ ہوتا ہے۔ وہ ان سب سے ملتا ہے اور اس کے نتیجے میں کچھ ایسے حالات و واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جن میں اس کی شخصیت نمایاں حیثیت رکھتی ہے —— ان حالات و واقعات سے اس محبوب کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔ مومن نے اس محبوب کو غیر معمولی شخصیت کا حامل نہیں دکھایا ہے۔ اُس میں عام انسانوں کی سی خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ عجیب غریب باتیں نہیں کرتا۔ اُس کی حرکات و سکنات بھی بعید از قیاس نہیں ہوتیں۔ اسی لئے محبت کرنے والا اس سے متوازن انداز میں اثر قبول کرتا ہے۔ اُن کے تعلق اور رشتے کی نوعیت انسانی ہوتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب نظر آتے ہیں۔ اس طرح محبوب کی شخصیت محبت کرنے والے کی شخصیت کے ساتھ شیر و شکر ہو کر کاروبارِ شوق کے اس نظام کو چلاتی ہے جو انسان کی جذباتی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

(۵)

مومنؔ اسی کاروبارِ شوق کے شاعر ہیں اور انھوں نے اپنی غزل میں اسی کے مختلف پہلوؤں کی مصوری کی ہے۔ اس میں بنیادی حیثیت تو محبوب کے کردار کو حاصل ہے لیکن محبت کرنے والا بھی اس میں کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا —— وہ تو کاروبارِ شوق کے اس پورے نظام میں محبوب سے بھی کچھ زیادہ ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ مومنؔ نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی لئے اُن کی غزل میں محبوب اور محبت کرنے والے کے درمیان ایک ناگزیر ربط نظر آتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح وابستہ معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کے درمیان خط نہیں کھینچا جا سکتا۔ محبت کرنے والا محبوب کے ساتھ ایک رشتے میں منسلک ہے۔ اس رشتے کی اُس کے نزدیک بڑی اہمیت ہے۔ وہ اس رشتے سے لذت حاصل کرتا ہے، لطف اندوز ہوتا ہے اور اپنے لئے مسرتیں بہم پہنچاتا ہے۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ محبت کرنے والے کے کردار میں ایک صحت مندی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی سے منہ نہیں موڑتا۔ حالات سے بیزار نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے اُن پر قابو پانے ساوی ہونے اور انھیں اپنی گرفت میں لے لینے کے لئے سرگرمِ کار رہتا ہے۔ نازِ حُسن کی پرستش اُس کی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے لیکن وہ یہیں تک اپنے آپ کو محدود نہیں کرتا — نیازِ عشق کے اظہار میں بھی پیش پیش رہتا ہے اور اس طرح اس کی حرکات و سکنات عشق کی مثالی واردات و کیفیات کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ مومنؔ نے اپنی غزلوں میں جہاں عاشق کے کردار کو پیش کیا ہے وہاں اُس کی زندگی کے انھیں پہلوؤں کی ترجمانی نظر آتی ہے۔

عاشق بھی مومنؔ کے یہاں ایک فعال مخلوق ہے۔ وہ بھی زندگی سے بھرپور ہے۔ اُس میں بھی بڑی جولانی ہے۔ وہ جذب و شوق سے عبارت ہے۔ اُس کی شخصیت میں پامالی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ محبوب کی طرح وہ بھی کاروبارِ شوق کے نظام میں برابر کا شریک نظر آتا ہے۔ وہ جذبۂ عشق کی اہمیت سے واقف ہے اور زندگی کو عشق اور عشق کو زندگی سمجھتا ہے۔ اسی لئے اس راہ میں اُس کے قدم ڈگمگاتے نہیں۔ وہ تھک کر نہیں بیٹھتا۔ جب تک اس کے دم میں دم باقی رہتا ہے اُس کے قدم برابر آگے کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ راستے کی دشواریاں

اُس کی راہوں میں حائل نہیں ہوتیں، اور وہ برابر اپنی منزل کی طرف بڑھتا جاتا ہے۔ بظاہر اُس کے یہاں مجموعی طور پر پریشاں حالی ضرور نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود وہ زندگی کو بسر کرنا چاہتا ہے۔ زندگی کو بسر کرنے کی خواہش اُس کے دل میں ایک شمع کی طرح فروزاں رہتی ہے۔ وہ زندگی سے بیزار نہیں ہوتا۔ اُس کی مسرّتوں سے سینے کو بھر لینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حصولِ لذت کا خیال اور لُطف اندوزی کا احساس کبھی بھی اُس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ وہ محبوب کو دیکھنے، اُس کے حُسن سے لُطف اندوز ہونے اور اُس کی ذات میں گُم ہو جانے کے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں۔ بس انھیں میں گُم رہتا ہے اور اُس کے لئے عملی طور پر اُس کی کوشش برابر جاری رہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کوششوں میں کبھی کبھی اُس کو ناکامی بھی ہوتی ہے یا محبوب سے قریب ہو جانے کے باوجود وہ اپنے آپ کو مطمئن نہیں پاتا کیونکہ اُس کی خواہشیں، آرزوئیں اور تمنائیں اُس طرح تکمیل سے ہمکنار نہیں ہوتیں جس طرح وہ چاہتا ہے۔ چنانچہ اس منزل پر پہنچ کر اُس میں کہیں کہیں محرومی کا احساس بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بے بس اور پریشاں حال محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ وہ محبوب سے قُربت حاصل کر کے اس سے لُطف اندوز ہونے کا خیال نہیں چھوڑتا۔ اور اِس کی وجہ اس کی رندی اور شاہد بازی ہے۔

یہ رندی اور شاہد بازی عشق و عاشقی کی شکل اختیار کر کے اُس کو دیدارِ یار پر اُکساتی ہے وہ اُس کے حُسن پر جان چھڑکتا ہے۔ اُس کے جلوے اُسے یاد آتے ہیں۔ اُس کے لب مے گوں کی شراب اُس کو سرشار کر دیتی ہے۔ وہ اُس کے خیال میں مست رہتا ہے۔ آہوئے نیم خواب اور نرگس نیم باز میں اُس کو آدھی آدھی رات گزر جاتی ہے اور وہ اُنھیں کے خیال میں گُم رہتا ہے اُس کی مسکراہٹیں اُسے یاد آتی ہیں، اور وہ اُس کی اس ادا پر جان نچھاور کرتا ہے مومنؔ کی غزل میں عاشق کی اس کیفیت کے نقشے جگہ جگہ نظر آتے ہیں ؎

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں ‏ ‏ ‏ بے بادہ مست ہوں میں شب ماہتاب میں

تھا محو رخِ یار میں کیا آئینہ دیکھوں ‏ ‏ ‏ معلوم ہے یار و مجھے جو زنگ مرا ہے

لبِ مے گوں پہ جان دیتے ہیں　　ہمیں شوقِ شراب نے مارا

کیونکر نہ آدھی آدھی رات جاگے وہ جس کا دھیان ہو　　آ ہوئے نیم خواب میں نرگسِ نیم باز میں

نہ کیوں کر بس مٹوا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر　　وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ عاشق محبوب کے حسن اور اس کی اداؤں سے گہرا تاثر قبول کرتا ہے۔ محبوب کی شخصیت کے یہ پہلو اس کی آتشِ شوق کو بھڑکاتے ہیں، اور وہ اس کو دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب یہ محبوب اس کو سامنے سے آتا ہوا نظر آتا ہے تو اضطرابِ شوق میں اس کو اپنا ہوش تک باقی نہیں رہتا۔ مومن نے عاشق کی اس کیفیت کو اس طرح پیش کیا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخِ دلربا آجائے ہے

تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

یہ اضطرابِ شوق کا عالم ہے جو عاشق پر ایک سرخوشی کی سی کیفیت طاری کر دیتا ہے۔

اس عالمِ سرخوشی میں عاشق کاروبارِ شوق کی مختلف منزلیں طے کرتا ہے۔ محبوب کی شخصیت اس کی آنکھوں کے سامنے رنگین پردے سے ڈال دیتی ہے ——— اور وہ ساری کائنات میں رنگینیوں کو بکھرا ہوا دیکھتا ہے۔ محبوب کی ذات کے ساتھ عاشق کی والہانہ وابستگی ان رنگینیوں کو پیدا کرتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اس عاشق کی محبت یک طرفہ نہیں ہوتی۔ اس کا محبوب بھی اس محبت میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔ اسی لئے اُن کے اس رشتے میں رنگینیوں کی اتنی فراوانی نظر آتی ہے۔ یہ عاشق محبوب سے ایک سطح پر تعلق قائم کرتا ہے اور ہر عالم میں برابری نبھاتا ہے۔ یہاں تک کہ محبوب کی طرف سے اگر لطف کم ہو جائے تو اسی نسبت سے اس کے پیار میں بھی کمی واقع ہو جاتی ہے ؎

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری　　واں لطف کم ہوا تو یہاں پیار کم ہوا

ظاہر ہے کہ جو عاشق کاروبارِ شوق کا یہ معیار رکھتا ہو اس کے یہاں رنگینی تو پیدا ہونی ہی چاہیئے یہی وجہ ہے کہ مومن نے عاشق کے جس کردار کو اپنی غزل میں پیش کیا ہے، اس کی حرکات و سکنات

میں سے ہر ایک میں رنگینی پائی جاتی ہے۔ اس رنگینی کا منبع وصل کا خیال ہے۔ اس عاشق پر وصل کا یہ خیال ایک سرخوشی بن کر چھایا رہتا ہے۔ چنانچہ وہ یا تو وصل کی باتیں کرتا ہے یا متعلقاتِ وصل کے مختلف پہلوؤں کا تذکرہ کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر اس کے کردار کی رنگینی اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے۔

پھولے جامے میں سماتے ہی نہیں   وصلِ شوخِ چست پیراہن میں ہم

یارب وصالِ یار میں کیوں کر ہو زندگی   نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

یہاں ہے چاک گریباں تو واں بھی چستی سے   قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

ہر آن آنِ دگر کا ہوا میں عاشقِ زار   وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے

وہ کہاں ساتھ سُلاتے ہیں مجھے   خواب کیا کیا نظر آتے ہیں مجھے

تھی وصل میں بھی فکرِ جدائی تمام شب   وہ آئے تو بھی نیند نہ آئی تمام شب

بوئے گل کا اے نسیمِ صبح اب کس کو دماغ   ساتھ سویا ہے ہمارے وہ سمن بر رات کو

کب تلک جئیں یارب ہجرِ غیرتِ مہ میں   صبح اُٹھ کے منہ کب تک آفتاب کا دیکھیں

شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم اُن کے کوچے میں
ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں

دھیان آیا ہے ترے منہ میں زباں لینے کا   جی ہم اے شوخ پئے سیرِ عدم دبتے ہیں

کس توقع پر اُمیدِ وصل اب　　طاقتِ صبر و شکیبائی نہیں

ان اشعار میں مومن نے ایک ایسے عاشق کی تصویر کھینچی ہے جو وصالِ یار کے خیال سے سرشار رہتا ہے اور یہ وصل کے لمحے اُس کو نصیب بھی ہو جاتے ہیں۔ جب تک یہ لمحے اُس کی زندگی میں نہیں آتے وہ اُن کو حاصل کرنے کے لئے سرگرداں رہتا ہے اور جب یہ لمحے اُس کو نصیب ہو جاتے ہیں تو وہ اپنے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔ ان لمحوں سے وہ رس نچوڑتا ہے اور اس طرح اُس کے ولولہ ہائے شوق کی تکمیل کے سامان فراہم ہوتے ہیں۔

یہ ولولہ ہائے شوق اپنی تکمیل کے لئے ایک ایسی ذات کا تقاضا کرتے ہیں جس کے بغیر وصل کا خیال تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ مومن نے جس عاشق کا تصور اپنی غزل میں پیش کیا ہے وہ اس ذات کے حصول کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ اُس کے پیچھے دوڑتا ہے اُس کے پیشِ نظر اس ذات کی صرف پرستش ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کو جذبے کی تسکین کے لئے حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ عاشق اُس کے مقابلے میں اپنے آپ کو حقیر نہیں سمجھتا بلکہ اُس سے برابری کی سطح پر ملتا ہے۔ مومن نے اس شعر میں اسی صورتِ حال کی وضاحت کی ہے ؎

ہیں اسیر اس کے جو ہے اپنا اسیر　　ہم نہ سمجھے صید کیا، صیاد کیا

اور اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ عاشق اور محبوب دونوں کے درمیان ایک ناگزیر ربط ہوتا ہے۔ عاشق اُس کے ہاتھوں پامال نہیں ہوتا۔ محبوب کے دام میں اُس کے صید ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ برخلاف اُس کے وہ خود صیاد بن کر اپنے دام میں غزل چشموں کو صید کرنے کا کاروبار شروع کر دیتا ہے ؎

آئے غزال چشم سدا میرے دام میں　　صیاد ہی رہا میں گرفتار کم ہوا

اور یہ سب کچھ اُس کے لئے ضروری ہے کیونکہ اُس کے بغیر جس مقصد کو وہ حاصل کرنا چاہتا ہے، وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مقصد ہے زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کی خواہش۔ اُس سے لذت حاصل کرنے کی تمنا اور لطف اندوز ہونے کی آرزو! ۔ کہ اسی طرح اُس کو آسودگی نصیب ہو سکتی ہے۔

اس عاشق کی زندگی میں ناکامی اور محرومی کا احساس کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبوب اُس کے جذب و شوق کی صحیح کیفیت کو سمجھتا ہے اور اس سلسلے میں اُس کی صداقت اور اخلاص مندی کو محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے وہ اس عاشق سے خواہ مخواہ دور نہیں بھاگتا وہ اُس کو ناز و انداز ضرور دکھاتا ہے کہ یہ بھی ایک اندازِ محبوبی اور طرزِ دل رُبائی ہے لیکن وہ اُس کو بیرے سے نظر انداز کر دینے کا قائل نہیں۔ وہ تو اُس سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کو تو خود اُس سے ملنے کی تمنا رہتی ہے۔ اور وہ فرطِ شوق سے خود دوڑ کے اُس کے گلے لگتا ہے ؎

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر　　　آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اک بار لگا

تاثیر سوزِ دل گرہ نار ہے مگر　　　اُس شعلہ رو کو سینے سے میرے لگا دیا

اور یہ سب کچھ جذبۂ دل اور تاثیر سوزِ دل کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ یہی باتیں ہیں جو محبوب کو عاشق کا گرویدہ بناتی ہیں اور وہ خود فرطِ شوق سے بے قرار ہو کر اس سے قربت حاصل کر لیتا ہے۔ اس طرح محبوب اور عاشق کے درمیان دوئی کا احساس باقی نہیں رہتا، اور وہ دونوں ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔

یہ اور بات ہے کہ عاشق کو اس کے باوجود سکون حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ بہر صورت عاشق صادق ہے ۔۔۔ اور عاشق صادق کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سب کچھ حاصل ہو جانے کے باوجود وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ہر چیز سے محروم ہے۔ اُس کو وصل میں بھی فراق کا خیال رہتا ہے محبوب کی موجودگی میں بھی اُسے ہجر کی کیفیت نظر آتی ہے ۔۔۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ بے قراری اُس کا مزاج ہے، بے چینی اُس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ وہ اس بے قراری سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ اس بے چینی کا علاج اُس کے پاس نہیں ہے۔ مومن نے اس شعر میں عاشق کی اسی کیفیت کی ترجمانی کی ہے ؎

کیا مجل ہوں اب علاجِ بے قراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اُس نے دل پر تو بھی دل دھڑکا کیا

اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ محبت کرنے والے کو محبوب کی قربت بھی سکون نہیں پہنچا سکتی۔ وہ اس کو تسکین پہنچانے اور دلاسا دینے کے خیال سے دل پر ہاتھ رکھ دے تب بھی اُس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اس طرح تو اُس کی اضطرابی کیفیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے اور اُس کی بے چینی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس اضطراب اور بے چینی کے نتیجے میں عاشق کو جن حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اُس پر جو مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں اُس کی تفصیل مومن نے اپنی غزلوں میں جگہ جگہ پیش کی ہے، اور اس طرح اس اضطراب اور بے چینی کے مختلف روپ دکھائے ہیں جس کو عاشق کے کردار میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اُن سے اُس کی شخصیت پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور اُن معیاروں اور قدروں کا اندازہ ہوتا ہے جن کے گرد اُس کی زندگی گھومتی ہے۔ مومن جب اس کی ترجمانی کرتے ہیں تو گویا عشق کی واردات کو پیش کرتے ہیں اور یہ عشق کی واردات اُن کے یہاں انسانی تجربات کے سانچے میں کچھ اس طرح ڈھل جاتی ہے کہ وہ اجنبی اور نامانوس نہیں معلوم ہوتی۔ یہ مومن کی غزل کی بھی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر اس میں رفعت اور ترفع کا احساس ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آنے لگتی ہے ؎

کچھ جی گرا پڑے تھا پر اب تونے ناز سے — تجھ کو گرا دیا تو مرا جی سنبھل گیا

وہ حالِ زار ہے میرا کہ گاہ غیر سے بھی — تمھارے سامنے وہ ماجرا بیاں نہ ہوا
لگی نہیں ہے یہ چپ لذّتِ ستم سے کہ میں — حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

کانٹا سا کھٹکتا ہے کلیجے میں غمِ ہجر — یہ خار نہیں دِل سے گُلِ اندام نکلتا

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں میں، کیا ہے، کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ سُن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو — سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

شب دم فرقت ہمیں کیا کیا مزے دکھلائے تھا ‏ ‏ دم رکے تھا سینے میں کم بخت جی گھبرائے تھا
بات شب کو اس سے منع بے قراری پر بڑھی ‏ ‏ ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا
ہوگئی دو روز کی الفت میں کیا حالت ابھی ‏ ‏ مومن وحشی کو دیکھا اس طرف سے جائے تھا

اُبلے کیونکر نہ نکلیں جائے اشک آنکھوں سے آہ ‏ ‏ میرے پہلو میں ابھی وہ آگ کا پرکالہ تھا

روئیے کیا بخت خفتہ کو کہ آدھی رات سے ‏ ‏ میں یہاں رویا کیا اور وہ وہیں سویا کیا
آنکھ عاشق کی کوئی پھرتی ہے اے وعدہ خلاف ‏ ‏ دیکھے میں مرتے مرتے سوئے در دیکھا کیا

نالہ پیہم سے یا فرصت نہیں ‏ ‏ حضرت ناصح کریں ارشاد کیا
جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو ‏ ‏ بے وفا پھر حاصل بیداد کیا
کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر ‏ ‏ ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا

ستم اے گرمیٔ ضبط فغاں او آہ چھاتی پر ‏ ‏ کبھی کس پڑ گیا چھالا کبھی پھوڑا نکل آیا

ہوں کیوں نہ محو حیرت نیرنگ ہائے شوق ‏ ‏ جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں خواب تھا

بزم مے میں بس ایک میں محروم ‏ ‏ آپ کے اجتناب نے مارا
کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں ‏ ‏ مجھے فکر جواب نے مارا

چھوڑا نہ دل میں کچھ بھی تپ ہجر نے کہ رات ‏ ‏ روتے تھے زار زار اور آنکھوں میں نم نہ تھا

روتے تو رحم آتا سو اس کے روبرو تو ‏ ‏ اک قطرہ خوں بھی چشم خوں بار تک نہ پہنچا

پروردۂ وفا سے ہو کب ترکِ عاشقی | کیا ناز تھے کہ مجھ سے تحمل نہ ہو سکا

دل قابلِ محبتِ جاناں نہیں رہا | وہ ولولہ وہ شوق وہ طغیاں نہیں رہا
کرتے ہیں اپنے زخمِ جگر کو رفو ہم آپ | کچھ بھی خیالِ جُنبشِ مژگاں نہیں رہا
غش ہیں کہ بے دماغ ہیں گُل پیرہن نمط | از بس دماغ عطرِ گریباں نہیں رہا
ناکامیوں کا گاہ گلہ گاہ شکر ہے | شوقِ وصال و اندوہِ ہجراں نہیں رہا
پھرتے ہیں کیسے پردہ نشینوں سے منہ چھپائے | رُسوا ہوئے کہ اب غمِ پنہاں نہیں رہا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے | ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
حالِ دل یار کو لکھوں کیونکر | ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں | سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

بعد مدت اُس کَ سے یوں پھرے بتنگ آکر | جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا | مرنا ہی مقدر تھا وہ آتے تو کیا ہوتا
ہونا تھا وصال اک شب قسمت میں بلا سے گر | تو مجھ سے خفا ہوتا میں تجھ سے خفا ہوتا

مر بھی گئے جدائی پردہ نشیں میں ہم | آیا نہیں زباں پہ دردِ نہاں ہنوز

اس طرح خاک چھانتے پھرتے نہ دشت دشت | ہوتے جو پائمال کسی رہ گذر میں ہم
ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم | پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا غبارِ دل | کہتے تھے اُن کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم

کیا دل لگے گا دیکھئے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

اگر جلاتے نہ اُس شعلہ رُخ کے عشق میں جی
تو سوزِ آتشِ غم سے جلا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ہنسانا کسی کا بھا جاتا
تو بات بات پہ یوں رُو دیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ
تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

دم بہ دم رونا ہمیں چاروں طرف تکنا ہمیں
یا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں

باقی نہیں کدورتِ شوقِ ستم کی ہرگز
کیا اے دل و جگر تم تیروں سے چھن گئے ہو

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو، گو ہو رسوائی
وہ اگر اِدھر دیکھیں مجھ کو دیکھتا دیکھیں

آج اِس بزم میں طوفان اُٹھا کے اُٹھے
یاں تلک رُوئے کہ اُس کو بھی رُلا کے اُٹھے
اُف ری وہ گرمیٔ صحبت کہ ترے سوختہ جاں
جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اُٹھے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

صبرِ وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے

یہ حالت ہے تو کیا حاصل بیاں سے
کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے

اِن اشعار میں مومن نے عشق و عاشقی کے مختلف تجربات کو واردات و کیفیات کی صورت دے دی ہے۔ اِن میں کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ یہ انسانی زندگی کے عام تجربات ہیں اسی لئے ان میں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا برخلاف اس کے ایک مانوس سی فضا نظر آتی ہے

اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس میں آفاقیت کی ایک لہرسی دوڑی ہوئی ہے۔ کیونکہ یہ واردات کیفیات جن کو یہاں مومن نے پیش کیا ہے تمام انسانوں میں مشترک ہیں۔ اسی لئے اس آئینے میں ہر انسان کو اپنی جذباتی واردات کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ ان میں بڑا درد ہے۔ بہت سوز و گداز ہے۔ اور اس درد اور سوز و گداز نے یہاں انسانیت کے درد اور سوز و گداز کی صورت اختیار کرلی ہے۔

یہ جذبات اور واردات و کیفیات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ مومن نے زندی اور شاہد بازی کے باوجود نیاز عشق کو بڑی اہمیت دی ہے۔ اور اُن کی غزل میں عاشق کا جو تصور ملتا ہے۔ اُس کی تمام حرکات و سکنات اسی نیاز عشق کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتی ہیں۔ وہ عشق کے اعلیٰ معیار رکھتا ہے۔ محبوب کی اُس کے نزدیک بڑی اہمیت ہے۔ اس محبوب پر جان نثار کرنا اُس کا نصب العین ہے۔ اُس کا جینا اور مرنا سب کچھ محبوب ہی کے لئے ہے۔ مومن نے ہر جگہ اس عاشق کو نیاز عشق کا حلقہ بگوش دکھایا ہے، اور اس سلسلے میں بعض ایسی باتیں بھی کہی ہیں جو بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اِن میں نیاز عشق کی بلندی اور انسانی اقدار کی برتری کا خیال نمایاں نظر آتا ہے۔

ایک شعر میں مومن نے عاشق کی یہ کیفیت دکھائی ہے کہ وہ محبوب کی جفاؤں سے پریشان ہے لیکن اس کے باوجود وہ شکوہ نہیں کرتا۔ کیونکہ نیاز عشق اس کو شکوہ سنج ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے وہ یہ سوچتا ہے کہ کہیں محبوب کی اس جفا سے اُس کے دل میں خواہش مرگ نہ پیدا ہو جائے۔ ورنہ محبوب کے سوا ایک اور ارمان ہوگا جس کو وہ پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ اُس کے نزدیک تو دل میں صرف محبوب ہی کو حاصل کرنے کا ارمان ہونا چاہیئے۔ مومن کہتے ہیں ؎

خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا، ورنہ — دِل میں پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا

اس شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اُس کو نیاز عشق ہی نے پیدا کیا ہے۔ عاشق محبوب کے ساتھ کچھ ایسا جذبِ صادق رکھتا ہے کہ وہ کسی اور کی آرزو تو درکنار، موت تک کی آرزو کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔

یہ عاشق محبوب کا بہت خیال رکھتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اُس کو ذرا سی بھی تکلیف ہو۔ یہاں تک کہ اُس کو عام عاشقوں کی طرح عالمِ فراق میں بھی یہ خواہش نہیں ہوتی کہ محبوب اُس کے پاس آجائے۔ کیونکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ اگر وہ اس عالم میں اُس کے پاس آگیا تو ہو سکتا ہے کہ اُس کے (عاشق) لئے سکون کا باعث ہو لیکن محبوب کو بہر صورت اُس کی تباہ حالی میں شریک ہونا پڑے گا اور اس طرح اس کو تکلیف ہو گی۔ اس لئے وہ چارہ گر کو مخاطب کر کے کہتا ہے ؎

جانے دے چارہ گر شبِ ہجراں میں مت بُلا   وہ کیوں شریک ہو مرے حالِ تباہ میں

ظاہر ہے کہ چارہ گر محبوب کو عالمِ فراق میں بُلا کر ہی عاشق کی پریشاں حالی کا علاج کر سکتا ہے اور غالباً اُس کے سامنے یہ تجویز بھی پیش کرتا ہے لیکن عاشق کو یہ بات صرف اس خیال سے منظور نہیں کہ اس طرح محبوب کو پریشانی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اس نیازِ عشق کی وجہ سے محبوب کے آرام کا خیال اس عاشق کے یہاں اس حد تک بڑھتا ہے کہ وہ اپنی ہجر کی شبِ دراز میں بھی کمی نہیں چاہتا کیونکہ اُس سے محبوب کے خوابِ ناز میں فرق آجانے کا امکان ہے۔ اُس کی خواہش تو یہ ہے کہ محبوب کو خوابِ ناز سے لطف اندوز ہونے کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت ملنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ یہ آرزو کرتا ہے کہ اُس کی شبِ دراز دراز تر ہو جائے ؎

تا نہ پڑے خلل کہیں آپ کے خوابِ ناز میں   ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شبِ دراز میں

یہاں بھی نیازِ عشق ہی نے عاشق کے یہاں اس خیال کو پیدا کیا ہے۔ اور اس سے اس کے جذبِ صادق کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے جس کے باعث نیازِ عشق نے یہ صورت اختیار کی ہے۔

یہ عاشق محبوب اور اُس کے عشق کو بہت عزیز رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عشق کے اچھے اور بُرے تمام پہلو اُس کے لئے یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ وصل کی مسرتوں ہی پر جان نہیں چھڑکتا۔ فراق کے غم اور محبوب کے نہ ملنے کے ملال تک کو اس لئے عزیز رکھتا ہے کہ اس سے عشق اور نیازِ عشق کی یاد تازہ ہوتی ہے ۔۔ مومن نے اس شعر میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے ؎

شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں   کہ گو خوشی نہیں مرنے کی پر ملال تو ہے

یہاں زندگی کا احساس کتنا شدید ہے ۔ یہ زندگی ہی عاشق کے نزدیک عشق اور نیازِ عشق ہے۔ اسی لئے وہ اس کے ملال تک کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔

اور پھر اس نیازِ عشق میں اس حد تک شدت پیدا ہوتی ہے کہ عاشق محبوب کے خیال سے شبِ وصلِ غیر تک کو کاٹنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے تاکہ وہ اُس کی ہر آزمائش پر پورا اُترے۔ یہ شعر کتنا عجیب لیکن جہاں تک نیازِ عشق کا تعلق ہے کتنا بلند ہے ۔

لے شبِ وصلِ غیر بھی کاٹی   تو مجھے آزمائے گا کب تک

یہ سوال یہاں پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر عاشق کی حمیت اور غیرت اس خیال سے کس طرح مطابقت پیدا کرتی ہے کہ وہ شبِ وصلِ غیر تک کاٹنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے اور یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عاشق آزمائش میں پورا اُترنے کے خیال سے اس حد تک جانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے کہ شبِ وصلِ غیر کے کاٹنے میں بھی اس کو تامل نہیں ہوتا۔ بظاہر یہ عجیب و غریب صورتِ حال ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس کو نیازِ عشق کی بلندی کے خیال نے پیدا کیا ہے۔

غرض مومنؔ نے اپنی غزل میں نیازِ عشق کو بڑی اہمیت دی ہے۔ ان کے عاشق کے کردار کی بنیاد یہی نیازِ عشق ہے، اور اُس کی تمام حرکات و سکنات اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ یہ عاشق جو کچھ بھی سوچتا ہے اور جو حرکتیں بھی اُس سے عملی طور پر سرزد ہوتی ہیں۔ اُن کی تہہ میں یہی نیازِ عشق کا خیال ہوتا ہے۔ اسی نیازِ عشق کا اثر ہے کہ وہ صداقت اور اخلاص مندی ایثار اور قربانی، محویت اور سپردگی کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ اور یہ سب باتیں مل کر اُس کے عشق کو انتہائی بلندی سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔

لیکن اس کے باوجود مومنؔ کا یہ عاشق محبوب کے سامنے گرا پڑا اور اس کے مقابلے میں کم مرتبہ نہیں معلوم ہوتا۔ محبوب سے اُس کے تعلق کی بُنیاد جذبِ صادق ہے۔ اس لئے یہ جذبِ صادق محبوب پر بھی اثر کرتا ہے، اور یہی سبب ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔ اور اُن کا میل جول ایک سطح پر ہوتا ہے۔ عاشق محبوب کے لئے صرف آہ و زاری ہی نہیں کرتا، محبوب کے وجود سے مسرت بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ اس سے

دور ہی نہیں رہتا، اُس کے قریب بھی پہنچتا ہے۔ اس کی بُنیاد عاشق کا یہی جذب صادق ہے۔ اسی جذب صادق کی وجہ سے اُن دونوں میں ایک دوسرے کے لئے جذب وکشش پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کاروبار شوق میں بعض ایسے لمحے بھی آتے ہیں جب محبوب خود دوڑ کر عاشق کے گلے لگ جاتا ہے ؎

جذبۂ دل کو نہ چھاتی سے لگاؤں کیونکر ‏ ‏ آپ وہ میرے گلے دوڑ کے اک بار لگا

ظاہر ہے کہ یہ جذبۂ دل ہی کا اثر ہے ورنہ محبوب کا اس طرح عاشق کے گلے لگنا تصور میں بھی ممکن نہیں۔ بہرحال اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عاشق اور محبوب ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ عاشق محض اُس کے کوچے کا گدا ہی نہیں ہے۔ اُس کی زندگی میں خاصا دخل رکھتا ہے۔ صرف عاشق ہی کو اس سے دلچسپی نہیں، محبوب بھی عاشق کا شیدائی ہے۔

اِن دونوں کا یہ والہانہ لگاؤ بڑا جذب واثر رکھتا ہے اور وہ اس کے اثر سے وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ سے زیادہ قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اس جذبِ صادق کی وجہ سے عاشق کو تاثیر سوزِ دل نصیب ہوتی ہے جس کو وہ کرۂ نار سے کم نہیں سمجھتا۔ اس کے اثر سے بھی محبوبِ شعلہ رو خود اُس کے سینے سے لگ جاتا ہے۔ مومن کا شعر ہے ؎

تاثیرِ سوزِ دل کرۂ نار ہے مگر ‏ ‏ اُس شعلہ رو کو سینے سے میرے لگا دیا

یہاں بھی جذب صادق کی ایک کیفیت دکھائی گئی ہے جس کے زیر اثر محبوب اور عاشق ایک جان دو قالب ہو جاتے ہیں۔

ایک عاشق جس کو محبوب کی یہ قربت نصیب ہو بہت حساس اور زود رنج ہوتا ہے۔ محبوب کی طرف سے اگر ذرا بھی بے التفاتی کا اظہار ہو تو اُس کے دل میں کچھ عجیب سے خیالات کی لہریں اُٹھنے لگتی ہیں۔ اُس کی زود حسی التفات تک کو بے التفاتی تصوّر کر لیتی ہے اور اُس کے ذہن میں کچھ عجیب گھروندے سے بن جاتے ہیں۔ خیالات کی رَو اُسے نہ جانے کہاں کہاں لے جاتی ہے اور وہ محبوب سے ایسی باتیں بھی کرنے لگتا ہے جس میں بظاہر تو بے رُخی ہوتی ہے لیکن درحقیقت اُس کی تہہ میں جذب صادق ہی کا ہاتھ ہوتا ہے۔ محبوب سے چھیڑ چھاڑ جاری رہتی ہے اور اس چھیڑ چھاڑ میں نوبت یہاں تک پہنچتی ہے جس کا اظہار مومن نے ان اشعار میں کیا ہے ؎

اچھا تو دیں گے اور کسی خوبرو کو دل   اچھا تو اپنی خوئے بدائے بدزباں نہ چھوڑ

گر چند سے اور یہ ہی رہی یار کی طرح   ہم بھی بنیں گے بوالہوس اغیار کی طرح

دل آگ ہے اور لگائیں گے ہم   کیا جانے کسے جلائیں گے ہم
گر غیر سے ہے یہ رنگِ صحبت   تو اور ہی رنگ لائیں گے ہم

اب اور سے دل لگائیں گے ہم   جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
بگڑے تو کریں گے اور سے صلح   تجھ پر بھی بُری بنائیں گے ہم
دل دے کے اک اور لالہ رو کو   ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری   کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم

ان اشعار میں واسوخت کا رنگ و آہنگ بہت نمایاں ہے۔ مومن نے یہاں عین معاملات کی ترجمانی کی ہے۔ اُن کو کاروبار شوق کے عام حقائق بنا کر پیش کیا ہے۔ اُن میں غیر معمولی کیفیت نظر نہیں آتی۔ عاشق کے یہاں ان خیالات کی لہریں ضرور اُٹھتی ہیں لیکن یہ صورت حال جذبۂ شوق کی اُس منزل کو ظاہر کرتی ہے۔ جہاں پہنچ کر عاشق خواہ مخواہ بغیر کسی سبب کے بھی محبوب کا شکوہ سنج ہو جاتا ہے اور اُس کی یہ شکوہ سنجی ان خیالات کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

یہ خیالات کسی حد تک اس عاشق کے طبقاتی احساس کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مومن نے اپنی غزل میں جس عاشق کا کردار پیش کیا ہے وہ ایک مخصوص معاشرتی اور معاشی ماحول کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور اس ماحول کے نقوش اُس کی شخصیت میں بہت گہرے نظر آتے ہیں۔ اس مخصوص ماحول میں جہاں محبوب کی حیثیت مجلسی ہو گئی تھی اور عاشق ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس کی زندگی اسی مجلسی ماحول میں گزرتی تھی، اُس کے یہاں ایسے خیالات اس چھیڑ چھاڑ اور لاگ ڈانٹ کے نتیجے میں بھی پیدا ہو سکتے تھے جس سے یہ ماحول عبارت تھا۔ عاشق کے کردار کو پیش کرتے ہوئے مومن کی غزل میں کہیں کہیں واسوخت

کے رنگ و آہنگ کو اس صورتِ حال نے بھی پیدا کیا ہے ـــــ اور اسی پر کیا منحصر ہے۔ اس عاشق کی تمام حرکات و سکنات میں اس ماحول کے اثرات اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ اُس کی حسن پرستی، محبوب کے ساتھ اُس کے تعلقات کی مخصوص نوعیت، اُس کے محسوسات اور واردات و کیفیات، سب میں اس ماحول کے اثرات نمایاں ہیں۔

غزل کی روایت میں عاشق اپنے معراجِ کمال پر اُس وقت پہنچتا ہے جب اُس پر وحشت طاری ہو جاتی ہے اور اُس کا جوشِ جنوں صحراؤں کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ بہار آتی ہے تو وہ جوشِ جنوں میں سوئے دشت بھاگتا ہے۔ لوگ اُسے پابہ زنجیر کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ زنجیریں اُس کی وحشت کو اسیر نہیں کر سکتیں۔ مومن نے اپنی غزل میں جس عاشق کو پیش کیا ہے اُس کو بھی ان حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ جوشِ جنوں میں گھر سے باہر نہیں نکلتا اور اُس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جنگل بھی بیٹھے بٹھائے اُس کے گھر آجائے۔ مومن کا بظاہر یہ عجیب شعر ہے ؎

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر لادے اک جنگل مجھے بازار سے

لیکن اگر اس عاشق کے طبقاتی احساس کو سامنے رکھا جائے تو یہ شعر ایسا کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتا اس کی تہہ میں تو یہی خیال ہے کہ اُس کی طبقاتی برتری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ جوشِ جنوں میں خود جنگل کی طرف بھاگے۔ برخلاف اس کے وہ چارہ گر کے سامنے اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ اگر جوشِ وحشت کا علاج ہی کرنا ہے تو اس کے لئے بازار سے ایک جنگل خرید کر لانے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے کہ جنگل کا خرید کر لانا چارہ گر کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے علاج تو خیر ناممکن ہے ـــــ لیکن بہر حال اس سے عاشق کے طبقاتی مزاج کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

غرض مومن نے اپنی غزل میں عاشق کا ایک مکمل اور بھرپور کردار پیش کیا ہے۔ اُس کے کردار کے نقوش اُن کی غزلوں کے اشعار میں جگہ جگہ بہت اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ عاشق حُسن کا شیدائی ضرور ہے لیکن حُسنِ نظر کی دولت بیش بہا سے بھی مالا مال ہے۔ یہ محبت کا بندہ ہے اور محبت کرنے کی صلاحیت اس میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اُس کی اس محبت کا منبع محبوب

کی ذات ہے اور اُس کی ذات کو وہ بڑی اہمیت دیتا ہے ۔ اُس سے قربت حاصل کرنے کی خواہش اُس کی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور وہ اس مقصد کے حصول کی خاطر زمین آسمان کے قلابے مِلا دیتا ہے۔ اِس سلسلے میں اُس کو عجیب وغریب جذباتی اور ذہنی تجربات ہوتے ہیں لیکن ان تجربات کے نتیجے میں جو واردات وکیفیات اُس پر طاری ہوتی ہیں اُن میں کوئی غیر معمولی اور خلاف فطرت بات نظر نہیں آتی عجیب وغریب تجربات سے دوچار ہونے کے باوجود اُس پر طاری ہونے والی واردات وکیفیات کی نوعیت انسانی ہی رہتی ہے اسی لئے ان میں ایک آفاقی رنگ وآہنگ نمایاں نظر آتا ہے ـــ یہ عاشق جذبِ صادق رکھتا ہے ۔ اخلاص مندی اس کی زندگی کی بُنیاد ہے ۔ وہ کچھ معیار رکھتا ہے ۔ یہ معیار اُس کے کردار میں بہت نمایاں نظر آتے ہیں اور اُس کے نزدیک معیاروں کی بڑی اہمیت ہے ۔ اسی لئے وہ ایثار، اور قربانی، محویت اور سپردگی کا مجسمہ نظر آتا ہے ـــ لیکن وہ کہیں بھی اپنے آپ کو نیچے نہیں گراتا۔ بلکہ کاروبارِ شوق کی ہر منزل میں لئے دیئے رہتا ہے۔ اپنی طبقاتی برتری کا احساس اُس کے یہاں ضرور موجود ہے لیکن یہ احساس اُس کے کردار کو اُس زمانے کی مجلسی زندگی کا صحیح آئینہ دار بنا دیتا ہے ۔ اور اُس زمانے کی سماجی زندگی کی بنیادی اقدار اُس کی شخصیت میں پوری طرح نمایاں نظر آتی ہیں ۔

(۶)

مومن کی غزل میں عشق وعاشقی کا ایک مکمل نظام ملتا ہے ۔ اس نظام میں محبوب اور محبّت کرنے والے کے کردار بُنیادی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اِن کے جذباتی اور جسمانی رشتے اور اس رشتے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے حالات وواقعات، معاملات ومحسوسات، واردات و کیفیات مل کر اس نظامِ عشق کے تار وپود کو تیار کرتے ہیں ۔ انھیں سے اُن کے تصورِ عشق کا ہیولا تیار ہوتا ہے ۔ مومن نے نظریاتی طور پر عشق اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال نہیں کیا ہے البتہ عملی طور پر ایسے پہلوؤں کی ترجمانی ضرور کی ہے ۔ جن میں سے اُن کے اِس تصوّرِ عشق کا پیکر اُبھرتا ہے اور اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ عشق کا ایک واضح تصوّر رکھتے ہیں ۔ اُن کے نزدیک وہ ایک باقاعدہ نظام ہے ۔ اُس کی دُنیا جذبات کی دُنیا ہے ۔ اور اسی جذباتی نظام کی حسن سامانی

کا نام عشق ہے مومن کے یہاں عشق کا ماورائی تصور نہیں ہے۔ وہ اسی دُنیا کا عشق ہے۔ انسانی زندگی اُس کی بُنیاد ہے اور اُس کی جڑیں اسی انسانی زندگی کی زمین میں پیوست ہیں۔ اسی لئے اُس میں ایک استواری کا احساس ہوتا ہے اور ایک پختگی نظر آتی ہے۔ وہ نشاط اور احساسِ نشاط کے گرد گھومتا ہے۔ جذباتی اور جسمانی تسکین اُس کا مقصد ہے۔ اکتسابِ لذت اور حصولِ مسرت کے خیال کو اس میں بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس کی حدیں کہیں کہیں تعیش سے بھی جا ملتی ہیں لیکن ان منزلوں سے ہمکنار ہونا آسان نہیں ہوتا۔ اس لئے یہ عشق کبھی کبھی ایک آزار کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور ان دونوں پہلوؤں کے درمیان ایک کشمکش اور آویزش جاری رہتی ہے۔ مومن نے اس کی پوری تفصیل پیش کی ہے اور اس تفصیل سے اُن کے تصورِ عشق کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔

اس تصورِ عشق میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ عمومیت ہے۔ مومن نے اپنی غزل میں اس عشق کو غیر معمولی بنا کر پیش نہیں کیا ہے۔ برخلاف اس کے عشق کو ایک عام انسان کا فطری جذبہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی لئے ان کے یہاں محبوب اور عاشق کی حرکات و سکنات اور واردات و کیفیات میں، دور از کار اور بعید از قیاس باتیں نظر نہیں آتیں۔ اُن کا محبوب بھی ایک عام انسان ہے۔ وہ اُردو غزل کے روایتی محبوب کی طرح خیالی مخلوق نہیں ہے۔ بلکہ اسی دنیا کا انسان ہے جو اپنی حرکات و سکنات سے یہ ظاہر کرتا ہے کہ اُس کو اپنی ذات ہی سے نہیں، محبت کرنے والے سے بھی دلچسپی ہے، اور وہ اُس پر ظلم ہی نہیں کرتا، اُس کی اہمیت کو بھی محسوس کرتا ہے اسی طرح عاشق مومن کے یہاں کوئی ایسی مخلوق نہیں جو صرف ظلم و ستم سہنے کے لئے پیدا ہوتا ہے جس کی محبوب کے سامنے کچھ بھی پیش نہیں جاتی اور جس کی زندگی ایک کس مپرسی اور زبوں حالی کے عالم میں بسر ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ تو ایک ایسا انسان ہے جس کی زندگی کے نہاں خانے میں آرزو کی قندیل روشن ہے اور جو اس کے سہارے زندگی کے راستے پر آگے بڑھتا ہے۔ محبوب سے اُس کو والہانہ وابستگی ہے۔ وہ اُس سے قربت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لئے نہ جانے کیا کیا کچھ کرتا ہے۔ وہ صرف ناکام اور نامراد ہی نہیں رہتا، اُس کو کامیابی اور کامرانی بھی نصیب ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کامیابی اور کامرانی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ تو راہِ شوق

کا مسافر ہے جو کسی ایک جگہ پر قیام کرنا نہیں جانتا۔ یہ سفر ہی اس کا نصب العین ہے، اور وہ اس میں لطف لیتا ہے۔ اسی لئے اس عشق میں انفعالیت کی جگہ حرکت نمایاں نظر آتی ہے۔ اسی صورت حال نے مومن کے یہاں عشق کو زندگی اور زندگی کو عشق بنا دیا ہے۔

زندگی ظاہر ہے کہ رنگین اور پُرکار بھی ہے۔ اور اس رنگینی اور پرکاری کی جھلکیاں عشق میں بھی نظر آتی ہیں۔ کاروبار شوق کے مختلف معاملات انسان کے حسین ترین لمحوں کی پیداوار ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُس میں بڑی رنگینیوں اور رعنائیوں کا احساس ہوتا ہے۔ مومن نے اپنی غزل میں جگہ جگہ ان معاملات کی جس طرح ترجمانی کی ہے، اُس سے اُن کے تصورِ عشق پر روشنی پڑتی ہے ؎

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا   دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

ہر ایک سے اُس بزم میں شب پوچھتے تھے نام   تھا لطف جو کوئی مرا ہم نام نکلتا

تیرے پردے نے کی یہ پردہ دری   تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

ناز و شوخی دیکھنا وقتِ تظلّم دمبدم   مجھ سے وہ عذرِ جفا کرتا تھا اور جھنجلائے تھا

وعدۂ وصلت سے دِل ہو شاد کیا   تم سے دشمن کی مبارک باد کیا

کس پہ مرتے ہو آپ پوچھتے ہیں   مجھے فکرِ جواب نے مارا
یوں کبھی نوجواں نہ مرتا میں   تیرے عہدِ شباب نے مارا

اگر مرضی یہی ٹھہری کہ تجکو چھوڑ دوں مجکو   بتا دے اور کوئی غیرتِ مہتاب اپنا سا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں میں نے دعویٰ کیا تحمّل کا

کیا کیجیے دل شوخیٔ فطرت پہ جو آ جائے یہ تو میں سمجھتا تھا کہ وہ رام نہ ہوگا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہائے ری چھیڑ رات سن سن کے حال میرا کہا کہ کیا صاحب

اظہارِ شوق شکوہ اثر اس سے تھا عبث یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا عبث

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

وہ چھیڑے ہے نکہت کو گل ہائے شبینہ کی اب تم سے بھی چل نکلی بادِ سحری اپنی

پامال اک نظر میں قیام و ثبات ہے اُن کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

بگڑتے ہو کیا اب بھی کہتا ہوں میں عیاں صلح پھر کس کی چتون سے ہے

ان اشعار میں مختلف اور متنوع معاملات کو پیش کیا گیا ہے لیکن یہ سب کے سب اس رشتے کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں جو محبوب اور محبت کرنے والے کے درمیان بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور

جس کی بدولت یہ زندگی اتنی رنگین اور پُر بہار نظر آتی ہے کہ اُس کو بسر کرنے اور برتنے کو جی چاہتا ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے مومنؔ کے تصوّرِ عشق کی بنیاد محبوب اور محبت کرنے والے کے باہمی رشتے پر استوار ہے اور انھوں نے اپنی غزل میں اسی رشتے کے مختلف پہلوؤں کو پیش کر کے اپنے عشقیہ تصوّرات کی وضاحت کی ہے۔ مومنؔ کے نزدیک یہ رشتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اسی لئے اُس کو ہر حال میں قائم رکھنے کی خواہش ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہتی ہے — اور اس خواہش کے ہاتھوں اس کا احساس اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ وہ اس راہ میں کسی چیز کو بھی حائل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ غیر رقیب اور دشمن کا خیال مومنؔ کے یہاں اسی احساس نے پیدا کیا ہے۔ یہ کردار عشقِ صادق کو پروان چڑھتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ کیونکہ اُس کی زندگی کے معیار مختلف ہیں۔ وہ تو ہوا و ہوس کا بندہ ہے۔ عاشق اُس کو اچھا نہیں سمجھتا۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان ایک آویزش شروع ہو جاتی ہے۔ مومنؔ کی غزل میں اس رقیب اور غیر کا ذکر بار بار آیا ہے، اور اس کو پیش کر کے انھوں نے درحقیقت عشق و عاشقی کی صداقت اور جذبِ صادق کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ یہ اشعار اسی صورت کی ترجمانی اور عکاسی کرتے ہیں ؎

جذبِ دل نے غیر کے بھی کیا کوئی تاثیر کی
آج کیوں آتے ہوئے ہر گام پر رکتے ہیں آپ

خو رشکِ غیر کی بھی ہم کو ہو گئی
اب اور کچھ نکالئے آزار کی طرح

وہاں چھوٹا گلے لگنا کہ شوقِ ہمکناری میں
لگا تے تھے گلے سے غیر کی تصویر اکثر ہم

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

گر غیر سے ہے یہ گرمِ صحبت
تو اور ہی رنگ لائیں گے ہم

غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ
آرزو ہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

محفل میں تم اغیار کو دُزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

جاں نہ کھا وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گِلا کرتا ہوں ہمدم، وہ قسم کھا جائے ہے

عدو کے وہم سے تکتا ہوں بزمِ غیر میں ہر سو
نہیں ہے اور کچھ یوں آپ جو چاہیں گماں کیجیے

اب اغیار سے ہاتھا پائی ہے کیوں
نزاکت بس اے ناز نہیں ہو چکی

شبِ وصل عدو کیا کیا جلا ہوں
حقیقت کھل گئی روزِ جزا کی

ان اشعار میں رقیب اور عدو ایک زندہ کردار معلوم ہوتا ہے۔ مومن کے شدید احساس نے اس کردار کی تخلیق کی ہے لیکن اس کا مقصد صرف اس کردار کو پیش کرنا نہیں، بلکہ جذبِ صادق کی اہمیت کو واضح کرنا ہے۔ اور یہ جذبِ صادق مومن کے تصورِ عشق کی بُنیاد ہے۔ یہ کردار جہاں بھی نمایاں ہوتا ہے، وہاں عشق و ہوس کی بُنیادی خصوصیات کی وضاحت ہوتی ہے اور شر کے مقابلے میں خیر کی قدروں کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عشق مومن کے خیال میں اقدارِ خیر ہی سے عبارت ہے، اور عاشق اُن کے خیال میں انھیں اقدارِ خیر کا علم بردار ہوتا ہے۔ ان اقدار کو برقرار رکھنے کی آرزو اُس کو بڑی آزمائشوں میں مبتلا کرتی ہے اور وہ نہ جانے کیا کیا کچھ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں ایسی منزلیں آتی ہیں جب عشق اُس کے لئے پھولوں کی سیج ہی نہیں رہتا کانٹوں کا بستر بھی بن جاتا ہے۔ اور اس پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ یہ عشق ایک اچھی خاصی مُصیبت کا سامان ہے۔ مومن نے ان اشعار میں اسی خیال کی وضاحت کی ہے ؎

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق
سچ تو یہ ہے بُری بلا ہے عشق

اثرِ غم ذرا بتا دینا — وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق
آفتِ جاں ہے کوئی پردہ نشیں — کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق
بوالہوس اور لافِ جاں بازی — کھیل کیا سمجھ لیا ہے عشق
وصل میں احتمالِ شادیٔ مرگ — چارہ گر دردِ بے دوا ہے عشق
سوجھے کیوں کر فریبِ دلداری — دشمن آشنا نما ہے عشق
ہم کو ترجیح تم پہ ہے، یعنی — دل رُبا حسن و جاں رُبا ہے عشق
دیکھ حالت مری کہیں کافر — نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق
دیکھئے کس جگہ ڈبو دے گا — میری کشتی کا ناخدا ہے عشق
اب تو دل عشق کا مزا چکھا — ہم نہ کہتے تھے کیوں بُرا ہے عشق
آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے — با وفا حُسن و بے وفا ہے عشق
وہ مجنوں وحشت آرا ہوں — نام سے میرے بھاگتا ہے عشق

قیس و فرہاد وامق و مومن
مر گئے سب ہی کیا وبا ہے عشق

یہاں عشق کو قہر، موت اور قضا صرف اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اُس کو اختیار کر کے انسان زندگی کے کام کا نہیں رہتا۔ وہ تو بس اس عشق کے تقاضوں کو پورا کرتا رہتا ہے اور اسی لئے اُس کو بڑی ہی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہر چیز اُس کے لئے آفتِ جان بن جاتی ہے۔ لیکن وہ اس کے باوجود زندگی سے گھبراتا نہیں، بلکہ اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی ہستی بالآخر مجنونِ وحشت آرا کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن وہ بہر صورت عشق پر غالب آجاتا ہے۔ — اس عشق میں عاشق کو تکلیفیں ضرور اُٹھانی پڑتی ہیں لیکن وہ ان میں لطف لیتا ہے۔ کیونکہ خیر کی وہ قدریں جن کا علم بردار عشق ہے اسی طرح فروغ پاتی ہیں۔

مومن نے اسی لئے اس عشق کو اہمیت دی ہے، اور اس کو حسن کی نیرنگیوں سے کسی طرح کم نہیں سمجھا ہے۔ کیونکہ اُن کے خیال میں عشق کی راہ کے نشیب و فراز حسن کی نیرنگیوں سے کچھ کم دلکش اور خوش گوار نہیں ہوتے ہے

حُسن کی نیرنگیوں سے کم نہیں ارژنگ عشق　　　نو بہ نو جلوہ ہے او رنگ کی تغییر ہے

یہاں رنگ کی تغییر درحقیقت عمل کے اس نشیب و فراز کی تمثیل ہے جو عشق کرنے والے کو عشق کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونا سکھاتی ہے لیکن اس کے باوجود مومن کا یہ خیال ہے کہ عشق کا انجام ہمیشہ اچھا نہیں ہوتا۔ کیونکہ عشق کے تمام تقاضے آسانی سے پورے نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے وہ اس کو فتنۂ آخر زماں سے کم نہیں سمجھتے ؎

بُرا ہے عشق کا انجام یا رب　　　بچانا فتنۂ آخر زماں سے

اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ عشق بڑے ہنگامے برپا کرتا ہے۔ وہ تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے لیکن اس کے باوجود سکون کا دشمن ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن نے اپنی غزل میں عشق کا ایک واضح تصور پیش کیا ہے۔ وہ اُن کے نزدیک انسان کا نہایت ہی اہم جذبہ ہے جو اُس کی تکمیل میں ممد و معاون ہوتا ہے۔ اُس کے ہاتھوں جذبات کی تسکین ہوتی ہے۔ خیر کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ ولولہ و شوق کے چراغ جلتے ہیں۔ اس کی روشنی میں انسان کو زندگی کے راستے پر بڑھنا آتا ہے اور زندگی بسر کرنے کے آداب سے آگاہی ہوتی ہے۔ مومن کی غزل میں یہ عشق ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں نظر آتا ہے۔ یہ نظام کچھ قدروں اور معیاروں سے عبارت ہے۔ مومن اسی دنیا کے عشق کے قائل ہیں۔ اُن کے یہاں عشق کا کوئی ماورائی تصور نہیں ملتا۔ لیکن اس دنیاوی عشق کو انھوں نے بہت اہم بنا کر پیش کیا ہے۔ عشق کے بارے میں جو خیالات و نظریات اُن کے یہاں ملتے ہیں، اُن میں کوئی خاص فکری گہرائی نظر نہیں آتی لیکن دنیاوی زندگی کے اعلیٰ معیاروں کے خیال نے اُن کے اس تصور میں ایک وقار ضرور پیدا کر دیا ہے۔

(۷)

مومن کی غزل کا بنیادی موضوع تو یہی عشق و عاشقی اور اُس کے مختلف معاملات مسائل کی ترجمانی ہے اور انھوں نے اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہا ہے اُس میں آپ بیتی کا رنگ ہے لیکن اُن کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اس آپ بیتی کو جگ بیتی کا روپ دے دیا ہے۔ اسی لئے اس میں عمومیت اور آفاقیت پائی جاتی ہے۔ اور یہ اُن کی غزل کی بہت بڑی خوبی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اُن کی غزل میں کہیں کہیں اُن کے ذاتی تجربات کچھ اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ اُس سے اُن کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے، اور اُن کے افکار و خیالات، عقائد و توہمات، اُفتادِ طبع اور ذہنی رجحانات نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ مومنؔ کی غزل کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے اور اسی کے اثر سے وہ اُن کی شخصیت کا آئینہ بن گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مومن کے یہاں محض خیالی باتیں نہیں ہیں۔ اُنھوں نے تو جو کچھ محسوس کیا ہے اُسی کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی غزلوں میں چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے دکھائی دیتے ہیں۔

اُنھوں نے اپنی غزل میں بہت واضح طور پر اپنے حُسن سے دلچسپی لینے، کشتۂ نازِ بتاں ہونے اور سوختۂ حُسن خداداد رہنے کا تذکرہ کیا ہے۔ مندرجۂ ذیل اشعار اُن کی شخصیت کے اس پہلو کی وضاحت کرتے ہیں ؎

دیکھیے انجام کیا ہو مومنِ صورت پرست — شیخ صنعاں کی طرح سوئے کلیسا جائے ہے

کُشتۂ نازِ بتاں روزِ ازل سے ہوں مجھے — جان کھونے کے لئے اللہ نے پیدا کیا

گہ غم حور گہے عشقِ بُتاں اے مومنؔ — ہیں سدا سوختۂ حُسن خداداد رہا

کیا کسی بُت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرتِ مومنؔ اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

درِ بُت خانہ و عشقِ بتاں اور آپ اے مومنؔ
یہ حضرت آ گئی اک بار کیا طبعِ مقدس میں

مومنؔ کو یہ ہے دولتِ دُنیا و دیں نصیب
شب بُت کدے میں گذرے ہے دن خانقاہ میں

اور دین و مذہب سے اپنی دلچسپی اس طرح ظاہر کی ہے ؎

فروغ جلوۂ توحید کو وہ برق جولاں کر
کہ خرمن پھونک دیوے ہستی اہلِ ضلالت کا

مرا جوہر ہو سرتاپا صفائے مہر پیغمبر
مرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سُنّت کا

شوقِ بزمِ احمدؐ و شوقِ شہادت ہے مجھے
جلد مومن لے پہونچ اس مہدی دوراں تلک

لیکن دین اور دُنیا کے درمیان اُس کشمکش اور آویزش کی وضاحت بھی کی ہے جو اُن کی شخصیت میں ہمیشہ جاری رہی ہے ؎

چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

مومن یہ لاف الفت تقویٰ ہے کیوں مگر
دِلّی میں کوئی دشمنِ ایماں نہیں رہا

اللہ ری گم رہی بت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

اور کہیں کہیں اپنی انسان دوستی کا اظہار بھی کیا ہے۔ مثلاً یہ شعر ؎

مومن نہ توڑ رشتۂ زنار برہمن
مت کر وہ بات جس سے کوئی دل شکستہ ہو

اس بات کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ مومن اپنی دین داری کے باوجود ایک انسانی زاویۂ نظر رکھتے تھے اور اختلاف کی وجہ سے کسی کا دل دُکھانا اُن کے نزدیک گناہ عظیم تھا۔

غرض مومن کی غزل میں ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ اشعار فنی اعتبار سے زیادہ دل کش اور دل آویز نہ ہی لیکن جہاں تک مومن کو سمجھنے اور اُن کی شخصیت کو جاننے کا تعلق ہے اُن کی اہمیت اپنی جگہ مُسلّم ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ مومن کا زاویۂ نظر جذباتی اور انفرادی تھا، اور اُن کی غزل میں انفرادی جذباتی معاملات کی ترجمانی کا پہلو غالب ہے لیکن جیساکہ اُن کی شخصیت سے

ظاہر ہے وہ ایک اجتماعی شعور بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ اس شعور کی جھلکیاں اُن کے بعض اشعار میں ملتی ہیں کہیں تو انھوں نے بہت واضح طور پر اپنے اشعار میں اس اجتماعی شعور کا اظہار کیا ہے، اور کہیں رمز و ایما کے پردے میں اپنے اس شعور کی وضاحت کی ہے۔ بہرحال ان اشعار سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی ماحول سے مطمئن تھے۔ اُنھیں اس کی زبوں حالی کا احساس تھا۔ وہ اُس کے کھوکھلے پن کا علم رکھتے تھے۔ انھیں اس کے انتشار کا بھی اندازہ تھا اور وہ اس پر خون کے آنسو بہاتے تھے۔ یہ اشعار اسی صورت حال کے ترجمان ہیں ؎

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی　　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

یاد ایام وصلِ یار افسوس　　　دہر کے انقلاب نے مارا

اس لیل و نہار غم نے مارا　　　ہے روزِ سیہ سیاہ تر رات

پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے　　　آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

شام سے تا صبح مضطر صبح سے تا شام ہم　　　ایک عالم میں ہیں کیوں اے گردشِ ایام ہم

کیا کہیں تم سے اے ہمدردو، پوچھو مت مُرغانِ چمن
کیونکر یاں ایام خزاں اور ہجر کے دن کٹ جاتے ہیں
کُنج قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یادِ سبز موسمِ گُل سے گاہے جی بہلاتے ہیں

شبنم خراب، مہر کتاں، سینہ چاک ماہ　　　لو اور بھی ستم زدہ روزگار ہیں

ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے / صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

دکھا دوں گا تماشا بس نہ چھیڑو مجھ سے مجنوں کو / ہلا دوں گا زمین و آسماں زنجیر تو کھینچو

غنچہ ہائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ہے / خیر مقدم گلشن ایماں میں آتی ہے بہار

سرگرمِ رقصِ تازہ ہیں قربانیوں میں ہم / سُرخی سے کس کی آئے ہیں جولانیوں میں ہم

اے گردشِ زمانہ کبھی تو تغیر آئے / حسرت مجھے قبول اگر اس قدر نہ ہو

کوئی دم ہم جہاں میں بیٹھے ہیں / آسماں کے ستم اُٹھانے کو

مبتلائے شب فراق ہوئے / ضِد سے ہم تیرہ روزگاری کی

ایک دم گردشِ ایام سے آرام نہیں / گھر میں ہیں تو بھی ہیں دن رات سفر میں پھرتے

نہ جاؤں کیونکہ سوئے دام آشیانے سے جب / خیالِ حسرتِ مُرغانِ ہم قفس گزرے

جلا جگر تپ غم سے پھڑکنے جان لگی / الٰہی خیر کہ اب آگ پاس آن لگی

مر گئے پر رہے بے خبر صیاد / اب توقع نہیں رِہائی کی

::پھیلی وہ بو جو ہم میں نہاں مثلِ غنچہ تھی / جھونکے نسیم کے یہ نیا گل کھلا گئے

ستم ہائے گردوں مفصل نہ پوچھو ۔۔۔ کہ سر پھر گیا ماجرا کہتے کہتے

مار ڈالا ہم کو جورِ گردشِ ایام نے ۔۔۔ بڑھ گئی رات اپنی روزِ حشر کی تقصیر سے

کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ امنِ قفس ۔۔۔ ہے بیم برقِ بلا روز آشیاں کے لئے

پانی کے بدلے برسے گی آج آگ ابر سے ۔۔۔ اُٹھتے ہماری خاک سے بھی کچھ بخار ہیں

اے حشر جلد کر تہہ و بالا زمین کو ۔۔۔ گر کچھ نہیں اُمید تو ہے انقلاب میں

یہاں مومن نے قفس اور آشیاں، وصلِ یار اور انقلاب، غنچۂ آرزو اور بہارِ گلشن ایماں، مرغانِ چمن اور ایامِ خزاں، کنجِ قفس اور یادِ سیرِ موسمِ گل، بجلی اور صیاد، مجنوں اور زنجیر، شبِ فراق اور تیرہ روزگاری، رقصِ تازہ، آگ اور ابر وغیرہ کے اشاروں میں اُس زمانے کی اجتماعی زبوں حالی کی تصویر کشی کی ہے۔ ان اشعار سے اس حقیقت کا اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کے زمانے میں حالات سازگار نہیں تھے۔ زندگی سیاسی انحطاط اور معاشی زوال کی وجہ سے ایک کس مپرسی کے عالم میں تھی۔ تہذیب اور معاشرت کا چراغ آندھیوں کی زد پر تھا۔ لیل و نہارِ غم کے باعث افراد کے لئے زندگی وبالِ جان ہو گئی تھی۔ آفتوں کا ایک سلسلہ اُن پر ٹوٹ پڑا تھا۔ اور لوگ بُری طرح پامال تھے۔ ہر شخص پر ایک اضطراب کا عالم طاری تھا۔ زندگی کے اُفق پر بجلیاں کوند رہی تھیں۔ ستم اُٹھانا اور غم کھانا افراد کا مقدر بن گیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مومن کی نگاہیں زندگی میں ایک انقلابی کیفیت کو محسوس کر رہی تھیں۔ گلشن ایمان میں اُنھیں بہار آتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اور کچھ لوگ قربانیوں میں سرگرم رقصِ تازہ دکھائی دے رہے تھے۔ زمین و آسمان میں ایک تہلکا مچا ہوا تھا۔ پانی کے بدلے ابر سے آگ برستی ہوئی اور خاک سے بخارات اُٹھتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے، انقلاب کا بازار گرم تھا اور اس انقلاب میں اُنھیں اُمید کی ایک کرن دکھائی دے رہی تھی، اور وہ اسی کی آرزو کر رہے تھے۔

مومن کو اپنے زمانے کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی انتشار کا علم تھا اور وہ اس کو پوری طرح محسوس کر رہے تھے۔ اُن کی اسی کیفیت نے اُن سے اس قسم کے اشعار کی تخلیق کرائی ہے، اور ان اشعار نے اُن کی غزل کو ایک اجتماعی میلان سے آشنا کیا ہے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مومن کی غزل کا بنیادی موضوع عشق و عاشقی ضرور ہے اور اُنھوں نے اُس کے اَن گنت پہلوؤں کی ترجمانی کی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اُن کی غزل میں بہت کچھ ہے۔ وہ اُن کی شخصیت کی عکاس ہے۔ اُن کے مخصوص کردار کی ترجمان ہے ۔۔۔ اس شخصیت اور کردار کے مدوجزر اور نشیب وفراز اس میں پوری طرح بے نقاب نظر آتے ہیں ۔۔۔ اور نہ صرف یہ بلکہ اُس زمانے کی سماجی زندگی کا جو ردِ عمل اس شخصیت اور کردار پر ہے اُس کی ترجمانی بھی اُس میں کچھ اس طرح ملتی ہے کہ اُس کا صحیح نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے ۔۔۔ مومن کی غزل کی یہ بہت بڑی خوبی ہے، اور اس کی بدولت اس کو تنوع اور ہمہ گیری کی دولتِ بیش بہا نصیب ہوئی ہے۔

(۸)

مومن کی غزل کے یہ موضوعات و مضامین اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔۔۔ ان کی بنیاد صداقت اور اخلاص مندی پر ہے۔ یہ مومن کے انفرادی تجربات ہیں۔ اُنھوں نے جو کچھ محسوس کیا ہے، جو کچھ اُن کے دل پر بیتی ہے، جن معاملات سے وہ دوچار ہوئے ہیں اُن سب کو اُنھوں نے غزل کے سانچے میں ڈھال دیا ہے اور اس سلسلے میں بڑی سلیقہ شعاری، اور ہنرمندی دکھائی ہے ۔۔۔ اُن کی غزلوں کے اشعار اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ وہ ایک بہت بڑے فن کار اور ایک اعلیٰ درجے کے خالقِ جمال ہیں۔ صنفِ غزل کی مزاج دانی کا شعور اُن کے یہاں بدرجۂ اتم موجود ہے اور اس شعور ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اُن کی غزل کے اشعار ڈھلے ڈھلائے نظر آتے ہیں۔ اُن میں ایک ہیرے کی طرح ترشی ہوئی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔ اُن میں رنگینی اور پُرکاری، شگفتگی اور شادابی پائی جاتی ہے۔ اسی لئے وہ نہ صرف دلوں میں اپنی جگہ بناتے ہیں بلکہ حواس پر سرخوشی بن کر چھا جاتے ہیں۔ مومن کی غزل میں روایت کا رچاؤ ہے۔ علامتوں اور اشاروں کی نیرنگی ہے، رمز و ایما کی

فسوں کاری ہے، زبان کی سادگی ہے، بیان کی رنگینی ہے، لب ولہجہ کا بانکپن ہے اور آہنگ کی پُر کیف نغمگی ہے ـــــ اُن کی غزل میں ان تمام پہلوؤں کا ایک نہایت ہی حسین اور لطیف امتزاج ملتا ہے، اور اس امتزاج ہی کی بدولت وہ حُسن وجمال کا ایک شاہکار بن گئی ہے۔

غزل کی روایت سے مومن نے بہت استفادہ کیا ہے۔ اس روایت کے اثرات اُن کے مزاج میں رچے ہوئے نظر آتے ہیں ـــــ اسی لئے اُنھوں نے اس اسلوب سے بڑا کام لیا ہے جو اس روایت میں بُنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اسلوب کی جان حُسن وعشق کی وہ فضا ہے جو غزل کی روایت کے ساتھ مخصوص ہے۔ مومن نے اپنی غزل میں اس فضا کو پوری طرح قائم کیا ہے اور اس میں شروع سے آخر تک یہ حُسن وعشق کی فضا نظر آتی ہے۔ پھر اُنھوں نے غزل کی عام علامتیں تمثیلیں اور تلمیحیں بھی کچھ اس طرح استعمال کی ہیں جن سے حسن وعشق کی اس فضا کو تقویت پہنچتی ہے ـــــ اور اس طرح اُن کی غزل میں اس روایت کا رنگ زیادہ گہرا ہو جاتا ہے لیکن مومن نے غزل کی روایت کے اِن عناصر اور لوازم سے محض روایتی انداز میں کام نہیں لیا ہے بلکہ ان کو نئی معنویت کے ساتھ نئے انداز میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اُس میں مجموعی طور پر ایک نئی امیجری کی تشکیل ہوئی ہے۔ یہ اشعار اسی صورتِ حال کو ظاہر کرتے ہیں ؎

شمع سے یہ کس نے ذکر اُس محفل آرا کا کیا
مرے شعلے اُٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جائے ہو

چھوٹنا دامِ شکستہ سے بھی آسان نہیں
ہیں گرفتارِ خمِ گیسوئے صیّاد رہا

اُلجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیّاد آگیا

کچھ قفس میں اِن دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا
ہیں اسیر اُس کے جو ہے اپنا اسیر
ہم نہ سمجھے صید کیا صیّاد کیا

لب مے گوں پہ جان دیتے ہیں ہمیں شوقِ شراب نے مارا

وہ ہنسے سُن کے نالۂ بلبل کا مجھے رونا ہے خندۂ گُل کا
نکہت اُس زلف کی صبا میں ہو اُڑ گیا رنگ بوئے سنبل کا

بُلبل کے سے نالے کہ صبا کی سی کریں سعی میرا نہ ہوا ہے وہ گُل اندام نہ ہوگا

خار و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آتی تھی رشک سے کیا برباد آپ آشیاں اپنا

گُل داغِ جنوں کھِلے بھی نہ تھے آ گئی باغ میں خزاں افسوس

اُس نے دِکھا دِکھا کے مجھے چھیڑ دیکھنا گُل پھینکے عندلیب گرفتار کی طرف

سوزشِ پروانہ دکھلاتے ہو کیا میں کیا کروں دیکھ جلتے شمع محفل کو جلا جاتا ہے دل

کیا کہیں تم سے اے ہمدرد و نہ پوچھو مت مرغانِ چمن
کیونکر یاں ایام خزاں اور ہجر کے دن کٹ جاتے ہیں
کُنج قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یادِ سیرِ موسمِ گُل سے گاہے جی بہلاتے ہیں

کہاں ہے تابِ زہرِ برق اے کاش جلا دے آتشِ گُل آشیاں کو

برق کا آسماں پر ہے دماغ پھونک کر میرے آشیانے کو

بہ رنگِ صورتِ بلبل نہیں نوا سنجی   یہ کیا ہوا کہ چپ اے گلستان بیان لگی

داغِ جنوں کو دیتے ہیں گل سے زبس مثال   ہیں کیا کہ عندلیب کو وحشت چمن سے ہے

نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیاد   نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے

کر دیا اُس جلوے نے مجنوں جلو   خاک اُڑائیں وادیِ ایمن میں ہم

کچھ قیس اور میں ہی نہیں سب کے سب ہوئے   اچھا تو دردِ عشق کا بیمار کم ہوا

کہاں ہے ناقہ ترے کان بجتے ہیں مجنوں   قسم ہے مجھ کو صدائے جرس کے آنے کی

چشمۂ حیواں بنا اُس کے لبوں کی شرم سے   پانی پانی بس کہ اعجازِ مسیحا ہو گیا

آتشِ آہ بے اثر دیکھی   آسمان گلشنِ خلیلؑ ہوا

نہیں آتا وہ لیلیٰ وش سکھا دے   کوئی لیلیٰ کا قصہ سارباں کو

یہاں مومن نے شمع، دامِ شکستہ، خمِ گیسو، صیاد و قفس، آشیاں، کعبِ ساقی، جام بادۂ گلگوں، نالۂ بلبل، خندۂ گل، عندلیب گرفتار، مرغانِ چمن، ایامِ خزاں، موسمِ گل، گلشن اور چمن کی علامتوں اور اشاروں اور قیس، مجنوں، ناقۂ لیلیٰ، چشمۂ حیواں، اعجازِ مسیحا اور گلشن خلیل وغیرہ کی تلمیحوں کو نئی معنویت کے ساتھ نئے انداز میں استعمال کیا ہے —— اِن میں غزل کی روایت کا رچاؤ موجود ہے لیکن یہ علامتیں اور تلمیحیں محض روایتی انداز میں استعمال نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے استعمال میں تو ایک اجتہادی شان نظر آتی ہے، اور اسی لئے ان میں جدت اور اچھوتے پن کا

احساس ہوتا ہے۔

ایک ایسا شاعر جو غزل کی روایتی علامتوں اور تمثیلوں کو نئی معنویت کے ساتھ نئے انداز میں استعمال کر سکتا ہو، اس کے لیے نئی علامتوں اور تمثیلوں کی تخلیق بھی دشوار نہیں ہوتی۔ مومن نے اپنی غزل میں بعض نئی علامتوں اور تمثیلوں کو بھی اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس میں ایک نئی امیجری پیدا ہو گئی ہے۔ اور جمالیاتی اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا ہے۔ صرف چند اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا ؂

چھوڑا نہ کچھ بھی سینے میں طغیانِ اشک نے
اپنی ہی فوج ہو گئی لشکر غنیم کا

کیا ٹھہرے فوجِ غم کے مقابل فغانِ آہ
جمتے نہیں ہیں لشکرِ برباد کے قدم

ربط اس سے ہے مثلِ شعلہ و شمع
مر جاؤں گر ایک دم جدا ہوں

داغِ خوں سے وہ مرے حیراں ہوا
دامن الجھا ہے گُلِ بے خار میں

ہو اور کو تو ہدایت جو خود ہوں آوارہ
یہ عمر کاش کہ جوں نالۂ جرس گزرے

بالیدہ دم بہ دم جو مرے دل کے خار ہیں
ہر آن برچھیاں سی مرے دل کے پار ہیں

صبح دم مہتاب کا سا رنگ کیوں ہے گر نہ تھا
بوالہوس کے پاس تو اے نازپرور رات کو

ہوتے ہیں پائمال گُل اے بادِ نوبہار
کس سے اڑائی تو نے یہ رفتار کی طرح

کیا باتیں بناتا ہے وہ جان جلاتا ہے
پانی میں دکھاتا ہے کافور کا جل جانا

برقِ آہ کو جو میں نے کہا مسکرا دیا — دِل گرمیوں نے اس کی کلیجا جلا دیا

شعلۂ آہ فلک رتبہ کا اعجاز تو دیکھ — اوّل ماہ میں چاند آئے نظر آخر شب

اندھیر پڑا زمانے میں ہائے — نے دن کو ہے مہر نے قمر رات

اگرچہ اس قسم کے اشعار مومن کی غزل میں ایسے کچھ زیادہ نہیں ہیں لیکن جو ہیں اُن میں ایک نیا حسن نظر آتا ہے اور وہ اس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ مومن میں ایک نئی امیجری پیدا کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم موجود ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اس امیجری کی تخلیق و تشکیل کسی شعوری کوشش کا نتیجہ نظر نہیں آتی۔ کیونکہ اس کی جڑیں اس زندگی اور ماحول میں پیوست دکھائی دیتی ہیں، جن میں شاعر نے زندگی بسر کی ہے۔

مومن کا فن بہت تہہ در تہہ ہے۔ اُس میں بڑی رمزیت اور ایمائیت ہے۔ وہ ہر خیال کا اظہار اشاروں اور کنایوں میں کرتے ہیں۔ غزل کی روایت میں یہ رمزیت اور ایمائیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مومن نے اس روایت سے استفادہ کیا ہے اور اپنی غزل میں مختلف طریقوں سے اس رمزیت اور ایمائیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کہیں تو یہ خصوصیت علامتوں اور تمثیلوں کے استعمال سے وجود میں آتی ہے اور کہیں محسوس کرنے کا مخصوص انداز اور سوچنے کا مخصوص زاویہ اس کو پیدا کرتا ہے۔ مومن عشق پردہ نشیں میں مرتے تھے اور اُس کے ساتھ انھیں بڑی قربت حاصل تھی۔ چنانچہ یہ جمالِ ہم نشیں بھی اُن کی غزلوں میں رمزیت اور ایمائیت کی اس فنی خصوصیت کو پیدا کرنے میں ممد و معاون ہوا ہے۔ مومن نے اس محبوب پردہ نشیں کی باتیں اشاروں اور کنایوں میں کی ہیں، کیونکہ کھلم کھلا اس کا اظہار نا ممکن تھا۔ اس صورتِ حال نے انھیں اشاروں اور کنایوں کا سہارا لینے کے لئے مجبور کیا ہے۔ اسی لئے رمزیت اور ایمائیت اُن کے یہاں ایک رچی ہوئی صورت میں پیدا ہوئی ہے اور اس نے فنی اور جمالیاتی اعتبار سے اُن کی غزل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں یہ خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے ؎

خبر نہیں کہ اُسے کیا ہوا پہ اُس در پر　　نشانِ پا نظر آتا ہے نامہ بر کا سا

اُن سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی　　مجھ کو مری شرم نے رُسوا کیا

مت پوچھ کہ کس واسطے چُپ لگ گئی ظالم　　بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

بات شب کو اُس سے منع بیقراری پر بڑھی　　ہم تو سمجھے اور کچھ وہ اور کچھ سمجھائے تھا

ذکرِ شراب و حور کلامِ خُدا میں دیکھ　　مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

پوچھنا حالِ یار ہے منظور　　میں نے ناصح کا مدعا جانا

حالِ دلِ یار کو لکھوں کیوں کر　　ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

اُس حُسن پہ خلوت میں جو حال کیا کم تھا　　کیا جانیے کیا کرتا گر تو مری جا ہوتا

شوقِ وصال دیکھ کہ آیا عدو کے گھر　　سوجھا نہ کچھ مجھے شبِ مہتاب دیکھ کر

زلفیں اُٹھاؤ رُخ سے کہ دل کی جلن مٹے　　بُجھ جائے ہے جہان میں وقتِ سحر چراغ

بس کہ اک پردہ نشیں کے عشق میں ہے گفتگو　　بات بھی کرتے نہیں جُز صنعتِ ایہام ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بے گانہ آشنا　　کیوں اپنے جی کو لگتے ہیں کچھ اجنبی سے ہم

دعوئے حُسن جہاں سوز اس قدر — پھر کہو گے تم میں ہرجائی نہیں

دن بھی دراز رات بھی کیوں ہو فراقِ یار میں — کاہے سے فرق آگیا گردشِ روزگار میں

ان نالہ ہائے شب کا اثر صُبح دیکھیو — آیا خلل گر اُس ستم آرا کے خواب میں

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں — تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں

ایسے سے کیا درستیٔ پیماں بستہ ہو — جو قول دے تو رنگِ حنا کا شکستہ ہو

شکستِ رنگ پہ مستی میں ہنستے ہیں ہم بھی — دکھائیں گے اُنھیں وقتِ خُمار آئینہ

ذکرِ اشکِ غیر میں رنگینیاں — بوئے خوں آئی تری گُفتار سے

تم اُٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا — سائے سے مرے وحشت اے رشکِ پری آتی

کس کے ہنسنے کا تصور ہے شب و روز کہ یوں — گدگدی دل میں کوئی آٹھ پہر کرتا ہے

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ — تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے — کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

اُس دہن کو غُنچہ، دل کیا کہوں — ڈر لگے ہے مُسکرانا چھوڑ دے

جی چاہتا ہے پوچھے کوئی کیا وہ مر گیا　　پھر ایک بات کہنے میں قصّہ تمام ہے

یوں بتا کر حالِ دل کہنا نہ تھا　　بات بگڑی میری ہی تقریر سے

رہی شب کی سی بے تابی تو ہر روز　　چُھپائیں گے ہم آنکھیں پاسباں سے

یہ اشعار بڑے ہی پہلودار ہیں اور ان میں تہہ داری کی کیفیت اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ مومنؔ نے یہاں بات اشاروں اور کنایوں میں کی ہے اور محض چند الفاظ میں معنویت کی دُنیائیں سمو دی ہیں۔ ان میں سارا کھیل تخیّل کا ہے۔ اور اس میں شبہ نہیں کہ یہاں تخیّل اپنے معراجِ کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ اسی لئے یہ اشعار تخیّل کو مہمیز کرتے ہیں اور یہ تخیّل ہی ان کی تہوں کو کھولتی ہے اور اصل معنویت کی تہہ تک پہنچاتی ہے۔ مومنؔ کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے رمزیت اور ایمائیت کو اپنے حدود میں رکھا ہے اور اُن کے کسی شعر میں بھی وہ ان حدود سے باہر نکل کر ابہام کی سرحدوں میں داخل نہیں ہوتی۔ اسی لئے اس میں صحیح فن کارانہ حسن نظر آتا ہے۔ اور اس کی بدولت غزل کی روایت نئے فنی محاسن سے آشنا ہوتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

اس رمزیت اور ایمائیت کے پہلو نے مومنؔ کی غزل میں ایک مصوّرانہ شان بھی پیدا کر دی ہے۔ مومنؔ تصویر کشی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ محاکات اُن کی غزل کا خاص جوہر ہے۔ یہ محاکات کہیں کہیں اُن کے یہاں ایک ڈرامائی رنگ و آہنگ بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اور اس طرح اُن کی بنائی ہوئی تصویروں میں اُبھار پیدا ہو جاتا ہے اور اُن کے رنگوں کی شوخی خطوط کے تیکھے پن کے ساتھ مل کر ان کی تصویروں کو زندگی سے بھرپور بناتی اور اُن میں جولانیوں کی بجلیاں بھر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بنائی ہوئی یہ تصویریں متحرک نظر آتی ہیں اور انھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب اُن میں جان پڑنے ہی والی ہے۔ یہ تصویریں کیسی رنگا رنگ اور زندگی اور جولانی سے کتنی بھرپور ہیں :

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا

ہر ایک سے اُس بزم میں شب پوچھتے تھے نام — تھا لُطف جو کوئی مرا ہمنام نکلتا

مت پوچھ کہ کس واسطے چُپ لگ گئی ظالم — بس کیا کہوں، میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

سن کے میری مرگ بولے مر گیا اچھا ہوا — کیا بُرا لگتا تھا جس دم سامنے آ جائے تھا
ناز و شوخی دیکھنا وقت تظلّم دم بہ دم — مجھ سے وہ عُذرِ جفا کرتا تھا اور جھُنجلائے تھا
ہو گئی دو روز کی اُلفت میں کیا حالت ابھی — مومن وحشی کو دیکھا اُس طرف سے جائے تھا

غیروں پہ کھُل نہ جائے کہیں راز دیکھنا — میری طرف بھی غمزۂ غمّاز دیکھنا

دیکھے ہے چاندنی وہ زمیں پر نہ گر پڑے — اے چرخ اپنے تو مہ کامل کو تھامنا

چلون کے بدلے مجھ کو زمیں پر گرا دیا — اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ایک ایک ادا سو سو دیتی ہے جواب اُس کے — کیوں کر لبِ قاصد سے پیغام ادا ہوتا

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے — تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

نہ کیونکر بس مرا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر — وہ تیرا مُسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ — تو ایک ایک کے منہ کو تکا نہ کرتے ہم

دم بہ دم رونا ہمیں چار سُو طرف تکنا ہمیں	یا کہیں عاشق ہوئے یا ہو گیا سودا ہمیں

ٹکٹکی لگائی ہے اب تو گو ہو رُسوائی	تا وہ گر ادھر دیکھیں مجھ کو دیکھتا دیکھیں

میں اپنی چشمِ شوق کو الزام خاک دوں	اُس کی نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں
میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مُدّعا	آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

محفل میں تم اغیار کو دُزدیدہ نظر سے	منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو

وہ جو ہم میں تم قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ جو لطف مجھ پہ تھے بیشتر وہ کرم کہ تھا مرے حال پر
مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ نئے گلے وہ شکایتیں وہ مزے مزے کی حکایتیں
وہ ہر ایک بات پہ روٹھنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی بیٹھے سب میں جو روبرو تو اشارتوں ہی میں گفتگو
وہ بیان شوق کا برملا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی کبھی ہم سے تم سے بھی راہ تھی
کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے آپ گنتے تھے آشنا جسے آپ کہتے تھے باوفا
میں وہی ہوں مومنِ مُبتلا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خموشی   کس بت کو دے دیا دل کیوں بت سے بن گئے ہو

سامنے سے جب وہ شوخ دل رُبا آجائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے
جاں نہ کھا، وصلِ عدو سچ ہی سہی پر کیا کروں
جب گلہ کرتا ہوں ہمدم وہ قسم کھا جائے ہے

بے پردہ پسِ چلمن یک بار تم آ بیٹھے   بے تابِ نظر کس کو کیوں جلوہ گری اپنی

بگڑتے ہو کیوں اب بھی کہتا ہوں میں   عیاں صلح پھر کس کی چتون سے ہے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے   کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب   تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

ان اشعار میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک مکمل تصویر ہے اور اس تصویر میں ایک مصوّرانہ شان پائی جاتی ہے۔ احساس، جذبے اور خیال نے ان تصویروں کے خطوط کا خاکہ تیار کیا ہے، اور الفاظ نے ان خطوط میں کچھ ایسے رنگ بھرے ہیں کہ یہ تصویریں حد درجہ خیال انگیز ہو گئی ہیں۔ اِن میں جگہ جگہ ڈرامائی رنگ و آہنگ بھی نمایاں ہے۔ اور اس ڈرامائی رنگ و آہنگ نے اِنھیں زندگی سے کچھ اور بھی قریب کر دیا ہے۔

مومن نے زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال کو بھی ایک فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ اور اُن کی غزل اس اعتبار سے بھی ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ اُنھوں نے زبان و بیان اور الفاظ کے استعمال میں کوئی خاص اہتمام نہیں کیا ہے۔ کوئی بڑی شعوری کوشش کا بھی اس میں دخل نظر نہیں آتا۔ اُنھوں نے تو سیدھے سادے انداز میں عام بول چال کی زبان استعمال کی

ہے لیکن اُن کا کمال یہ ہے کہ اس زبان کو اُنھوں نے ادب اور شاعری کی زبان بنا دیا ہے؛ اور اُس میں حُسن کے وہ تمام عناصر اور لوازم پیدا ہو گئے ہیں جن کے بغیر شاعری کی زبان کا تصوّر بھی ناممکن ہے۔ مومن نے اس معاملے میں تکلّف اور تصنّع سے کام نہیں لیا ہے۔ اسی لئے اُن کی زبان میں سادگی کا حُسن ہے، ایک فطری روانی ہے، ایک برجستگی اور بے ساختگی ہے اُنھوں نے اُردو روزمرہ کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اُن کی گھٹی میں پڑا ہے محاورے کے استعمال میں بھی وہ بڑا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اُن کے اشعار میں جگہ جگہ اس روزمرہ اور محاورے کا استعمال بڑی خوش اسلوبی سے ہوا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ الفاظ اور زبان کے اس استعمال سے وہ شعریت کو پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں؛ اور اُن کی غزل میں شاعرانہ حُسن کا جو رچاؤ ملتا ہے اُس میں الفاظ اور زبان و بیان کا بڑا ہاتھ ہے۔ یہ الفاظ اُن کے یہاں کہیں تو ایک مخصوص آہنگ کو پیدا کرتے ہیں جو احساس اور جذبے کے آہنگ کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے کہیں اُن کی متناسب دروبست سے ایک مخصوص نغمگی پیدا ہوتی ہے کہیں یہ علامات و اشارات اور تشبیہات و استعارات کا روپ اختیار کر کے ایک شاعرانہ فضا کی تخلیق کرتے ہیں کہیں اُن کی ترشی ہوئی کیفیت ایک ایسی جگمگاہٹ اور چمک دمک کو پیدا کرتی ہے جس میں بلا کا حُسن ہوتا ہے۔ غرض مومن نے اپنی غزل میں الفاظ اور زبان و بیان کے استعمال سے شاعرانہ حُسن کی جو تخلیق کی ہے، اُس نے اُن کی غزل کو فنّی اعتبار سے بہت بلند کر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کی وضاحت ہوتی ہے ؎

آگ اشکِ گرم کو لگے جی کیا ہی جل گیا
آنسو جو اُس نے پونچھے شب اور ہاتھ جل گیا
اُس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

کانٹا سا کھٹکتا ہے کلیجے میں غمِ ہجر
یہ خار نہیں دل سے گُلِ اندام نکلتا

جوابِ خونِ ناحق میرا ایسا کیا دیا تو نے
کہ ظالم رہ گئے منہ لے کے سب احباب اپنا سا

نالۂ شب نے یہ ہوا باندھی | ہو گیا گُل چراغ بلبل کا

آہِ سحر ہماری فلک سے پھری نہ ہو | کیسی ہوا چلی یہ کہ جی سنسنا گیا

غُربت میں گُل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد | جیسے قفس میں مُرغِ چمن کو چمن کی یاد

لگائی آہ نے غیروں کے گھر آگ | ہوئے کیا کیا وہ اتنی بات پہ آگ

سُرمہ ہیں اُس چشمِ جادو فن میں ہم | خاک ڈالیں دیدۂ دشمن میں ہم

اس طرح خاک چھانتے پھرتے نہ دشت دشت | ہوتے جو پائمال کسی رہ گذر میں ہم

کیا گُل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گُل تو دور | اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

خاک اُڑائی گُل نے یہ کس کے جنونِ عشق میں | آئے ہے کچھ اُڑی ہوئی بادِ صبا غبار میں

اس ستم گر سے مگر آنکھ لڑی ہے کہ جناب | کیسے کچے گھڑے پانی لب جو بھرتے ہیں

شب فُرقت میں خاک جھپکے آنکھ | یاد ہے چشمِ نیم خواب ہمیں

شبِ غم کا بیان کیا کیجیے | ہے بڑی بات اور چھوٹا منہ

جہاں سے تسلی کو تیری ترس ترس گزرے | جو تجھ پہ بس نہ چلا اپنے جی سے بس گزرے

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم   طرزِ خرام و شوخیٔ رفتار کے لئے

رہی شب کی سی بے تابی تو ہر روز   چُرائیں گے ہم آنکھیں پاسباں سے

پھیلی وہ بو جو ہم میں نہاں مثلِ غنچہ تھی   جھونکے نسیم کے یہ نیا گُل کھلا گئے

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آجائے   پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آجائے

یہاں اشکِ گرم کو آگ لگنے، ہاتھ کے جل جانے، دل کی آگ پر پنکھا سا جھلنے، اپنا سامنہ لے کر رہ جانے، نالۂ شب کے ہوا باندھنے، چراغِ بلبل کے گُل ہو جانے، دیدۂ دشمن میں خاک ڈالنے دشت دشت خاک چھانتے پھرنے، فصل گل میں گل کھلنے، کچّے گھڑے پانی بھرنے، جی سے گزرنے اور قیامت کے قدم لینے میں جو حُسن ہے وہ اگرچہ روزمرہ اور محاورے کے فن کارانہ استعمال سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس میں شاعر کی تخلیل ایک ایسی شعریت اور شاعرانہ حُسن کو پیدا کرتی ہے جس کا اثر براہ راست حواس پر ہوتا ہے۔ اور اس طرح مومن کی یہ سلیقہ شعاری اُن کی غزل میں فنی اور جمالیاتی اعتبار سے ایک نیا رنگ و آہنگ پیدا کرتی ہے۔

فارسی غزل کی فنی روایت کے اثرات مومن کی غزل پر بہت گہرے ہیں اور وہ مختلف زاویوں سے اُن کی غزل کے فنی اور جمالیاتی پہلو میں اپنے آپ کو رونما کرتی ہے۔ خاص طور پر فارسی ترکیبوں کو تراشنے میں مومن نے بڑے فن کارانہ شعور کا اظہار کیا ہے اور اپنی غزلوں کے مختلف اشعار میں فارسی ترکیبوں کو تراش کر کچھ ایسی گُل کاریاں کی ہیں جس کی مثال سوائے غالب کی غزل کے اُردو غزل کی روایت میں کسی اور کے یہاں نہیں مل سکتی۔ یہ ترکیبیں فارسی الفاظ سے بوجھل نہیں ہیں۔ برخلاف اس کے ان میں ایسے الفاظ کو آپس میں ہم آہنگ کیا گیا ہے جو مومن کی غزل میں صوری اور صوتی دونوں اعتبار سے ایک نئی دُنیا پیدا کرتے ہیں۔ ان اشعار میں کیسی کیسی رنگین اور پُرکار ترکیبیں مومن نے تراشی ہیں اور ان سے کیسے کیسے عجیب صوری اور صوتی اثرات کی تشکیل ہوئی ہے ؎

ذرا ہو گرمیِ صحبت تو خاک کر دے چرخ — مرا سرور ہے گُل خندۂ شرر کا سا

گر یہی گرمیِ مضمون شرر ریز رہی — رشتۂ شمع سے شیرازۂ دیواں ہوگا

لگی نہیں ہے یہ چُپ لذّتِ ستم سے کہ میں — حریفِ کشمکشِ نالہ و فغاں نہ ہوا

ہوں کیوں نہ محوِ حیرتِ نیرنگ ہائے شوق — جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں خواب تھا

تشنہ کامیِ وصال کی مت پوچھ — شوقِ تیغِ خوش آب نے مارا

جوں نکہتِ گُل جُنبش ہے جی کا نکل جانا — اے بادِ صبا میری کروٹ تو بدل جانا

محوِ جفا ستم کشِ الطاف کب ہوا — رحم اُس کو میرے حال پہ آیا غضب ہوا

روتے تو رحم آتا سو اُس کے روبرو تو — اک قطرہ خوں بھی چشمِ خوں بار تک نہ پہنچا

کرتے ہیں اپنے زخمِ جگر کو رفو ہم آپ — کچھ بھی خیالِ جُنبشِ مژگاں نہیں رہا

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے بہ رنگِ گُل — پھر مجھ کو آ گئی کسی گُل پیرہن کی یاد

اے سوزِ گریہ آگے تری آب و تاب کے — پانی بھرے ہے جلوۂ آتش فشانِ شمع

امتحاں کے لئے جفا کب تک — التفاتِ ستم نما کب تک

پھولے جامے میں سماتے ہی نہیں وصلِ شوخِ چُست پیراہن میں ہم
اور شبنم دِن کو ٹھہرے کیا مجال روتے ہیں اے مہروش گلشن میں ہم

یہاں ہے چاکِ گریباں تو واں بھی چُستی ہے قبائے شوخ شمائل کے ٹکڑے ٹکڑے ہیں

غیر سے سرگوشیاں کر لیجئے پھر ہم بھی کچھ آرزوہائے دلِ رشک آشنا کہنے کو ہیں

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح طرزِ نگہہ چشمِ فسوں ساز تو دیکھو

کیا ہو گئی خود بینی اب غیر سے چشمک ہے یا خوش نگہی وہ کچھ یا بدنظری اتنی

جی میں ہے موتیوں کی لڑی اس کو بھیج دوں اظہارِ حالِ چشمِ گہربار کے لئے

یہاں گُل خندۂ شرر، رشتۂ شمع، شیرازۂ دیواں، حریفِ کشمکش نالہ و فغاں، نیرنگ ہائے شوق شوقِ تیغِ خوش آب، ستم کش الطاف چشمِ خوں بار، جنبشِ مژگاں، گل پیرہن، جلوۂ آتش فشانِ شمع، التفاتِ ستم نما، وصلِ شوخِ چُست پیراہن، مہروش، قبائے شوخ شمائل، آرزوہائے دلِ رشک آشنا، طرزِ نگہِ چشمِ فسوں ساز، خود بینی و خوش نگہی، اظہارِ حالِ چشمِ گہربار کی ترکیبوں نے جو حُسن پیدا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مومن کو ایسی ترکیبوں کے تراشنے میں کمال حاصل ہے، اور انھوں نے ایسا کر کے فنی اور جمالیاتی اعتبار سے اپنی غزل کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔

مومن کی غزل میں ایک مخصوص لب ولہجہ بھی خاصے کی چیز ہے اور وہ اسی لب ولہجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ انھیں بات کرنے کا ڈھنگ آتا ہے۔ وہ گفتگو کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یہی بات کرنے کا ڈھنگ اور گفتگو کرنے کا سلیقہ اُن کے یہاں ایک مخصوص لب ولہجہ کا روپ اختیار کر لیتا ہے اور اُن کی شخصیت کا سارا بانکپن، اُن کے کردار کی تمام رعنائی اس لب ولہجہ میں سمٹ کر یکجا ہو جاتی ہے، اور چھپ چھپ کر مختلف زاویوں سے اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔

مومن سیدھے سادے انداز میں بات نہیں کرتے۔ اُن کی بات تو تہہ در تہہ ہوتی ہے۔ اسی لئے جو لہجہ وہ اختیار کرتے ہیں وہ بھی سیدھا سادہ اور سپاٹ نہیں ہوتا بلکہ تہہ در تہہ ہونے کے باعث اس میں بھی ایک پیچ اور بانکپن کا احساس ہوتا ہے اور بڑی رنگینی اور رعنائی نظر آتی ہے۔ مومن کی غزل میں اس لہجے کو محسوس کرنے کے ایک مخصوص انداز اور سوچنے کے ایک مخصوص زاویے نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے اس میں تکلف اور تصنع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے فطری ہونے کے باعث اس میں کچھ ایسی کیفیت نظر آتی ہے کہ یہ مومن کا مزاج معلوم ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد صرف زبان اور الفاظ کے استعمال ہی پر اُستوار نہیں ہے۔ اس میں تو اُن کے احساس اور جذبے، ادراک اور شعور کا لہو دوڑا ہوا ہے۔ یہ اشعار مومن کی غزل کے مخصوص لب و لہجہ کو پوری طرح واضح کرتے ہیں ؎

مت پوچھ کہ کس واسطے چپ لگ گئی ظالم
بس کیا کہوں میں کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کیا کروں اللہ سب ہیں بے اثر
ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے
یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

یہ رنگ آمیزیاں کیسی ہیں کس کا ڈر ہے، دیکھو تو
مجھے تو کچھ نظر آتا ہے یہ خون ناب اپنا سا

عشق اُس کی بلا جانے عاشق ہوں تو پہچانے
دُبھ کو اطبا نے سودے کا خلل جانا

سینے پہ ہاتھ دھرتے ہی کچھ دِل پہ بن گئی
تو جان کا عذاب ہوا دِل کا تھامنا

کیوں اُلجھتے ہو جنبشِ لب سے
خیر ہے میں نے کیا کہا صاحب

ہائے ری چھیڑ رات سُن سُن کے　　حال میرا کہا کہ کیا صاحب

لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی　　قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

ہے ہے تمیزِ عشق و ہوس آج تک نہیں　　وہ چُھپتے پھرتے ہیں مجھے بے تاب دیکھ کر

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا　　انصاف کیجے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

کچھ نہیں نظر آتا آنکھ لگتے ہی ناصح　　گر نہیں یقین حضرت آپ بھی لگا دیکھیں
کس نے اور کو دیکھا کس کی آنکھ جھپکی ہو　　دیکھنا اِدھر آؤ، پھر نظر ملا دیکھیں

شکوہ نہیں غیر کے ستم کا　　انصاف کرو تو میں بھی کیا ہوں
مجھ رمز شناس سے یہ باتیں　　کیا خوب میں غیر سے بُرا ہوں

نومیدئی جواب ہے کیوں آنے شوق پر　　یہ کیا ہوا کہ میں پسِ قاصد رواں نہیں

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو　　ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو

صبح عشرت ہے وہ نہ شام وصال　　ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

پامال کیجے شوق سے پر بزمِ خاص میں　　اتنا تو ہو کہ خاک مری دربدر نہ ہو

بس بس نہ کرو بات کہ یاد آئے ہے مجھ کو　　ناصح سے جو کچھ بے خودیوں میں بھی سُنا ہے

یہ کون کہے اُس سے کی ترکِ وفا ہیں نے | کر تو ہی ذرا ناصح پیغام بری اتنی
تو چھیڑے ہے نکہت کو گل ہائے شبینہ کی | اب تم سے بھی چل نکلی بادِ سحری اتنی
کہتا ہے مرے آگے وہ مجھ پہ عدو غش ہے | ہے ہے مری اُلفت سے ہے بے خبری اتنی

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے | میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

کیا کیا جوابِ شکوہ میں باتیں بنا گیا | لو اب بھی دل درست اسی دل شکن سے ہے

اور ان اشعار ہی پر کیا منحصر ہے مومن کی غزل کے تو ہر شعر میں یہ مخصوص لب و لہجہ ملتا ہے اس لب و لہجہ سے مومن نے فنی اور جمالیاتی اعتبار سے بڑے اہم کام انجام دیئے ہیں مکمل اظہار و ابلاغ میں یہ لب و لہجہ معاون ہوتا ہے۔ اس سے احساس کی صحیح کیفیت اور جذبے کی اصل حالت پر روشنی پڑتی ہے اور اُس کا صحیح تاثر قائم ہوتا ہے۔ مومن اس لب و لہجہ میں کہیں کہیں مکالمے کا جو انداز اور ڈرامے کی جو شان پیدا کرتے ہیں، اُس سے یہ تاثر کچھ اور بھی شدید اور دیرپا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی غزل میں محاکات اور مصوری کا جو پہلو اتنا نمایاں نظر آتا ہے اس میں بھی اس لب و لہجہ کا بڑا ہاتھ ہے۔ جہاں بھی وہ اس لب و لہجہ سے کام لیتے ہیں وہاں ایک تصویر سی بنتی ہے اور ایک پیکر سا اُبھرتا ہے، جن سے حواس براہ راست متاثر ہوتے ہیں۔ پھر یہ لہجہ بہ ذات بھی اپنے اندر ایک حُسن رکھتا ہے۔ اس میں زبان و بیان کے حسن کے ساتھ انداز اور طرز ادا کا تیکھا پن ساحری کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مومن کی غزل میں اُن کے اس لب و لہجہ کی حیثیت بہ ذاتِ خود ایک فن کی ہے اور جمالیاتی اعتبار سے اُس میں ایک انفرادی شان پیدا کرنے کا سہرا بھی اُن کے اسی لب و لہجے کے سر ہے۔

یہ تجزیہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مومن ایک بڑے خالقِ جمال ہیں۔ اور انھوں نے اپنی غزل میں فن غزل کے بنیادی مقتضیات کو پیش کر کے غزل کہنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اُن کے یہاں صرف غزل کی روایت کا رچاؤ ہی نہیں ملتا، اُس پر کچھ ایسے اضافے بھی نظر آتے ہیں جنھیں تجربے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مومن کی غزل میں روایت اور

تجربے کے اس امتزاج نے فنی اور جمالیاتی اعتبار سے ایک نئی فضا پیدا کی ہے۔ اور اس نئی فضا ہی نے اُس کو حسن و جمال کا ایک شاہکار بنایا ہے۔

(۹)

اُردو غزل کی روایت میں مومن کی غزل مجموعی طور پر بہت بڑے اضافے کا باعث بنی ہے۔ اُس نے اس روایت کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا ہے، اور اس طرح اُس میں ایک نئی زندگی پیدا کی ہے۔ مومن سے قبل کی اُردو غزل میں وہ جولانی نہیں تھی جو اُن کے یہاں اتنی نمایاں نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے پیش رؤوں سے استفادہ ضرور کیا ہے لیکن اُن میں سے کسی ایک کی بھی تقلید نہیں کی ہے۔ اُن کی غزل کی بنیاد تو اُن کے تجربات ہیں۔ اسی لئے اُس میں صداقت اور اخلاص مندی کے پہلو نمایاں ہیں۔ اور انھیں پہلوؤں نے اُس کو زندگی اور جولانی سے معمور کیا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ مومن ایک فعال ذہن رکھتے تھے۔ انفعالیت پسندی اُن میں نام کو نہیں تھی — اسی لئے اُن کی غزل میں اُن کی شخصیت کا یہ پہلو بھی اپنی جھلک دکھاتا ہے لیکن اس جولانی کو اُنھوں نے اپنے حدود میں رکھا ہے اور حد سے متجاوز نہیں ہونے دیا ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے یہاں زندگی کو بسر کرنے، اُس سے لذّت حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کی خواہش تو نظر آتی ہے لیکن یہ خواہش تعیش پسندی اور عیش کوشی کے حدود میں داخل نہیں ہوتی۔ اُس کی بنیاد تو وہ توازن اور اعتدال ہے جو انسانی زندگی اور انسانیت کی بنیاد ہے۔ مومن کی غزل میں یہ انسانی آہنگ بہت نمایاں ہے اور اسی آہنگ کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ آپ بیتی ہونے کے باوجود جگ بیتی معلوم ہوتی ہے۔

مومن کی غزل کا موضوع بظاہر تو محدود معلوم ہوتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھا جائے تو اُس میں وسعتیں نظر آتی ہیں۔ اُن کی غزل کا موضوع حسن و عشق، اُس کے مختلف معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی ہے — اس ترجمانی میں مفکرانہ گہرائی تو یقیناً نہیں ہے۔ لیکن تنوع اور رنگا رنگی، وسعت اور ہمہ گیری کے پہلو اس میں ضرور نمایاں نظر آتے ہیں — مومن نے یہ ترجمانی محسوساتی انداز میں حیاتی زاویۂ نظر سے کچھ اس طرح کی ہے کہ انسانی

زندگی کے ان پہلوؤں کی ساری تفصیل و جزئیات آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔۔۔۔۔ اُن کے یہاں انسانی زندگی کے جذباتی نظام کا گہرا شعور ملتا ہے اور وہ حُسن و عشق کے نشیب و فراز کو پیش کرتے ہوئے اس شعور سے بڑا کام لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی غزل میں انسان کی جذباتی زندگی کا مد و جزر پوری طرح بے نقاب نظر آتا ہے۔ انسانی حواس پر حُسن و جمال کے جو اثرات ہوتے ہیں عشق و عاشقی اس کے دل و دماغ کو جن حالات سے دوچار کرتی ہے۔ مومن کی غزل میں ان سب کی تفصیل موجود ہے۔۔۔ اور وہ بنیادی طور پر انسانی زندگی کے اسی پہلو کے شاعر ہیں۔۔۔ اس سلسلے میں اُنھوں نے غیر معمولی باتیں تو یقیناً نہیں کی ہیں لیکن اُن کے ذاتی تجربات نے ان میں ایک انفرادی شان ضرور پیدا کردی ہے لیکن اس کے باوجود حُسن و عشق کے مختلف پہلوؤں کی جو تصویریں اُنھوں نے بنائی ہیں اُن میں ایک عمومی اور آفاقی رنگ بھرا ہے۔۔۔ اور یہ اُن کی عشقیہ شاعری کی سب سے بڑی خوبی ہے۔۔۔۔ وہ انسانی زندگی کے حسین ترین لمحوں کی عکاس ہے۔ اسی لئے وہ حد درجہ رنگین اور پرکار نظر آتی ہے۔۔۔ لیکن اُس میں سوز و گداز اور درد و کسک کی بھی کمی نہیں ہے۔ البتہ سوز و گداز اور درد و کسک کا یہ پہلو اُن کے یہاں افسردہ دلی کا روپ اختیار کرکے افسردگی کو عام نہیں کرتا۔ وہ انسانی زندگی کی عام محرومی کو اس افسردگی اور افسردہ دلی کا منبع قرار دیتے ہیں۔ اسی لئے یہ نہ صرف گوارا ہو جاتی ہے بلکہ اس سے زندگی کا احساس بڑھتا ہے، اور اُس کو بسر کرنے کے خیالات بیدار ہوتے ہیں۔ مومن کی غزل انسانی زندگی کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے لیکن یہ ربط کسی جگہ بھی جذباتی ہیجان اور ہنگامے کی صورت اختیار نہیں کرتا۔ بر خلاف اس کے انسانی جذبات کی تہذیب کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔ مومن کی غزل تہذیب جذبات کے اس اہم کام کو انجام دینے کا خیال ہر حال میں اپنے پیش نظر رکھتی ہے، اور اس میں شبہ نہیں کہ یہی اُس کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

یہ غزل اپنے آس پاس اور گرد و پیش سے بے خبر نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں اُس زمانے کی زندگی کی جھلکیاں بھی جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ اُس زمانے کی زندگی کے اثرات تو حُسن و عشق کے مختلف معاملات کی ترجمانی تک میں موجود ہیں۔ اُس میں حُسن و جمال کے

جو معیار ہیں، عشق و عاشقی کی جو اقدار ہیں، اُن کو اُس زمانے کی مخصوص معاشرت اور تہذیب نے پیدا کیا ہے۔ یہ معاشرتی اور تہذیبی شعور مومن کی غزل میں جگہ جگہ کام کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اُن کی عشقیہ شاعری میں اس شعور کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ اور اس شعور نے مومن کی غزل کو ایک نہایت ہی حسین اور دل آویز پس منظر بہم پہنچایا ہے۔ اسی پس منظر میں مومن کی بنائی ہوئی تصویروں کے خط و خال پوری طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ اس شعور ہی نے مومن کے یہاں اجتماعی رجحان بھی پیدا کیا ہے، اور اسی کی بدولت وہ اپنی غزل میں اُس زمانے کی زندگی کے بعض اجتماعی پہلوؤں کو بھی پیش کرنے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن تغزل کا دامن اس عالم میں بھی اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے۔ بات یہ ہے کہ مومن غزل کے فن کو برتنے کا مزاج رکھتے ہیں۔ اسی لئے اُن کی غزل میں ہر جگہ یہ فن اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

اُردو غزل کی روایت میں مومن کی غزل کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ وہ ہر اعتبار سے منفرد نظر آتی ہے۔ اور اُس کے منفرد ہونے کا یہ راز زندگی اور فن کے اُس حسین امتزاج میں ہے جو اُس کا طرۂ امتیاز ہے!

مومن کی مثنویاں

مومن نے مثنویاں بھی لکھی ہیں، اور اُن میں سے ہر مثنوی بقول شیفتہ "رشکِ گلشن" اور "غیرتِ چمن"[۱] ہے۔ ان مثنویوں میں بڑی رنگینی ہے، بڑی ہی رعنائی ہے، یہ بہت ہی پُرکار ہیں۔ یہ انسانی زندگی کے ایسے لمحوں کی داستانیں ہیں جب اُس کی آنکھوں کے سامنے رنگین پردے سے پڑے ہوتے ہیں۔ اور وہ زندگی اور کائنات کی ہر چیز کو ایک رنگین عینک سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ ہر طرف اُسے رنگینیوں اور رعنائیوں کے بسیرے نظر آتے ہیں۔ اور وہ انھیں میں اپنے آپ کو گم کر دینا چاہتا ہے۔ ان میں زندگی کے ایسے دور کی تصویر کشی ہے جس میں انسان کی جوانی دیوانی ہو جاتی ہے اور وہ اس جوانی کے جوشِ جنوں میں نہ جانے کیا کیا کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن اُس کو خود اس بات کی خبر نہیں ہوتی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیسی کیسی عجیب حرکتیں اُس سے سرزد ہو رہی ہیں۔ اس عالم میں تو ہر چیز اُس کے لئے روا ہو جاتی ہے اور وہ کسی بات کو بھی معیوب نہیں سمجھتا۔ اخلاق کے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ تہذیب اور معاشرت کی قدریں ڈانوا ڈول ہو جاتی ہیں ـــــ لیکن وہ

۱۔ شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۷

ان کی پروا نہیں کرتا اور زندگی کے اس راستے پر بہت دور تک چلا جاتا ہے۔ یہ مثنویاں انسان کے اسی دورِ ہوس کی روداد ہیں۔ جن کو مومنؔ نے آپ بیتی کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا ہے۔ اسی لئے یہ واقعیت سے لبریز اور حقیقت سے بھرپور نظر آتی ہیں۔ ان میں مبالغہ نہیں ہے۔ یہ تو سچے واقعات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی اور شخصی ہونے کے باوجود ان میں بھی ایک انسانی رنگ و آہنگ کی جھلکیاں جگہ جگہ اپنے آپ کو رونما کرتی ہیں۔ یہ ایک مخصوص معاشرتی ماحول اور اس ماحول کے سائے میں پرورش پانے والے ایک فرد کی جذباتی اور جسمانی کیفیات کی ترجمان اور عکاس ضرور ہیں لیکن ان میں ایک انسان کے دل کی دھڑکن صاف سُنائی دیتی ہے اور ساتھ ہی اُس کے خون کی گرمی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ان مثنویوں میں زندگی کے اعلیٰ معیار نہیں ہیں کہنے کو ان میں عشق و عاشقی کے واقعات کا بیان ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عشق و عاشقی سے زیادہ ان میں ہوس کی باتیں ہیں۔ انھیں ہوس کی باتوں کو ان مثنویوں میں عشق تصوّر کر لیا گیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ہوس اور عشق میں زمین آسمان کا فرق ہے اسی لئے ان میں عشق و عاشقی کا کوئی اعلیٰ اور ارفع تصوّر نہیں ملتا ـــــ ان مثنویوں کا بنیادی کردار تو ایک ایسا شخص ہے جس پر جوانی ٹوٹ کر آئی ہے اور جس نے دل کھول کر اس جوانی کی داد دی ہے۔ لذّت کا احساس اور تعیش کا خیال اس کی گھٹی میں پڑا ہے۔ چنانچہ وہ بچپن ہی سے اس لذت اور تعیش کو حاصل کرنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ اس سلسلے میں اُس کو نہ جانے کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ نہ جانے کتنی رسوائیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ نہ جانے کتنی بدنامیاں سہنی پڑتی ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ باز نہیں آتا۔ ایک اضطرابی کیفیت اُس کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتی، اور وہ ایک عالمِ سرخوشی میں سرگرداں پھرتا ہے۔ نہ جانے کتنے غزال چشم اُس کے دام میں اسیر ہوتے ہیں، لیکن وہ خود کسی کا اسیر نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ صیاد ہی رہتا ہے۔

سات یا نو سال کی عمر سے یہ سلسلے شروع ہوتے ہیں اور اُس وقت تک جاری رہتے ہیں جب تک جوانی کا نشہ ہرن نہیں ہو جاتا۔ اس عرصے میں جان کی بازی لگائی جاتی ہے۔ دِل کا کھیل کھیلا جاتا ہے، زہرہ جبینوں سے پیمانِ وفا باندھے جاتے ہیں۔ چوری چھپے ملاقاتیں

ہوتی ہیں۔ نامۂ و پیام کا سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ وصل کے منصوبے بنائے جاتے ہیں اور اکثر وصل کی نوبت آ بھی جاتی ہے۔ وصل کے ان لمحوں سے وہ جی بھر کے رس نچوڑتا ہے اور خوب خوب کھُل کھیلتا ہے۔ رنگ کے فوارے چھوٹتے ہیں۔ نور کی بارش ہوتی ہے اور ساری فضا پر ایک سرخوشی کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ لمحے جاوداں نہیں ہوتے۔ یہ سلسلہ ختم بھی ہو جاتا ہے، ہجر کے تاریک لمحے بھی آ جاتے ہیں۔ اور اُن کی تاریکیاں اس فضا پر مُسلط ہو کر تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کا خون کر دیتی ہیں لیکن پھر کوئی اور سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ غرض عشق و ہوس کے یہ کھیل جاری رہتے ہیں۔ مومنؔ نے اپنی ان مثنویوں میں انھیں کی تفصیل و جزئیات کی تصویر کشی کی ہے۔ ان میں عشق کی سپردگی اور اُس کی فنادگی کے مقابلے میں لذت پسندی اور عیش کوشی اور ہوس کاری کے خیالات نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ اور انھیں خیالات نے ان مثنویوں کو عشق کے اعلیٰ معیاروں اور عاشقی کی ارفع قدروں سے بڑی حد تک محروم رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں اُس سوز و گداز کی بھی کمی نہیں ہے جن کو ناکامی اور محرومی کا احساس پیدا کرتا ہے اور جو اِن رنگین اور پرُ کار لمحوں میں سائے کی طرح انسانی زندگی کے ساتھ رہتے ہیں۔

اِن مثنویوں کو ایک مخصوص معاشرتی ماحول نے پیدا کیا ہے اور اس ماحول کے اثرات اِن میں مختلف زاویوں سے اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ اِن میں حسن سے والہانہ انداز میں دلچسپی لینے کی جو فضا ہے، محبوب کا جو مخصوص تصور ہے، اُس کی ذات سے حصول لذت کا جو خیال ہے اور عشق و عاشقی کے جو معیار ہیں، اُن سب میں اُس مخصوص ماحول کا عکس نظر آتا ہے۔ جس کے سائے میں اِن مثنویوں کی تخلیق ہوئی ہے۔ اُس زمانے میں حُسن اور حُسن کا احساس زندگی میں بہت بڑھ گیا تھا۔ اور حسن پرستی افراد کے مزاجوں میں کچھ اس طرح داخل ہو گئی تھی کہ اُس سے علیحدگی اختیار کرنے کا خیال ناممکن تھا۔ معاشرے میں انحطاط و زوال کی کیفیت تھی اور اس انحطاط و زوال نے ایک طرف تو اپنی کھوئی ہوئی عظمتوں کے احساس کو بڑھا دیا تھا اور دوسری طرف عیش و نشاط میں گم ہو جانے کی ایک فضا قائم کر دی تھی چنانچہ افراد اسی میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔ یہ پناہ انھیں حسن و شباب میں ملتی تھی۔ یہی حسن و شباب اُن کے نزدیک

محبوب تھا۔ اس محبوب سے وہ دلچسپی لیتے، لذت حاصل کرتے اور لطف اندوز ہوتے تھے۔ اسی کا نام اُن کے نزدیک عشق تھا۔ ظاہر ہے کہ اس عشق میں اعلیٰ معیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے اکثر یہ عشق ہوس کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ اور وہ ساری زندگی اس ہوس کو پورا کرنے کے لئے سرگرم رہتے تھے۔ محبوب کی حیثیت مجلسی تھی اور اس کی زندگی کا مقصد محض دادِ عیش دینا تھا۔ ان حالات نے عیش و نشاط کی ایک مخصوص فضا پیدا کر دی تھی۔ یہی فضا مومنؔ کی ان مثنویوں کا موضوع ہے۔ بظاہر تو یہ فضا اپنے معیاروں اور قدروں کے اعتبار سے عجیب معلوم ہوتی ہے لیکن ان مخصوص معاشرتی حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ فضا ایسی کچھ عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اس میں جو معیار اور قدریں ہیں وہ کسی ایک فرد کے معیار اور قدریں نہیں ہیں بلکہ ایک پورے معاشرتی ماحول کے معیار اور قدریں ہیں جن کا عکس افراد کے اعمال و افعال میں بھی نظر آتا ہے۔ مومن بھی اسی معاشرے کے فرد تھے۔ اُن کا مزاج بھی اسی معاشرے کا مزاج تھا۔ اس معاشرے میں جو معیار عام تھے اور جن قدروں پر اُس کی بنیاد استوار تھی۔ اُن کے ساتھ اُنھوں نے بھی رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اُن کی اِن مثنویوں میں اسی صورت حال کی ترجمانی اور عکاسی نظر آتی ہے۔

مومنؔ کی یہ مثنویاں اُن کے ذاتی اور انفرادی تجربات کی صحیح آئینہ دار ہیں۔ اِن کا موضوع اُن کی زندگی کے اُس دور کا نشیب و فراز ہے جب اُنھیں خود اپنا ہوش نہیں تھا۔ اُس زمانے میں اُنھیں جو واقعات پیش آئے ہیں۔ جن حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ جو کچھ اُن کے دل پر بیتی ہے۔ جن چیزوں سے اُن کے حواس متاثر ہوئے ہیں۔ اُن سب کی تفصیل اُنھوں نے ان مثنویوں میں پیش کر دی ہے۔ اِن میں اُن واقعات کا بیان ہے جو اُنھیں اپنی زندگی میں پیش آئے ہیں۔ اور جن کا اُن پر گہرا اثر ہوا ہے۔ اسی لئے اُن کی اِن مثنویوں میں اُن کی شخصیت اور کردار کی بھی ایک جان دار تصویر نظر آتی ہے۔ اِن سے نہ صرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مومنؔ نے اپنی زندگی میں کتنے عشق کئے اور کس کس طرح اپنی ہوس کو پورا کیا۔ بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ زندگی کے ایک خاص دور میں اُن کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کیا تھی اور وہ اُس کے زیر اثر کن طوفانوں سے دوچار ہو رہے تھے، اور اُن کی زندگی کے

اُفق پر کون سی آندھیاں اُٹھ رہی تھیں اور ان طوفانوں کے تھپیڑوں اور آندھیوں کے جھونکوں نے اُن کا کیا حال کر دیا تھا؟

یہ مثنویاں اُردو مثنوی کی فنی روایت کے زیرِ اثر نہیں لکھی گئی ہیں۔ اسی لئے ان میں مثنوی کی صنف کے فنی مقتضیات کو بھی پوری طرح سامنے نہیں رکھا گیا ہے۔ ان میں قصّے کا عنصر تو موجود ہے لیکن یہ باقاعدہ مکمل اور مربوط داستانیں نہیں ہیں۔ ان میں تو بعض ایسے واقعات کا بیان ہے جو بالکل سیدھے سادے ہیں اور جن میں نشیب و فراز کے باعث پیدا ہونے والی وہ پیچ دار کیفیت نہیں ہے جو کہانی میں دلچسپی کے عناصر کو پیدا کرتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ واقعات دلچسپ ہیں کیونکہ ان میں صداقت کا حُسن اور واقعیت کی دل آویزی ہے ــــ ان میں انسانی زندگی کا نفسیاتی شعور اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔ یہ مجموعی طور پر بہت مربوط نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک میں ایک توازن اور ہم آہنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اور اسی وجہ سے ان میں ایک وحدت نظر آتی ہے کہیں کہیں طوالت کا احساس ان میں ضرور ہوتا ہے لیکن اس طوالت کو بھی ایک ذہنی کیفیت کی مخصوص رَو نے پیدا کیا ہے۔ اسی لئے یہ طوالت بھی طبیعت پر بار نہیں بنتی۔ بلکہ کسی حد تک دلچسپی ہی کو قائم رکھتی ہے۔ ان مثنویوں میں واقعیت کی دل آویزی ہے۔ حقیقت کی دل کشی ہے۔ تفصیل و جزئیات کے جمالیاتی اظہار نے ان میں بڑا حُسن پیدا کیا ہے۔ واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے بعض بہت اچھے نمونے ان میں مل جاتے ہیں۔ اگرچہ ان مثنویوں کا خاتمہ عموماً ناکامی اور محرومی پر ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود ان میں سے ہر ایک میں شگفتگی اور شادابی، رنگینی اور پُرکاری کی چاندنی سی کِھلی ہوئی نظر آتی ہے اور جگہ جگہ رنگ و نور کا ایک دریا سا موج زن دکھائی دیتا ہے۔ مومنؔ نے ان مثنویوں میں انسانی زندگی کے جذباتی پہلوؤں کی بڑی ہی فن کارانہ مصوّری کی ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زبان اور الفاظ کے استعمال کو بہ ذاتِ خود ایک فنِ لطیف بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں مجموعی طور پر جمالیاتی اظہار کے اعلیٰ اور ارفع نمونے ملتے ہیں جنھوں نے ان مثنویوں کو حد درجہ حسین اور دلکش نظمیں بنا کر فنی اعتبار سے ہم دوشِ ثریا کر دیا ہے۔

(۲)

مومن کی پہلی عشقیہ مثنوی شکایت ستم ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے دو ابتدائی عشقیہ واقعات کی تفصیل پیش کی ہے۔ مثنوی کا آغاز طلب آب آتش رنگ سے ہوتا ہے۔ مومن اپنی زبوں حالی کا حال بیان کر کے ساقیِ گلفام سے اس بادۂ آتش رنگ کی فرمائش کرتے ہیں کہ اسی طرح محتاج چارہ سازی اور خستۂ ناز بے نیازی کا مداوا ممکن ہے۔ حواسوں کا انتشار اس سے دور ہو سکتا ہے اور خمار کی کیفیت ختم ہو سکتی ہے۔ وہ مثل قلقل خروش میں اور مثل بادہ جوش میں آسکتا ہے۔ اس عالم کیف و مستی ہی میں جوشِ دل کے رازِ پنہاں کو زبان تک لانے کی سکت اس میں پیدا ہو سکتی ہے اور وہ گلۂ یار و شکوۂ دوراں دونوں کو بیان کر سکتا ہے۔

اس تمہید کے بعد مومن اس گلۂ یار اور شکوۂ دوراں کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ عشق کے اس پہلے سانحے سے وہ اس وقت دوچار ہوئے جب ان کی عمر صرف سات یا نو برس کی تھی۔ لکھتے ہیں :-

تھے برس ہم شمارۂ افلاک ۔۔۔ کہ ہوا پائمال صورتِ خاک
کھو دیا چین ایک مہ رو نے ۔۔۔ شب سیہ کی ہلال ابرو نے
خنجرِ غمزہ نے ہلاک کیا ۔۔۔ نرگسِ سرمہ سا نے خاک کیا
اور اس کا بھی مجھ پہ دل آیا ۔۔۔ کھو کے دل میں نے جان کو پایا
دشنہ تھے زخم بار دونوں کے ۔۔۔ ہوئے سینے فگار دونوں کے
صبر و آرامش و ثبات چلے ۔۔۔ اپنے دونوں ساتھ سات چلے
ہوئے آرام و صبر دونوں رواں ۔۔۔ بے اجازت گئے سکون و تواں
اپنا ہوش اس کے رنگ کا پیرو ۔۔۔ اس کا صبر اپنے رنگ کا پیرو
دونوں اک تازہ کار اُفتادہ ۔۔۔ دونوں دلدار دونوں دلدادہ
ہوئی نظروں میں گفتگو باہم ۔۔۔ عرض کی دل کی گفتگو باہم
ہم کو چشمِ لحاظ پاسِ وفا ۔۔۔ اُن کو منظور التماسِ وفا

ترس جور فراق زیب بیاں　　سخنِ اشتیاقِ وردِ زباں
نکلے ارماں خیال کے کیا کیا　　ہوئے وعدے وصال کے کیا کیا
ہائے بچپن میں دِل کا آجانا　　کچھ سمجھتے نہ تھے یہ کیسا جانا

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بچپن ہی سے اُن کا مزاج عاشقانہ تھا۔ اور ابھی وہ سنِ شعور کو بھی نہ پہنچے تھے کہ انھیں عشق بازی کا چسکا پڑ گیا۔ اس عشق نے اُن کے حواس گم کردیئے اور اس زمانے میں وہ اس غم والم سے آشنا ہوئے جس کا اُس وقت خواب بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ لکھنے پڑھنے اور کھیلنے کے دن تھے لیکن اس عشق و عاشقی نے سب کچھ بھلا دیا۔ صرف عشق و محبت کی باتیں یاد رہ گئیں۔ اور ان باتوں نے اُن کی نیند اور اقربا کے ہوش اُڑا دیئے۔ علاج کے منصوبے بنائے جانے لگے اور نہ جانے کیا کیا جتن کئے گئے لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ روز بروز حالت بد سے بد تر ہوتی گئی۔ ہر طرف اس عشق کا چرچا ہونے لگا۔ جان پر آفتیں آتی رہیں اور ہجر و وصال کی کشمکش میں دن گزرتے گئے یہاں تک کہ دو سال کا عرصہ بیت گیا ؎

گھر سے عیش وطرب کے جوش گئے　　میری نیند اقربا کے ہوش گئے
ہوئے سرگرم چارۂ و تدبیر　　کئے کیا کیا علاج بے تاثیر
دستہ ہائے گل و ہجوم سمن　　بسترِ خواب رشکِ صحنِ چمن
چشمِ بد کے لئے فسوں سازی　　تازہ ہر شب فسانہ پردازی
اُڑ گیا اور بھی مرا آرام　　حال تغییر مقتضائے مقام
ذکرِ ہجراں سے رقتیں آئیں　　وصل کی جائے حسرتیں آئیں
شہرۂ عاشقانہ ہونے لگا　　حال میرا فسانہ ہونے لگا
گہ گہے جو وصال ہوتا تھا　　وہ بھی جی کا وبال ہوتا تھا
دیکھ وہ غمزۂ ہراس آلود　　نگہِ آرزو تھی یاس آلود
شبنم و نرگس اُس کی تر آنکھیں　　جی بھر آئے دیکھ کر آنکھیں
کان رکھو جو آہ بیہم پر　　صدمہ نو بہ نو رہے دم پر
آفت جان و دل فراق و وصال　　الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال

ظاہر ہے کہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک ایک شخص کو اس کا علم ہو گیا۔ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ بالآخر محبوب نے مصلحتاً ملنا جلنا کم کر دیا، اور وہ دونوں ایک دوسرے سے دور رہنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہجر و فراق کے اس عالم نے دونوں کے لئے زندگی کو ایک اچھی خاصی مصیبت بنا دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد قسمت نے مدد کی۔ وہ اس طرح کہ اتفاق سے ایک شادی میں محبوبہ کا آنا ہوا اور وہ اسی بہانے سے ایک خالی مکان میں آ کر اپنے عاشق سے ملی۔ دونوں جانب سے گلے شکوے ہوئے، دیر تک نالہ و فریاد کا سلسلہ جاری رہا۔ آنکھوں سے آنسو بہتے رہے لیکن یہ صحبت دو دن سے زیادہ نہ چل سکی ؎

ہوئی شادی ہمارے یاں یک بار — آئی مہماں وہ دولت بیدار
شرکتِ محفل سراپا زیب — اُس کے آنے کی ہو گئی تقریب
ایک خالی مکان میں آ کر — مل گئی چپکے چپکے ڈھب پا کر
کیا ملاقات رشک تنہائی — دم بہ دم تازہ حسرت افزائی
دونوں جانب سے نالہ و فریاد — شکوۂ جور طعنۂ بیداد
گرد دل سے اُڑیں زمیں کے ہوش — نالہ آسماں فگن کا جوش
اشک آنکھوں سے مستقل جاری — خونِ دل تا بہ لختِ دل جاری
آرزو پائمال پاسِ وصال — لحظہ لحظہ خراب تر احوال
اُس پہ آیا زمانۂ رخصت — دورِ ایام نے نہ دی فرصت
آ گیا دو ہی دن میں روزِ نشور — منتشر ہو گئی وہ بزم سرور

اور پھر یہ کیفیت ہوئی ؎

آئے رنج و غم و تعب مہماں — گھر گئے اپنے اپنے سب مہماں
شعلہ زن آہِ سینہ سوز وداع — مہر حشر آفتاب روزِ وداع
لاشۂ صور دوش افغاں پر — اک قیامت بنی دل و جاں پر
وہ ملاقات آخری ہے ہے — کیسی دلداریاں مری ہے ہے
وہ نگاہ ہراس آلودہ — حرفِ امید یاس آلودہ

آرزوئے وصال کی باتیں ممکن و احتمال کی باتیں

اس طرح کلیجے پر پتھر رکھ کر وہ دونوں ایک دوسرے سے رخصت ہوئے۔ لیکن وہ محبوبہ اس فراق کے کربِ مسلسل کی تاب نہ لا سکی اور بہت تھوڑے عرصے میں جاں بحق تسلیم ہوئی ؎

ایک دن جی زیادہ گھبرایا جانِ بے تاب کو نہ صبر آیا
ایک جان اور غم کا وہ انبوہ ایسے نازک پہ شدتِ اندوہ
جوشِ یاس آسمان تلک پہنچے تاب لائے کہاں تلک بچے
تنگیٔ دہر وحشت افزا تھی تپشِ دل قیامت آرا تھی
بہرِ تسکین شدتِ خفقاں ٹھہری گل گشت روضۂ رضواں
گئی جنت میں بس کہ ایسی حور ہوئی بے تاب کیسی کیسی حور
رشک سے خضر پائمال ہوا ملک الموت سے وصال ہوا

یہ روح فرسا خبر جب عاشق تک پہنچی تو اس کی حالت بھی دگرگوں ہو گئی اور اس پر ایک سکتے کا عالم طاری ہو گیا، آنکھ سے خون کے دریا بہنے لگے اور وہ خاک میں لوٹنے لگا۔ مومن نے اس کی تفصیل خود اسی کی زبانی بیان کی ہے ؎

مجھ کو جس وقت یہ خبر آئی بے ہوشی مرگ کی خبر لائی
پاس بدنامی اک ذرا نہ رہا ہوش ناموس و ننگ کا نہ رہا
خار خار غم آشکارہ ہوا مثلِ دل جامہ پارہ پارہ ہوا
ہو گئی بس کہ لوٹے خاک میں ہم جلد ہم رنگ کسوتِ ماتم
کیا نظر زخمِ اندروں آیا چشم سے رو کے روتے خوں آیا
نہ لیا پھر قرار نے آرام کھو دیا اضطرار نے آرام
سینہ کوبی سے دِل فگار ہوا تیر حسرت جگر کے پار ہوا
دم اٹکتے اٹکتے ٹوٹ گیا سر پٹکتے پٹکتے پھوٹ گیا
آہ نے دل سے کیا اٹھائے دھوئیں جاہ بابل کے بس اڑائے دھوئیں

اس حال زار کو دیکھ کر اقربا اور اطبا نے چارہ گری کی بڑی بڑی کوششیں کیں اور

اس سلسلے میں اپنے ترکش کے تمام تیر چھوڑ دیئے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تکلیفوں میں اضافہ ہوتا گیا، لیکن ان کی چارہ گری سے نجات حاصل کرنے کے لیئے اُس نے بظاہر یہ دکھانے کی کوشش کی کہ طبیعت توازن اور اعتدال کی طرف مائل ہے لیکن اس کے دل میں اندر ہی اندر طوفان اُٹھتے رہے۔ اس صورتِ حال نے عاقلوں تک کو دیوانہ بنا دیا۔ کیونکہ وہ اصل حقیقت کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔

اتفاق سے اسی زمانے میں ایک صورت غم غلط کرنے کی نکل آئی، اور اس صورتِ حال نے دل کے بوجھ کو بڑی حد تک ہلکا کر دیا۔ ہوا یوں کہ اسی زمانے میں ایک اور سمن اندام کی بوئے جاں فزا نے اُس کی زندگی میں رعنائی کی ایک رمق پیدا کر دی۔ اور اُس نے اپنے پہلے غم کو بڑی حد تک بھلا دیا۔ اُس سے کسی حد تک اطمینان کی صورت پیدا ہوئی لیکن عشق بہر حال عشق ہے، اور اُس میں مسرت و غم دونوں کی دھوپ چھاؤں سے دوچار ہونا یقینی ہے۔ محبوب نے دل دہی اور دل نوازی کا حق ادا کر دیا لیکن مومن کے دل میں ایک خلش سی پھر بھی باقی رہی ؎

دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں　　جلوہ افروز ہے سرِ بالیں
سالِ عمر اب تھے ہم شمارِ بروج　　کہ ہوا اخترِ بلا کا عروج
چرخ نے داغِ نو دیا مجھ کو　　والہ اُس ماہ کا کیا مجھ کو
صدمۂ جاں گسل دوبارہ ہوا　　جوں کتاں سینہ پارہ پارہ ہوا
دیکھ زانو پہ اُس کے سر اپنا　　تھا دماغ آسمان پر اپنا
جان سی آ گئی کہ تھا سرشار　　آبِ حیواں سے جان زانوئے یار
کیا کہوں پرسشِ نگاہِ گرم　　چشم سے غمزہ داد خواہ ستم
ذکرِ اُمید خاطرِ محروم　　سخنِ دل دہی کا جوش و ہجوم

اور اُس کی اِس دل دہی میں بھی اندازِ دلبری اور طرزِ دل رُبائی تھا۔ بات کرتی تو یہ معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ غرض دوست داری کی ان باتوں اور محبت کی اس گفتگو نے مومن میں بڑی حد تک توانائی پیدا کی اور اُنھیں ایک نئی زندگی نصیب ہوئی ؎

حرف منہ سے جو اُس کے نکلے پڑیں ‏ ایک غنچے سے لاکھ پھول جھڑیں
دیکھ اُس لب کی گوہر افشانی ‏ ہو گیا آب ابرِ نیسانی
حال پوچھا جو ناتوانی کا ‏ بڑھ گیا زور سخت جانی کا
لب جاں بخش چارہ جو کیا کیا ‏ اُلفت آلودہ گفتگو کیا کیا
واہ اُس لب کی چارہ فرمائی ‏ بات میں آ گئی توانائی
شادیاں دل کو ہم کناری کی ‏ ہائے باتیں وہ دوست داری کی
پوچھنا اب مزاج کیسا ہے ‏ غش یہ پھر تم کو آج کیسا ہے
جان سے یوں گزر نہیں جاتے ‏ موئے کے پیچھے مر نہیں جاتے
حظ اُٹھاؤ ذرا جوانی کے ‏ کچھ مزے دیکھو زندگانی کے
محمرِ رفتہ کی جستجو کب تک ‏ اپنے مرنے کی آرزو کب تک
آخر اک روز جان جانی ہے ‏ یہی دو دن کی زندگانی ہے

مومن پر اس نئے محبوب کی دل دہی اور دلداری کا اتنا اثر ہوا کہ پہلی محبوبہ کی یادِ رفتہ رفتہ دل سے محو ہونے لگی اور بالآخر زندگی سے بیزاری کا خاتمہ ہو گیا۔ غم سے نجات ملی اور جی کو آرام آ گیا۔ روز تازہ گل ہائے انبساط کھلنے لگے اور ہر سحر خندۂ نشاط کا جوش نظر آنے لگا۔ محفل آرائیاں ہوئیں۔ دل دہی و دلبری کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور وہ روز بروز ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ نوبت بوس و کنار تک جا پہنچی اور ہر لحظہ یہی شغل رہنے لگا۔ ایک سال تک دونوں نے زندگی کے یہ مزے اُٹھائے لیکن بالآخر یہ صحبت بھی منتشر ہونے لگی۔ نحوست نے پاؤں پھیلائے۔ عیش و نشاط کی رنگینیوں کو ادبار کی تاریکیوں نے اپنی گرفت میں لے لیا اور شوقِ دشت و جوشِ جنوں کے سامان پھر فراہم ہو گئے۔

قصہ یہ ہوا کہ ایک دن مومن نشاط و سرور میں مصروف تھے۔ بادۂ شوق کا دور چل رہا تھا۔ بوسہ و آغوش کی لذتوں نے ایک سرخوشی کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ اس عالم میں دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے پڑے تھے کہ اُنھیں نیند آ گئی۔ اتفاق سے اُس وقت وہاں ایک جیّالہ چلی آئی، اور اُس نے دونوں کو اس عالمِ بے حجابی میں دیکھ لیا۔

وہ اس منظر کی تاب نہ لا سکی۔ آگ بگولا ہو گئی اور سارے شہر میں اس نے دونوں کو بدنام کر دیا۔ لوگوں کے ہاتھ یہ بات آئی اور انھوں نے اور اس خبر کو اس طرح پھیلایا جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے۔ غرض ہر طرف ایک شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ فتنے جاگ اُٹھے۔ ہنگاموں نے سر اُٹھایا۔ جاننے والوں نے علیحدگی اختیار کی۔ دوست احباب امن بچانے لگے۔ عزیز و اقربا نے سرزنش شروع کر دی۔ مومن نے اس کا نقشہ بڑی خوبی سے کھینچا ہے۔

لب پہ ہر اک کے حرفِ ناگفتہ — گل زغنچہ ہائے ناشگفتہ
کیا جگر سوز حرفِ بے ادبی — برقِ گل خندہ ہائے زیرِ لبی
یاس و محرومیٔ امان و شفیع — تیر باران طعنہ و تشنیع
کوئی کہتا تھا کیا کہے کوئی — کس سے یہ ماجرا کہے کوئی
کوئی کہتا تھا آپ کی کیا بات — اتنی سی عمر اور یہ حرکات
دیکھنا عشق کی فسوں سازی — کھیل بچوں کا ہوئے جاں بازی
اور ہم دونوں رہن حیرانی — کہ کھلا کیونکہ رازِ پنہانی

اور پھر گھر والوں نے جس طرح آڑے ہاتھوں لیا اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے ؎

واں سے ناچار آئے ہم گھر میں — پاؤں رکھتے وہاں اژدر میں
ڈر سے ہر گام لغزشِ پا تھی — ایسی مستی خمار میں کیا تھی
آستانے پہ جو قدم رکھا — سر پہ بارِ سنگ غم رکھا
دیکھتا کیا ہوں سارا گھر ہے غمیں — جو نظر آئے ہے سو چیں بہ جبیں
دیدۂ مار چشمِ مردم ہے — مژہ ہر ایک نیش کژدم ہے
اقربا کی نگاہیں قہر آلود — دستِ دشمن میں تیغ زہر آلود
نغمۂ دیپک تھی صدائے قدم — ہوئی آگ آتے ہی صدائے قدم
دیکھتے ہی دل اور بھر آیا — چشمِ نم میں لہو اُتر آیا

غرض گھر والے دیر تک لعنت ملامت کرتے رہے۔ کسی نے کہا سارے خاندان کی آن کو بٹہ لگا دیا اور اس حرکت ناز یبا سے آبا و اجداد کی عزت و شان خاک میں مل گئی۔

کوئی کہنے لگا کہ ارمان نکلنے کی تمام راہیں مسدود ہوگئیں کیونکہ ان سیاہ کاریوں کے بعد نسبت کا قرار پانا اور کدخدائی کا سامان ہونا اب خواب وخیال میں بھی ممکن نہیں۔ مومن نے یہ سب باتیں سُنیں اور نہ جانے کس کے خیال میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگے، اور کہا کہ یہ سب کچھ جھوٹ اور سراسر بہتان ہے۔ یہ خبر کسی دشمن نے اڑائی ہے اور اس طرح اُن سے انتقام لیا ہے۔ جب ایک آدھ جھوٹی قسم بھی کھائی تو گھر والوں کو یقین ہوگیا کہ واقعی یہ کسی کی شرارت ہے اور اُس نے خواہ مخواہ یہ طوفان اُٹھایا ہے اور اس طرح بات آئی گئی ہوگئی لیکن اُنھیں نظر بند کر دیا گیا اور آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس پابندی نے اُن کا بُرا حال کر دیا۔ اور وہ اُس کی وجہ سے پریشان رہنے لگے ؎

جھوٹی اک آدھ جب قسم کھائی ۔۔۔ سمجھے سچ ہے یہ سن وشیدائی
صاف طوفان اس کو جان گئے ۔۔۔ دشمنِ جان اُس کو جان گئے
کی وہاں جانے کی مگر بندی ۔۔۔ مجھ سا دل بند اور نظر بندی
دام تارِ نگاہ میں ہیں اسیر ۔۔۔ حلقۂ چشم حلقۂ زنجیر
ہائے کس نورِ چشم پر تاکید ۔۔۔ لگے آنکھوں میں رکھنے بس کے دید
اب کہاں وہ وصالِ تنہائی ۔۔۔ غمِ عزلت ملالِ تنہائی
سعیٔ آرام و ناصبوری ہائے ۔۔۔ خوگرِ وصل و رنجِ دوری ہائے
تپش دل کی حد نہیں کیسی ۔۔۔ مجھ سے نازک پہ شدتیں کیسی
صید محرومیٔ آرزوے وصال ۔۔۔ سعیٔ پرواز و شوق بے پر و بال

اور اس طرح ایک عالمِ ہجر میں زندگی کے دن کٹنے لگے۔ اختر شماری اُن کا شعار ٹھہرا۔ شوق نظارہ سے نگاہ بے تاب رہنے لگی۔ آہ و نالہ کی شعلہ فشانی نے جہنم کا نقشہ پیش کر دیا۔ پھولوں کے بدلے منہ سے شرار جھڑنے لگے۔ ہوش وحواس کا خاتمہ ہوگیا۔ وحشت طاری ہوگئی۔ جیب و گریبانِ جنوں کے ہاتھوں نئے نئے گُل کھِلنے لگے۔ نیند اُڑ گئی اور خیالِ یار میں صبح سے شام اور شام سے صبح تک تڑپنا ان کا مقدر بن گیا ؎

وہم درمانِ دل کرے ہر شب ۔۔۔ شکل بستر سے مشورے ہر شب

شعلہ رو کا خیال جان جلائے | شمع بالیں کو دیکھ رونا آئے
دھیان مہتاب پر کبھی جو جائے | لوٹتے لوٹتے سحر ہو جائے
چھیڑ دستی کرے جنوں بے باک | صبح کے ساتھ ہو گریباں چاک
سامنے وہ جو مہروش آئے | مجھ کو جوں تاب مہر غش آئے
گر پڑوں صحن خانہ میں ناچار | صورتِ سایۂ در و دیوار
شوق دیدن کو بس کہ جوش آئے | بے قراری سے مجھ کو ہوش آئے
دیکھ کر اُس کی جلوہ فرمائی | مضطرب دیدۂ تماشائی
خواہش دل کو ہو وہیں شدت سے | بیٹھا دیکھوں نگاہِ حسرت سے
آرزو لذتیں اُٹھانے کی | پہلوئے شوق میں بٹھانے کی
گلے لگنے کو بس کہ جی ترسے | مستعد دل کہ گر پڑے بر سے

لیکن اس خیال کو حقیقت بنانے کی کوئی صورت نہ نکلی اور وہ اسی اضطراب کے عالم میں ایک زمانے تک جور گردوں کے شکوہ سنج رہے۔ دورِ لیل و نہار اور ستم روزگار نے اُنھیں کہیں کا نہ رکھا اور اس طرح بے حواسی کے عالم میں وہ جگہ جگہ اپنا دردِ دل سُناتے پھرے۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ ایک دن اسی محبوبۂ دل نواز اور سراپا ناز سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ دیکھتے ہی اُس نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ اور رو رو کر گلے شکوے کہنے لگی ؎

کئی دن بعد ایک دن تنہا | اتفاقاً ملی وہ مہ سیما
بس مجھے دیکھتے ہی رونے لگی | سِلک گوہر نثار ہونے لگی
گریہ رہ رہ کے بار بار آیا | جھوم جھوم ابر نو بہار آیا
لب پہ ہر دم وہ نالۂ غم کش | رعد جس کا نہ ہو سکے دم کش
نفسِ گرم کا قلق دمساز | غیرت برق شعلۂ آواز
چاہے وہ چپ رہوں پہ رہ نہ سکی | جی میں دل کی کہوں پہ کہہ نہ سکی
جوش میں دردِ دل کہا کب جائے | یوں بھی برباد حرفِ مطلب جائے
آخر اس ولولے سے صبر گیا | جی پہ بے اختیار جبر کیا

دل کو لب کی طرف رجوع کیا — قصۂ درد و غم شروع کیا
کہ ترے واسطے میں خوار ہوئی — بے حجابی سے شرمسار ہوئی
کیسی رسوائیاں ہوئیں ہی ہی — محشر آرائیاں ہوئیں ہی ہی

اور اس طرح دیر تک وہ اپنا قصۂ غم بیان کرتی اور ایام وصال کو یاد کرکے خون روتی رہی — اپنے عالم ہجر اور اس عالم ہجر میں اپنی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیت کا اس نے پورا نقشہ کھینچ دیا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اس کو از سرِ نو ملنے کی ایک تدبیر سوجھی اور یک جا ہونے کا ڈھب خیال میں آیا۔ وہ ڈھب یہ تھا کہ جب رات کو تمام لوگ سو جائیں تو ملاقات کی صورت نکل سکتی ہے۔ اگر وہ چپکے چپکے آجائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو تو ایک بار پھر وہ بیتے ہوئے حسین لمحے واپس آسکتے ہیں — لیکن اس کا مقصد شب کو رہ جانا نہیں، بلکہ صرف ایک دو گھڑی کی ملاقات ہے، تاکہ اس سے جی ٹھہر سکے۔

مومن نے جب یہ مژدۂ جاں فزا سنا تو یوں معلوم ہوا جیسے گھر میں عید آگئی۔ جامے میں پھولے نہیں سمائے۔ سر کو پاؤں پر دھر دیا۔ اس کے صدقے ہوئے۔ گلے لگے — لیکن بالآخر یہ وقت بھی گزر گیا۔ رخصت ہو کر گھر واپس آئے اور پھر وہی در د مجبوری کا سامنا کرنا پڑا۔ شب وعدہ کا انتظار کرنے لگے۔ جب وہ رات آئی تو ڈرتے ڈرتے جائے ملاقات کی طرف روانہ ہوئے۔ وصل کا لمحہ آیا، اور کئی راتیں اسی طرح گزریں۔ مدتوں یہ سلسلہ جاری رہا لیکن خوبی قسمت کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔

ایک شب کہ بہت ہی خوبصورت چاندنی رات تھی، مومن کے دل میں محبوبہ کے پاس جانے کا خیال پیدا ہوا۔ یہ بات خطرے سے خالی نہیں تھی لیکن چاندنی رات نے کچھ ایسا سماں باندھا تھا کہ مومن کے دل میں یہ خواہش انگڑائیاں سی لینے لگی اور وہ فرطِ شوق سے مجبور ہو کر محبوبہ سے ملنے کے لئے چل دیئے۔ اس اندیشے کے باوجود کہ چاندنی رات میں کسی نہ کسی کی نظر ضرور پڑ جائے گی۔ لیکن اس کے فسوں نے مجبور کر دیا۔ چاندنی رات بھی بس قیامت تھی ؎

ایک شب جوشِ انبساط و سرور　　ساغرِ مے لبالب مے نور
ظلمتِ شب بیاضِ روزِ سپید　　قمر و کاسہ لیسیٔ خورشید
ہر ہر اختر جوابِ ماہ وشاں　　خرمنِ برق خط کاہکشاں
شرم اُس شب سے شمع طور کرے　　لیلۃ القدر اخذِ نور کرے
جلوۂ ماہتاب نور فشاں　　پردۂ سایہ ہم قماشِ کتاں
ذرہ ذرہ غبارِ نورانی　　صبحِ محشر کی سی درخشانی
چوں دلِ صاف کاشفِ اسرار　　ہم فروغِ ضمیرِ شب بیدار
روشنی سے نظر کو پائے نظر　　نگہ چشمِ مور آئے نظر
عالم آئینۂ تجلیٔ ذات　　جنبشِ عرش گردشِ اوقات
زیرِ خاک آسماں دِکھائی دے　　بے نشاں کا نشاں دکھائی دے

ایسی حسین اور دل آویز چاندنی رات میں بھلا کوئی کیسے اپنے شوق و اشتیاق پر احتساب کرسکتا ہے۔ مومن سے بھی ضبط نہ ہوسکا اور وہ اُس سے ملنے کے لئے وہاں پہنچ ہی گئے۔ لیکن وہ ان کو اس عالم میں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئی اور اس پر گھبراہٹ کا عالم طاری ہو گیا ؎

دیکھتے ہی مجھے وہ گھبرائی　　پاس گم کردہ ہوش و صبر آئی
لگی کہنے غضب کیا تو نے　　مجھ کو رسوا پھر اب کیا تو نے
چھوڑ دے ہاتھ کیا پکڑتا ہے　　جا ابھی کوئی آ پکڑتا ہے
دور تجھ کو نہیں ہے پاسِ حیا　　شرم آتی نہیں یہ ننگ گیا

مومن نے منت سماجت کی اور یوں گویا ہوئے ؎

میں نے منّت سے التماس کیا　　کہ محبت نے بے حواس کیا
کیا کروں دل پہ اختیار نہیں　　جان کو تیرے بن قرار نہیں

وہ اس بے قراری کو دیکھ کے ٹھہر گئی۔ اس طرح وصل کا سامان پیدا ہوا، لیکن وہ جلد ہی رخصت ہو گئی ؎

تھم گئی ہائے اضطراب کو دیکھ
ٹھہری یک لحظہ پیچ و تاب کو دیکھ

دل مرے وصل سے خراب ہوا
پھر یہ ناکام کامیاب ہوا

اُٹھ گئی لیک جلد وہ خود کام
میں ہوس کا رہ گیا دل تھام

اسی عالم میں مومنؔ وہاں سے رخصت ہوئے۔ صحن میں سے گزر رہے تھے کہ ایک پیرزن کی نگاہ اُن پر پڑی۔ وہ دیکھ کر کہنے لگی کہ یہ نوجوان کیسے شریر ہیں۔ ہر رات رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ صبح ان کو مزا چکھا دوں گی۔ یہ سن کر اُن کے کان کھڑے ہوئے گھر واپس گئے مگر دل دھڑکتا رہا یہی سوچتے رہے کہ قیامت آنے والی ہے۔ لیکن خیر کچھ زیادہ ہنگامہ نہ ہوا — پھر بھی اُن کے دل میں خلش ضرور باقی رہی۔ اس لئے یہ سوچا کہ یہ سارا ماجرا اُس شمع شعلہ عذار کو بھی سنا دیا جائے چنانچہ ہمت کر کے سر شام اُس کے پاس پہنچے۔ وہ دیکھ کر آگ بگولا ہو گئی ؎

سو سر شام اُدھر ہوا جو گزار
ملی تنہا وہ شمع شعلہ عذار

چشم نم سے پڑی نظر مجھ کو
ہو گئی آگ دیکھ کر مجھ کو

لگی کہنے کہ جل ہوا کھا بس
جی بھرا آئے ہے چلا جا بس

پاس اپنے بٹھانے سے تیرے
کھڑے ہوتے ہیں رونگٹے میرے

چاہئے دل کے بدلے لاگ لگے
جل گئی جان تجھ کو آگ لگے

واہ کیا خوب آشنائی کی
سخت بے گانگی بُرائی کی

موردِ طعن شیخ و شاب کیا
ساتھ اپنے مجھے خراب کیا

تجھ سے اب دل لگائے وہ ناکام
جس کو ہونا ہو خلق میں بدنام

کیوں نہ دل میں مرے کدورت آئے
کیا کیا یہ تو خاک میں مل جائے

ڈھونڈ لے اور کوئی مہ رو اب
ہاتھ اُٹھا میرے ملنے سے تو اب

غرض وہ بہت بگڑی اور اگرچہ اُنھوں نے بڑی منت خوشامد کی لیکن وہ کسی طرح مہربان ہونے کے لئے تیار نہ ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ محبوب کی اس بے اعتنائی نے ہجر و فراق سے دوچار کر دیا اور اس ہجر و فراق کے عالم میں پورے دو سال گزر گئے۔

دو سال کے بعد تجدیدِ ملاقات کی نوبت پھر آئی۔ اتفاق یہ ہوا کہ ایک دن وہ مجموعہ

اپنے کوٹھے پر تنہا بسر کر رہی تھی۔ مومن نے جب یہ منظر دیکھا تو فوراً اُس کے پاس جا پہنچے دوڑ کر گلے لگ گئے۔ اُس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کی، لیکن اُسے کامیابی نہ ہو سکی۔ ناچار اُس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ چنانچہ مومن کو ایک بار پھر کھل کھیلنے، دادِ عیش دینے اور دل کھول کر مزے اُٹھانے کا موقع ملا ؎

اپنے کوٹھے پہ ایک دن تنہا | پھر رہی تھی وہ آفتاب لقا
اسی دم میں بھی ناگہاں پہنچا | داد کو میری آسماں پہنچا
دوڑ کر لگ گیا گلے سے بس | زور کرتے ہیں جس طرح بے بس
وہ بہت آپ کو چھڑایا کی | تھی مری جان تلملایا کی
صید آخر ہوئی وہ نازک دوش | حلقۂ دام تھا نہ تھی آغوش
کر گئی بارے دل میں تاثیر آہ | تھے مجرب فسونِ تسخیر آہ
کیا کہوں اشک چشمِ نم کا جوش | ہو گئی آتشِ غضب خاموش
ہو گئے دل سے دور کینِ عناد | مل گئی بارے جو تھی اپنی مُراد
پھر وصل سے ہوئے بے ہوش | بن گیا گھر دکانِ بادہ فروش
اُس کی دل بستگی کے ہائے مزے | خوب دل کھول کر اُٹھائے مزے

اور کچھ عرصے یہ سلسلہ پھر جاری رہا لیکن چرخ تفرقہ انداز کو یہ معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ وہ گھڑی آ گئی جب وہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

ایک پیر زال اس جُدائی کا سبب بنی۔ اُس نے مومن سے خواہ مخواہ بیر باندھ لیا۔ یوں تو وہ اُن کی محرم راز تھی اور نامہ و پیغام لے جاتی تھی۔ ایک دن وہ بُلانے کے لئے آئی۔ مومن اُس وقت دیوان خانے میں فکرِ سخن کر رہے تھے، دروازہ بند تھا، اُس نے آواز دی۔ پیام پہنچایا مومن نے جواب دیا کہ ٹھہر کے آؤں گا۔ اس پر وہ بگڑ گئی، منہ بنائے ہوئے واپس چلی گئی، اور محبوبہ سے جا کے یہ کہا ؎

تو ہے اُن کے لئے حزیں و ملول | وہ ہیں عیش و نشاط میں مشغول
اب وہ کھل کھیلے کب ہیں تجھ پہ پسند | دیکھ کر مجھ کو کر لیا در بند

رخنۂ در سے میں نے جب جھانکا — اور عالم نظر پڑا واں کا
اک پری وش نہ تجھ سی غیرتِ حور — پاس بیٹھی تھی اُن کے اب سے دور
میری آواز سن نہ آئے نکل — وہیں سے بولے آؤں گا تو چل

ظاہر ہے کہ یہ باتیں صریحاً غلط تھیں لیکن غلط باتوں کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ آپس میں کشیدگی پیدا ہو جائے اور دونوں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ وہ یہ سُن کر سخت برہم ہوئی، طیش آگیا۔ آتش رشک بھڑکنے لگی، التفات ختم ہو گیا۔ ان کی آنکھوں سے تو اُدھر اشک جاری رہے لیکن وہ ذرا بھی نہ پسیجی۔ ناراض ہونے کا سبب پوچھا، کوئی جواب نہ ملا۔ بس ایک خاموشی مسلط رہی۔ رشک باعثِ کدورت بنا اور پھر صفائی کی کوئی صورت نہ نکل سکی۔

مومنؔ نے بھی اُس سے انتقام لینے کا تہیّہ کیا اور جی میں کسی اور سے ملنے کی ٹھانی لیکن پھر پریشانیوں سے تنگ آکر اُلفت مجازی کو خیر باد کہہ دیا۔ بتوں کے نام کو آگ لگا دی اور سترہ برس کے سن میں اس نتیجے پر پہنچے کہ عورت کے ساتھ رشتہ قائم کرنا لایعنی بات ہے۔ کیونکہ وہ سچی نہیں ہوتی، اُس کی فطرت میں مکّاری ہے اور فریب دینا تو اُس کی گھٹی میں پڑا ہے ؎

رشک جب باعثِ کدورت ہو — پھر صفائی کی خاک صورت ہو
اُس کو پروا نہیں میں مرتا ہوں — چندے اور انتظار کرتا ہوں
بن ملے انتقام لوں گا میں — ہیچ کسی اور سے ملوں گا میں
لُطف پیرِ فلک نے کیوں نہ کیے — عمر کیا تھی کہ ایسے داغ دیئے
کیسی کیسی سیہ شبیں آئیں — ایسی ایسی بلائیں دکھلائیں
دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن — ہے ابھی سترہ برس کا سن
مومنؔ آ تو بھی اپنے نام پہ جا — نام کو ان بتوں کے آگ لگا
چھوڑ بس اُلفتِ مجازی کو — کر سلام ایسی عشق بازی کو
کب تلک حسرتِ وصال اناث — کیا نہیں جانتا تو حال اناث
رنج و اندوہِ بے نہایت کیوں — حیلہ اندیشوں کی شکایت کیوں

کسی نے کی ہے یا نہیں تعلیم
آیت اِنَّ کیدکُنَّ عظیم

ظاہر ہے کہ مومن نے کھُل کھیلنے کے جس انداز کو اپنا نصب العین بنا لیا تھا اور اُس کو سامنے رکھ کر عیش کوشی میں جس طرح دن گزار رہے تھے اُس کا ردِّ عمل انھیں خیالات کی صورت میں رونما ہو سکتا تھا

یہ تفصیل اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ مومن کی مثنوی شکایت ستم، کا موضوع کوئی خاص کہانی نہیں ہے۔ اس کا موضوع تو چند سچے واقعات ہیں۔ جن کو مومن نے آپ بیتی کے رنگ میں پیش کیا ہے۔ اسی لئے اس میں حقیقت و واقعیت کا رنگ بہت گہرا نظر آتا ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ واقعات آنکھوں کے سامنے ظہور پذیر ہو رہے ہیں اور کاروبار شوق کا یہ کھیل کھُلے خزانے کھیلا جا رہا ہے۔ مومن نے کوئی بات چھپائی نہیں ہے۔ ہر چیز کو عالم آشکارا کر دیا ہے اور اس سلسلے میں بڑی بے باکی دکھائی ہے۔ حد درجہ نڈر اور صاف گو ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اسی صاف گوئی اور بے باکی نے اس میں زندگی کی لہر دوڑائی ہے۔ وصال و فراق کے نشیب و فراز کو اس مثنوی میں ذاتی اور انفرادی تجربات کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ احساس کی شدت اور جذبے کی اخلاص مندی ان تجربات کی بنیاد ہے۔ اسی لئے ان میں جگہ ایک ڈرامائی شان بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ڈرامائی شان ہی نے اس مثنوی کو دلچسپ بنایا ہے اور کہانی کے نشیب و فراز اور مدّ و جزر کی بڑی حد تک تلافی کر دی ہے۔ اس کے موضوع میں رفعت اور ترفع کے عناصر نہیں ہیں — کیونکہ عشق کی سپردگی اور رفتادگی کو اس میں پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ تو عنفوان شباب کی جذباتی ہیجان انگیزی کا ایک دل آویز مرقع ہے۔ خود لکھنے والے کو اس سلسلے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ اسی لئے اس نے اکثر مقامات پر اپنے عشق کو ہوس اور ہوس کاری سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک نوجوان کی داستانِ ہوس ہے لیکن بڑی ہی لذیذ اور دل آویز ہے۔ ابتذال اس میں کہیں بھی پیدا نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے ایک رنگینی اور رعنائی کی فضا شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں وصل و فراق کی دھوپ چھاؤں آنکھ مچولی کھیلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اور اس صورت حال نے اس میں انسانی زندگی کا مخصوص رنگ و آہنگ پیدا کر دیا ہے۔ کیونکہ زندگی صرف رنگینیوں ہی سے عبارت نہیں ہے۔ اس میں ہجر و فراق کی غم انگیزی کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ مومن نے اس ماحول کو پیش کر کے اس مثنوی میں اپنے آس پاس اور گرد و پیش کے معاشرتی ماحول کی صحیح مصوری کی ہے۔ عیش و عشرت کا خیال اس

معاشرے میں نمایاں حیثیت رکھتا تھا ـــ مومن نے اسی خیال کو اس مثنوی میں اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔ عورت کی حیثیت اس معاشرے میں مجلسی تھی۔ اُس کی زندگی کا مقصد دادِ عیش دینا تھا اسی لئے اس کے کردار میں بہت بلندی باقی نہیں رہی تھی۔ مومن نے اسی وجہ سے اُس کی ذات کو مکر و فریب کا ایک مجسمہ سمجھا ہے اور جو واقعات بیان کئے ہیں۔ اُن سب کی تان اسی خیال پر جا کر ٹوٹی ہے۔ ایک متوازن معاشرے میں شاید یہ بات صحیح نہ ہو لیکن جس غیر متوازن معاشرے میں مومن زندگی بسر کر رہے تھے، اُس میں یہ سب کچھ ممکن تھا۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو مومن کا یہ خیال حقیقت نظر آتا ہے۔ اسی خیال نے اس مثنوی میں ایک مربوط کیفیت اور ایک ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ فنی اعتبار سے یہ ایک بلند مثنوی نہ سہی لیکن اس میں شاعرانہ حُسن کے بعض بہت ہی اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اس میں منظر نگاری ہے، واقعہ نگاری ہے، محاکات ہے، مُصوری ہے، بیان کا حسن ہے، آہنگ کی نغمگی ہے، روانی کا ترنم ہے اور ان سب نے مل کر اُس کو ایک نہایت ہی دلکش اور دل آویز نظم کی صورت دے دی ہے۔

(۳)

مومن نے اپنی دوسری مثنوی کو "قصۂ غم" کا نام دیا ہے۔ اور اس میں بھی ایک قصے کے پیرائے میں عشق و ہوس کے بعض واقعات بیان کئے ہیں۔ اس مثنوی کا آغاز بھی شراب گلگوں کی طلب سے ہوتا ہے۔ مومن ساقی کے سامنے جامِ شراب کی آرزو کرتے ہیں کیونکہ موسم کی دل کشی اس کا تقاضا کرتی ہے اور مناظر کا حُسن اس کی ترغیب دیتا ہے ؎

ہیں جلوۂ نوبہار کے دِن — بدمستیٔ بادہ خوار کے دِن
تزئینِ سمن کے ہیں یہ ایام — گُل گشتِ چمن کے ہیں یہ ایام
کیا رنگِ چمن بہار پر ہے — عالم گل و لالہ زار پر ہے
آیا ہے نظر جو سروِ بُستان — شمشاد کھڑا ہے سخت حیران
اور دیکھ کے جلوہ ہائے شمشاد — پابندِ طرب ہے سروِ آزاد
ہے وجد فزا نوائے بلبل — قربانِ ترانہ ہائے بلبل
دل کش ہے غضب صدائے قمری — کیا چیز ہے ہائے ہائے قمری

باندھے ہے ہوا نسیم کتنی ۔۔۔ ہے روح فزا نسیم کتنی
کیا کیا ہی مچا رہا ہے دھوم ابر ۔۔۔ آتا ہے مُدام جھوم جھوم ابر
چل سوئے چمن بہار دیکھیں ۔۔۔ سیرِ گُل و لالہ زار دیکھیں
بیٹھیں لب آب جو یہ یک دم ۔۔۔ پی جائیں سبو سبو پہ یک دم

کہ جانِ غمگیں کو اسی طرح مسرور بن سکتا ہے۔ اضطراب کی کیفیت کم ہو سکتی ہے، اور غم عشق نے جن گلفتوں سے دوچار کر رکھا ہے اُن کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ موسم کے اثر سے یہ کیفیت کچھ زیادہ ہی شدید ہو جاتی ہے ؎

گھِر آتے ہیں جب سیاہ بادل ۔۔۔ اور پڑتے ہیں بس بنگاہ بادل
اُمڈے ہے وہیں سحاب گریہ ۔۔۔ پہنچے ہے فلک تک آب گریہ
چلتی ہے جو بادِ نو بہاری ۔۔۔ دم بھرتی ہے جی کا بے قراری
جب دیکھے ہے سبزہ لہلہاتا ۔۔۔ کیا کیا ہی یہ جی ہے تلملاتا
لالہ کا خیال آئے ہے گر ۔۔۔ پڑ جاتے ہیں تازہ داغ دل پر
گُل برگ کہیں جو دیکھ پایا ۔۔۔ خوں نابِ دل آنکھ نے بہایا

اور اس کا سبب یہ ہے کہ عشق میں محبوب جفا پیشہ دلوں پر چرکے لگاتے ہیں۔ رقیبوں سے ساز باز اُن کا مزاج ہے۔ عاشق کو وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ اوروں کی محفلوں میں تو نغمے چھیڑتے ہیں لیکن عاشق کی طرف اُن کی توجہ نہیں ہوتی۔ غیروں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں اور عاشق ایک عالمِ کرب میں ہجر و فراق کی راتیں کاٹتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق چیز ہی ایسی ہے۔ یہ تو مستقل طور پر رنج جاودانی کا سامان فراہم کرتا ہے۔ اس سے نجات ممکن نہیں۔ اسی خیال کو حقیقت ثابت کرنے کے لئے مومنؔ ایک قصہ سناتے ہیں اور یہ قصہ اس طرح شروع ہوتا ہے۔

کسی شہر میں ایک نوجوان تھا۔ عشاق میں اس کی بڑی شہرت تھی۔ ہر طرف اس کے عشق کے چرچے تھے۔ نام تو اس کا مومنؔ تھا لیکن دین سے اُسے کوئی رغبت نہ تھی۔ بتوں کی پرستش اس کا ایمان تھا، آوارگی، ہرزہ گردی اور بدنامی اس کی قسمت میں لکھی تھی۔ دین و دنیا

سے اُسے کوئی سروکار نہیں تھا بس ہمیشہ بتانِ نازنیں سے ربط رکھتا اور عیش و عشرت میں وقت گزارتا دن اُس کے لئے عید اور رات شب برات تھی۔ شراب جوانی سے مدہوش اور نشاط و شادمانی سے سرشار رہتا۔ رنج و غم کی اُس نے کبھی صورت تک نہیں دیکھی تھی۔ شعر و شاعری کا شوق تھا۔ بذلہ سنجی اُس کے مزاج میں داخل تھی۔ اُس کی بات بات میں لطیفہ تھا۔ خوش باشی اُس کی قسمت میں لکھی تھی۔ زندگی سے جی بھر کے رس نچوڑنا اُس کے معمولات میں داخل تھا ؎

ربط اُس کو بتانِ نازنیں سے ۔۔۔ دُنیا سے نہ کام کچھ نہ دیں سے
آشفتہ کاکلِ پریشاں ۔۔۔ انداز پرست کفر کیشاں
خوں نابہ فشاں کبھو نہ دیکھا ۔۔۔ ہر سو نگراں کبھو نہ دیکھا
وقفِ غم و دردِ گہ نہ پایا ۔۔۔ گرمِ دمِ سرد گہ نہ پایا
مدہوشِ شرابِ نوجوانی ۔۔۔ سرشارِ نشاط و شادمانی
آرام و طرب میں صرفِ اوقات ۔۔۔ مشغول سرور و عیش دن رات
ہر دم اُسے شاد شاد دیکھا ۔۔۔ سرمستِ مئے مراد دیکھا
وہ طبع کبھی غمیں نہ دیکھی ۔۔۔ بھولے سے جبیں پہ چیں نہ دیکھی
جوں غنچہ سدا کھلے ہی جانا ۔۔۔ ہر وقت ہر آن مُسکرانا
جوں شیشۂ سبز و قلقلِ مے ۔۔۔ صد خندہ و قہقہہ پیاپے
دیوانوں سے شوق بے نہایت ۔۔۔ اشعار کا ذوق بے نہایت
تصحیحِ سخن پہ طبع مائل ۔۔۔ علمِ شعرا میں فرد کامل
بے بذلہ سنی نہ بات کوئی ۔۔۔ ختم اُس پہ ہوئی لطیفہ گوئی
مل چلنے کی ہر کسو سے تھی خو ۔۔۔ تھا یار ہر غرض جہاں میں تھا جو
ہر پیر و جواں سے آشنائی ۔۔۔ سارے ہی جہاں سے آشنائی

غرض اس نوجوان میں بڑی خوبیاں تھیں۔ اُس نے کبھی بُرے دن نہیں دیکھے تھے۔ وہ کبھی ناسازگار حالات سے دوچار نہیں ہوا تھا خطرناک موڑ اُس کی زندگی میں نہیں آئے تھے اور اس

لحاظ سے اُس کی زندگی قابلِ رشک تھی

اتفاق ایسا ہوا کہ اچانک اس نوجوان کی ایک رشک پری سے آنکھ لڑ گئی لیکن وہ محبوب ستم پیشہ اور وفا نا آشنا تھا۔ اخلاص مندی تو اُسے چھو بھی نہیں گئی تھی۔ بات بات پر فریب دینا اُس کے مزاج میں داخل تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نوجوان کی زندگی ایک زبردست طوفان سے آشنا ہوئی، اور اس طوفان نے اسے کہیں کا نہ رکھا ؎

آنکھ آفتِ جان سے لڑائی — اک ترچھی نگاہ کی برچھی کھائی
اک بت کا ہوا وہ آشنا یوں — مومن سے بنا برہمن افسوس
کی دوستی ایسے بے وفا سے — بے گانہ رہے جو آشنا سے
یار اپنے ہی گوں کے ایک عیار — حیالہ دول فریب و مکار
باتوں سے تو ٹپکے کیا محبت — اور دل میں نہ ہو ذرا محبت
دیکھی جو اُدھر سے یوں لگاوٹ — سمجھا نہ کہ سب یہ ہے بناوٹ
اُلفت ہے کہاں کہاں ہے یاری — باتیں یہ فریب کی ہیں ساری

غرض وہ اس فریب کاری میں مبتلا ہو گیا اور اُس نے بُری طرح دھوکا کھایا۔ اُس نے سوچا تو یہ تھا کہ یہ عشقیہ زندگی پھولوں کی سیج ہے لیکن وہ تو کانٹوں کا بستر نکلا۔ یہی خیال کر کے اُس نے نہ جانے کتنی حسین دُنیا ئیں بسائی تھیں اور ان میں خواہشوں اور آرزوؤں کے بڑے ہی خوبصورت رنگ محل تعمیر کیے تھے لیکن وہ سب خواب و خیال میں تبدیل ہو گئے۔

یہ محبت کا واقعہ اس نوجوان کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب بن کر رونما ہوا۔ اُس نے ہوش و حواس کھو دیئے، دیوانگی طاری ہو گئی۔ ہر وقت محبوب کا خیال رہنے لگا۔ اس کے کوچے کے چکر لگانے شروع کر دیئے اور دیکھتے دیکھتے دُنیا سے کنارہ کش ہو گیا۔ دوستوں سے میل ملاقات ترک کر دی۔ احباب اُس کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ کہیں نظر نہ آیا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اُس سے ملنے کو ترس گئے۔ اس داستان کا راوی بھی اُس کے احباب میں شامل تھا، اُس نے بھی کونہ کونہ چھان مارا لیکن اُس کی کوئی خیر خبر نہ ملی۔

ایک روز ایسا ہوا کہ بادل گھِر کر آئے، ٹوٹ کر مینہ برسا۔ موسم پر جوانی آگئی۔ اس

پُرکیف منظر میں اس دوست کے دل میں سیرِ دشت اور گل گشتِ چمن کا خیال پیدا ہوا ؎

ابر و گل و سبزہ سب طرب ریز | افلاک و زمیں سرور انگیز
بس دیکھ کے اُس گھڑی کا عالم | اپنے نہ تھے اختیار میں ہم
کھینچا ہے ہوا نے دامنِ دل | بھڑکی تپِ شوقِ گلخنِ دل
جی چاہا کہ سیرِ دشت کیجیے | ہے ابر شرابِ ناب پیجیے
دِل میں اپنے جائے صحرا | زنجیر بنی ہوائے صحرا
آخر ہوئے مضطرب شتاباں | لے ہی گئی اُلفتِ بیاباں
دیکھیں تو کچھ اور ہی ہے عالم | صحرا بھی نہیں بہشت سے کم
رُخسارِ زمیں پہ سبزہ ہر سو | ریحانِ خطِ عذارِ گل رو
از بس کہ ہے سبزہ جلوہ آرا | ہے خاک طلسمِ چرخِ خضرا

وہ اس منظر سے لطف ہونے کے لئے نکلا تھا لیکن یہاں اس کو وہ نوجوان یاد آگیا، اور اُس کی یاد کے ساتھ ہی اُس کی پریشاں حالیوں کی تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہی دلکش مناظر جو دل کو اُبھار رہے تھے، جی جلانے لگے ؎

وہ سبزہ کہ باعثِ طرب تھا | وہ گل کہ نشاط کا سبب تھا
وہ ہی مرے حق میں سم ہوا پھر | وہ ہی سببِ الم ہوا پھر
تھی برق جو موجبِ تبسم | اور موجۂ ابر کا تلاطم
ہے ہے پھر اُسی نے جی جلایا | ہے ہے پھر اسی نے خوں رُلایا
طغیانِ سرشکِ چشمِ گریاں | غارت گرِ خانماں تھا طوفاں
نالیدنِ رعد آہ و زاری | آتش دہ برقِ بے قراری
تھے ہم جو گئے پئے تماشا | سو آپ ہی بن گئے تماشا

غرض اس عالم میں وہ شخص جنگل کی سیر کر رہا تھا کہ اس کو وہ عاشق نوجوان نظر آیا جس کے ساتھ کبھی اُس کی دوستی تھی اور جو دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرکے روپوش ہوگیا تھا۔ اس جنگل میں اُس نے پناہ لی تھی۔

یہ جانشینِ مجنوں حد درجہ خراب وخستہ حالت میں وہاں مارا مارا پھر رہا تھا۔ چہرے سے حزن وملال کے آثار نمایاں تھے۔ ایک ایک انداز سے پریشانی ٹپکتی تھی ؎

لٹکے ہوئے سر کے بال اُس کے | تھے ضعف سے کیا وبال اُس کے
کرتے تھے بیاں وہ خم بہ خم بال | سب جان کے پیچ وتاب کا حال
وہ موئے سیہ شبِ جُدائی | ہاں ہجر کی رات سر پہ آئی
وہ بال کہ زیب بخش سر تھے | آلودۂ خاک اس قدر تھے
بس یک سرِ مو کو جھاڑیئے گر | پیدا ہو وہیں زمینِ دیگر
سر پر گلِ داغ یوں نمودار | جوں لالہ ہو زیب بخش دستار
سب حال جبیں کی چیں سے ظاہر | قسمت کا لکھا جبیں سے ظاہر
حیران سا چہرہ آئینہ وار | منہ زرد و برنگ زعفران زار
دو دو دل ومتہم بہ گیسو | ناخن کی خراش ونام ابرو
آنکھیں سبب سرشکِ گلگوں | جوں جام سرِ شہید پر خوں
مژگاں موئے سرِ شہیداں | یا خار کہ دل میں تھے وہ پنہاں
اب آنکھوں میں اشک جو بھر آئے | وہ گریہ کے ساتھ باہر آئے

اور اس عالم میں زبانِ حال سے وہ اپنی داستان غم سُنا رہا تھا۔

اس داستان میں درد وغم اور الفتِ صنم کی باتیں تھیں۔ ایامِ گذشتہ کا بیان اور محبتِ بتاں کا ذکر تھا۔ اُس کی گفتگو سُن کر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے محبوب اُس کے سامنے ہے اور وہ اُس سے گرم گفتار ہے۔ کبھی اُس کی تعریفیں کرتا ہے۔ کبھی محبت کے ابتدائی زمانے کے حالات بیان کرتا ہے۔ کبھی وصل کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ کبھی ہجر کی کیفیت کا نقشہ کھینچتا ہے۔ کبھی اُس کی بے نیازی اور ستم گری کے گلے شکوے کرتا ہے اور آخر میں اپنی ناکامی کا رونا روتا ہے۔ اور اس طرح اس گفتگو سے اُس کی عشقیہ زندگی کے نشیب وفراز کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے ؎

سب سے پہلے تو اس گفتگو میں وہ محبوب کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؎

اے جلوۂ برق خانماں سوز | اے شعلۂ آتش جہاں سوز

اے طعنہ زنِ فسوں نگاہاں — اے موجدِ قتلِ بے گُناہاں
اے غارتِ جان وجانِ مومن — اے آفتِ خانمانِ مومن
اے دلربا و دل رُبائے دلدار — اے کافرِ بے وفائے عیّار
اے محرمِ و محرمِ تمنّا — اے ہمدم و ہمدمِ مسیحا
اے مہرِ عروج کج ادائی — اے ماہ بروج بے وفائی
اے نقش ونگارِ مسکنِ حُسن — اے تازہ بہارِ گلشنِ حسن
اے نورِ سِ بوستانِ خوبی — تجھ پر سے نثار جانِ خوبی
اے جادوئے پُرفن وفسوں ساز — بازی دہِ عاشقانِ جاں باز

اس کے بعد اُس کی ستم کشی بیان کرتا ہے ؎

کب تک یہ ستم کے طورِ ظالم — کب تک یہ جفا و جورِ ظالم
کیوں بھاتے ہیں اتنے جور تجھ کو — آتا نہیں کیا کچھ اور تجھ کو
کیوں رنج پسند غم کشوں کا — کیا یہ ہی ہنر ہے مہوشوں کا
یا ہے ترے زعم میں وفا عیب — ہے بھی تو نہیں ہوا اِس میں کیا عیب
کیا تو ہی جہاں میں مہ جبیں ہے — آخر کوئی اور بھی حسیں ہے
ہیں اور بھی لوگ واقفِ ناز — اوروں میں بھی ہیں ترے سے انداز
رکھتے ہیں جہاں میں اور بھی آن — اوروں پہ بھی لوگ دیتے ہیں جان
تم سا نہیں کوئی شوخ جلّاد — کرتا نہیں کوئی ایسی بیداد
یہ تم نے نئی طرح نکالی — معشوقی ہے آپ کی نرالی
ہر ناز و ادا ستمگری ہے — عاشق کشی آہ دلبری ہے

اور پھر یہ واضح کیا ہے کہ اُس کی ستمگری ہمیشہ سے تو ایسی نہیں تھی۔ ایک زمانہ وہ تھا جب الطاف کے دریا بہتے تھے اور دلداری اور دل دہی کی کوئی انتہا نہیں تھی ؎

یہ ظلم تھے کب کہاں ستم تھے — کیا کیا مرے حال پہ کرم تھے
تھی حد سے زیادہ مہربانی — اظہارِ محبت نہانی

مجھ بن نہ کبھی طعام کھانا　　ہمراہ ہی بس مدام کھانا
ہر رات کو میرے ساتھ سونا　　اک لحظہ کبھی جدا نہ ہونا
سم تھا تمھیں مے کا جام مجھ بن　　مے جانتے تھے حرام مجھ بن
تھے لطف و کرم ہی ہمیشہ　　دلداری و دلدہی ہمیشہ
بس دیکھ کے مسکرا ہی دینا　　الفت کو جتا کے جی ہی لینا
دُزدیدہ کبھی نگاہ کرتے　　دل میں اسی طرح راہ کرتے
وہ بن مرے بے قرار ہونا　　وہ بن مرے زار زار رونا

نہ صرف یہ بلکہ رات دن کچھ ایسی صحبت رہتی تھی ؎

پہروں ہی گلے سے لپٹے رہنا　　یہ رنج نزاکتوں پہ سہنا
لب سے مرے لب ملائے رکھنا　　بازو سے وہ سر اٹھائے رکھنا
وہ سینے پہ لیٹ کے ستانا　　مطلب کے سخن پہ روٹھ جانا
وہ صلح ادھر ادھر لڑائی　　وو ہیں خفگی وہیں صفائی
وہ منہ میں زباں کی لذتیں ہائے　　ظاہر حرکت سے رغبتیں ہائے
اپنا جو ہوا کچھ اور ارادہ　　جی چاہا کچھ اس سے بھی زیادہ
پھر کیا ہی ادا سے کج ادائی　　کس ناز سے کرنا ہاتھا پائی

اور شوخی و دلبری نے چھیڑ چھاڑ کا یہ ماحول پیدا کر دیا تھا ؎

ہے یاد وہ دوستی کا عالم　　وہ شوخیٔ و دلبری کا عالم
کس لطف سے چھیڑتی ستاتی　　گدگدیوں سے خوب سا ہنساتی
ہو جاتا میں ہنستے ہنستے بیدم　　آتیں مجھے ہچکیاں بھی پیہم
کہتی کسی نے تمھیں کیا یاد　　آتی نہیں ہچکیاں سوا یاد
ہاں کس نے کیا ہے یاد بولو　　ہے کون تم اس کا نام تو لو
لاتا گل و عطر میں کبھی گر　　فرماتی یہ مجھ سے مسکرا کر
یہ گل تو عمل کیا ہوا ہے　　یہ عطر فسوں کیا ہوا ہے

یہ سونگھوں نہ میں، نہ یہ لگاؤں ممکن نہیں تیرے دم میں آؤں

اور پھر اس چھیڑ چھاڑ کی تان یہاں جا کر ٹوٹتی تھی ؎

ہے یاد وہ عالمِ ملاقات ہے یاد وہ شوخیٔ اشارات
مَیلان جو ہوا معاشرت کا دھیان آ ہی گیا مباشرت کا
بس خواہش دل سے رہ نہ سکنا اور پاس حیا سے کہہ نہ سکنا
پھر کیا ہی شرارتوں سے کہنا پردے میں اشارتوں سے کہنا
انگڑائی کبھی تو ہنس کے لینی چلمن کبھی اُٹھ کے چھوڑ دینی

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں خواب و خیال ہو گئیں۔ ہجر و فراق نے گھیرے ڈال دیے۔ اور اس عالم میں زندگی اُس کے لئے وبال جان بن گئی۔ وہ اس پر کڑھتا ہے اور اس پریشانی سے باہر نکلنے کی خواہش اُس کے یہاں بیدار ہوتی ہے۔ وہ وصل سے پھر کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ کیونکہ اب اُس میں ہجر کے صدموں کو برداشت کرنے کی سکت باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن اُس کے جوشِ جنوں کا وہی عالم ہے۔ وہ اس کے اثر سے نہ جانے کیا کیا کچھ بکتا رہتا ہے۔ اس کو اپنا ہوش نہیں ہے لیکن عالمِ بے ہوشی میں بھی انا الصنم اُس کے وردِ زبان رہتا ہے۔

اس طرح یہ مثنوی ان اشعار پر ختم ہو جاتی ہے ؎

بس مومنؔ دل گداز خاموش اب طاق ہوئی ہے طاقت ہوش
باقی نہیں اب تو ہم میں حالت ہے اور ہی درد و غم میں حالت
جاری ہے ہر ایک چشم سے خوں تھے شعر کہ نالہ ہائے موزوں
اس قصۂ غم نے جی کھپایا اس سوزِ نہاں نے جی جلایا
کر ڈالا کباب سامعیں کو آگے نہیں تاب سامعیں کو
ہر حرف ترا شرر فشاں ہے ہے آگ کا شعلہ یا زباں ہے

زیں بیش ز سوزِ سینہ مخروش
چوں شمع خموش باش خاموش

یہ مثنوی ایک سیدھی سادی سی نظم ہے۔ اس میں کوئی خاص قصہ نہیں ہے۔ اس کی عمارت تو صرف ایک معمولی واقعے کے سہارے کھڑی ہے۔ یہ واقعہ صرف ایک شخص کی محبت سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محبت اُس پر یہ اثر کرتی ہے کہ وہ جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہے اور اپنی عشقیہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اس انداز میں پیش کرتا ہے کہ اُس کے بیان میں کہیں کہیں قصے کی سی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس میں وہ بات نہیں جو ایک کہانی میں ہونی چاہیے۔ اس کی دلچسپی کہانی میں نہیں، بلکہ ایک کردار کی زندگی کے نشیب و فراز کی ترجمانی اور مختلف عشقیہ معاملات کی عکاسی میں ہے۔ وصل اور ہجر دونوں پہلوؤں کو اس مثنوی میں بڑی تفصیل و جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس سے اُس زمانے کی جذباتی زندگی کی صحیح تصویر سامنے آتی ہے۔ اس تصویر میں اس مخصوص معاشرت کا رنگ بہت گہرا ہے جس کے سایے میں اس زمانے کے افراد زندگی بسر کر رہے تھے اور جس کا رنگ خود اُن کے مزاجوں میں رچا ہوا تھا۔ مومن نے یہاں گہرے نفسیاتی اور سماجی شعور کا اظہار کیا ہے، اور اجتماعی پس منظر میں انفرادی جذباتی زندگی کی مصوری بڑی چابک دستی سے کی ہے۔ اگرچہ مومن نے اس مثنوی کو آپ بیتی کا رنگ نہیں دیا ہے اور خود راوی بن کر ایک نوجوان مومن نامی کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کے مدّ و جزر کی ترجمانی کی ہے لیکن اس کے باوجود اس میں آپ بیتی کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے اور مومن کی شخصیت اس میں شروع سے آخر تک بے نقاب دکھائی دیتی ہے۔ اسی صورت حال نے اس کو حقیقت اور واقعیت سے قریب کیا ہے اور ایک مانوس انسانی فضا قائم کی ہے اس میں مختلف مناظر کے بہت ہی دل آویز نقشے ہیں۔ انسانی جذبات کی بہت ہی دلکش مصوری ہے۔ واقعات کا حقیقت سے نہایت ہی بھرپور بیان ہے۔ مومن نے اس مثنوی میں شاعرانہ اظہار کا کمال دکھایا ہے اور جگہ جگہ شعریت کے بہت ہی خوبصورت نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ شعریت تمثیلوں اور تلمیحوں، علامتوں اور اشاروں، تشبیہوں اور استعاروں کے صحیح استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ اور زبان و بیان اور الفاظ کے فن کارانہ صرف نے اس شعریت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

---

(۴)

مومن کی تیسری مثنوی "قولِ غمیں" کے نام سے مشہور ہے اور اس کے بارے میں ایک عام خیال یہ ہے کہ یہی مومن کی صحیح اور سچی داستانِ عشق ہے۔ شیفتہ نے گلشن بے خار میں وثوق کے ساتھ اس خیال کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ "مثنوی قولِ غمیں کہ از مصنفاتِ خان معز الیہ است شرحِ نسخۂ حسن و جمال ہماں صاحبِ موزوں قد است"[۱]۔ صاحب کے عشق کا واقعہ مومن کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اُس کے اثرات اُن کی شخصیت پر بہت گہرے ہیں، اسی لئے اُنھوں نے اس مثنوی میں اس واقعے کو بہت تفصیل و جزئیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ احساس کی شدت اور جذبے کی اخلاص مندی بھی نسبتاً اس میں زیادہ نظر آتی ہے۔ کہانی کا عنصر اس مثنوی میں بھی ایسا کچھ زیادہ نمایاں نہیں ہے۔ دوسری مثنویوں کی طرح اس میں بھی صرف چند واقعات بیان کئے گئے ہیں لیکن ان کا بیان نسبتاً زیادہ ڈوب کر کیا گیا ہے۔ اسی لئے ان میں صداقت نسبتاً زیادہ نظر آتی ہے اور حقیقت و کا احساس بھی نسبتاً زیادہ ہوتا ہے۔

اس مثنوی میں سب سے پہلے تو مومن نے اپنی پریشانی اور زبوں حالی کا تذکرہ کیا ہے۔ اور مرجانے کی آرزو کی ہے کہ اُن کے خیال میں اسی طرح انھیں سکون اور اطمینان نصیب ہو سکتا ہے ؎

کاش مرجاؤں کہ چین آئے کہیں — بد دماغی سے سرِ زیست نہیں
کب تلک نزع کے عالم میں ہوں — کب تلک یوں ستمِ مرگ سہوں
کب تلک ناک میں دم آہ رہے — وردِ لب نعرۂ اللہ رہے
کب تلک چشم سے خوں ہو جاری — کب تلک درد کرے دلداری
عمر برباد نہ جائے اے کاش — دل کی آئی مجھے آئے اے کاش
ہائے یہ ظلم سہا کیوں کر جائے — ہیں جیوں اور مرا دل مر جائے

اور اس پریشانی اور زبوں حالی کا سبب یہ بتایا ہے کہ وہ سراپا غم ہیں۔ دردِ ہجراں سے انھیں فراغ حاصل نہیں۔ کوئی اُن کا پُرساں حال نہیں کوئی ہمدم و دمساز نظر نہیں آتا۔ وصلِ جاناں

---

[۱] شیفتہ: گلشن بے خار: ص ۱۹۵

تو درکنار ذکرِ جاناں تک کی نوبت نہیں آتی۔ اسی لئے وہ کسی ایسے شخص کی آرزو کرتے ہیں جو ان کے غم میں شریک ہو سکے لیکن انہیں دور تک کسی ایسے شخص کی صورت نظر نہیں آتی ؎

کوئی اپنا نہیں جو چارہ کرے ‌ ‌ ‌ چارۂ مومنِ آوارہ کرے
چارہ گر ہو نہ سکے فکر تو ہو ‌ ‌ ‌ وصلِ جاناں نہ سہی ذکر تو ہو
ماجرا سن کے مرا رونے لگے ‌ ‌ ‌ روتے روتے تو ذرا رونے لگے
سینۂ چاک کا گر ہو نہ رفو ‌ ‌ ‌ ٹانک دے چاک گریباں تو کبھو
چشمِ خوں ریز سے خوں پاک کرے ‌ ‌ ‌ پیرہن ساتھ مرے چاک کرے
دل ہو مضطر تو نہ آرام لے وہ ‌ ‌ ‌ میں جو تڑپوں تو ذرا تھامے وہ
نرم سا کچھ تہہ پہلو رکھ دے ‌ ‌ ‌ سر کو دے پٹکوں تو زانو رکھ دے
کچھ کرے بات ذرا بہلائے ‌ ‌ ‌ جی کسی ڈھب سے مرا بہلائے
ہائے میں ڈھونڈ کے لاؤں کس کو ‌ ‌ ‌ ماجرا اپنا سناؤں کس کو
کون میرا اگر اپنا میں ہوں ‌ ‌ ‌ عاشقِ بے کس و تنہا میں ہوں
یہ بھی مشکل ہے کہ خاموش رہوں ‌ ‌ ‌ ہاں مگر خود ہی سنوں خود ہی کہوں

چنانچہ اپنا حال خود اپنے آپ ہی کو سناتے ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں کوئی دوسرا تو اس کو سننے اور سمجھنے والا موجود نہیں ہے۔ یہ حال کوئی کہانی اور افسانہ نہیں ہے بلکہ محض ایک داد و بیدادِ مظلومانہ ہے جس کے ایک ایک لفظ سے حسرت و حرمان کی کیفیت ٹپکتی ہے اور جس سے عبرت کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔

کہانی اس طرح شروع ہوتی ہے۔

مومن کسی شوخ پر جان و دل سے فدا تھے۔ اس کا عالم یہ تھا کہ کسی کو خاطر ہی میں نہ لاتا۔ الفت، مروت اور وفا کے الفاظ تو جیسے اس نے سنے ہی نہیں تھے۔ ستانا اور دکھ پہنچانا اس کا شعار تھا بے ادائی اس کی ادا تھی لیکن اس کے باوجود مومن اس سے ایک زمانے تک نباہتے رہے لیکن پھر بالآخر صحبت بگڑ گئی۔ اَن بن ہو گئی۔ اس غم سے ان کا برا حال ہوا۔ اس کی جدائی بہت شاق گزری لیکن کچھ بس نہ چلا۔ اسی غم و غصہ کے عالم میں دن گزرتے گئے۔ اور وہ یہ سوچتے رہے

کہ یہ سلسلہ شروع ہی کیوں کیا۔ اور اگر شروع کیا تھا تو پھر لڑائی کیوں لڑی اور اگر لڑائی لڑی بھی تھی تو اس کو منا کیوں نہیں لیا۔ اور اگر اب تک نہیں منایا تو اب تجدید ملاقات میں کون سی قباحت ہے۔ پھر از سرِ نو یہ سلسلہ شروع کرنا چاہیئے۔

اِن خیالات کو وہ عملی جامہ تو نہ پہنا سکے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انھیں جینے کے آداب آگئے اور انھوں نے شعر و شاعری سے لو لگائی۔ احباب سے ملنا جلنا شروع کر دیا۔ اور اس طرح شعر و شاعری اور ہنسنے ہنسانے میں اُن کا وقت گزرنے لگا ـــــ اور اس عالم میں اُنھیں نہ حسرتِ وصل ہی باقی رہی نہ اندوہ فراق ؎

سخت جانی کا گلہ دِل پر شاق ۔۔۔ حسرتِ وصل نہ اندوہ فراق
نہ سبک سر ہیں گراں جانی سے ۔۔۔ گر پشیماں تو پشیمانی سے
نالہ و آہ و فغاں کچھ نہ رہا ۔۔۔ رنج کا نام و نشاں کچھ نہ رہا
اب شب و روز مسرت کا خروش ۔۔۔ انبساط و طرب و عیش کا جوش
نغمہ سنجی و خوش الحانی و بس ۔۔۔ شعر گوئی و غزل خوانی و بس
رات دن ہنسنے ہنسانے کی بات ۔۔۔ یاروں سے ملنے میں صرفِ اوقات

آشناؤں میں سدا گھر میں کہاں
گہہ وہاں گاہ وہاں گاہ وہاں

بظاہر یہ عجیب و غریب کیفیت تھی لیکن بہر حال وہ اس سے دوچار ہوئے اور چندے اُن پر یہی عالم رہا۔ کاروبار شوق میں کبھی کبھی ایسی منزلیں بھی آجاتی ہیں۔

اس عالم میں مومن ایک روز اپنے دوست کے پاس جا رہے تھے کہ راستے میں انھوں نے ایک طُرفہ تماشا دیکھا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک مکان ہے۔ اس مکان میں ایک چلون پڑی ہے اور اس چلون کے پیچھے ایک عورت کھڑی دعوت نظارہ دے رہی ہے۔ اُنھوں نے اس کو دیکھا۔ آنکھوں آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے۔ اُس کی بے باکی نے حیران کر دیا۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور سوچتے رہ گئے کہ اگر یہ پس چلون اشارے کر سکتی ہے تو آخر اندر کیوں نہیں بلا لیتی۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اس لئے سوچا کہ پوچھ گچھ کرنی چاہیئے ؎

ایک دن جاتے تھے اک یار کے پاس — یارِ غم خوار و وفادار کے پاس
راہ میں طرفہ تماشا دیکھا — غرفۂ و بامِ دل آرا دیکھا
آگے اُس غرفے کے چلون ہی پڑی — پس چلون کوئی عورت ہے کھڑی
محوِ نظارۂ رنگِ بازار — ناگہاں ہو گئی مجھ سے دوچار
کہ وہ چلون کا ذرا تھا پردہ — گرچہ تھا پردہ پہ کیا تھا پردہ
ہوئے آپس میں نظارے کیا کیا — کئے ابرو سے اشارے کیا کیا
ترجماں چشم و نظر مطلب سے — کچھ تبسم بھی نمایاں لب سے
اور میں حیران و سراپا حیرت — کیا کہوں میں کہ مجھے کیا حیرت
کہ الٰہی یہ تماشا کیا ہے — گر سر خود ہے تو ڈر کس کا ہے
کیوں نہیں چلون اُٹھا دیتی یہ — کیوں نہیں گھر میں بلا لیتی یہ
اور جو مانع ہے تو کیوں باک نہیں — کیا سبب ہے کہ خطرناک نہیں
جی میں آیا کہ تجسس کیجے — کسی ڈھب بھید یہاں کا لیجے

لیکن پھر یہ خیال ہوا کہ کہیں خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں — چنانچہ کچھ توقف کیا لیکن پھر طبیعت نہیں مانی اور اُس عورت کے حالات کو جاننے اور اُس تک پہنچنے کی تدبیریں نکالنے لگے۔

یہ کام ظاہر ہے کہ آسان نہیں تھا۔ بہت سے حربے استعمال کرنے پڑے۔ بالآخر نہ جانے کتنے فریبوں سے وہاں تک رسائی حاصل کی۔ جاکر دیکھا تو وہ مکان بہت ہی خوبصورت نظر آیا اور اُس کے مکین تو مکان سے بھی زیادہ خوبصورت تھے۔ کسی قسم کا غم تو انھیں چھو بھی نہیں گیا تھا۔ بس اُنھیں تو شب و روز ہنسنے ہنسانے سے کام تھا۔ یہ فضا مومنؔ کو بہت بھائی اور وہاں آنا جانا اُن کے معمولات میں داخل ہو گیا ؎

سو فریبوں سے وہاں تک پہنچے — پہنچے ہم اور کہاں تک پہنچے
وہ مکاں رشکِ قصورِ افلاک — جلوۂ عالمِ بالا تہِ خاک
ہم نشیں ہمدم و غمخوار ہوئے — ہم بھی اک محرمِ اسرار ہوئے

گرچہ تھا اور طرح کا نہ مزاج — لیک شدّت سے ظریفانہ مزاج
زیبِ لب مضحکہ ایجاد کلام — رات دن ہنسنے ہنسانے سے کام
رنج و افکار سے بے غم رہنا — شاد و خنداں خوش و خرم رہنا
دیکھی یہ گرمیٔ صحبت جو وہاں — دلِ افسردہ لگا بہلنے وہاں
طبع آخر کو ذرا آ ہی گئی — صحبتِ زندہ دلاں بھا ہی گئی
ہنسی آنے کو غنیمت جانا — واں کے جانے کو غنیمت جانا
لطف اس طرح کے جب پانے لگے — پھر تو ہر روز وہاں جانے لگے

اور اس طرح اُن کا وقت ان صحبتوں میں بہت اچھی طرح گزرنے لگا۔ لیکن پھر اسی زمانے میں ایک مصیبت نازل ہوئی۔ ایک روز یہ وہاں لطف اٹھا رہے تھے کہ صاحب خانہ کے یہاں کوئی مہمان آیا۔ یہ پردے کے خیال سے باہر آئے اور کچھ دیر اس خیال سے ٹھہرے رہے کہ پھر اندر بلائے جائیں گے اور ہنسنے بولنے میں اُن کا جی بہل جائے گا۔ لیکن انتظار کرتے کرتے طبیعت گھبرا گئی۔ ناچار گھر واپس آگئے۔

دوسرے دن وہاں سے یہ پیام آیا کہ مہمان کی طبیعت کچھ ناساز ہے آکر نبض دیکھ جائیے۔ مومن تو منتظر تھے ہی۔ فوراً وہاں جا پہنچے۔ صاحب خانہ نے ساری روداد سُنائی۔ مہمان کی علالت اور اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور نبض دیکھنے کی فرمائش کی۔ اُنھوں نے نبض تو دیکھی لیکن علاج کرنے کی بجائے خود مریض ہو گئے۔ نبض پر ہاتھ دھرنا تھا کہ دل قابو سے نکل گیا، اُس کی محبت میں گرفتار ہو گئے اور سب کچھ فراموش کر دیا ؎

میں نے اُس نبض پہ جو ہاتھ دھرا — ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا
صاف صندل سے زیادہ وہ ہاتھ — نرم مخمل سے زیادہ وہ ہاتھ
پنجۂ مہر کا سا شعشۂ نور — دستِ گلدستہ رہے جس کے حضور
اُس کو جوں ہاتھ لگایا میں نے — دل سے بس ہاتھ اُٹھایا میں نے
دھر دیا تھام جگر ہاتھ میں دل — لئے بیٹھا تھا مگر ہاتھ میں دل

اس طرح ایک آفتِ تازہ اُن کی جان پر آئی۔ چنانچہ یہ غزل پڑھی جس کا مطلع ہے ؎

کیا لگا دستِ دل آرام سے ہاتھ — دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

غزل کا سُننا تھا کہ مہمان نے ہاتھ کو جھٹک کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور صاحب خانہ سے ہنس کر کہنے لگی کہ یہ بیچارے علاج کیا کریں گے یہ تو خود کسی مرض میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں ؎

اس غزل نے اُسے آگاہ کیا — ہاتھ کو ہاتھ جھٹک کھینچ لیا
ہنس کے یوں صاحب خانہ سے کہا — کہ یہ درمانِ مرض جانے کیا
ہے یہ بیچارہ تو آپ ہی بیمار — زردیٔ رخ سے عیاں ہے آزار
کوئی ناداں ہے کہے اس کو طبیب — درد میں خود ہے گرفتار غریب
ہاں خلل جوشِ جنوں کا ہے اسے — شرط ہم بدتے ہیں سودا ہی اسے
کیا تماشا ہے کہ ہم جانیں مرض — یہ طبیب اور نہ پہچانیں مرض
یہ ہمارا نہ خلل بتلائیں — ہم مریض ان کا مرض پا جائیں

غرض وہ اس طرح شوخیاں کرتی رہی، اور اس کے ساتھ اس شوخی میں وہ سب لوگ بھی شریک ہو گئے جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ مومن سے کوئی جواب نہ بن پڑا خاموش رہے اس پر اور بھی قہقہے لگائے گئے ؎

جب یہ حالت ہوئی سب کو معلوم — پھر تو ہنسنے کی مچی اور بھی دھوم
کوئی کہنے لگی رنجیدہ ہیں آج — بے مزہ ہیں نہیں کل کا سا مزاج
کوئی بولی کہ لڑ آئے ہیں کہیں — کچھ کسی سے بگڑ آئے ہیں کہیں
آپ نے اتنے میں ہنس کر یہ کہا — کہیں سے پی تھی کہ اب نشہ چڑھا
یا کسی کی انھیں یاد آئی ہے — بے خودی بے خبری چھائی ہے
بے حواسی سے نہیں نام کو ہوش — کچھ نہ کچھ تو ہے کہ بیٹھے ہیں خموش
کوئی پوچھو تو ہوا کیا ان کو — آئی درپیش بلا کیا ان کو
کیا سبب کس لئے بے ہوشی ہے — کچھ تو ہے بات کہ خاموشی ہے

غرض اس طرح دیر تک فقرے بازیاں ہوتی رہیں۔ مومن کچھ نہ بولے۔ صرف اتنا کہا ؎

کہ میں اچھا تھا یہاں جب آیا — یہ ہوا یاں ہی پری کا سایا

لیکن یہ بات اُن کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ اُن کی اصل کیفیت لوگوں پر ظاہر ہو گئی اور ان میں سے ہر ایک نے طعنے دینے شروع کر دیئے ؎

بس یہ کہتے ہی تو سب جان گئے — بات جو دل کی تھی پہچان گئے
پھر وہ ناوک فگنی ہونے لگی — بے دھڑک طعنہ زنی ہونے لگی

مومن بھی حتی المقدور جواب دیتے رہے لیکن کچھ زیادہ کہنے کی طاقت نہیں تھی۔ اس لئے کچھ بن نہ پڑی، اور وہ مجبوراً سب کی باتیں سُنتے رہے۔

دن بھر اسی طرح ہم صحبتِ یار رہنے کے بعد شام کو گھر پہنچے، لیکن گھر پر جی نہ لگا۔ دن کی باتیں یاد آتی رہیں۔ بڑی مشکل سے رات کٹی۔ دن نکلا تو پھر یہ خیال آیا کہ کوچہ یار کی طرف چلنا چاہیئے چنانچہ مومن وہاں جا پہنچے۔ محبوبہ اُس وقت کوٹھے پر تھی، اس کو ان کے آنے کی خبر نہیں تھی، اتفاقاً وہ بے خبری کے عالم میں سامنے آئی اور ان سے دوچار ہوئی۔ اُس کو اس عالم میں دیکھنا تھا کہ انھیں غش آنے لگا۔ کچھ عجب سراپا دیکھا۔ خیر اندر گئے۔ پھر وہی ماحول پیدا ہوا۔ چھیڑ چھاڑ ہونے لگی۔ اُس نے کہا کہ اس وقت کیسے آئے؟ اُنھوں نے سیدھا سادہ سا جواب دے دیا کہ بے چینی نے مجبور کیا۔ صاحب خانہ نے اس ڈر سے کہ مہمان کہیں خفا نہ ہو جائے بات بنائی اور یہ کہا کہ یہ تو میرے پاس تشریف لاتے ہیں، اور یہ اُنھیں کا گھر ہے۔ اس پر مہمان نے مزید فقرے چست کرنے شروع کر دیئے۔ کہنے لگی ؎

سمجھی ہیں ناز کی یہ باتیں ہیں — اور انداز کی یہ باتیں ہیں
سُن کے وہ بولی کہ ہاں کیا صاحب — کیا کہا آپ نے اچھا صاحب
گھر جو ان کا ہے یہ تو یہ ہی رہیں — ہم چلے جاتے ہیں تو یہ ہی رہیں
سُن کے آوازہ یہ ہم رہ نہ سکے — آہ کی اور تو کچھ کہہ نہ سکے
پھر سخن ایسے ہی کچھ ہونے لگے — وہ تو ہنسنے لگے اور ہم رونے لگے

بالآخر یہ رخصت ہو کر گھر آئے لیکن گھر پر جی نہ لگا۔ کچھ عجب پریشانی رہی۔ اسی پریشانی کے عالم میں تھے کہ محبوبہ کی طرف سے ایک نامہ بر آیا اور نامۂ دلدار و خطِ مشکین رقم اپنے ساتھ لایا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ مجھے تمھاری کیفیت کا علم ہے۔ میں بھی تمھاری ہی طرح مشتاق ہوں۔

لیکن یہ رُسوائی کا ڈر اور بدنامی کا خیال راستے میں حائل ہے۔

یہ نامۂ دلدار مومنؔ کے لئے مژدۂ جاں فزا ثابت ہوا۔ اُنھوں نے اس کو آنکھوں سے لگایا اور دِل کا تعویذ بنایا۔ اور اُس کا جواب یہ لکھا کہ میں دل سے مجبور تھا ورنہ ایسی حرکت مجھ سے سرزد نہ ہوتی ؎

کہ ترے صدقے مری جاں مومنؔ جانِ مومنؔ ترے قرباں مومنؔ
اس طرح رو دیا بازار و نزار دل کے بھر آنے سے میں تھا ناچار
دل مرے قابو میں اے جان نہ تھا ورنہ ایسا بھی تو نادان نہ تھا
کہ کچھ آتا نہ خیالِ انجام جان کر میں تجھے کرتا بدنام
اس جگہ تو ہے بہت ضبط ضرور پر کروں کیا کہ ہوں دل سے مجبور
کیا کہوں کس سے کہوں حالِ دل آہ درد سے میرے کوئی کیا آگاہ
چین ہے دن کو نہ شب کو آرام بے قراری سے شب و روز ہے کام
ہر زماں آہ ہے، ہر دم رونا ہر گھڑی جانِ حزیں کا کھونا
ہے رواں چشم سے جیحوں دن رات لب پہ ہے نالۂ موزوں دن رات

اس طرح یہ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری رہا ملاقاتیں بھی ہوتی رہیں۔ دن میں ایک بار وہاں ضرور جاتے، اور کچھ وقت وہاں گزار کر واپس آتے۔ ملاقات میں مجبوریوں کا ذکر ہوتا۔ معذوریاں بیان ہوتیں۔ ایک دوسرے کو تسلی دیتے۔ دونوں کا جی بھر آتا اور خوب روتے ؎

حالت اپنی جو ہوئی اور تغیر ہوئی اُس کو بھی زیادہ تاثیر
چھا گئی چشم میں اک بے خوابی دِل کو بھی رہنے لگی بے تابی
دیکھ غمگین وہ مجھے غم کھاتی سُن کے حسرت مری حُزن ہو جاتی
کسی سے روتے اگر سُن لیتی چھپکے سے کونے میں جا رو دیتی
صبح تک شب کو نہ سویا کرتی یاد کر غم مرا رویا کرتی

غرض اس طرح ایک دوسرے سے مِلنے جُلنے، اپنا اپنا حالِ دل کہنے، اور رونے رُلانے کا سلسلہ کچھ روز جاری رہا۔

لیکن بالآخر محبوبہ کے رخصت ہونے کے دن آگئے، اور کوچ کی تیاری ہونے لگی۔ اس خبر نے مومن کے دل کا کچھ عجب حال کیا۔ لیکن اُس نے رخصت ہونے سے قبل ملاقات کی ایک صورت نکالی۔ چنانچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے ملے۔ لیکن صرف چند لمحوں کے لئے آخر کوچ کا لمحہ آگیا اور دونوں نے ایک دوسرے کو رو رو کر رخصت کیا ؎

کام دل رنج و بلا کو سونپا تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا
کہہ کے یہ اُٹھ گئی جی کھوتی ہوئی ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے با دلِ مضطرب و مضطر آئے
کیا کہوں کیونکہ گزاری وہ رات گزری کس حال میں ساری وہ رات
کس سے یہ صدمہ سہا جاتا ہے کس سے وہ حال کہا جاتا ہے
جو ہو دل دادہ سمجھ لے آپہی
کار اُفتادہ سمجھ لے آپہی

اس کے بعد وہی ہوا جو عام طور پر ان معاملات میں ہوتا ہے۔ معشوقہ نے سفر اختیار کیا اور عاشق نے آوارگی۔ اُس کا رخصت ہونا تھا کہ عاشق نے دشت نوردی کا کاروبار شروع کر دیا۔ نہ جانے کتنے صحراؤں کی خاک چھانی، اور یہی اُس کا مشغلہ بن گیا۔ دیوانوں کی سی باتیں اور وحشیوں کی سی حرکتیں اُس سے سرزد ہوتی رہیں۔ اور اس طرح عشق کی آخری منزلوں سے ہمکنار ہو کر اُس نے عشق و عاشقی کی مختلف داستانوں میں اپنی ایک اور داستان کا اضافہ کر دیا۔

اس کے بعد مومن نے ایک حکایت تمثیل کے طور پر بیان کی ہے۔ یہ ایک ایسے نوجوان کی داستان ہے جو ہمیشہ آنکھ لڑانے کے لئے آمادہ رہتا تھا اور جس کو ہمیشہ تیر ہوس سے گھائل ہونے کی تمنا رہتی تھی۔ جب بھی وہ کہیں کوئی اچھی صورت دیکھتا تو غش آجاتا۔ لیلیٰ کی بات ہوتی تو نیند اُڑ جاتی۔ شیریں کا بیان ہوتا تو منہ میں پانی بھر آتا۔ ایک دن کسی نے اُس کے سامنے مومن کی یہ غزل چھیڑ دی جس کا مطلع تھا ؎

بو کچھ آتی ہے صبا سے تیری ناک میں دم ہے جفا سے تیری

تو اُس کا زخم ہرا ہو گیا اور دبی ہوئی چوٹ اُبھر آئی۔ اور اُس نے اپنا ماجرائے عشق

سنانا شروع کیا — کہ وہ کس طرح ایک ایسے محبوب کے عشق میں گرفتار ہوا جو غرفے سے اشارے کرتی تھی لیکن جس کا وصل اُسے ایک روز بھی میسر نہ ہوا۔ بالآخر عاشق نے جان دے دی اور جب اُس کا جنازہ محبوب کے کوچے سے گزرا تو وہ اُس کی تاب نہ لاسکی اور جذبِ اُلفت نے یہ تاثیر دکھائی کہ وہ اوپر سے گر کر مرگئی۔ عشق کی تاثیر نے اُس کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔ عشق کا انجام یہی ہوتا ہے ؎

عشق کے ڈھنگ بیاں کیا کیجے — اس کے نیرنگ بیاں کیا کیجئے
اس کا ہر جائے جُدا ہے عالم — جس جگہ دیکھو نیا ہے عالم
اس کی تاثیر فسوں و جادو — اثر اس کا کوئی چھوڑے ہے کبھو
یہ کسی کو نہیں رکھتا محروم — جس پہ گزرے ہے اُسے ہے معلوم
زندگی میں ہو اگر وصل محال — بعد مرنے کے مقرر ہو وصال

آخر میں مومن نے اپنے محبوب کے واپس آجانے کی امید کی ہے لیکن ساتھ ہی اس کا اظہار کیا ہے کہ اب اُن میں کچھ باقی نہیں رہا ہے۔ کیونکہ وہ دل کی آگ سے جل کر خاک ہو گئے ہیں ؎

جب موئے پر بھی بر آتی ہو اُمید — وہ بھی آجائیں تو کیا کچھ ہے بعید
لوگ جا کر بھی تو پھر آتے ہیں — گاہ بچھڑے بھی تو مل جاتے ہیں
مومنِ زار کہ تھا گرم بیاں — سوزشِ سینہ سے تھا شعلہ فشاں
دل کی آتش سے جلا خاک ہوا — بجھ گیا شعلہ بھڑک کر دل کا
آنچنیں نالہ زدہ رفت زہوش — ہم چو شمع سحری گشت خموش

اور اس طرح یہ مثنوی ختم ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ اس تفصیل سے ظاہر ہے اس مثنوی میں بھی کوئی خاص کہانی نہیں ہے۔ صرف چند واقعات پیش آئے ہیں جن کو ایک لڑی میں پرو کر کہانی کا روپ دے دیا گیا ہے لیکن چونکہ ان واقعات میں آپ بیتی کا رنگ ہے۔ اس لئے یہ دلچسپ معلوم ہوتے ہیں۔ مومن کو جو واقعات پیش آئے ہیں جن معاملات کا انھیں سامنا کرنا پڑا ہے، اور اس سلسلے میں جو کچھ اُن کے دل پر بیتی ہے، اُس کو انھوں نے اس مثنوی میں بہت تفصیل و جزئیات کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔

واقعات یہاں صرف واقعات ہی نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے ذاتی اور انفرادی تجربات کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی لئے ان میں واقعیت کا احساس ہوتا ہے اور اس آئینے میں ایک انسان کی ذہنی کیفیات کی حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی میں جگہ جگہ جذبات نگاری کے بعض بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اس میں عشق کی صداقت اور اس کے اعلیٰ معیاروں کا احساس بھی موجود ہے۔ اسی لئے یہاں عشق کی حدیں ہوس سے ملی ہوئی نظر نہیں آتیں۔ برخلاف اس کے عشق کی سپردگی کا احساس جگہ جگہ ملتا ہے۔ اور عشق کے ان معیاروں ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ مومن نے اس مثنوی میں ہجر و فراق کے لمحوں کو بہت نمایاں کر کے پیش کیا ہے۔ وصل کی لذتوں کا بیان اس میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ عیش پسندی اور تعیش کوشی کی فضا بھی اس میں نہیں ہے۔ برخلاف اس کے اُن آزمائشوں کا بیان نسبتاً زیادہ ہے جس سے عشق میں محبوب اور محبت کرنے والے دونوں کو گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ مثنوی زندگی سے لبریز نظر آتی ہے۔ اس میں زندگی کو بسر کرنے اور اس کو برتنے کا احساس بہت شدید ہے اور اس احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ محبت کرنے والا زندگی سے بیزار نہیں ہوتا اس پر حزن و یاس کی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ وہ قنوطیت کا شکار نہیں ہوتا۔ امید کی کرن اُسے آخر وقت تک نظر آتی رہتی ہے اور وہ مختلف طریقوں سے اپنے دل کو تسلی دیتا رہتا ہے۔ اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ اُس کی محبت ناکام ہو چکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو کچھ وہ سوچتا ہے وہ پورا نہیں ہوتا اور جو سہانے خواب اُس کو نظر آئے ہیں وہ شرمندۂ تعبیر نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ اُس زمانے کی مخصوص معاشرتی اور تہذیبی فضا کی بھی اس میں حقیقت سے بھرپور تصویریں نظر آتی ہیں اور اُن معیاروں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جن کو رہن سہن میں لوگ بہت اہمیت دیتے تھے۔ فنی اعتبار سے بھی یہ مثنوی بہت دلکش ہے۔ اس میں اکثر ایسے مقامات آتے ہیں جہاں شاعر کی تخییل جمالیاتی اظہار کو حد درجہ دلکش بنا دیتی ہے اور جگہ جگہ حسن بیان کی بجلیاں سی کوندتی ہیں۔ اس میں تفصیل و جزئیات کا بیان ہے، جگہ جگہ ایک ڈرامائی شان ہے، محاکات و مصوری ہے، تشبیہات و استعارات کی رنگارنگی ہے، الفاظ کے مخصوص دروبست سے پیدا ہونے والی نغمگی اور موسیقی ہے۔

اور ان سب نے مل کر اس مثنوی کو بھی ایک شاہکار نظم بنا دیا ہے۔

(۵)

مومن کی چوتھی مثنوی "تفِ آتشیں" ہے۔ اس کا آغاز بھی جامِ شرابِ احمر کی طلب سے ہوتا ہے تاکہ اس شخص کا کچھ غم غلط ہو سکے جو اب تک صرف شرابِ غم پیتا رہا ہے، اور جس نے اس کے لئے زندگی کو وبالِ جان بنا دیا ہے۔ اس میں کچھ کہنے کی سکت تک باقی نہیں رہی ہے۔ وہ اظہارِ غم تک کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دل شکنی اور جاں شکنی جس کا مقدر بن گئی ہو ضعف سے جس کا بُرا حال ہے جس کے دل و جگر خون ہو کر بہہ گئے ہیں، جس کا مشغلہ گریہ و زاری ہے اور جس کا وقت اکثر دشت نوردی اور صحرا گردی میں گزرتا ہے۔ اس کے پاؤں چھلنی ہو چکے ہیں لیکن جوشِ جنوں پھر بھی اسے چین سے نہیں بیٹھنے دیتا ؎

دل کے قلق سے دشت نوردی — نقشِ قدم ہے صحرا گردی
پڑ گئے لاکھوں پاؤں میں چھالے — جوشِ جنوں نے پاؤں نکالے
ہائے اذیت کیوں کر جاوے — چین نہ آوے موت نہ آوے
کاوشِ تازہ پیہم جی کو — نزع کی حالت ہر دم جی کو
سخت مشوّش ہوں کیا کیجے — دِل کو تسلی کیوں کر دیجے
کس کنے بیٹھوں کیونکر ٹھہروں — ٹھہرے یہ دل تو دم بھر ٹھہروں
یار نہیں ہے اپنے ڈھب کے — آئے ہے وحشت ملنے سے سب کے
سیرِ گلستاں خار لگے ہے — موجِ رواں تلوار لگے ہے
شعر رواں سے اشک رواں ہو — راگ سُنے سے مشقِ فغاں ہو

اور وہ اپنی اس کیفیت سے اس حد تک پریشان ہو جاتا ہے کہ طاقتِ ضبط باقی نہیں رہتی اور نوبت شکوے تک جا پہنچتی ہے۔ مجبور ہو کر وہ شکوۂ بے باکانہ کرتا اور شوخ بیانی کے ساتھ رازِ نہانی کھولتا ہے۔ یہی باتیں ایک قصّے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

قصّہ یہ ہے کہ اس شخص کا مزاج ہمیشہ سے عاشقانہ تھا۔ شعلہ وشوں سے دل لگانے اور محبت کرنے کی اس کو کچھ عادت سی ہو گئی تھی۔ ایک نہ ایک سے اس کو کام ہی

رہتا تھا۔ خود محبوب تک اُس کی چاہ کی تمنا کرتے تھے۔ بدنامی اس کے نام کو نہ جانے کہاں کہاں لے گئی تھی۔ دور دور اُس کا شہرہ تھا۔ چنانچہ اُس نے غم کے بہت سے چرکے کھا کر زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور دل بہلانے کے لئے شعر و سخن سے رشتہ جوڑ لیا تھا لیکن اسی زمانے میں اُس کی حسن پرستی اور عشق بازی نے ایک نیا گل کھلایا اور اُس کی زندگی ایک نئے حادثے سے دوچار ہوئی۔ باغ طرب میں تازہ گل کھلے اور رہتا ہوا زمانہ ایک دفعہ پھر واپس آگیا ؎

عیش کو پھر مہمان بُلایا　　ربطِ قدیمی یاد دِلایا
تازہ کھِلا گل باغِ طرب میں　　ربط ہوا گل خندہ و لب میں
ہو گئی یاری دل سے خوشی کی　　ٹھہری تبسم سے بھی ہنسی کی
جان و فرح ہم گوہرِ راحت　　خواب و مزہ ہم بسترِ راحت
چشمِ تر دُشوار یہ غم میں　　سو شکر آئی ایک ایک دم میں
سیرِ چمن میں روز گزاری　　ہم نفس و دم بادِ بہاری
رود و شراب و صحبتِ یاراں　　رات کو عیدِ بادہ گساراں
طبع کشیدہ رنج کشوں سے　　گرمی صحبت شعلہ وشوں سے
زمزمہ سازی سے دم سازی　　چنگ نوازی گوش نوازی

چندے اسی طرح گزری لیکن زمانہ ہمیشہ ایک راستے پر نہیں چلتا۔ چنانچہ وقت کے ساتھ اس عیش و طرب کا خاتمہ ہو گیا اور مسترتیں غم میں تبدیل ہو گئیں۔

وہ اس طرح کہ ایک دفعہ اُن کے یہاں کسی کی شادی ہوئی۔ یہ اُس تقریب کے مہتمم اور مختارِ کل تھے۔ مصروفیت کا عالم تھا۔ انتظامات کے سلسلے میں اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے تھے کہ اچانک پردے کے پیچھے سے کان میں ایک بہت ہی لطیف سی آواز آئی ؎

شادی اُٹھی اک گھر میں شتابی　　اس میں ہوئی یہ خانہ خرابی
بس کہ تکلف نالہ اثر تھا　　اُن کا مکان بھی اپنا ہی گھر تھا
تھی جو وہ بزم جان و دل آرا　　میں بھی وہاں تھا محفل آرا
کارکن و مختار وہاں میں　　مہتمِم ہر کار وہاں میں

اندر باہر سور فزائی — تھی متعدد بزم آرائی
سوئے ہر اک بزم اپنا گزر ہو — مجھ کو بکاریں کام جدھر ہو
اپنا گزر جوں صاحبِ خانہ — تا درِ رنگیں بزم زمانہ
پردے سے اک آواز خوش آئی — جس نے یہ چپ ہے مجھ کو لگائی
وصف کی اُس کے تاب کہاں ہے — رنگ بیاں کی لال زباں ہے
لفظ جو تھے مربوط صدا سے — سو نہ ادا ہو نطق ادا سے
کیا کہوں اُس کی سحر بیانی — لفظ کئی اور لاکھ معانی

اس رنگین اور رس میں ڈوبی ہوئی آواز کا سننا تھا کہ مومن صبر و قرار کھو بیٹھے۔ کیونکہ یہ تو محبت کی باتیں تھیں۔ ان کی تہہ میں تو کاروبارِ شوق کی سلسلہ جنبانی تھی۔

یہ آواز جہاں سے آئی تھی مومن نے اُدھر دیکھا تو صرف اُس پردہ نشیں کی ایک جھلک نظر آئی، کیونکہ اُس نے فوراً ہی چلون کو اُٹھا کر گرا دیا۔ یہ صرف پردہ داری نہیں تھی، ایک اندازِ محبوبی اور طرزِ دل رُبائی تھا۔

آہ نے کتنی تیز اثری کی — پردہ نشیں نے پردہ دری کی
چلون اُٹھا کر وہیں گرا دی — ایک جھلک سی اپنی دکھا دی
پردہ اُٹھایا شوق نہاں نے — منہ کو چھپایا تاب و تواں نے
کیا کہوں عالم اتنی جھلک کا — رنگ اُڑے ہے مہر فلک کا
جوں نظر آئی وہیں نہاں تھی — کیسی تجلی برق تپاں تھی
دیکھ وہ عالم جلوہ گری کا — ہوش اُڑے یک بار پری کا
قامتِ رعنا آہ ستم کش — تابِ جبیں یا شعلۂ آتش
زلف مسلسل سلسلہ جنباں — حلقہ کاگل یا درِ زنداں
تیغ شکاری جنبش ابرو — چشم کی گردش شوخیِ آہو
کشتۂ مژگاں ترک نگاہاں — سرمہ فسان تیغ صفاہاں
رنگِ صبا گل ریز تکلم — خندۂ گلبن طورِ تبسم

بس کہ وہ شکل پردہ نشیں ہے — دل سے زباں تک آتی نہیں ہے

اس قدِ رعنا کی جھلک کو دیکھنا تھا کہ مومن کے ہوش اُڑ گئے۔ دیر تک خاموش کھڑے رہے۔ حیرت کا عالم طاری ہو گیا، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔ لیکن وہ اسی عالم میں اُنھیں تڑپتا ہوا چھوڑ کر رخصت ہو گئی۔ شام کو بارے آنکھ بچا کر وہ ملنے کی غرض سے آئی۔ حال احوال پوچھا تسلّی دی اور اس طرح ان نوازشوں کا سلسلہ جاری رہا ؎

شام کو بارے آنکھ بچا کر — دیکھ گئے اس حال کو آ کر

آکے تسلّی دے گئے کچھ کچھ — تاب و تواں پھر لے گئے کچھ کچھ

کیا کہوں کیا کیا جلوے دکھائے — وہیں گئے اور وہیں آئے

لطف و نوازش ہائے پیہم — ٹھہرے نہ ٹھہرے آئے پیہم

لیکن بالآخر رخصت کا وقت آ پہنچا۔ وہ محفل بھی ختم ہو گئی اور اس طرح جدائی کا وقت آ گیا۔

وہ ملنے تو آتی ہی تھی۔ ایک دن اُس نے رخصت کا ذکر کر کے پیامِ مرگ بھی سُنا دیا۔ اور یہ بات ذہن نشیں کرائی کہ اب ملنے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ گھر میں پابندیاں بہت ہیں اور وہاں کسی کا بھی گزر نہیں ہو سکتا ؎

قید کہوں کیا اپنے گھر کی — کانپتی جا دے بادِ سحر کی

دھیان نہ آنے پائے کسی کا — ذکر نہ ہرگز آئے کسی کا

بادِ صبا پیغام نہ لاوے — مرغِ سلیماں اُڑنے نہ پاوے

تا دمِ مرگ ارمان نہ نکلے — نزع بھی ہو تو جان نہ نکلے

یہ سب کچھ کہہ سُن کر وہ رخصت ہو گئی چلتے وقت صرف اتنا اور کہا کہ ملاقات پھر اسی جگہ ہو سکتی ہے ——— اُس کا رخصت ہونا تھا کہ مومن پر قیامت گزر گئی، دل گھبرانے لگا، بے چین رہنے لگے نیند اُڑ گئی۔ آنکھوں سے خون کے دریا بہنے لگے۔ کوئی صورت سکون کی باقی نہیں رہی۔ ہر کام سے ہاتھ اُٹھا لیا اور جنگلوں اور ویرانوں میں مارے مارے پھرنے لگے۔

عیشِ وطن اندوہِ غریباں — دستِ جنوں سے چاک غریباں

پاؤں سے وحشت سر نہ اُٹھاوے — شوقِ مغیلاں تلوے کھجاوے

سوزِ نہانی فانیِ دوزخ — سینہ کرے مہمانیِ دوزخ
سیرِ گلستاں سے خفقاں ہو — دیکھ کے جدول اشک رواں ہو
خار سے چبھیں گل گشتِ چمن سے — ناک میں دم خوشبوئے سمن سے
نغمہ بلبل نالہ سکھا دے — خندہ گل پر رونا آوے

اور خاصے عرصے تک یہی کیفیت رہی۔

ایک روز جب اس پریشانی سے تنگ آ گئے اور کسی طرح جی نہ لگا تو ضبط کی طنابیں ٹوٹ گئیں اور یہ رسوائی کا خیال کیے بغیر فرطِ شوق سے مجبور ہو کر کوچہ یار کی طرف چل دیئے وہاں پہنچے تو اپنا اور اس کوچے کا منظر ہی عجیب تھا ؂

لٹنے کا عالم شوق سے ہم پر — لغزشِ پا ہر ایک قدم پر
سوچتے دل میں عذر و بہانہ — خوش حرکاتِ مضطربانہ
دل نے غرض اک بات بتائی — خضر نے بھی یہ راہ نہ پائی
حیلہ بہانہ کیا کہ کرامت — جینے ہی جی ہو جس سے قیامت
پہنچے جوں ہی ہم جائے گھر اس کے — ہوش گئے دروازے پہ اس کے
دیکھے نگہباں چشم سے بہتر — آنکھ سے ٹپکے خون کبوتر
چلنے نہ دیویں بادِ بہاری — تا نہ کرے پیغام گزاری

یہ منظر دیکھ کر ان کے دل میں محبوب سے ملنے اور دل کے ارمان نکالنے کی خواہش کچھ اور بھی انگڑائیاں لینے لگی۔

یہ ابھی نہ جانے کیا کیا کچھ سوچ رہے تھے کہ اندر سے ایک نہایت مکروہ المنظر خادمہ نکلی جس کا انداز ڈائنوں کا سا تھا۔ اس کے ہاتھ مومن نے پیام بھیجا لیکن وہ وہاں سے صاف جواب لائی اور وہ بارگاہِ محبوب میں باریاب نہ ہو سکے۔ ناچار انھیں وہاں سے ناکام واپس آنا پڑا۔ گھر پہنچے تو شرمندگی اور مایوسی کی وجہ سے بُری حالت ہو گئی۔ چار مہینے اسی عالم میں گزر گئے۔

اس کے بعد ایک روز ایک تازہ گل کھلا۔ جب اتفاق سے وہ رشکِ مہرِ درخشاں

ان کے ایک دوست کے یہاں مہمان آئی۔ اُنھیں بھی اس کی خبر ملی۔ اُنھوں نے موقعے کو غنیمت جان کر اُس کے پاس پیغام بھیجنا مناسب خیال کیا۔ ایک محرمِ راز کو فوراً طلب کیا اور اُس کے ہاتھ اپنا حالِ دل اُس تک پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ پیغام کیا تھا شکوہ و شکایت کا ایک اچھا خاصا دفتر تھا ؎

گرمیٔ شوق و سوزِ نہانی　　　آہِ سحر کی شعلہ فشانی
چشمِ سحر آلودہ کا شکوہ　　　بختِ بخواب آسودہ کا شکوہ
قوت فزائی غصہ و غم کی　　　آب وہی خوننابِ ستم کی
ہجر قیامت زا کی شکایت　　　مرگ قدم فرسا کی شکایت

اُس نے یہ گلے شکوے سُنے لیکن اُس پر ان کا کوئی خاص اثر نہ ہوا، بلکہ طبیعت میں ایک برہمی پیدا ہو گئی ؎

سُنتے ہی نام عاشقِ بے کس　　　کہنے لگے کس ناز سے بس بس
بارِ دگر یہ نام نہ لینا　　　رنجِ پیہم مجھ کو نہ دینا
نام کو اُس کے آگ لگاؤں　　　دل کی طرح سے اُس کو جلاؤں
ننگ دو عالم آپ تو تھا ہی　　　مجھ کو بھی کیا بدنام کیا ہی
پھر نہ سوالِ وصل کرے وہ　　　پھر نہ خیالِ وصل کرے وہ

غرض اُس نے خوب آڑے ہاتھوں لیا، اور ذرا بھی رحم کھانے کے لئے تیار نہ ہوئی۔ اُس کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر مومن کا بُرا حال ہو گیا۔ جان پر بن آئی۔ جی سے گزر گئے ۔ لیکن اُن کے خیال میں یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ عشق میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس قسم کے افسانوں سے عشق کی تاریخ بھری پڑی ہے۔ اس کو واضح کرنے کے لئے وہ ایک مختصر سی حکایت سُناتے ہیں۔

یہ حکایت صرف اتنی سی ہے کہ ایک جوان تھا۔ عشق و عاشقی اُس کی سرشت میں داخل تھی۔ سر سے پاؤں تک محبت کی تصویر معلوم ہوتا۔ عشق نے اُس کے ہوش اُڑا دیے تھے۔ ہر وقت نالے کرتا، آہیں بھرتا، اور گریہ خونیں سے طوفان اُٹھاتا۔ غرض کچھ عجیب

کیفیت تھی ؎

گریۂ خونیں سے دم طغیاں — دستِ مژہ جوں پنجۂ مرجاں
سینہ برنگِ آبلہ لپکے — آہِ سحر سے دوزخ ٹپکے
نامِ دوا آزار فزا ہو — دل سے نہ دم بھر ہاتھ جدا ہو
چہرہ گُل و گُل رنگ شکستہ — رنگ ہزار دام گسستہ
شورِ فغاں تمہیدِ قیامت — داغِ جنوں خورشیدِ قیامت
دیکھے جدھر کو چشم بھر آوے — آنکھ میں آنسو جوں نظر آوے
قوت و غذا غم غصہ کھانا — خواب فراموش نیند کا آنا
جامہ قبائے گل اندامان — جیب سحر ہم دامنِ داماں
شاخِ کمان غم کھینچے سے بازو — سینے میں تیرِ عشق ترازو
ضعف قوی سے چارہ کم اُس کو — کھینچنا مشکل تابِ دم اُس کو
ہر دم لب پر جانِ حزیں تھی — ہر آن آنِ بازپسیں تھی
سنگ ہو آب انداز نظر سے — یاس در و دیوار سے برسے
دل کی حقیقت کچھ نہ کہے وہ — دیکھے جدھر کو دیکھ رہے وہ
شدتِ رقت میں ہنس دیوے — تا کوئی عاشق جان نہ لیوے

اس عالم میں وہ نوجوان زبان حال سے اپنے محبوب کے جور و جفا کا شکوہ کرتا۔ ایک دن یہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ کسی دوست نے یہ باتیں سُن لیں آخر اُسے ہمراز بنایا، اور اس کے مشورے سے محبوب پردہ نشیں تک پیغام پہنچانے کی ٹھہری تاکہ ملاقات کی کوئی صورت نکلے۔

بالآخر اس کا یہ پیغام تمنا محبوب تک پہنچا۔ حدیثِ شوق اُس کے سامنے ادا کی گئی۔ اُس نے سب کچھ سُنا، لیکن سُن کے یہ جواب دیا کہ اگر صبر کا یارا نہیں تھا تو پھر عشق کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ محبوب کا ملنا آسان نہیں ہوتا۔ میرا ملنا بھی جوئے شیر کا لانا ہے۔ اس لئے بدنام کرنے اور رسوا ہونے سے کیا فائدہ! — یہ سب باتیں پیغامبر نے سُنیں اور واپس آ کر اس نوجوان عاشق کو پیغام مرگ سُنا دیا۔ وہ اُس کی تاب نہ لا سکا اور

اس کی جان ہوا ہو گئی ؎

پھر کے جوں ہی پیغام بر آیا — آ کے پیام مرگ سُنایا
جانِ الم کش تاب نہ لائی — جوشِ قلق کو تاب نہ آئی
بات سے اُس کے جان ہوا تھی — شمع سحر اور بادِ صبا تھی
ایک ہی دم میں تھا دم رخصت — آہ کی بھی دی غم نے نہ فرصت
عشق کا ادنیٰ کام ہے یہ تو — نیک بہت انجام ہے یہ تو
عشق سے جو ہو کس کو عجب ہے — عشق حریفِ مرو طلب ہے

اس طرح یہ مثنوی ان اشعار پر ختم ہو جاتی ہے ؎

مومنِ زار اب بند زباں کر — ختم سخن کر ترک بیاں کر
تا بہ کجا یہ گرم بیانی — تا بہ کجا یہ شعلہ فشانی
تابِ سماعت اب نہیں ہم کو — آگ لگے اس گرمئ دم کو
پھونک دیا جی تیری زباں نے — سینہ جلایا سوزِ نہاں نے
چشم سے سیلِ اشک رواں ہے — تو نہیں شاعر مرثیہ خواں ہے

حرفِ قلق نے سخت ستایا
تیری تپش نے سب کو لٹایا

مومن کی یہ مثنوی دوسری مثنویوں کے مقابلے میں نسبتاً مختصر ہے لیکن مجموعی طور پر اس کا انداز بھی کم و بیش وہی ہے جو اُن کی دوسری مثنویوں کا ہے۔ اس میں بھی کہانی کا کوئی خاص ارتقا نہیں ہے۔ صرف دو تین واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ واقعات مسلسل اور مربوط تو ہیں لیکن ان میں ہمہ گیری نہیں ہے۔ آپ بیتی کے رنگ نے ان واقعات کو بھی دلچسپ بنایا ہے اور ان میں بھی ایک دلکشی پیدا کر دی ہے۔ مومن نے اس مثنوی میں جذباتی معاملات کو انفرادی تجربات کے روپ میں بڑی خوبی سے ڈھالا ہے۔ اس میں ہوس کی باتیں کم ہیں وصل کے لمحوں کی تفصیل و جزئیات کا بھی اس میں پتہ نہیں چلتا۔ زیادہ زور تو اس میں ہجر و فراق کی کیفیات کے بیان پر دیا گیا ہے، اور ایک ناکام اور محروم عاشق کی ذہنی اور جذباتی

کیفیت کی واقعیت سے بڑی ہی بھرپور تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ اسی لئے اس مثنوی میں مجموعی طور پر خاصا سوز و گداز ملتا ہے اور اس کے بہت سے اشعار دلوں پر اثر کرتے ہیں۔

(۶)

مومن نے اپنی پانچویں مثنوی 'حنین مغموم' کے عنوان سے لکھی ہے۔ یہ مثنوی چوتھی مثنوی کا تتمہ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا آغاز اُس غم کے اظہار سے ہوتا ہے جس کا باعث پچھلی محبوبہ تھی۔ اُس نے مومن سے قطع تعلق کر لیا تھا، اور اس کے اس ترکِ محبت کی وجہ سے محبت کرنے والی کی زندگی بڑی بے کیف اور بے رنگ و بو ہو گئی تھی۔ مومن نے اس مثنوی میں سب سے پہلے اس کیفیت کی تفصیل پیش کی ہے اور لکھا ہے کہ جینے سے اُن کا دل سرد ہو گیا ہے۔ زندگی میں کوئی کشش باقی نہیں رہی ہے۔ بات بات پر رونا آجاتا ہے، کیونکہ دل بُری طرح جل چکا ہے۔ ہر وقت محبوب کی یاد ستاتی ہے۔ اُس کے ساتھ جو لطف اٹھائے ہیں۔ اُس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے رہتا ہے اور اُس کو یاد کر کے آنکھیں روتی ہیں۔ ساقی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

کام کیا اب ساغرِ سرشار سے | بادہ کش ہوں جامِ چشمِ یار سے
مجلسِ غم ہے مجھے بزمِ شراب | ہو گیا دل گرمیوں سے جی کباب
جلوۂ مے نے پلایا خوں مجھے | آگئی یادِ لبِ مے گوں مجھے
دیکھ دورِ ساغرِ مُل کی بہار | پھر گئی آنکھوں کے آگے چشمِ یار
وصل کا عالم نظر میں چھا گیا | پھر نشہ خود رفتگی کا آگیا
چشمِ تر لبریزِ خوں پیمانہ ہے | جوں صراحی گریۂ مستانہ ہے

اور یہی سبب ہے کہ ضبطِ غم کی طاقت اُن کے اندر باقی نہیں رہی ہے۔ اور اس کیفیت نے کچھ عجب حال کر دیا ہے ؎

پھر سرشکِ لالہ گوں غماز ہے | رنگِ رو پھر مائلِ پرواز ہے
پھر ہوا ہے ناخنِ غم جاں خراش | پارہ پارہ دلِ جگر ہے پاش پاش
پھر ہیں کیا کیا ولولے تاثیر کے | پھر پھرے دن نالۂ شبگیر کے

پھر ہے وقفِ نالہ و فریاد دل — دشمنِ جاں ہے پھر اک صیاد دل
پھر کسی زلفِ سیہ کا دھیان ہے — ظلمتِ کفر اپنا پھر ایمان ہے
پھر غرض کھانا کہاں پینا کہاں — خونِ دل لختِ جگر ہے آب و ناں
ذکرِ خفتن معنیٔ بے گانہ ہے — طالعِ خوابیدہ پھر افسانہ ہے
فکر ہائے بے خودی کا ہوش ہے — عقل کو کتنا جنوں کا جوش ہے
پھر وہی درماندگی بے چارگی — پھر وہی صحرا ہے اور آوارگی

یہ حالت دیکھ کر سب لوگ مایوس ہو گئے، معالجوں نے علاج کرنا چھوڑ دیا۔ دوستوں سے یہ حالت دیکھی نہ گئی، شاگردوں نے نا اُمید ہو کر تاریخ نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ (اس سلسلے میں شیفتہ کو بہت سراہا ہے، اور اُن کی دوست داری اور جاں نثاری کی بہت تعریف کی ہے) لیکن اس کے باوجود مرنے کی صورت نہ نکلی، اسی عالم میں زندہ رہے، اور پاک دامن محبوبہ انھیں برابر تڑپاتی رہی لیکن اس کا سبب خود اُن کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اُس نے یہ انداز کیوں اختیار کیا ؎

ہائے وہ یوسف لباسِ بے تمیز — بوئے پیراہن رکھے مجھ سے عزیز
کچھ نہیں کھلتی ہے وجہِ احتراز — پاک دامن ہے وہ تو میں پاک باز
ایسے عاشق سے حذر بے فائدہ — پاسِ عصمت اس قدر بے فائدہ
کیا ہے آخر فتوے اہلِ جمال — گر نہیں معشوق عاشق پر حلال

غرض اس طرح وہ محبوبہ اُن سے کنارہ کش ہو گئی اور وہ اُس کے بارے میں نہ جانے کیا کیا کچھ سوچتے رہے۔

اور اُن کے اس عشق کا قصہ سارے عالم میں مشہور ہو گیا۔ ہر طرف بُری طرح رسوا ہوئے۔ بدنامیاں دور دور تک پھیل گئیں۔ اس کی وجہ ایک پردہ نشیں محبوب کی ذات تھی ؎

وحشیانِ عشق میں سرخیل ہوں — خانہ بربادی میں رشکِ سیل ہوں
جا بجا قصہ مرا مشہور ہے — اہلِ وجد و حال تک مذکور ہے

حق تو یہ ہے عشق بازی یہ نہیں — پایۂ عشق مجازی یہ نہیں
پہلے تھا یہ عشق کا رتبہ کہاں — مری خواری سے لگی اُلفت کو شاں
دے گئیں نام اس قدر بدنامیاں — کام کی نکلیں مری ناکامیاں

لیکن بالآخر اُن کی یہ ناکامیاں موثر ثابت ہوئیں۔ اُن کی گریہ وزاری کا محبوبہ پر اثر ہوا، اور اُس نے ایک پیرزال کو مومن کے پاس پیغام لے کر بھیجا۔ اُنھوں نے اس پیغام کا مختصر سا جواب یہ لکھ دیا کہ اب ملنے نہ ملنے کی کوئی شکایت باقی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ وصل و فراق میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔ لیکن وہ پری فن باز نہ آئی۔ پیام آتے رہے، چھپکے چھپکے کچھ ملاقاتیں بھی ہوئیں لیکن اُس کی صورت بدل گئی تھی اور اس لحاظ سے بُرا حال ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ اس کی طرف راغب نہ ہوسکے اور اُن کا دل اختلاطِ گرم سے سرد ہو گیا۔ لیکن محبوبہ اس ہیئت کذائی کے باوجود اب تک اپنے آپ کو بُتِ ہزار شیوہ سمجھتی تھی۔ ابھی تک اُس کو حسن و جمال کا دعویٰ تھا۔ یہ دیکھ کر اُن کی طبیعت کچھ اور بھی بدمزہ ہوئی اور یہ احساس ہوا کہ سننے والوں کی طبیعت بھی بدمزہ ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ ایک نئی محبوبہ کا قصہ سنانے لگتے ہیں۔

یہ قصہ یوں ہے کہ ایک جگہ اتفاق سے وارد ہوئے اور ایک مہروش پر ان کا دل آگیا۔ جس جگہ یہ سانحہ پیش آیا وہ عجیب جگہ تھی۔ بہت سے نازنینانِ عشوہ کار وہاں جمع تھے۔ اُن میں ایک رشک پری ایسی تھی جس کا حُسن لاجواب تھا۔ اس کو دیکھنا تھا کہ یہ اُس پر دل و جان سے فدا ہو گئے ؎

کیا جگہ تھی کثرتِ آفات کی — ہم نشیں تھیں جمع اُس بدذات کی
کیسی کیسی نازنیں اک اک پری — گرم فکرِ دل رُبائی دلبری
ایک سے اک آتشیں رُخسار تر — ایک سے اک دل رُبا دلدار تر
ان میں اک رشک پری محوِ حور — سب بلائیں سی لگیں جس کے حضور
اس پری رُخسار پر دل آگیا — جلوۂ پنہاں نظر میں چھا گیا
ہو گیا کیسا ہوا عزت کا پاس — رنگ کے ساتھ اُڑ گئے ہوش و حواس

جانب چلون نظر جو جا پڑی ایک بجلی تھی جو جاں پر آپڑی
ایسے رُخ کی تاب کیا لائے نظر اس لئے تھا پردۂ نا آئے نظر
ورنہ کیونکر چھپ سکے ایسی چمک پردہ کھل جائے تو حائل ہو فلک
تھی تجلّی طور کی چلون کی آڑ کیا کہوں تنکے کی اوجھل ہو پہاڑ

اس گھر میں اکثر اس محبوبہ سے ملاقاتیں رہیں۔ ناز و نیاز کا کھیل کھیلا گیا۔ شعر و شاعری کی محفلیں آراستہ ہوئیں اور اس طرح بہت اچھا وقت گزرا۔

بالآخر یہ محبت آخری درجے میں بوس و کنار کے عالم تک پہنچ گئی، وفا کے عہد و پیمان باندھے گئے اور نوبت وصل تک جا پہنچی ؎

بوسہ و آغوش کا عالم رہا کوئی عشرت کا تقاضا کم رہا
عہد و پیمانِ وفا باہم ہوئے وعدہ ہائے وصل مستحکم ہوئے
میرے گھر اقرار آنے کا کیا قول اس سے پھر نہ جانے کا کیا
وقتِ رخصت مضطرب ہونے لگی دیکھ کر حسرت زدہ رونے لگی
آنے کب دے گر نہ ہو لوگوں کا پاس ذکر سے جانے کے جاتے تھے حواس
جوش آیا کسمسا کر رہ گئی تا بہ دامن ہاتھ لاکر رہ گئی
چلتے چلتے کہہ دیا جلد آئیو کچھ بہانہ ہو نہ ہو ہو جائیو
دم بہ دم میل طبیعت ہو زیاد جو مراد اپنی وہی اس کی مراد

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ایک دوسرے کے حد درجہ قریب ہونے کا نتیجہ تھا۔

یہ صورت حال سب پر روشن ہوگئی۔ جب اس کا علم اس بدصورت محبوبہ کو ہوا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے تو اس نے انتقام لیا۔ ایک دن اس کے پاس آکر مہمان رہی اور مومن کے ہرجائی ہونے کا سارا حال کہہ سنایا اور اس طرح اس کے کان بھر دیئے، اس نے یہ سنا تو وہ مومن سے برگشتہ ہوگئی۔ مومن نے اس کو منانے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس طرح وہ صحبت درہم برہم ہوگئی۔

اس سانحے نے مومن کی دنیا اجاڑ دی، وہ اس کے ہجر میں نیم بسمل کی طرح

تڑپنے لگے۔ بیتے ہوئے حسین لمحوں کی سہانی یاد انھیں ستاتی رہی سخت پریشانی میں وقت گزرنے لگا۔ زندگی سے بیزار ہو گئے لیکن آرزو کی قندیل ٹمٹماتی رہی اور وہ یہ سوچتے رہے کہ کاش وہ حسین لمحے ایک دفعہ پھر واپس آجائیں، ظاہر ہے کہ وہ لمحے واپس نہیں آسکتے تھے ۔ انھیں خود بھی اس کا یقین تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ مایوس نظر نہیں آتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی کا خاتمہ اس طرح ہوتا ہے ؎

مومن اتنی بے قراری کس لئے　　جوش مایوسانہ زاری کس لئے
ناامیدی اس قدر کس واسطے　　شیونِ شام و سحر کس واسطے
آیۂ لا تقنطوا تو ہوگی یاد　　قولِ حق پر کیوں نہیں ہے اعتماد
ساتھ دل کے کھو دیا کیا دین بھی　　نذر اُس جحت کے کیا کیا دین بھی
رحمتِ حق سے ہے کیوں مایوس تو　　کافر ایسا ہو گیا افسوس تو
نالہائے نارسا سے فائدہ　　ان بُتوں کی التجا سے فائدہ
سنگ دل ہیں ان کو کیونکر آئے رحم　　کس پہ آیا ہے کہ تجھ پر آئے رحم
ضبط آہ و نالہ و فریاد کر　　بھول جا سب کچھ خدا کو یاد کر
پھر تماشائے نیاز و ناز دیکھ　　انتقامِ تفرقہ پرداز دیکھ

رحم کن بر حالِ زارِ خویشتن
با خدا بسپار کارِ خویشتن

یہ مثنوی اُن کی چوتھی مثنوی ہی کا تتمہ معلوم ہوتی ہے۔ جو واقعہ اس کا خاص موضوع ہے وہ تو بعد میں شروع ہوتا ہے۔ اس سے قبل تو وہ اس واقعے پر اظہارِ غم کرتے ہیں جس سے وہ پہلے دوچار ہو چکے ہیں اور جس کا اثر اب تک اُن پر باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی کا خاصا حصہ اسی کیفیت کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ دو سیدھے سادے واقعات اور ہیں جن کا پہلے واقعے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں لیکن چونکہ یہ ایک شخص کی زندگی کے واقعات ہیں، اس لئے اس رشتے سے اُن میں ایک وحدت اور ہم آہنگی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وحدت کی بنیاد اُس شخص کی ذہنی اور جذباتی کیفیت

ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس مثنوی کا سارا حسن اسی کیفیت کے بیان میں ہے — آپ بیتی کے رنگ و آہنگ نے اس مثنوی میں بھی بڑی جاذبیت اور دلکشی پیدا کر دی ہے۔ ورنہ جہاں تک داستان اور قصے کے عنصر کا تعلق ہے اس میں کوئی خاص دلکشی نہیں ہے۔ مومن نے اس مثنوی میں بھی واقعات سے زیادہ انسانی زندگی کے ذہنی اور جذباتی نشیب و فراز کی تفصیل و جزئیات کو پیش کیا ہے — کہیں کہیں طوالت کا احساس اس میں ضرور ہوتا ہے، اور اسی کی وجہ سے بعض جگہ نامربوط کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن بیان کا حسن اور اظہار کا جمالیاتی پہلو اس کی تلافی کر دیتا ہے۔

(۷)

مومن کی چھٹی اور آخری عشقیہ مثنوی "آہ و زاریٔ مظلوم" ہے۔ اس کا آغاز نالۂ اخگر فشاں اور فغان شعلہ ریز کی آرزو اور آتش زبانی کی تمنا سے ہوتا ہے" تاکہ اُن کا سوز نہانی لب تک آسکے ؎

الٰہی نالۂ اخگر فشاں دے — فغان شعلہ ریز و خوں چکاں دے
عنایت کر مجھے آتش زبانی — کہ لب تک لاسکوں سوزِ نہانی
دے اتنی گرمیٔ طرزِ تکلم — کہ ہو غرقِ عرق برقِ تبسم
جھڑیں باتوں میں میرے منہ سے وہ پھول — کہ جائیں شعلۂ رُوگُل ریز کو بھول
مُبتانِ سنگ دِل کا جی جلا دے — زباں کو شعلۂ دوزخ بنا دے

اور اس طرح ناکام و ناامید دل کا ارمان نکل سکے اور ان باتوں کو سُن کر محبوب کے دل میں محبت کا خیال اور ملاقات کا شوق پیدا ہو لیکن محبوب سے انھیں اس بات کی توقع نہیں ہے۔ کیونکہ وہ بہت ہی خودکام اور خودسر ہے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اسی لئے برگشتہ رہتا ہے۔ اس برگشتگی کا ایک اور سبب اُس کے مذہبی اعتقادات اور اخلاقی تصورات بھی ہیں ؎

الٰہی کیا کروں خودکام ہے وہ — بُتِ غارت گرِ اسلام ہے وہ
تعجب کیا دعا کی ناشکیبی — اثر ہونے نہ دے عابد فریبی

نہ چھوڑے وہ صنم ایمان کسی کا | بنائے داغ جبہ شیخ پٹکا
اگر ترک نگہ جائے سوئے چرخ | تو کر دے مشتری کو ہندوئے چرخ
اگر لاف ورع ہو وردِ پندار | بنا دے وہ رگ گردن کو زنار
وفورِ خودپرستی چشم بد دور | شیوع بت پرستی دل سے منظور
بہم ربطِ رقیباں کے خیالات | رواجِ شرک میں مصروف دن رات
نرالا سب سے اس کا کیش وآئین | محبِ اہلِ بیت و دشمن دین
غضب خوں ریز کا فرما جرا ہے | فضائے خانہ دشتِ کربلا ہے
گلے اپنے شہیدوں کے لگے خاک | جسد مُردے کا اس مذہب میں ناپاک
نہ ڈھونڈھے قتل عاشق میں سبب کچھ | برائے مصلحت جائز ہے سب کچھ
مسلمانوں کے حق میں دوزخ اندیش | کہے کفار کو مومن وہ بدکیش
طلسمِ شیعگی جادو کلامی | صفت میری جو ہو تو نیک نامی
مری اُلفت چھپائے مجھ سے بے دین | تقیہ فرض جانے مستحب کین
خلافت ہے حقِ لیلےٰ کہے وہ | مرے بس در پے ایماں رہے وہ

چنانچہ اس طرح اُنھوں نے محبوب کے عقائد کو واضح کر کے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اُس سے وفا کی توقع نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اُس کے رام ہو جانے کی دعا کرتے ہیں ؂

یہ دن دکھلائے ہاں قدرت نمائی | کہ صبح وصل ہو شام جدائی
کرے تزئین تو تشریف اسلام | دل و جاں سے ہو وہ زیبا صنم رام
نکالے عرض ایماں مطلب اپنا | کروں آخر اُسے ہم مذہب اپنا
پڑھے کلمہ مرا وہ نامسلماں | مبارک باد دیں کیا کیا مسلماں
ادا ہو احتساب پارسائی | بنے دیں دار کا فرما جرائی
امامِ شہر کی تجدیدِ ایماں | کرے کس کس طرح تائیدِ ایماں

لیکن جب یہ دعا قبول نہیں ہوتی تو پھر انھیں یہ خیال آتا ہے ؂

الٰہی کس ستم گر سے پڑا کام | کہ ناکامی نے میری کر دیا کام

ہوس نکلی فراقِ جاں گسل کی — رہی دل ہی میں حسرت بھرے دل کی
نہ نکلا ایک ارمان آہ میرا — گیا جی مفت میں اللہ میرا
رہا خمیازہ فرمائے بر و دوش — خمارِ بادۂ شوقِ ہم آغوش
شکر ریزِ فسوں تھا حرفِ مطلب — ہوئے بند التماسِ بوسہ میں لب
مری یہ شورشِ شیریں کلامی — رہی لذت فزائے تلخ کامی
نہ پہنچے خلوتِ دلدار میں گاہ — ملے تو خانۂ اغیار میں آہ
ملے کیونکر نہ مژگاں دستِ افسوس — کفِ پا کے ہے سہلانے سے مایوس
نہ کیوں رو رو کے بس اپنا کرے خوں — نہ رکھے چشم پر وہ پائے گل گوں
جگر خوں گشتۂ بے دست و پائی — نہ آئے ہاتھ وہ پائے حنائی

اور اس طرح اپنی بگڑی ہوئی تقدیر کا رونا روتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ اس لئے بادِ سحرگاہ کے ہاتھ محبوبہ کو پیام بھیجتے ہیں جس میں گزشتہ ملاقاتوں کا ذکر اور آئندہ کی آرزوؤں اور تمناؤں کا بیان ہوتا ہے۔ لیکن یہ باتیں محبوب پر اثر نہیں کرتیں اور اس کی بے نیازی کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

اس کا ردِ عمل اُن پر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی عشق بازی کی اہمیت کو واضح کرنے لگتے ہیں:-

نہ پھولو اس قدر سنگین دل پر — نہیں فرہاد سے کچھ میں بھی کم تر
نہ جاؤ آہ بے تاثیر پر تم — کرو تغییرِ حالت پر نظر تم
بدل جاتا ہے اک دم میں زمانا — نہیں اس چرخِ کج رو کا ٹھکانا
نہ سمجھو یہ غرورِ جاودانی — کہ میری جاں نثاری جاں فشانی
معاذ اللہ اگر معجز نما ہو — تو بعد مرگ بھی کیا جانے کیا ہو

اور اس کے ساتھ اس خیال کا اظہار بھی کرتے ہیں کہ یہ عشق بڑے کارہائے نمایاں انجام دے سکتا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کی تاریخ میں اس جذبِ دل میں نہ جانے کیا کیا کچھ کیا ہے۔ عشق و عاشقی کی داستانیں اس خیال کو صحیح ثابت کرتی ہیں اور وہ اپنے اس خیال کو صحیح ثابت کرنے کے لئے ایک نوجوان کی داستانِ عشق سُناتے ہیں۔

یہ داستان اس طرح بیان ہوتی ہے۔

شہر میں ایک خانہ ویران نوجوان تھا کہ محبت جس کا اوڑھنا بچھونا تھی، اور اسی لئے وہ سر سے پاؤں تک تصویرِ محبت نظر آتا تھا — دل کی کیفیت اُس کی صورت سے ظاہر ہوتی تھی — ہر وقت نالہ کھینچتا اور گریہ وزاری کرتا — زندگی سے کوئی توقع باقی نہیں رہی تھی۔ صرف موت کے سہارے جی رہا تھا ؎

روان پرور خیالِ جان فشانی — اجل کے آسرے پر زندگانی
نہ چھوڑی دل لگانے کی تمنّا — قیامت ناز اُٹھانے کی تمنّا
اسیرِ حسرتِ گیسوئے دلدار — گرفتار گرفتاری دل آزار
خراب آرزوئے خواریٔ عشق — ہلاکِ حسرتِ بیماری عشق
اسی ارمان میں رویا کرے وہ — نگاہِ پاک کو دھویا کرے وہ
پھرے دیوانہ وار اک اک گلی میں — یہ کیا سودا ہوس سودے کے جی میں
ہوا اس سے آتشِ سوزِ نہاں تیز — پڑھے اشعار کیا کیا درد آمیز
کوئی گر حال پوچھے تو نہ بولے — نگہ سربستہ مطلب پر نہ کھولے
رہے دل ہی میں دل کی یہ عیاں سب — نہ کوئی رازداں اور رازداں سب

جب عزیزوں اور دوستوں نے اُس کی یہ حالت دیکھی تو بہت پریشان ہوئے، سبب معلوم کرنے کی کوشش کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ کسی پری رو اور شعلہ رخسار کا مارا ہوا ہے اور ایک کا فر پر بہتان بھی لگا دیا۔ یہ بات تمام شہر میں پھیل گئی۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ جب یہ بات اس سادہ رو تک پہنچی تو وہ بہت حیران ہوئی کہ آخر اس نوجوان نے میرا جلوہ کس طرح دیکھ لیا لیکن پھر یہ خیال کیا کہ ہو سکتا ہے کہ کہیں جلوہ دیکھ لیا ہو اور وہ عشق میں مبتلا ہو گیا ہو۔

یہ بات جب اُس کے دل میں بیٹھی تو ہر لمحہ اُس نوجوان کا خیال اور اُس کے ساتھ مل کر لذت اُٹھانے کا دھیان رہنے لگا، اُس کے خیال نے نیند اُڑا دی۔ راتیں بے چینی کے عالم میں گزرنے لگیں، نامہ بر کا انتظار رہنے لگا — لیکن کامیابی کی کوئی صورت نہ نکلی۔

تو اُس نے ایک ہم نشیں سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیئے ؎

کی آخر مشورت اک ہم نشیں سے — کہ اُٹھتا ہے دُھواں جانِ حزیں سے
جلایا شوقِ وصلِ تفتہ جاں نے — کیا خاک آتش سوزِ نہاں نے
انھیں فکروں میں سرگرداں ہوں دن رات — کہ اس وحشی سے ہو کیونکر ملاقات
ذرا دیکھوں تو کیا ہے اس کی صورت — نہ کر دے خاک تاثیرِ کدورت
نہ کیونکر رحم آئے سن کر احوال — کہ ہے اک سرفراز اس طرح پامال
کوئی تدبیر لے تو ہی بتا دے — کسی صورت سے وہ صورت دکھا دے

اُس نے یہ جواب دیا ؎

کہا اُس نے کہ اے سرمایۂ ناز — فدا تیرے ستم پر سب کے انداز
بلا تیری مرے اندوہ و غم میں — کہ وہ کیا میں پری کو لاؤں دم میں
نکال اپنی ہوس ہائے نہانی — ترے قربان عیش جاودانی
ذرا دھر کان حرفِ دل نشیں پر — نہ کر بیدادِ جانِ نازنیں پر
کہاں تک دور بینی ہے کہاں تو — بلائے شوق سے اُس کو یہاں تو
وہ گو بدنام ہے پر چھپ کے آنا — کوئی گر جان لے تو میں نے جانا

یہ بات اُس کے دل میں بیٹھ گئی اور اُس نے اس نسخے کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ایک عجوزۂ حیلہ پرداز کو بلایا، اور اُس نوجوان کو یہاں تک لانے کا کام اُس کے سپرد کیا وہ تیار ہو گئی اور اُس کو وہاں لانے کی تدبیریں نکالنے لگی۔

اُس نے اپنے مکان کو خوب سجایا، اور اُس میں اس نوجوان کو مہمان بلایا۔ اُس کے آنے سے عجیب دلکش فضا پیدا ہوئی ؎

غضب ہے اُس بلا کا کیا ٹھکانا — پری خانے میں دیوانے کا آنا
کیا گھر دل میں شوقِ بے دلی نے — محل پایا غمِ آب و گلی نے
ہوا وحشت فزا دردِ نہانی — ٹھکانے لگ گئی بے خانمانی
زبس ہر صورتِ خورشید رُخسار — نگاہِ شوق کو نظارہ دشوار

سراپا حیرت افزائے نظر تھا جہاں پہنچی نظر گویا کہ گھر تھا
صفا سے گر نہ ہوتی لغزش پا تو رہتی پا بہ گل چشمِ تماشا

اس کو دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئی اور اُس کے انداز اور طور طریقوں کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ وہ عاشق زار نہیں بلکہ بوالہوس ہے۔ چنانچہ وہ الطافِ نہاں سے بیزار ہو گئی لیکن اُس نوجوان نے باتوں باتوں میں کسی طرح محبوبہ کے مکان کا پتہ دریافت کر لیا اور سیدھی اُس کے مکان کی راہ لی۔

وہاں جا کر دیکھا تو ایک بہت ہی خوبصورت مکان نظر آیا۔ دیکھ کر جی خوش ہوا، قدم لڑکھڑانے لگے، ابھی گلی ہی میں تھا کہ اچانک اس مکان میں سے ایک کنیز برق رفتار نمودار ہوئی

کہ ناگہ اک کنیزِ برق رفتار ہوئی جوں شعلۂ آتش نمودار
نہ چالاکی ہی میں رشکِ قمر وہ کہ تھی خورشید سے بھی گرم تر وہ
نشاط افزا بہارِ گل جبینی شگفتہ جاں نثارِ گل جبینی
عیاں طرزِ نظر سے مہربانی نگہ نا آشنائے سرگرانی
دہن جوں غنچہ لبریزِ تبسم گل افشاں بے سخن طرزِ تکلّم
ادا فہم نگاہِ چشمِ مشتاق زباں دانِ اشارت ہائے عشّاق

اور ایک ادائے خاص سے اس دردمندِ چشمِ بیمار کو دیکھا۔ کہنے لگی کہ تیرا علاج مشکل ہے کیونکہ جس کا تو مشتاق ہے۔ وہ کسی کی بات نہیں سنتی اور مشتاقوں کے نام سے تو اُسے نفرت ہے۔ صرف میں ایک ایسی ہوں کہ اُس کے سامنے عاشق کا نام لینے کی جرأت کر سکتی ہوں۔ اگر تو اپنا افسانۂ غم مجھے سنا دے تو میں موقع پا کر کسی ڈھب سے اُس تک پہنچا دوں گی۔ اس لئے کہ مجھے تیری جوانی پر بہت ترس آتا ہے۔

یہ سن کر نوجوان میں کچھ ہمت پیدا ہوئی اور اُس نے یہ کہا کہ صرف اتنا پیام اُس محبوبہ تک پہنچا دے کہ میں اُس کے عشق میں بُری طرح رسوا ہو چکا ہوں میں نے اُس کی تصویر دیکھی ہے اور اس تصویر نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ میں اپنی جاں سے بیزار ہوں اور مجھے اُس کے بوسۂ لب کی تمنا ہے۔ اُس تند خو نے جب یہ بات سُنی تو اُسے خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اور یہ کہلا بھیجا

کہ وہ اُس کے حال سے پوری طرح واقف ہے۔

مجھے ہے خوب تیرا حال معلوم مگر سُن چکی ہوں عشق کی دھوم
سب اس غفلت مزاجی پر خبر ہے کہ تو عاشق ہے لیکن اور بہ ہے
بگاڑے گا کہیں باتیں بنا کر یہ دم دے تو کسی ناداں کو جا کر
فسونِ نالہ بے تاثیر ہے یاں سراپا معجزہ تقریر ہے یاں
خدا کے واسطے رُسوا نہ کیجو کہیں اس بات کا چرچا نہ کیجو
رہے اُس کو مبارک جو ہو بدنام تری ناکامیوں سے مجھ کو کیا کام
کبھی اے بے خرد بھولے سے زنہار نہ لینا نام میرا پھر خبردار

اُس نوجوان تک جب محبوبہ کا یہ پیام پہنچا تو وہ خون کے آنسو بہاتا، نالے کرتا اور آہیں بھرتا، وہاں سے ناکام واپس ہوا، اور یہ سوچا کہ جنگلوں کی خاک چھانے تاکہ محبوبہ کو محبت کا یقین آجائے

عناں کش جوشِ وحشت سوئے صحرا طپش رشکِ رمِ آہوئے صحرا
کیا آخر سفر بے چارگی سے ہوا ویرانہ گھر آوارگی سے
چلا منزل بہ منزل خاک اُڑاتا ہوا پر خاک کے تودے اُڑاتا
سراسیمہ، پریشاں حال بیدل نہ ہمراہ و نہ سامان و نہ منزل

اس عالم میں اُس کا گزر ایک ایسے صحرا میں ہوا جو عرصۂ محشر کی یاد تازہ کرتا تھا — اُس کی خاطرِ مشکل پسند کو اس صحرا کی فضا پسند آئی اور وہ وہیں رہ پڑا۔ اور وہیں سے بادِ صبا کے ہاتھ یہ پیغام بھیجتا رہا کہ اجازت ہو تو وطن واپس آجاؤں لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ بالآخر اُس نے یہ سوچا کہ اس صحرا میں جان دینے سے کیا فائدہ۔ شہر کی طرف چلنا چاہیئے تاکہ اُس کوچے میں مرنے کا موقع مل جائے۔

جب وہ صحرا سے رُخصت ہو کر شہر میں آیا تو دھوم مچ گئی۔ عزیزوں کو اُس کا حال معلوم ہوا۔ وہ استقبال کے لئے دوڑے اور اُس کے لیے سدِ راہ بن گئے۔ وہ محبوب کے کوچے تک نہ پہنچ سکا۔ جنت کو جانے کا خیال اس کے دل میں آیا اور اُس نے ایک بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں جان دے دی۔

اس واقعہ کے بعد محبوبہ نے خواب میں اُس نوجوان کو جنت کے مقام پر دیکھا۔ آنکھ کھلی تو پریشان ہو کر بے تحاشا بھاگی۔ حال معلوم کیا۔ مرنے کی خبر ملی۔ بہت غم ہوا۔ فوراً اُس کی قبر کی طرف چل دی اور اُس سے لپٹ کر رونے لگی۔ اسی وقت زلزلہ آیا۔ قبر پھٹ گئی۔ اور وہ اُس میں سما گئی۔ ظاہر ہے کہ اُس کا یہ مرنا جینے سے کسی طرح کم نہ تھا کیونکہ اس طرح تو اُسے حیاتِ جاودانی حاصل ہو گئی۔

مومن اس کے بعد یہ کہتے ہیں کہ وہ اس قسم کے سو قصے سنا سکتے ہیں، اور اگر یقین نہ ہو تو خود مر کر بھی دکھا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُنھوں نے اپنی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے ؎

کہاں تک آرزوئے ہم نشینی — رکھے وا ماندۂ خلوت گزینی
کہاں تک سوزِ شوقِ ہم کناری — کرے یوں گرم جا بر میں ہماری
کہاں تک اشتیاقِ بوسۂ لب — فسوں خوانِ فغان و جوشِ یارب
کہاں تک یاس ہم خوابی جگاوے — پریشاں خواب بیداری دکھاوے
کہاں تک حسرتِ ذوقِ ملاقات — کہاں تک تلخ کامی بے مکافات
کہاں تک رشکِ دشمن یار جانی — کہاں تک مہرباں نا مہربانی
کہاں تک طولِ ایامِ جدائی — کہاں تک عرضِ غم کی نارسائی
کہاں تک سوزِ دل شمعِ شبِ تار — کہاں تک بختِ خفتہ چشمِ بیدار
کہاں تک بے کسی فریاد رس ہو — کہاں تک سینے میں دل خوں ہوس ہو
کہاں تک کچھ نہ ہو تدبیرِ آرام — کہاں تک چھوڑ دوں تدبیر پہ کام
کہاں تک مفت جی جائے کہاں تک — کہاں تک کچھ نہ بن آئے کہاں تک

حریفِ یاس اک مدت ہوا میں
خبر لے جلد ہی ظالم مُوا میں

اور اس طرح یہ مثنوی اپنی زبوں حالی اور کس مپرسی کے اظہار پر ختم ہو جاتی ہے۔

اس مثنوی میں کسی حد تک کہانی کا عنصر موجود ہے۔ اس کی بنیاد تو محض دو تین واقعات ہیں اور انھیں واقعات سے اس کہانی کا تار و پود تیار ہوا ہے لیکن ان میں ایک

مربوط کیفیت پائی جاتی ہے۔ اور اسی مربوط کیفیت نے اس میں ایک وحدت اور ہم آہنگی پیدا کردی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ان واقعات کا بیان یہاں صرف سیدھے سادے اور سپاٹ انداز میں نہیں ہوا ہے، بلکہ ان میں نشیب و فراز اور پیچ و خم کی کیفیت نمایاں ہے جس کی وجہ سے کہانی میں دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔ مومن کی دوسری مثنویوں کی طرح یہ مثنوی بھی آپ بیتی ہے، اور اس آپ بیتی کے رنگ نے اس میں بھی حقیقت اور واقعیت کی شان پیدا کردی ہے۔ اسی لئے اس میں بھی زندگی کا احساس ہوتا ہے اور ایک مانوس سی فضا نظر آتی ہے۔ مومن نے اس مثنوی میں محبوب کی شخصیت کو بھی پوری طرح نمایاں کرکے پیش کیا ہے اور اس کے عقائد اور تصوّر اخلاق کی تصویر بھی کھینچی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے عقائد کی اہمیت بھی واضح کی ہے اور مختلف زاویوں سے ان کو نمایاں کیا ہے۔ مومن نے یہاں اس بات کی صراحت بھی کی ہے کہ وہ ان عقائد میں پختہ ہیں اور عشق کی جذباتی کیفیت بھی ان کو ٹھیس نہیں لگا سکتی۔ اس طرح اس مثنوی سے مومن کی شخصیت کے بعض پہلوؤں پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ عشق کا تصور کم و بیش اس مثنوی میں بھی وہی ہے جو ان کی دوسری مثنویوں میں ملتا ہے لیکن اس میں عاشق اور محبوبہ دونوں کی جذباتی کیفیت میں بلندی نظر آتی ہے۔ وہ دونوں عشق و عاشقی کے اعلیٰ معیار رکھتے ہیں۔ اسی لئے ان دونوں کے انجام میں المیہ کیفیت ہے۔ نوجوان عاشق اپنے عشق کی صداقت کو ثابت کرنے کے لئے جان دے دیتا ہے۔ محبوبہ صرف اس خیال سے اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتی کہ وہ اس کو بوالہوس اور ہرجائی سمجھتی ہے لیکن جب اس کو اس کے مرنے کے بعد عشق کی صداقت اور اخلاص مندی کا یقین ہوجاتا ہے تو وہ خود بھی جان دے دیتی ہے۔ مومن نے اس مثنوی میں جذبات نگاری کا بھی کمال دکھایا ہے اور اس کی وجہ عشق کے اعلیٰ معیاروں کا خیال اور احساس ہے جس کی اس مثنوی میں ایک لہر سی دوڑی ہوئی ہے۔ منظرکشی، واقعہ نگاری اور تصویر کاری کے بھی اس میں بہت اچھے نمونے ملتے ہیں، اور مجموعی طور پر زبان و بیان کا حسن بھی اپنے شباب پر نظر آتا ہے۔

(۸)

مومنؔ کی یہ مثنویاں اُردو مثنوی کی روایت میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ مجموعی طور پر ان کا انداز اُردو کی عام مثنویوں سے مختلف ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس روایت میں اضافہ کیا ہے۔ یہ محض روایتی انداز میں نہیں لکھی گئی ہیں۔ اور اسی لئے مثنویوں کی روایت سے ان کا کوئی خاص تعلق بھی نہیں ہے۔ مثلاً ان کی بنیاد وہ داستانیں نہیں ہیں جن میں عام طور پر مافوق الفطرت باتیں ہوتی ہیں، اور بعید از قیاس واقعات کے بیان کو جس کا حسن اور مبالغہ آرائی کو جس کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ ان کا مقصد صرف کہانی کہنے اور ایک خیالی سی فضا پیدا کرنے کا خیال نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے بعض فطری معاملات کی ترجمانی ہے جس میں لکھنے والے کی کسی شعوری کوشش کو دخل نہیں۔ اسی لئے ان مثنویوں کی فضا غیر انسانی نہیں ہے۔ اور کسی جگہ بھی ان کے غیر حقیقی ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔

یہ مثنویاں تو مومنؔ کی آپ بیتی ہیں۔ ان میں تو صرف اُن واقعات کا بیان ہے جو انھیں زندگی میں پیش آئے ہیں۔ اور جن کا اثر اُن پر بہت گہرا ہوا ہے۔ اسی لئے یہ واقعات تجربات کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مومنؔ نے ان واقعات کو ایک تماشائی کی طرح افسانہ بنا کر بیان ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ انھیں اپنی زندگی کا جز بنا کر پیش کیا ہے، اور وہ خود اُن کا جز بن گئے ہیں ــــ اسی لئے یہ واقعات محض ذہن کی اختراع نہیں معلوم ہوتے بلکہ ان مثنویوں میں ایسے انفرادی تجربات کا روپ اختیار کر لیتے ہیں جن کو زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان واقعات کے پردے میں تو مومنؔ نے اپنی مخصوص ذہنی اور جذباتی کیفیات کو پیش کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ انھیں کیفیات نے ان واقعات کی تشکیل کی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان میں صداقت کا احساس ہوتا ہے۔ اور شروع سے آخر تک حقیقت و واقعیت کی ایک لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ بیتی نے ان مثنویوں میں حقیقت اور واقعیت کے رنگ کو کچھ اور بھی گہرا کر دیا ہے اور ساتھ ہی ایک مانوس سی فضا بھی پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ جو واقعات ان مثنویوں میں پیش کئے گئے ہیں۔

اُن میں کچھ انسانی رنگ و آہنگ ہے کہ اُس میں ہر انسان کو خود اپنی تصویر نظر آتی ہے۔

مومن کی شخصیت ان مثنویوں میں پوری طرح بے نقاب ہے۔ یہ تو اُن کے مزاج افتادِ طبع، ذہنی رجحانات، عادات و اطوار، اخلاق اور کردار کی صحیح تصویریں ہیں۔ مومن تو ان مثنویوں میں ہنستے بولتے، چلتے پھرتے اور زندگی کو بسر کرتے، اُن کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے اور اُس کی مسرتوں سے رس نچوڑتے نظر آتے ہیں۔ بچپن سے لے کر جوانی کے زمانے تک جو واقعات انھیں پیش آئے ہیں، جن حالات سے اُنھیں دوچار ہونا پڑا ہے، جو کچھ اُن کے دل پر بیتی ہے۔ اُن کی تمام تفصیلات ان مثنویوں میں موجود ہے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مومن ایک رنگین مزاج شخص تھے، اور اُن کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔ وہ زندگی کو ایک رنگین عینک سے دیکھتے تھے۔ جوانی نے اُن کے لئے کائنات کی ہر چیز کو پُر کار بنا دیا تھا، وہ حُسن کے شیدائی تھے۔ اور یہ حسن اُن کی زندگی کے اُفق پر ایک سرخوشی بن کر چھا گیا تھا۔ زندگی بھر وہ اس حُسن کے پیچھے دوڑتے اور اُس کی حلاوتوں سے سینہ بھر لینے کے لئے سرگرداں رہے، اس سلسلے میں اُنھیں عجیب و غریب حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ بدنام ہوئے، رسوائیاں ہوئیں۔ ذلّتیں اُٹھانی پڑیں — لیکن وہ باز نہ آئے اور حُسن سے لذّت حاصل کرنے اور لطف اندوز ہونے کا خیال ایک لمحے کو بھی اُن کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوا۔ اسی حسن پرستی، لطف اندوزی اور لذّت پسندی کو اُنھوں نے ان مثنویوں میں عشق کا نام دیا ہے۔ اسی لئے اُن کے عشق میں اعلیٰ معیار نہیں ہیں۔ بلکہ اُس کی حدیں ہوس سے ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُن کے اس عشق کو صرف ہوس تو نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ انھیں عشق و ہوس کے درمیان ایک خط بھی کھینچا ہے اور اپنے عشقیہ واقعات کو بیان کرتے ہوئے عشق کی سپردگی کی طرف بھی اپنی طبیعت کا میلان ظاہر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو واقعات اُنھوں نے پیش کئے ہیں، اُن میں صرف وصل اور متعلقاتِ وصل ہی کے مختلف پہلوؤں کو بنیادی حیثیت حاصل نہیں ہے، اُس کی محرومیاں بھی اُس میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ان مثنویوں میں ہجر و فراق کا بیان جو اتنا نمایاں نظر آتا ہے، اُس کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ عشق کو صرف لذّت پسندی سے عبارت نہیں سمجھتے۔ اُن کے نزدیک محرومی اور ناکامی کا غم بھی اُس میں بنیادی حیثیت

رکھتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُنھوں نے چھ مختلف عشقیہ واقعات کی تفصیل پیش کی ہے اور اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُنھوں نے صرف ایک عشق تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا ہے اور اس کا سبب بلاشبہ یہ ہے کہ وہ زندگی میں ایک کے بعد دوسرے محبوب کے پیچھے دوڑتے رہے ہیں لیکن اس طرح اُنھوں نے اُس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے جو اُن کی زندگی میں موجود تھا، اور جس کو پیدا کرنے کی ذمہ داری اُن کے زمانے کے خارجی اور اجتماعی حالات پر بھی تھی۔ اُس زمانے میں عشق کا ایک مخصوص تصور تھا۔ مومن نے ان عشقیہ واقعات کو پیش کرتے ہوئے اسی تصور کو اپنے سامنے رکھا ہے۔ اسی لئے اُس میں محبوب کا کوئی بلند تصور عشق کا کوئی اعلیٰ معیار اور عاشق کا کوئی اعلیٰ کردار نظر نہیں آتا۔ البتہ وہ اُس زمانے کی زندگی کے عام معیاروں کو ضرور پیش کرتے ہیں۔

ان مثنویوں کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اس زمانے کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کا صحیح نقشہ نظر آتا ہے۔ مومن نے اگرچہ ان مثنویوں میں اپنے انفرادی معاملات اور واردات و کیفیات کی مصوّری کی ہے لیکن اپنے آپ کو ایک مخصوص معاشرے کا فرد ثابت کیا ہے۔ اسی لئے جن حرکات و سکنات اور افتادِ طبع و ذہنی رجحانات کی ترجمانی ان مثنویوں میں کی گئی ہے۔ اُس میں اُس زمانے کی مخصوص تہذیبی اور معاشرتی حالت کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اُس زمانے میں حسن کا جو تصور تھا، عشق و عاشقی کے جو معیار تھے، مجلسی زندگی کی جو کیفیت تھی، رہن سہن کے جو آداب تھے، وہ سب ان مثنویوں میں جگہ جگہ اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔ محبوب کی حیثیت یہاں مجلسی ہے۔ اُس کی زندگی کا مقصد محفل آرائی ہے۔ اس کی ان محفلوں میں رنگینیوں کا بسیرا ہے۔ عاشق وہاں ان رنگینیوں سے لُطف اندوز ہونے کے لئے رسائی حاصل کرتا ہے لیکن یہ سب کچھ اُس معاشرے میں پردے کے پیچھے ہوتا ہے اسی لئے محبوب کی پردہ نشینی ان مثنویوں میں اتنی نمایاں کر کے پیش کی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ اُس معاشرے میں ان پردہ نشینوں کا بھی ایک اچھا خاصا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو کہنے کو تو پردہ نشیں تھے لیکن جنھوں نے اس پردے کے پیچھے کُھل کھیلنے کا ایک دوسرا ہی کاروبار جاری کر رکھا تھا۔ مومن نے محبوب پردہ نشیں کو پیش کر کے درحقیقت اپنے معاشرے کے اسی پہلو

کی تصویر کشی ہے۔ عاشق اس معاشرے میں اسی محبوب پردہ نشیں سے عشق کرتا تھا اور اس کے عشق کے معیار یہی تھے کہ وہ اُس کی محفل میں رسائی حاصل کر کے اس کی رنگینیوں اور رعنائیوں میں گم ہو جائے اور اس طرح اس کو لذت حاصل کرنے کا موقع ملے۔ لذت پسندی اُس معاشرے کا معیار تھا۔ اسی لئے اُس زمانے کے عشق میں بھی یہی خیال نمایاں ہے۔ اور عشق کرنے والے اسی کے پیچھے دوڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس صورت حال کے ہاتھوں جو مخصوص فضا پیدا ہو سکتی ہے وہ ان مثنویوں میں بھی موجود ہے۔

مومنؔ کی بڑائی اس میں ہے کہ اس مخصوص معاشرتی ماحول کی ترجمانی کے باوجود اُنھوں نے ان مثنویوں میں نفسیاتِ عشق کی جو تصویریں کھینچی ہیں، اُن میں انسانی رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے۔ وہ افراد جو اس کاروبارِ شوق کو چلاتے ہیں۔ اُن کا تعلق ایک مخصوص معاشرے سے ضرور ہے، اور اُن کی حرکات و سکنات میں اُس معاشرے کی تمام خصوصیات اپنی جھلک دکھاتی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ غیر معمولی افراد نہیں ہیں۔ اُن میں مجموعی طور پر عام انسانوں کی خصوصیات زیادہ نمایاں ہیں۔ وہ عام انسانوں کی طرح حسن سے دلچسپی لیتے اور محبت کرتے ہیں، اُن کی زندگی صرف وصل ہی سے عبارت نہیں ہے، ہجر و فراق کی تلخیوں سے بھی اُنھیں دوچار ہونا پڑتا ہے، وہ ہمیشہ کامیاب و کامراں ہی نہیں رہتے، ناکامیوں سے بھی اُن کی بھینٹ ہوتی ہے۔ اُنھیں زندگی کا غم بھی کھانا پڑتا ہے۔ وہ اُداس ہونا بھی جانتے ہیں۔ اسی صورت حال نے مومنؔ کی ان مثنویوں میں ایک انسانی فضا قائم کی ہے۔ اور اس انسانی فضا نے اُنھیں زندگی سے ہم کنار کر کے خاصا بلند کر دیا ہے۔

یہ مثنویاں شاعرانہ فن کاری اور فن کارانہ شاعری کے لحاظ سے بھی منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں جگہ جگہ اعلیٰ درجے کی شاعری کے نمونے ملتے ہیں اور مختلف اشعار میں شعریت کی جو بجلیاں سی کوندتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اُن کا اثر براہ راست حواس پر ہوتا ہے۔ یہ حسیاتی شاعری کی بہت اچھی مثالیں ہیں اسی لئے ان میں تفصیل و جزئیات کا حسن ہے اور اس حسن کو ایک محاکاتی انداز اور مصورانہ شان نے دوبالا کر دیا ہے۔ مثنویاں کیا ہیں ایک اچھا خاصا نگار خانہ ہیں جس میں انسانی زندگی کے رنگین لمحوں کی ایسی اَن گنت تصویریں جمع

ہیں جن کے رنگوں کی شوخی خطوط کے تیکھے پن کے ساتھ مل کر کچھ ایسی فضا پیدا کرتی ہے جو دیکھنے والے کو قدم قدم پر چونکاتی ہے۔ ان میں جگہ جگہ تخییل کا کمال نظر آتا ہے۔ اس تخییل نے ان میں رنگینی اور پرکاری پیدا کی ہے اور کچھ عجیب گل بوٹے بنائے ہیں۔ انھیں مثنوی نگاری کے فنی پیمانے سے ناپنا صحیح نہیں ہے۔ یہ تو واقعیت اور حقیقت سے بھرپور رومانی نظمیں ہیں جن میں شاعرانہ حسن کے شباب کو بے نقاب دیکھا جا سکتا ہے۔

اُردو مثنوی کی روایت میں مومنؔ کی یہ مثنویاں بھی حسن اور رنگینی کے ساتھ ایک نرالی شان سے جلوہ گر نظر آتی ہیں اور ان کے انداز اور رنگ و آہنگ کو دیکھ اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ حسن کی اس رنگینی اور رنگینی کے اس حسن نے نہ صرف ان مثنویوں کو بلکہ خود مثنوی کی اس روایت کو رشکِ گلشن اور غیرتِ چمن بنا دیا ہے!

مومن کی اہمیت

مومن اپنے زمانے کے ایک اہم انسان اور شاعر تھے۔ اُن کی اِس اہمیت کو اُن کے ہم عصر شاعروں، تذکرہ نگاروں، تاریخ نویسوں اور جدید دور کے محققوں اور نقادوں سب ہی نے تسلیم کیا ہے اور بہت واضح الفاظ میں اس کی وضاحت کی ہے۔ مومن نے خود بھی اس روایتی عجز و انکسار کے باوجود جو اُس زمانے کی تہذیب کا لازمی جز تھا اور جس کا رنگ مومن کی شخصیت میں بھی رچا ہوا تھا اپنی اہمیت محسوس کی ہے، اور اپنی تحریروں میں کہیں کہیں اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ہر چند کہ اس اظہار میں تعلّی کا رنگ و آہنگ ہے لیکن اس سے بھی مومن کی شخصیت اور شاعری کی اہمیت پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔ غرض ان تمام تحریروں سے مومن کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

غالب اُنیسویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے، اور مومن کے ہم عصروں میں اُن کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مومن کی وفات پر اُنھوں نے جو رُباعی کہی ہے، اور جس کو میرزا قادر بخش صابر نے اپنے تذکرے 'گلستانِ سخن' میں درج کیا ہے۔ اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے دِل میں مومن کی کتنی عزت تھی، وہ اُن سے کتنی محبت کرتے اور اُن کو کتنی اہمیت

دیتے تھے ؎

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر | خوں نابہ بر رُخ زدیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن | چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر[۵۱]

حالی نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے کہ غالب نے جب مومن خاں کا یہ شعر سنا ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا | جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اُس کی بہت تعریف کی اور کہا کہ کاش مومن خاں میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا۔"[۵۲]

مومن کے ہم عصروں میں شیفتہ کی شخصیت بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور نقاد تھے۔ مومن کے بارے میں اُنھوں نے اپنے تذکرے گلشن بے خار میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے :۔

"مومن تخلص بے بہا لعل سخن دانی، یک دانہ گہر دریائے معانی، فرماں فرمائے اقلیم سخن پایہ بلند ساز این فن، بہ دور آور ساغر، بادۂ بے غش، نواگر نغمہ ہائے دلپذیر و دلکش، صاحب جائگاہ رفیع صورت، معانی بیان و بدیع، مہر سپہر نکتہ دانی، واقفِ سیر آسمانی، شاعر حکمت بہ رو، حکیم سخن گستر فریدِ عصر، یکتائے دوراں، جامع فنونِ شتی حکیم محمد مومن خاں الامی اعطاہ اللہ تعالیٰ استعداد من ابجع من اشتات الکمال و جری فی ریاض قلبہ من ینابیع فیضہ الاقدس، انہار الافضال از دودمانِ گرامی و از خاندان نامی است۔ حدِ فضائل عمیم و جلائل فخیمش حدِ رقم نیست و شمار محامد بزرگ و مکارمِ سترگش اندازۂ قلم نہ۔"[۵۳]

اور آگے چل کر اُن کی شاعری کے بارے میں یہ خیالات ظاہر کئے ہیں :۔

"شاعری دونِ مرتبہ اوست۔ اما چوں سخن دریں فن است اعراض نا مستحسن زبان جادو طرازش سحر را بہ مرتبۂ اعجاز رسانیدہ و سخن دلپذیرش طول را ہم پایۂ ایجاز گردانیدہ۔ گوہر افشانی طبع نیساں بارش دامن دامن، کانِ جواہر در جیب و آستین مفلساں انداختہ و گل ریزی اندیشۂ بہار

---

۵۱ میرزا قادر بخش صابر: گلستانِ سخن: ص ۴۴ | ۵۲ حالی: یادگارِ غالب: ص ۷۶
۵۳ شیفتہ: گلشنِ بے خار: ص ۱۹۵

نثارش چمن چمن ریاضِ جنت بہ چشمِ نظارگیاں جلوہ گر ساختہ در جنب تفرد فاتش ماہتاب کہ بہ یکتائی علم است مانند ستارگاں بہ تعدد مشہور و بہ ضیائے شمع فکر آتش ذرات نامحسوس بہ جلوۂ خورشیدِ درخشاں مشاہد و منظور۔ در پیشِ چنیں نیر گیتی آرا انوری کم از سہا و در بارگاہِ چنیں خدیو فریدوں فر خاقانی کمینہ چاکر۔ عنی یکے از وظیفہ خوارانِ خوانِ نعمتِ او ست و بو فراس یکے از غاشیہ بردارانِ میدانِ مکرمتِ او۔ دعوی گرانِ بلند آہنگ ہمہ دانی در حضرتش نغمۂ ہیچ مدانی می سرایند و مدعیان طلیق اللسان بہ پیش گاہش لب می بندند و زبان با ظہار لکنت می کشایند ——— دیوانش مملو از اصنافِ سخن است، و مثنویاتِ متعدد دارد کہ ہر یکے رشکِ گلشن و غیرتِ چمن است[1]

کریم الدین بھی مومن کے ہم عصر تھے۔ اُنھوں نے تذکرۂ طبقاتِ شعرائے ہند میں اُن کے بارے میں لکھا ہے:۔

"مومن تخلص جناب حکیم مومن خاں صاحب کا ہے جو شاعر مشہور و معروف طبقۂ چہارم میں موجود ہیں۔ ایسے ذہین اور ذکی اور ظریف اور عقلمند کم ہوتے ہیں۔ حال استعداد کا اُن کی یہ ہے کہ عربی شرحِ مُلّا تک اور فارسی خوب جانتے ہیں اور کچھ طب میں بھی مہارت ہے۔ اصلاح اشعار کی شاہ نصیر سے اُنھوں نے لی ہے۔ مگر در باب فنون نظمیہ کے خدا نے اُن کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے اُستاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے۔ شعر اُن کا بہت اچھا ہوتا ہے۔ شاگرد اُن کے بہت ہیں مگر سب سے ممتاز شاگرد میر حسین تسکین ہیں۔ ایک دیوان اُن کا بہت بڑا ہے جس کو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ نے فراہم کیا تھا۔ درمیان ۱۸۴۶ء کے وہ دیوان میں نے چھپوا دیا ہے۔ اب عمر اُن کی قریب چالیس کے ہوگی۔ یہ شاعر اس طبقے میں بڑے اُستاد کامل شمار کئے جاتے ہیں۔ مومن دہلوی، ناسخ لکھنوی، نصیر دہلوی، ابراہیم ذوق دہلوی۔ سوائے اِن کے اور شاعر بھی بہت اچھے کہنے والے ہیں مگر یہ لوگ ٹکسالی ہیں۔ ان کے کلام کی سند ہو سکتی ہے بخلاف اوروں کے کہ وہ لوگ اُن کے شاگردوں میں سے ہیں یا آنکہ اُن کے متبع ہیں۔ سوائے اس کمال شاعری کے مومن مذکور کو علم نجوم اور رمل بھی خوب آتا ہے۔ عروض خوب جانتے ہیں

---

[1] شیفتہ؛ گلشن بے خار: ص ۱۹۶-۱۹۷

چھ مثنویاں اور ایک دیوان اُن کی تصنیف سے ہیں بہت خلیق اور حلیم، ظریف آدمی ہیں۔ ابتدا میں تمام اوقات شعرگوئی اور لہو و لعب دُنیا میں صرف کر کے، تمام مزے عیاشی کے اُٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر بھی کہنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر کمال عنایت فرماتے ہیں۔ اکثر شام کو شہر کی سیر کرتے ہیں۔ اب پابند نماز روزے کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں۔"[۵۱]

اور اپنے دوسرے تذکرے "گلدستۂ نازنیناں" میں ان خیالات کا اظہار کیا ہے:۔

"شاعرِ بے نظیر خاک پا جس کی باب شاعری میں اکسیر، لعل کانِ سخن دری بے بہا، سخن دانی میں گوہر یکتا، عالم جمیع اصناف سخن، واقف اسرار فن، چشمۂ فیض اُس کے سے سب دانی و قاضی کامیاب، فنون حکمیہ اور احوالات سیّارات میں گوہر نایاب ـــ خاقانی ہر چند کہ زبان فارسی کا زمانِ مقدم میں گزرا لیکن اگر وہ بھی ہوتا تو جبین نیاز آستان اس شاعر پر رکھتا۔ مرحبا وہ لطافت جو کلام فارسی اس شاعر کی میں ہے ہرگز نہ پاتا۔ اس کو اگر سحر کہیں تو بجا ہے، اور اگر افسوں کہیں تو سزا ہے۔ اور اگر اعجاز کہیں تو سچ ہے۔ حقیقت میں یہ شاعر اس رتبے کا ہے۔ میر نے اگرچہ طرزِ نو اختیار کی، پر اس رتبے کو نہ پہنچ سکا۔ سودا کو گو دعوی ہمسری ہر شاعر کا سودا ہوا پر یہاں وہ بھی دیوانہ ہو گیا۔ خاقانی و فیضی و انوری اگرچہ فیض فیض خاقان سے مُنوّر ہوئے۔ پر اُن کے سامنے اُن کا چراغ نہ روشن ہوا۔ حکیم اس پائے کے کہ بوعلی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے، پر اُن کے سامنے شعورِ نبض دیکھنے کا نہ پائے۔ المختصر موصوف بجمیع صفات کمال اور قادر بر تمام فنون حکمتہ ـــ نام اُن کا محمد مومن خاں سلمہ اللہ تعالیٰ ـــ قلم میں یہ طاقت کہاں کہ ایک شمۂ شمائل شاعر موصوف کا لکھ سکے۔ ناچار تمام اوصاف اس شاعرِ بے بدل جامع جمیع کمال و فضل کے ذہن مُتّہم نارسائی کا کر کے قلم انداز کئے جاتے ہیں۔ اور کچھ اشعار اُن کے دیوان سے قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں، کیونکہ اس شاعر کا دیوان اس قابل نہیں کہ اُس سے انتخاب کیا جائے بلکہ سب اشعار درجہ مساوات کا خوبی اور مرغوبی میں رکھتے ہیں۔"[۵۲]

میرزا قادر بخش صابر اپنے تذکرے "گلستانِ سخن" میں اُن کے متعلق لکھتے ہیں:۔

---

۵۱ کریم الدین: طبقات شعرائے ہند: ص ۴۴۳-۴۴۴ ۵۲ کریم الدین: گلدستۂ نازنیناں: ص ۱۰۲-۱۰۳

مومن تخلص سخن سنجِ بے عدیل محمد مومن خاں مرحوم غفر اللہ لہ۔ زمینِ سخن اُس کی بلندیٔ فکر سے رشکِ افلاک، اور اوجِ فلک اس کی علوئے طبع کے مقابل پستیٔ خاک۔ عروسِ معنی اس کے حجلۂ طبع میں شوخ و برجستہ۔ رازِ غیب اُس کے سینۂ قلم میں سربستہ۔ خامہ اُس کے سوزِ معنی سے نخلِ طور، اور ورق اُس کے فروغِ مضامین سے مطلعِ نور، مصرع آہ اُس کی غزلِ عاشقانہ میں تضمین اور اسرار الیقین اُس کے ابیاتِ عارفانہ میں گوشہ گزیں سخن سنجانِ عصر ہر چند بالا دوی فکر سے عرش تاز تھے لیکن جو کہ یہ بالا نگاہ اپنی ہمتِ عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا۔ ہر سر بلند اُس کو پست اور ہر بزرگ خورد نظر آتا، اور وہ بے تصنع اُس کا نام اُسی پندار کے موافق زبان پر لاتا اور ہر چند مساحانِ اقلیمِ کمال منازلِ دور و دراز طے کر کے نشیب و فراز راہ سے واقف و پیرایۂ سخن سے آگاہ تھے لیکن بس کہ یہ چابک خرام کمال پیش بینی سے مراحل بے شمار باقی پاتا تھا اُن کو کاہل قدم اور شکستہ پا جان کر بے اختیار ریش خند کرتا اور اُن تیز قدموں کو نقشِ پا سے نارساتر بتاتا جو کہ کوتاہ بینانِ روزگار اس والا پایگی اور علوئے ہمت سے آگاہ نہ تھے۔ اُس کی نگاہ کو عیب بیں، اور اور اُس کی نگاہ کو خردہ گیر تصور کر کے زبان سرزنش دراز اور طومار شکوہ دراز کرتے ــــ ایک دیوان ضخیم کہ اصنافِ سخن پر مشتمل اور اُس کے سامنے فصاحتِ سحبانی مخجل ہے، اور مثنویاتِ متعددہ مثل قصۂ غم اور شکایتِ ستم، قولِ غمیں اور تفِ آتشیں، اُس قادر الکلام سے صفحۂ روزگار پر یادگار ہیں۔ ہر چند کہ زبانِ اُردو میں علمِ یکتائی بلند ہی تھا لیکن کمالِ مہارتِ فارسی کوس لمن الملک کی صدائے ہند سے فارس تک پہنچ کر طوطیٔ ہند اور بلبلِ شیراز کو دم بخود کر دیتا تھا۔ غزل ہائے فارسی کاغذ پارہ ہائے پراگندہ پر ثبت اور بالفعل محبتِ طبیعی اور قرابتِ قریبہ کے تقاضے سے اُس کے شفیق میر عبد الرحمٰن آہی تخلص خلف میر حسین تسکین کے عہدۂ اہتمام میں ہے اور جو کہ وحیدِ عصر مسیح وحد، جالینوس زماں بقراطِ دوراں حکیم احسن اللہ خاں سلمہ الرحمٰن کو شفائے مرضی کے اہتمام سے قدم بڑھا کر احیائے اموات اور معجزۂ مسیحائی کی ترویج پیش نہاد ہے، قریب ہے کہ وہ دیوان منصۂ طبع میں جلوہ گر ہو کر شہرتِ تمام پیدا کرے۔

اتفاقاتِ قضا و قدر سے ایک روز ایک مکان کے بامِ بلند پر عروجِ معنی کے تصور میں تھا کہ ناگاہ لغزشِ پا نے اوجِ سخن سے پستیٔ زمین کی طرف مائل اور اس مضمون پیش پا افتادہ کی جانب

متوجہ گیا۔ ہر چند اُس بام کی بلندی چنداں پایہ نہ رکھتی تھی لیکن کچھ آسمان کی کج روی اور کچھ زمین کی ناہمواری سے دست و بازو میں ضرب شدید پہنچی۔ اس شدّتِ الم میں اس حادثہ جانکاہ کی تاریخ یہ پائی. گویا اُس کوٹھے سے پاؤں کا پھسلنا بامِ معنی کی نردبان تھا ؎

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت، گفتا — خود با خروش گفتم بشکست دست و بازو
گفتم کہ با یدت گفت تاریخ ایں مصیبت — گفتا خموش گفتم بشکست دست و بازو

۱۲۶۸

چند ماہ انواع شدائد نے وہ رنج دیا کہ اُن کا تحمل حدِ بشر سے خارج تھا۔ آخر الامر اسی سال میں کہ بارہ سو اڑسٹھ ہجری تھی بسفر آخرت اختیار کر کے وابستگان جگر فگار کے دل کو رنج اور داغ میں مبتلا اور حورانِ فردوس کو سعادت استقبال سے مستعد کیا۔۔۔۔ اس امر ناگزیر کے کئی مہینے بعد نواب مصطفےٰ خاں بہادر شیفتہ تخلص کہ انسان صورت و ملک سیرت ہیں رویائے صادقہ میں دیکھتے ہیں کہ گویا مومن خاں کا خط آیا ہے اور اُس کے خاتمے پر خط سبز سے مرقوم ہے مومن اہل الجنۃ۔۔۔۔ وسعتِ رحمت سے کیا بعید ہے کہ جوشِ دریائے مغفرت نے اُس مستحق کرامت کے دامن کو لوثِ عصیاں سے پاک کر دیا ہو۔ صدق اللہ عز و جل قال عذابی اصیب من اشاء و رحمتی وسعت کل شیٔ ؎

ابر رحمت سخت بے پروا خرام است اے صدف
تا گدا می قطرہ ایں جا باز کردہ اند دہان

اسی سانحہ عبرت افزا کی تاریخ ہے وہ مصرعہ جو میر حسین تسکین کی سال وفات اُس سے معلوم اور اُس کے ذکر میں مرقوم ہے۔[1] مرزا اسد اللہ خاں غالب نے اس رباعی کی عبارت میں اظہار الم اور اس نظم کے پیرائے میں افشائے غم کیا ہے ؎

شرط است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر — خوں نابہ بہ رُخ ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن — چوں کعبہ سیہ پوش نہ باشم ہمہ عمر

راقم آثم بھی از بس کہ مومن جنت نصیب سے رابطہ محبت کا مستحکم رکھتا تھا فکر تاریخ میں سر بجیب

---

[1] ارم میں مومن و تسکین دعارف۔ گلستان سخن: ص۱۸۱

ہوا۔ ناگاہ معدنِ ضمیر سے ایک لعلِ آب دار اور ایک گوہرِ شاہوار ہاتھ آیا ؎

برلبِ کوثر و تسنیم برفت — تشنۂ جامِ محبت مومن
گفت تاریخِ وفاتش صابر — یافت مقبولیِ جنت مومن

اجو میاں برشاد صبر تخلص نے "ماتم مومن خاں" مادہ تاریخ پایا اور خوب پایا۔ در محمد افضال علی صدق تخلص نے بھی ایسا ایک مادہ پایا ہے کہ اُس مادے سے پائے میں کم نہیں "مومن آباد کرد خلد بریں"۔ اب چند شعر لکھ کر ماتم مومن خاں مرحوم کو تازہ اور اس الم کو بے اندازہ کرتا ہے اور سخن کی بے کسی پر نالہ اور معنی کی مظلومی پر نوحہ سر کرتا ہے۔[۱]

سر سید احمد خاں تذکرۂ اہل دہلی (آثار الصنادید) میں ان کے بارے میں لکھتے ہیں:۔
"زنگ زدائے آئینۂ سخن دانی، مصقل مراتِ نکتہ رانی، محیِ مراسم کمال ماہی کساد فضل و افضال جلوہ دہ عرائس مضامین تازہ زیب و سادہ کمالات بے اندازہ، سرمستِ نشۂ سخن وری، نظر باز شاہد معنی پروری، غواص محیط تدقیق، آشنائے بحرِ تحقیق، پیرایہ پیرائے محامد پسندیدہ، حلیہ طراز اطوار گزیدہ، غازہ پرداز خلق محمدی، مظہر آثار سعادتِ ازلی و ابدی، یگانۂ جہاں محمد مومن خاں مومن تخلص ـــــ اُن کے کمالات کا اندازہ ظرفِ شمار سے افزوں اور حیطۂ تعداد سے بیروں ہے۔ معنیٔ تازہ سے الفاظ میں جان ڈالنا اور انفاس عیسوی سے معنی پژمردہ کو تازہ تر از گل اور سیراب تر از مُل کرنا ایک شیوہ ہے خاص اس سخن سنج معانی پناہ کا ـــ ان کے فروغِ ضمیر سے دری، کوکب دری، اور اُن کی متانت طبع سے سخنِ ریختہ ایوانِ ریختہ۔ اگر یہ کہا جاوے کہ شیرینیٔ زبان حافظ اور نمکِ سخن سعدی اور متانت تراکیب انوری اور نشستِ الفاظ خاقانی اور آیاتیٔ عبارات ابوالفضل ہندی اور تازگیٔ معانی کمال الدین اصفہانی، اور سوا اس کے جو خوبی صنفِ شعرا سے کسی کے ساتھ مختص ہے، سب اُن کے کلام معجز نظام میں صرف ہے۔ حق شناسی اور مرتبے سے بہت بعید اور نہایت دور از کار ہے۔ حق یہ ہے کہ قسامِ ازل نے سب کو انھیں کے خوانِ استعداد سے منصبِ ریزہ چینی اور انھیں کے

---

[۱] مرزا قادر بخش صابر: گلستانِ سخن: ص ۲۴۳-۲۴۴

دیگِ کمال سے وظیفہ چاشنی گیری عطا کیا ہے۔ زبانِ ریختہ میں وہ کمالِ مبداء فیاض سے حاصل ہوا ہے کہ سودا کو اُن کے سخن کے رشک سے جنون اور میر اُن کے کلام کی خجلت سے سرنگوں ۔۔۔ سخن گوئی کو یہ حدِ اعجاز پہنچایا اور شعر نے اُن سے مرتبہ حکمت کا پایا۔ نکاتِ سخن اور دقائقِ فن اُن کے قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ابر سے بارانِ لطافت۔ اُن کی طبیعت اور فروغ اُن کے ضمیر میں ایسی ہے جیسے آئینے میں صفا اور مشرق میں خورشیدِ رخشاں۔ ابیات اُن کے مثل بیتِ ابرو سراپا انتخاب اور اشعار اُن کے مانند مصرعِ زلف مجموعۂ آب و تاب۔ سخن اُن کا باوصف پُرگوئی کے رکاکت سے خالی، اور فکر اُن کا باوجود غور کے عالی۔ دیوان ریختہ کا مشتمل ہے اصناف اور شعبِ فن پر۔ غزلیات سے لے کر تا مخمسات و مسدسات اور فرد سے لے کر تا رباعیات و قطعات جس پر نظر پڑے اگر وہ عاشقانہ ہے ہر حرف اُس کا گردۂ تصویرِ آہ ہے اور اگر اندازِ معشوقانہ کا بیان ہے تو ہر دائرہ اُس کا ایک چشمِ سرمہ سا ہے مستغنی نگاہ و ماحصل کلام اُن کا حصر و شمار سے افزوں ہے"[1]

نواب صدیق حسن خاں تذکرۂ "شمع انجمن" میں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"شاعرِ قابل بود۔ ہمیشہ پری زادانِ معانی را بہ دامِ بیانے صید می کرد و سخن در فارسی و ریختہ ہر دو می سرائید۔ از شعرائے نامور شاہجہاں آباد و صاحبانِ استعدادِ خدا دادا است"[1]

عبدالغفور خاں نساخ اپنے تذکرے "سخن شعراء" میں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"مومن تخلص حکیم مومن خاں مرحوم ولد حکیم غلام نبی خاں مغفور دہلوی ۔۔ ایک یا دو غزل میں نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی، اصلاح پسند نہ آئی۔ بارہ سواڑسٹھ ۱۲۶۸ ہجری میں قضا کی۔ "ماتم مومن خاں" ان کی وفات کی تاریخ ہے۔ علم تنجیم و طب میں خوب دخل رکھتے تھے جمیع اصنافِ سخن پر قادر تھے، اشعار اُن کے پُرمضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں۔ راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں

لہ سرسید احمد خاں: تذکرہ اہل دہلی: ص ۱۴۹-۱۵۰ لہ نواب صدیق حسن خاں: شمع انجمن: ص ۴۴۸

گذرا نہیں۔ کلیات اُن کا نظر سے گزرا ہے[۵۱]

نورالحسن خاں "تذکرۂ طور کلیم" میں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مومن حکیم مومن خاں فرزند حکیم غلام نبی خاں دہلوی در طب ید طولیٰ داشت و در نجوم پایۂ بالا۔ بر جمیع اصناف سخن قادر بود۔ از لطائف شعر و شاعری کما ہو حقہ ماہر۔ بہ قوتِ سخن وری مومن کم ترکسے برخاستہ و ہر دو لفظ چنداں دستگاہے نصیب او گشتہ کہ پارسیان ازاں خود می انگارند و ہندیاں بہ شرف ہم زبانی نازہا دارند۔ دیوانش مملو از اصناف سخن ست۔ مثنویات متعدد دارد۔ فرصتم نیست کہ بہ انتخاب دیوان وے پردازم ہمانا از گلشن بے خارہیتے چند بر داشتم کہ ہر یکے از دست بوئے فصاحت و گلدستہ بلاغت می تواں شمرد۔ الحق دریں فن محسود ابنائے روزگار ست و مشہور ہر شہر و دیار۔ ناظورۂ بیان نازکش سرمایۂ حیاتِ عشاق ناکام و معشوقۂ کلام دل آویزش تسلی خاطرہائے پُر آلام۔ مذاق آشنایانِ معنی از عذوبت کلام شیر فیش ذائقہ لطف بر داشتہ اند و نکتہ شناسان نغز گفتار سخن جادو فریبش را افسوں دل ربا انگاشتہ اند۔ ہمانا وفات او در ۱۲۶۸ھ واقع شدہ"[۵۲]

"آبِ حیات" میں اُن کے بارے میں لکھا ہے:۔

"رنگین طبع رنگین مزاج، خوش وضع، خوش لباس، کشیدہ قامت، سبز رنگ، سر پر لمبے لمبے گھونگھر والے بال، اور ہر وقت انگلیوں سے اُن میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھالے پائنچے، اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ ایسی دردناک آواز سے دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے۔ باتیں کہانیاں ہو گئیں۔ باوجود اس کے نیک خیال سے بھی اُن کا دل خالی نہ تھا۔ نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مُرید ہوئے کہ مولانا اسمٰعیل صاحب

۵۱ نساخ: سخن شعراء: ص ۴۶۷ ۵۲ نورالحسن: طورِ کلیم: ص ۹۷-۹۸

کے پیر تھے۔ خاں صاحب انہیں کے عقائد کے بھی قائل رہے[1]

اور کلام پر اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے:۔

"غزلوں میں اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں، اور استعارہ اور تشبیہہ کے زور نے اور بھی اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے۔ ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کئے ہیں۔ اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اُس کا انداز جرأت سے ملتا ہے، اور اس پر وہ خود بھی نازاں تھے۔ اشعار مذکورہ میں فارسی کی عمدہ ترکیبیں اور دلکش تراشیں ہیں کہ اُردو کی سلاست میں اشکال پیدا کرتی ہیں۔ اُن کی زبان میں چند وصف خاص ہیں جن کا جتلانا لُطف سے خالی نہیں۔ وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذاتِ شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر میں عجیب لطف لطیف بلکہ معانی پنہانی پیدا کرتے ہیں ـــــ اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیں فارسی کی اور استعارے و اضافتیں اُردو میں استعمال کر کے کلام کو نمکین کرتے ہیں ـــــ قصائد اپنے درجے میں عالی رُتبہ رکھتے ہیں اور زبان کا انداز وہی ہے ـــــ مثنویاں نہایت درد انگیز ہیں کیونکہ درد خیز دل سے نکلی ہیں۔ زبان کے لحاظ سے جو غزلوں کا انداز ہے وہی اُن کا ہے"[2]

خواجہ امداد امام اثر کاشف الحقائق میں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"حکیم مومن خاں ذوق کے ہم عصر تھے۔ مگر ذوق سے غزل گوئی کا رنگ علیحدہ رکھتے تھے۔ غالب بھی اسی زمانے میں تھے۔ گو مومن کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہے۔ ہر چند مومن اور غالب دونوں شاعری کا داخلی پہلو برتتے تھے تو بھی ان دونوں کے مذاق شاعری جداگانہ تھے۔ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی جتنی غزلیں ہیں ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ مومن کی غزل سرائی دہلی کی غزل سرائی کا طور رکھتی ہے۔ غزل سرائی میں مومن بھی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین حوالۂ قلم کرتے ہیں۔ گو اُن کے بیان

۱؎ آزاد: آب حیات: ص ۴۴۴ ۲؎ ایضاً: ص ۴۲۹-۴۳۰

میں خواجہ درد یا میر صاحب کے کلام کی پُرتاثیری پائی نہیں جاتی ہے۔ ان دونوں بزرگوں کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ جس طرح کمان سے تیر نکلے اِن کا کلام سامع کے دل پر فوراً جا بیٹھتا ہے۔ برخلاف اس کے مومن کا اندازِ سخن ہے کہ جب تک بغور ان کے کلام پر نظر نہ ڈالیے لطفِ کلام حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اس لیے بعض بے مغز دل نے مومن کے دیوان کو مہمل قرار دیا ہے ـــــ اس میں شک نہیں کہ مومن ایک بڑے بلیغ شاعر ہیں۔ مگر میر صاحب کے کلام کی رفعت، جلالت، سکنت، خستگی، برشتگی کو نہیں پہنچتے ہیں۔ اور ہر چند وصل، فراق غم ملال، رنج، ضد، عداوت، حسد، رشک، اضطراب، بے تابی، بے خوابی کے مضامین خوب باندھتے ہیں۔ مگر اُن کے کلام سے کبھی کبھی کوچہ گردی کی بو آجاتی ہے ـــــ اس پر بھی جوانانہ انداز کے ساتھ تہذیب کی عنان کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے۔ خیر خواجہ اور میر کے معاملاتِ قلبیہ کے مضامین کی بندش میں مومن خاں جو کچھ سمجھے جائیں مگر حقیقت حال یہ ہے کہ وہ ایک ایسے بڑے غزل سرا ہیں کہ اُن کی غزل سرائی پر اہلِ دہلی کو بلکہ ہر دیار کے مذاق کو ناز ہونا چاہیے۔ مومن خاں کی غزل سرائی تشبیہ سے اکثر پاک دیکھی جاتی ہے، استعارے بھی کثرت سے داخلِ کلام نہیں ہوتے اور مبالغے سے خالی نہیں دیکھے جاتے ہیں[۱]

صفیر بلگرامی تذکرۂ جلوۂ خضر میں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"مومن خاں عاشق تن برشتہ طبیعت تھے ـــــ طبیعت کی وارستگی اور شوخی نے اُن کے کلام میں علم کے ساتھ ضم ہو کر عجیب مزا پیدا کر دیا تھا۔ زورِ طبیعت سے اُن نہانی واقعات اور وارداتِ خاطر کو ایسے پیرائے میں باندھ جاتے ہیں کہ دوسروں کے لئے کارے دارد ـــ واقعی عجیب بامذاق شاعر ہو گیا ہے۔ جرأت اس رنگ کے موجد تھے۔ مگر بہ سبب کم علمی کے بہت کھُل گئے تھے۔ مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ اداشناس ہی اُس کے مزے کو جانتا ہے[۲]"

۱۔ خواجہ امداد امام اثر: کاشف الحقائق: ص ۱۲۲-۱۲۳ ۲۔ صفیر بلگرامی: تذکرۂ جلوۂ خضر جلد اول: ص ۲۴۰-۲۴۱

مولانا عبدالحی نے گل رعنا میں اُن کے بارے میں آزاد کی رائے نقل کر کے ان خیالات کا اظہار کیا ہے :-

"بات یہ ہے کہ جو جذبات و خیالات غزل میں بیان کیے جا سکتے ہیں، وہ سب قدما کے حصے میں آ گئے اور جتنے لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان کے ہو سکتے ہیں وہ سب ختم ہو گئے ممکن ہے کہ متاخرین اُس دائرے سے نکل کر ہر قسم کے خیالات پر اپنی شاعری کی بنیاد قائم کر دیتے تو اُن کو وسیع، اور فراخ میدان مل جاتا مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اُسی محدود دائرے میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔ مومن خاں کے ہم عصروں میں مرزا غالب نے اس میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ مگر جیسا کہ خود مولانا حالی نے یادگار غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے کہ "مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے" حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے۔ وہ اُن کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے۔ قصیدوں میں غزلوں میں مثنویوں میں ہر جگہ اُن کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں، مگر افسوس ہے کہ اُن کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو اُن کی کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا اُن کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والوں کا ذہن خود بخود اُس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اُس کے سمجھنے میں کاوش فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔"[۵۱]

مولانا عبدالسلام ندوی اُن کے متعلق شعر الہند میں لکھتے ہیں :-

---

۵۱ مولانا عبدالحی: گل رعنا: ص ۳۰۱-۳۰۲

مومن خاں نے بھی اوّل اوّل ناسخ ہی کے رنگ میں کہنا شروع کیا تھا۔ چنانچہ اُن کے دیوان میں اس رنگ کے بہت سے اشعار ملتے ہیں ــــ لیکن یہ رنگ اُن کی اُفتادِ طبع کے خلاف تھا۔ اس لئے اُن کی عشق مزاجی نے اُن کو جرأت کے رنگ یعنی معاملہ بندی کی طرف مائل کیا۔ لیکن انھوں نے اس میں بھی دہلی کی شان کو قائم رکھا۔ اور نہایت متانت اور تہذیب کے عشق و ہوس کے جذبات ادا کئے۔ چنانچہ صفیر بلگرامی اپنے تذکرے میں لکھتے ہیں "جرأت اس رنگ کے موجد تھے۔ مگر بسبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے۔ مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور نرالی ترکیبوں نے ایسے پردے میں رکھا کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے۔ اسی سبب سے اکثر اُن کے اشعار کو لوگ بے معنی بتاتے ہیں" (جلوۂ خضر صفحہ ۱۴۲) لیکن مشکل بندشوں اور نرالی ترکیبوں کو چھوڑ کر انھوں نے جہاں صفائی اور روانی کے ساتھ معاملہ بندی کی ہے، وہاں بھی وہ جادۂ تہذیب سے الگ نہیں ہوئے ہیں۔[۱]

مولانا ضیاء احمد بدایونی اُن کے بارے میں دیوان مومن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

"مومن سے پہلے جس قدر شعراء گذرے ہیں قصیدے میں (باستثنائے سودا) اُن کا کوئی ہمسر نہیں۔ اگرچہ پختگی اور صفائی میں قصائد ذوق کا پایہ کہیں برتر ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں۔ اُن کی تشبیب عموماً نادر اور پُر لطف ہوتی ہے تشبیب میں شعرائے سلف عموماً بہاریہ مضامین یا مناظر وغیرہ سے ابتدا کرتے تھے۔ مومن نے تشبیب کو اس کے حقیقی معنی میں منحصر کر دیا۔ گویا اُن کی تشبیب میں سرتاپا تغزل کی شان نظر آتی ہے۔"[۲]

ان میں سے شروع کی چھ مثنویاں جن کے نام تاریخی ہیں عشقیہ ہیں اور جگ بیتی

---

[۱] مولانا عبدالسلام ندوی: شعر الہند: ص ۲۴۷-۲۴۸ [۲] ضیاء احمد بدایونی: دیوان مومن: ص ۳۶

نہیں بلکہ آپ بیتی ہیں۔ مومن کی شاعری میں عام پر داخلی رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مثنوی بھی جو عموماً خارجی مضامین کے لئے مخصوص ہوتی ہے اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ دِقّت پسندی، مضمون آفرینی، تکلّف، معاملہ بندی، بدیع الاسلوبی جو اُن کی غزلیات کا وصف ہیں، مثنویات میں بھی علی وجہ الکمال نظر آتی ہیں ـــــ اکثر موقعوں پر زبان کی سلاست اور جدید تراکیب کی لطافت دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے [۵۱]۔"

"اُردو شعراء میں نفس تغزّل کے اعتبار سے جس نقطۂ عروج تک پہنچ گئے ہیں، دوسروں کو اُس کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں ـــــ مومن کا وصف یہ ہے کہ انھوں نے غزل کو اُس کے حقیقی مفہوم میں منحصر کر دیا۔ مانا کہ ایسا کرنے سے شاعری کا میدان تنگ تر ہو گیا لیکن یہ عیب نہیں بلکہ ہنر ہے کہ اُن کی دقیقہ سنج طبیعت نے ظرف تنگنائے غزل میں اِن قیود کے باوجود وہ جولانیاں دکھائیں اور اس محدود موضوع میں وہ تنوعات پیدا کیے کہ تمام معاصرین پر سبقت لے گئے اور نفس غزل کے لحاظ سے بہترین غزل گو کہے جانے کے مستحق ٹھہرے [۵۲]۔"

عرش گیاوی اُن کے بارے میں حیاتِ مومن میں لکھتے ہیں :-

"تغزل کا اُن کے انداز یہ کہ اشعار اُن کے مضامین پیچیدہ، نازک خیالوں اور نادر ترکیبوں کے ساتھ درد و غم سے معمور ہیں۔ ایک ہی لفظ کو متواتر لاتے ہیں اور معنیٰ عجیب و دلکش پیدا کر دیتے۔ بہتیرے شعر ایسے بھی ہیں جو بالکل سہل ممتنع ہیں اور عام دماغوں کی وہاں تک رسائی نہیں۔ یہی سبب ہوا کہ کلام اُن کا خاص پسند رہا ہے اور ہے مگر مجھے اپنی تشریحات سے یقین ہے کہ اگر اسی طرح اور اہل قلم بھی متوجہ ہوئے تو مقبولیت عام رکھی ہوئی ہے [۵۳]۔"

---

۵۱ ضیاء احمد بدایونی : دیوان مومن : ص ۴۵ ۵۲ ایضاً : ص ۵۱-۵۲
۵۳ عرش گیاوی : حیات مومن : ص ۱۱۱

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اردو میں لکھتے ہیں :-

"مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لئے شہرۂ آفاق ہے ۔ اُن کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہیں اور کلام میں ایک خصوصیت پیدا کردیتے ہیں ۔ اُس میں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز اُن کو طرزِ لکھنؤ سے علیحدہ کردیتی ہے ۔ عاشقانہ رنگ کے وہ اُستاد کامل ہیں ۔ اُن کی علمی لیاقت اور طباعی اُن کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے ۔ مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے دلدادہ ہیں کیونکہ فارسی میں اُن کو بھی وہی تبحر حاصل تھا ——— اُن کی مثنویاں سراپا نشتر ہیں جن میں حرماں نصیب عاشق کے سوزِ محبت کا اظہار ہے ۔ وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں اور مضطرب دلوں کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہیں ۔ ——— مومن شعرائے اُردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں ۔ نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دل فریب شاعری کی وجہ سے یا اس لئے کہ اُن کے معاصرین اُن کی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحب طرز ہیں جن کے پیرو نسیم دہلوی منشی امیر اللہ تسلیم ، حسرت موہانی وغیرہ ایسے نامآور وہ لوگ ہیں"[۱]

ڈاکٹر اعجاز حسین مختصر تاریخ ادب اُردو میں لکھتے ہیں :-

"مومن کی یادگار ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہیں ۔ کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معنی آفرینی اور جدت بیان کے لحاظ سے اُردو میں کم شعرا اس پائے کے گزرے ہیں ۔ فارسی ترکیبوں اور الفاظ کے اُلٹ پھیر سے سادی بات کو بھی شان دار بنا سکتے تھے ۔ کبھی کبھی الفاظ کی تکرار تاثیر بڑھانے میں مدد دیتی تھی ۔

مومن کا دل عشق کی لذت سے خوب واقف تھا ۔ اس وجہ سے درد اور مزہ کلام کو دلکش اور پُر لطف بنا دیتا ہے ۔ اشعار میں تھوڑی سی پیچیدگی ، طرز تشبیہ اور استعارے کی ندرت اُن کی انفرادی خصوصیات میں داخل ہیں اور فرسودہ خیال

---

[۱] ڈاکٹر رام بابو سکسینہ : تاریخ ادب اُردو (ترجمہ مرزا محمد عسکری) : ص ۳۰۸

کو بھی اسلوبِ بیان کے زور سے نیا کر لیتے ہیں جس سے پُر لطف معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔ اُن کی جذبات نگاری میں اصلیت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے کیونکہ وہ وارداتِ قلب اور محبت کی نفسیات کو مدِ نظر رکھ کر شعر کہتے تھے۔ اُن کی غزلیں فلسفیانہ مباحث سے بھی خالی نہیں۔ حیات و موت کی کشا کش مختلف طریقوں پر بیان ہوئی ہے ——— اُن کی مثنویاں اُن کی حیات کی آئینہ دار ہیں جن میں جذبات کی آمد اور زبان کی سلاست اور روانی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں"[۱]

ڈاکٹر یوسف حسین خاں "اُردو غزل" میں اُن کے بارے میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں:۔

"مومن خاں کے کلام میں بھی رمز و کنایہ کثرت سے استعمال ہوا ہے اور چونکہ وہ کنایے کے ساتھ بہت کچھ مطالب اور اُن کی منطقی کڑیاں حذف کر جاتے ہیں اس لئے سامع کو ذرا ٹھٹک کر سوچنا پڑتا ہے کہ وہ کیا کہہ گئے۔ اُن کے کلام میں خاص کنایے کی مثالیں کثرت سے ہیں جیسی اُردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں"[۲]

نیاز فتح پوری اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"اگر میرے سامنے اُردو کے تمام شعرائے متقدمین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میرا) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیاتِ مومن دے دو، اور باقی سب اٹھالے جاؤ"

"انھوں نے (مومن نے) نہ کبھی بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا اور نہ کسی امیر کو سراہا جس کی ایک وجہ تو اُن کی غیور اور خود دار فطرت تھی اور دوسرا سبب یہ تھا

---

[۱] ڈاکٹر سید اعجاز حسین: مختصر تاریخ ادب اُردو: ص ۱۳۶
[۲] ڈاکٹر یوسف حسین خاں: اُردو غزل: ص ۷۱

کہ وہ سمجھتے تھے ایسے وقت میں بادشاہ کی تعریف کرنا زخم پر نمک چھڑکنا ہے۔ بلکہ زیادہ گہری نظر سے اُن کے کلام کو دیکھا جائے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس وقت کی سیاسیات سے نابلد نہ تھے۔ اور قومی خودداری کا جذبہ اُن میں اس قدر موجود تھا کہ جہاد پر اُنھوں نے ایک مثنوی ہی سپردِ قلم کردی، اور دیوان میں بھی بعض اشعار ایسے پائے جاتے ہیں جن کا روئے سخن فرنگیوں کی طرف ہے[۵]۔

میرزا جعفر علی خاں اثرؔ اُن کے بارے میں لکھتے ہیں :-

مومنؔ کی شاعری میں چند ایسی خصوصیتیں ہیں جو اُردو کے کسی دوسرے شاعر میں نہیں پائی جاتیں یا الشاذ کالمعدوم کا وجود رکھتی ہیں ـــــ اُس نے اپنے دائرۂ تخیل کو بہت محدود کردیا ہے۔ مسائلِ تصوف و سائنس و فلسفہ کی کہنا چاہیئے کہ جھلک بھی نہیں۔ صرف ایک متلون شاہدِ مجازی سے محبت ہے، اور اسی کے تمام لوازم ہیں۔ ادا و ناز و غمزہ و کرشمہ کی مصوری ہے، اپنے یا غیر کے جذبۂ رشک و حسد و رقابت کی نقاشی ہے۔ ادا بندی و معاملہ نگاری واردات حسن و عشق کا تذکرہ و تجزیہ ہے مگر سب مجاز کا پہلو لئے ہوئے۔ تاہم اس محدود دائرے میں اُس نے ایسی حیرت انگیز جدت اور تنوع سے کام لیا ہے کہ جو شعر ہے نیا ہے اور اسی کے ساتھ بے حد دلکش۔

فارسی کی خوشنما ترکیبوں کو سلیقے سے برمحل استعمال کرنا ـــــ اس صفت میں وہ غالب کا مدِمقابل ہی نہیں بلکہ اس لحاظ سے پیش پیش ہے کہ اُن کی طرح ایسی ترکیبوں کے استعمال میں بے اعتدالی نہیں برتی۔ جو ترکیب ہے خوبصورت ہے، اور گویا اسی جگہ کے لئے وضع ہوئی تھی۔ بعض ترکیبیں فارسی شعراء سے مستعار لینے کے بجائے اُس نے خود گڑھی ہیں۔ ان میں بھی وہی لطافت ہے ـــــ مومنؔ کے دیوان میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ملے گا جس کی بندش سست ہو یا اندازِ بیان شاعرانہ نہ ہو یا خیال میں تازگی نہ ہو۔ فن کے

---

[۵] نیاز فتح پوری: کلام مومن پر ایک طائرانہ نگاہ: نگار مومن نمبر

لحاظ سے یہی شاعری کی معراج ہے۔

نفسیات کے دشوار ترین مسائل کو سادہ الفاظ میں دلکش طریقے سے بیان کیا ہے۔ البتہ
جیسا پہلے عرض کیا جا چکا ہے تصوف نہیں ہے۔ دو چار شعر کھینچ تان کر شاید اس زمرے میں آجائیں
مگر یہ کمی مومن کی شاعرانہ عظمت کو اور زیادہ نمایاں کرتی ہے اور شاعری کے بیشتر اشعار میں
وسعت معانی صرف ان مسائل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ حقائق و معارف کی بحث کا یہ لازمی
نتیجہ ہے لیکن مجردات کو چھوڑ کر نفسیات کے مسائل کو مختصر الفاظ میں نظم کر دینا آسان کام نہیں
مومن کو زبان پر ایسی قدرت ہے اور فطرت انسانی کا اس قدر گہرا مطالعہ کیا ہے کہ وارداتِ
قلبیہ و محسوسات ذہنیہ کو متشکل کر کے آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے —— اور جہاں تک
فن کا واسطہ ہے اُس کا ہر شعر مکمل ہے[1]"

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی "دلی کا دبستانِ شاعری" میں اُن کے بارے میں لکھتے ہیں :-

"مومن بھی غالب کی طرح اپنی انفرادیت لئے ہوئے تھے سنجیدہ معاملہ بندی اور
تغزل اُن کی غزلوں کا مخصوص جوہر ہے۔ نازک خیالی اُن کی شطرنج کے نقشوں کی طرح دقتِ نظر
اور پیچیدگی کی حامل ہوتی ہے —— مومن بھی غالب کی طرح روش عام سے علیحدہ رہتے
تھے۔ اُن کی مشکل پسند اور جدت طراز طبیعت کسی شعبے میں بھی تقلید کرنا عار سمجھتی تھی ——
عقائد میں حسن عقیدت اور جوشِ مذہب بہت ہے اور یہ اُن کے ماحول اور تربیت کا
نتیجہ ہے۔ اکثر جگہ دوسروں پر مذہبی نوک جھوک بھی کر جاتے تھے۔ مومن سے قبل جس قدر
شعراء گزرے ہیں بہ لحاظ ندرت قصیدے میں بہ استثنائے سودا اُن کا کوئی ہمسر نہیں۔
اگرچہ ذوق کا پایہ پختگی اور صفائی میں کہیں برتر ہے تاہم زور اور ندرت ادا میں مومن
کا جواب نہیں۔ اُن کی تشبیب عموماً نادر اور پُر لطف ہوتی ہے۔ تشبیب کو بھی مومن اس کے
حقیقی معنوں میں پیش کرتے ہیں یعنی اس میں بھی تغزل کی شان نظر آتی ہے۔ مثنویاں اُن کی
زیادہ تر عاشقانہ ہیں اور اُن میں آپ بیتی پائی جاتی ہے[2]"

---

[1] جعفر علی خاں اثر لکھنوی: مومن کا تغزل: نگار مومن نمبر ص ۹۷-۹۶
[2] ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی: دلی کا دبستان شاعری: ص ۲۴۴

سید وقار عظیم اُن کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

مومن کا تغزل صرف مومن کا حصہ ہے۔ اسی تغزل نے مومن کو مومن بنایا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس تغزل کے بنیادی عناصر تقریباً وہی ہیں جو ہر اُردو شاعر کی غزل کے۔ اس لحاظ سے میر، جرأت، غالب، داغ اور مومن میں ذرا بھی فرق نہیں۔ اُن کی غزلوں میں وہی روایتی مثلث ہے جس کے ضلعے عاشق، محبوب اور رقیب کی شخصیتیں ہیں۔ پھر بھی دوسروں میں اور مومن میں فرق ہے۔ یہی فرق ہے جس نے مومن کو امتیاز دیا ہے۔ اور یہی امتیاز مومن کے نام اور اُن کے کلام کے لئے بقائے دوام کی ضمانت ہے۔[۵]

راقم الحروف نے چند سال قبل اپنے ایک مضمون میں مومن پر ان خیالات کا اظہار کیا تھا "اُردو غزل کی روایت میں مومن کی آواز بالکل اچھوتی اور نئی ہے۔ اس آواز میں جو لوچ اور بانکپن ہے، جو تہ داری اور رمزیت ہے، جو شگفتگی اور شادابی، جو رنگینی اور رچاؤ ہے، اُس سے مومن کا تغزل پہچانا جاتا ہے۔ مومن کی اس مخصوص آواز نے اُردو غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اُردو غزل کو ایک نئے انداز سے آشنا کرنے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ــــ اور اس میں شبہ نہیں کہ اُن کے تغزل میں جدت کی جو آب و تاب اور اُپج کی جو چمک دمک ہے، اُس کی مثال اُردو غزل کی ڈھائی تین سو سال کی روایت میں کسی دوسری جگہ ذرا مشکل ہی مل سکتی ہے ــــ مومن نے یقیناً تغزل کی ایک نئی دُنیا پیدا کی ہے، اور اس دُنیا میں وہ مُنفرد نظر آتے ہیں ــــ اُنھوں نے فن کی ایک نئی راہ نکالی ہے، اور اُن کے بعد اس راہ پر بہتوں نے چلنے کی کوشش کی ہے لیکن ان میں سے کسی ایک نے بھی مومن پر اضافہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ یہ سب کے سب اُن کی بڑائی کے معترف ہیں اور اُن کے اجتہاد کو سب ہی تسلیم کرتے ہیں۔ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ مومن سے قبل اس فنّی اجتہاد کا کسی نے خواب بھی نہیں تھا۔ مومن کے بعد اُن کا تتبع تو ضرور کیا گیا۔ اور اُن کے تغزل کی رنگین کاریاں

---

۵ سید وقار عظیم: انتخاب مومن: ص ۱۵-۱۶

بیشتر کے لئے نشانِ راہ ثابت ہوئیں اور مومن نے اُن کے لئے رہبرِ منزل کا کام کیا۔ چنانچہ اُن کی قائم کی ہوئی تغزل کی روایت ان شاعروں کے ہاتھوں پروان چڑھی اور اس طرح اس روایت نے اپنا مقام پیدا کر لیا۔ اسی لئے مومن کی شاعرانہ شخصیت کو ایک ادارہ اور ان کے اس اندازِ تغزل کو ایک تحریک سے تعبیر کرنا ایسا کچھ بے جا نہیں ہے[۱]

مومن کو خود بھی اپنی اہمیت کا احساس ہے چنانچہ اپنے کلام میں اُنھوں نے بھی جگہ جگہ اس احساس کا اظہار کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کی وضاحت ہوتی ہے ؂

مومن بہ خدا سحر بیانی کا جبھی تک — ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

گر یہی گرمیٔ مضمون شرر ریز رہی — رشتۂ شمع سے شیرازۂ دیواں ہوگا

شاعری اپنی ہوئی نیرنگیٔ دانش وری — جو سخن ہے سو طلسمِ رازِ بطلیموس ہے

اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور مومن نے غزل — دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہرِ فن ہو گیا

مومن کسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو — جو پست فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا

مومن سے ہوا چھی غزل تھا اس لئے یہ زور شور — کیا کیا مضامین لائے ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

پڑھتا ہے غزل کہیں جو مومن — لگ اُٹھتی ہے ایک بار آتش

پڑھے مومن نے کیا کیا گرم اشعار — بھری تھی دل میں یا رب کس قدر آگ

۱؎ ڈاکٹر عبادت بریلوی: مومن کا تغزل: رسالہ اردو کراچی: اکتوبر ۱۹۵۷ء: ص ۳۷۲

کتابیات

(۱)

IRVINE: LATER MUGHALS

SARKAR: FALL OF THE MUGHAL EMPIRE

FRANCKLIN: HISTORY OF THE REIGN OF SHAH AULUM

PERCIVAL SPEAR: TWLIGHT OF THE MUGHALS

W.H. SLEEMAN: RAMBLES AND RECOLLECTIONS

MAJOR ARCHER: TOURS IN UPPER INDIA

BISHOP HEBBER: NARRATIVE

DR. TARA CHAND: HISTORY OF THE INDIAN PEOPLE

DR. TARA CHAND: INFLUENCE OF ISLAM ON INDIAN CULTURE

LYALL: RISE AND EXPANSION OF BRITISH POWER IN INDIA

ROBERT: HISTORY OF BRITISH INDIA

CAMBRIDGE HISTORY OF INDIA

CUNNINGHAM: HISTORY OF SIKHS

SINHA: RANJIT SINGH

GAZETTEERS OF DELHI DISTRICT

BEALE: THE OREINTAL BIOGRAPHICAL DICTIONARY

R. PALME DUTT: INDIA TO DAY

ABDULLAH YUSUF ALI: CULTURAL HISTORY OF INDIA DURING BRITISH PERIOD.

(۲)

ذکاء اللہ: تاریخ ہندوستان

غلام حسین خاں: سیر المتاخرین

درگاہ قلی خاں: مرقع دہلی

حسن نظامی: قدیم دلی

فیاض الدین: بزمِ آخر

سید احمدؒ: رسوم دہلی

ناصر نذیر فراق: لال قلعے کی ایک جھلک

سر سید احمد خاں: تذکرہ اہلِ دہلی (آثار الصنادید)

شاہ ولی اللہؒ: تفہیمات

فضل حق خیرآبادی: باغی ہندوستان

مناظر احسن گیلانی: تذکرہ شاہ ولی اللہ

عبید اللہ سندھی: شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک

خلیق احمد نظامی: شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات

منظور احمد عثمانی: الفرقان (شاہ ولی اللہ نمبر)

مولانا محمد میاں: علمائے ہند کا شاندار ماضی
مولانا طفیل احمد منگلوری: مسلمانوں کا روشن مستقبل
سید ابوالحسن علی ندوی: سیرت سید احمد شہید
سید ابوالحسن علی ندوی: مسلمانوں کے تنزل نے دنیا کو کیا نقصان پہنچایا
غلام رسول مہر: سید احمد شہید
غلام رسول مہر: سرگذشتِ مجاہدین
مسعود عالم ندوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک
شیخ محمد اکرام: موج کوثر
شیخ محمد اکرام: رود کوثر
مولوی محمد جعفر: سوانح احمدی
ڈاکٹر ہنٹر: مسلمانان ہند
خلیق احمد نظامی: تاریخ مشائخ چشت
ڈاکٹر سید عابد حسین: قومیت اور قومی تہذیب
ڈاکٹر عبداللہ یوسف علی: انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ
سید ہاشمی فرید آبادی: تاریخ ہند و پاکستان
رئیس احمد جعفری: بہادر شاہ ظفر

(۴)

شیفتہ: گلشن بے خار
کریم الدین: تذکرۂ طبقاتِ شعرائے ہند
کریم الدین: گلدستۂ نازنیناں
میرزا قادر بخش صابر: گلستانِ سخن
نساخ: سخن شعراء
قطب الدین باطن: گلستانِ بے خزاں

صفیر بلگرامی : تذکرۂ جلوۂ خضر

نور الحسن : طور کلیم

آزاد : آب حیات

عبدالحئی : گُلِ رعنا

عبدالسلام ندوی : شعر الہند

حالی : یادگارِ غالب

گارساں دی تاسی : مقالات

گارساں دی تاسی : خُطبات

ناصر نذیر فراق : مے خانۂ درد

غالب : خطوط غالب

غالب : عودِ ہندی

غالب : اُردوئے معلّیٰ

امداد امام اثر : کاشف الحقائق

شیفتہ : کلیاتِ شیفتہ و حسرتی

مرزا فرحت اللہ بیگ : دلّی کا ایک یادگار مشاعرہ

مرزا فرحت اللہ بیگ : مضامین فرحت

عرش گیاوی : حیات مومن

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی : دلّی کا دبستانِ شاعری

ڈاکٹر مولوی عبدالحق : خطباتِ عبدالحق

ڈاکٹر مولوی عبدالحق : مقدمات عبدالحق

ڈاکٹر سید عابد حسین : مضامینِ عابد

نیاز فتح پوری : انتقادیات (اول و دوم)

نیاز فتح پوری : نگار مومن نمبر

نیاز فتح پوری : نگار اُردو شاعری نمبر
نیاز فتح پوری : نگار، اصنافِ سخن نمبر
رشید احمد صدیقی : جدید اُردو غزل
آلِ احمد سرور : نئے اور پُرانے چراغ
آلِ احمد سرور : ادب اور نظریہ
ڈاکٹر یوسف حسین خاں : اُردو غزل
فراق گورکھپوری : اُردو غزل گوئی
فراق گورکھپوری : اندازے
کلیم الدین احمد : اُردو شاعری پر ایک نظر
کلیم الدین احمد : سخن ہائے گفتنی
مجنوں گورکھپوری : تنقیدی حاشیے
مجنوں گورکھپوری : نقوش و افکار
سید احتشام حسین : ذوقِ ادب اور شعور
سید احتشام حسین تنقید اور عملی تنقید
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی : غزل اور متغزلین
سکسینہ : تاریخ ادب اُردو (ترجمہ مرزا محمد عسکری)
ڈاکٹر سید اعجاز حسین : مختصر تاریخ ادب اُردو

(۴)

کلیاتِ مومن ۔ مطبع رفاہ عام دہلی ۱۸۴۶ء
کلیاتِ مومن ۔ مجلس پریس دہلی ۱۸۵۲ء
کلیاتِ مومن ۔ انڈین پنچ پریس دہلی ۱۸۵۵ء
کلیاتِ مومن ۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۷۲ء
کلیاتِ مومن ۔ نول کشور پریس لکھنؤ ۱۸۸۰ء

کلیاتِ مومن — نول کشور لکھنؤ ۱۸۸۵ء

کلیاتِ مومن — نول کشور لکھنؤ ۱۹۰۵ء

کلیاتِ مومن (چھٹا اڈیشن) لکھنؤ ۱۹۳۰ء

مجموعۂ قصائدِ مومن: مرتبہ ضیا احمد بدایونی: الناظر پریس ۱۹۲۲ء

دیوانِ مومن: مرتبہ ضیا احمد بدایونی: انڈین پریس الٰہ آباد ۱۹۳۳ء

دیوانِ مومن (فارسی) مطبع سلطانی دہلی ۱۲۷۱ھ

انشائے مومن (فارسی) مطبع سلطانی دہلی ۱۲۷۱ھ

انتخابِ مومن — عارف ہسوی

انتخابِ مومن — وقار عظیم اردو مرکز ۱۹۵۰ء

اشاریہ

(کتبہ عبدالحق اکبر آبادی)

ڈاکٹر عبادت کی کتابیں

۱

تنقیدی زاویے

(۲)

اُردو تنقید کا ارتقا

(۳)

روایت کی اہمیت

(۴)

خطباتِ عبدالحق

(۵)

غزل اور مطالعۂ غزل

(۶)

کلیاتِ میر

(۷)

تنقیدی تجربے

(۸)

جدید شاعری

(۹)

مومن اور مطالعۂ مومن

(۱۰)

مقدماتِ عبدالحقؒ (زیرِ طبع)

(۱۱)

سحرالبیان اور اس کا تنقیدی مطالعہ (زیرِ طبع)

(۱۲)

شاعری اور شاعری کی تنقید (زیرِ طبع)

(۱۳)

میر تقی میرؔ (زیرِ طبع)

(۱۴)

تنقید اور اصول تنقید (زیرِ طبع)

(۱۵)

شاعری کیا ہے؟ (زیرِ طبع)

(۱۶)

ولی اور مطالعۂ ولی (زیرِ طبع)

(۱۷)

شاہ حاتم اور اُن کا عہد (زیرِ طبع)

(۱۸)

خواجہ میر دردؔ (زیرِ طبع)

(۱۹)

نظیر اکبر آبادی (زیرِ طبع)

(۲۰)

غالب اور مطالعۂ غالب (زیرِ طبع)

(۲۱)

اقبال کا فن (زیرِ طبع)

(۲۲)

جدید اُردو ادب (۱۸۵۷-۱۹۶۱) زیرِ طبع